

گھر کے ہر فرد کے لئے

# پاکستان

جنوری  
2008  
سال نو مبارک

عید مبارک



دکھ کا تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے



300	24	209
میں کس قدر غافل ہوں	مستقل عمرات	زندگی کے دائے
صغریٰ زیدی	ادارہ	تحسین اختر

302	279	253
پاکیزہ دُستی	بہنوں کی مٹیل	دیا جلنے رکھنا
عظمیٰ آفاق سعید	انجم انصار	نگہت اعظمی

306	292	263
بڑا پاکیزہ	جلت رنگ	خصوصی مضمون
انجم انصار	انجم انصار	شائستہ زرین

308	296	272
روحانی نشوونما	میرا انتخاب	شہزوری
ادارہ	آمنہ حماد	نبیلہ فی عباسی

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.  
Postal Address: Box No. 662, G.P.O., Karachi-74200  
Phone: (021) 5802552, Fax: 5802551, E-mail address: jdggroup@h otmail.com

47	214	23
افسانے	مکمل ماحول	اداریہ
سراپنیہ	جسٹیشن	مجھے کچھ کہنا ہے
رضوانہ پرنس	نورین ظفر خان	انجم انصار

83	62	10
شاہد اہل	ناوٹ	فیشن 08
بلقیس ظفر	اسما قادری	بتول زہرہ نقوی

121	100	26
جگنوؤں سی محبت	خواتین خوابش چہ	سلسلہ وار ماحول
عالیہ حرا	سائہ عارف	ناہید سلطانہ اختر

169	180	138
لمبیت	گراہوا	اپریل
حنار رضوان	عالیہ بخاری	شیرین حیدر

پبلشر پروپرائیٹرز: نذر رسول، مقام اشاعت: 63 سی فیز II (ایکسٹنشن) ڈی ایچ اے کمرشل ایریا۔ مین کورنگی روڈ کراچی 75500  
پرنٹر: جمیل حسن۔ مطبوعہ: ان حسن پرنٹنگ پریس۔ بابا کی اسٹیمپ کراچی



# مجھے کچھ کہنا ہے.....!

کسی بھی مہذب معاشرے میں انسانی حقوق اور آزادیوں کو تہذیب کے دائرے میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اسلام میں بھی اظہار رائے کی لامحدود آزادی نہیں ہے بلکہ اس پر چند قانونی اور اخلاقی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔

اس لیے کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کسی کے خاندان، مذہب یا پیشوا کو نشانہ بنائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے اور (اے مسلمانو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

آزادی سلب نہ ہو اور وہ معاشرے کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ اسلامی ریاست میں کسی شخص کو ایسی رائے کے اظہار کی آزادی نہیں ہے جو معاشرے میں فتنہ و فساد کا سبب بنے۔

اسلام نے کسی مسلمان کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ دوسرے مسلمانوں کا مذاق اڑائے اور اس کو برے ناموں سے پکارے یا غیبت کرے۔

اسلام نے اظہار رائے کی مکمل آزادی دی ہے اور یہ حدود بھی معاشرے اور فرد کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے عائد کی گئی ہیں۔ تاہم ان حدود میں رہتے ہوئے آزادی اظہار رائے کو اسلامی ریاست میں کوئی حکومت روک نہیں سکتی جب تک عملاً کسی باغیانہ سرگرمی کا مظاہرہ نہ ہو۔

اور باغیانہ سرگرمیوں سے دوسروں کا تو نقصان ہوتا ہی ہے مگر اس میں آپ کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ کبھی کسی کو نقصان پہنچانے سے پہلے اگر یہ سوچ لیا جائے کہ یہ دنیا مختصر ٹھکانا ہے اور ہمیں اپنے اعمال کی جزا اور سزا دونوں ملیں گی۔ تو شاید ہم سب اپنے منفی ارادوں کو تکمیل نہ دینے پائیں۔

آئیے نئے عیسوی سال کا سورج طلوع ہوتے وقت ہم اپنے آپ سے یہ وعدہ کریں کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے..... کیا خیال ہے؟



### فرمان باری تعالیٰ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

وہن میں زبردستی نہیں ہے (کیونکہ) ہدایت بے شک گمراہی سے ممتاز (اور صاف ظاہر) ہو چکی ہے پس جس نے بتوں کا (جو گمراہ کرتے ہیں) انکار کیا اور اللہ (حق) پر ایمان لایا تو (گویا) اللہ نے (اپنے ہاتھ سے) ایک مضبوط رسی پکڑ لی جو (کبھی) ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ (حق) کی (سنت) اور سب کی نیوٹوں کو) جانتا ہے (۲۵۶) ایمان لانے والوں کا اللہ (حق) کا راز ہے کہ انہیں (گمراہی کی) تاریکیوں سے (ہدایت کی) روشنی میں لاتا ہے اور جو (اسلام کے) منکر ہیں ان کے کارساز شیاطین ہیں جو انہیں (ہدایت کی) روشنی سے (گمراہی کی) تاریکیوں میں لاتے ہیں، یہی لوگ دوڑتی ہیں وہ اس میں ابدالاً باور ہیں گے (۲۵۷) (اے محمد ﷺ) کیا تم نے اس (یعنی نمرود کی) حالت پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے اس (غور کی) وجہ سے کہ اللہ نے اس بادشاہی دی تھی ان کے رب کے بارے میں (ان سے) جھگڑا کیا (تھا) جب ابراہیم نے کہا میرا رب تو ہے جو (سب کو) جلاتا اور مارتا ہے (اس کے جواب میں) بولا کہ میں (بھی تو) جلاتا اور مارتا ہوں (آپ کے اللہ کا) میں کمال ہی کیا ہوا) ابراہیم نے (اس پر) کہا پس تحقیق اللہ تو مشرق سے آفتاب لاتا ہے، اچھا (جب جانیں) تو اس مغرب سے لے آ، اس پر وہ کافر بھونچکا ہو گیا (سکتہ میں رہ گیا) اور اللہ بے انصافوں کو راہ (حق) نہیں دکھاتا (۲۵۸) ان جیسے بزرگ کہ ایک قریہ پر گزرے اور وہ اپنی چھتوں کے بل گرا پڑا تھا، کہنے لگے کہ (اب) اس قبیلہ کو اللہ اس ویرانی کے بعد کیونکر آباد کرے گا (اور خود سور ہے) پھر (ان کی روں) قبض کر لی گئی اسی طرح) سو برس تک اللہ نے ان کو مردہ رکھا پھر انہیں (جلا کے) اٹھایا (اور) پوچھا کہ تم تپتی دیر تک پڑے رہے کہا کیا دن یا دن سے کم، ارشاد ہوا (نہیں) بلکہ تم سو برس پڑے رہے پس اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو (جن کو تم نے درخت میں لٹکا دیا تھا) کہ (تک) نہیں اور اپنے گدھے کو دیکھو (کس کی ہڈیوں کا تودہ پڑا ہوا ہے) اور ہم تمہیں لوگوں کے لیے نمونہ کیا چاہے ہیں اور (گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو (کہ) کیونکر ہم (ڈھانچہ بنانے کے لیے) ان کو جنش دیتے ہیں اور پھر ان کو کشتہ (کا جامہ) پہناتے ہیں پھر جب ان پر یہ ظاہر ہوا (تو) کہنے لگے میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے (۲۵۹) جب ابراہیم نے کہا اے پروردگار مجھے (بھی تو) دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا، ارشاد ہوا (کہ) کیا تمہیں (اللہ کا) یقین نہیں (ابراہیم نے) عرض کیا (کہ) کیوں نہیں مگر (آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں کہ) میرے دل کو تسکین جائے، فرمایا (اچھا) چار پند لو اور اپنے ساتھ ان کو بلاؤ، پھر (ان کی بوٹی بوٹی کر کے اپنے ہاں کے) ہر پہاڑ پر ان کا ایک ٹکڑا رکھ دو پھر ان کو (اپنے پاس) بلاؤ (تو وہ) تمہارے پاس دوڑتے ہوئے (چلے) آئیں گے اور جان لو کہ (سورہ بقرہ۔ آیت نمبر ۲۵۶ تا ۲۶۰)

### فرمان رسول اکرم ﷺ

☆ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ایک ریشمی حلہ (ایک مرتبہ) ہدیہ میں بھیجا۔ میں نے اس کو پہنا لیا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک پہ غصے کا اثر دیکھا پس میں نے اس کو پھاڑ کر اپنی (قریبی رشتہ دار) عورتوں میں تقسیم کر دیا۔

(بخاری: کتاب الہبہ)

☆ اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ طیبہ طاہرہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے۔ وہ بولیں کہ اپنے گھر والوں کی خدمت میں (معروف) رہتے تھے۔ پھر جب نماز کا وقت آ جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے لیے چلے جاتے۔

(بخاری: کتاب الاذان)

☆ سیدنا ابو جحیم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نماز پڑھنے والے کے سامنے سے نکلے والا یہ جان لیتا کہ اس پر کس قدر گناہ ہے تو بے شک اسے چالیس دن تک کھڑا رہنا بھلا معلوم ہوتا اس بات سے کہ اس کے سامنے سے نکل جائے۔ ابو نصر (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ چالیس دن کہا یا چالیس مہینے یا چالیس برس۔

(بخاری: کتاب البواب سترۃ البصلی)

☆ اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک دن اپنے حجرے کے دروازے پر دیکھا اور جس کے لوگ مسجد میں کھیل رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اپنی چادر سے چھپا رہے تھے۔ میں ان کے کھیل کود دیکھ رہی تھی۔ ایک روایت میں ہے وہ اپنے ہتھیاروں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

(بخاری: کتاب الصلاۃ)

☆ سیدنا ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اگر رشک کرے تو دو چیز دن میں کرے، ایک وہ مرد جسے اللہ نے قرآن دیا اور وہ اسے دن رات میں پڑھتا ہے، اس کا پڑوسی سن کر کہتا ہے، کاش مجھے اس کے مثل نصیب ہوتا پھر میں بھی اسی طرح عمل کرتا، اور دوسرا وہ مرد جسے اللہ نے مال عطا کیا اور وہ اس کو راہ حق میں خرچ کرتا ہے، پھر کوئی کہے، کاش مجھے بھی یہ میسر آتا تو میں بھی اسی کی طرح خرچ کرتا۔

(بخاری: کتاب فضائل القرآن)



ناھید سلطانه اختر

ہمارے آس پاس بکھرے جیتے جاگتے کرداروں کا احوال

کہاں ہے تو؟

”کہاں ہے تو میرے پروردگار!

سن رہا ہے تا!

بیٹی اجر گئی ہے میری

میری بچی اجڑ گئی ہے میرے مولا!

کیوں میرے مولا؟

کیوں پروردگار؟

میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا میرے اللہ جو یہ دکھ دیکھنے کو ملا۔

اے اللہ کہاں یاؤں تجھے!

کہاں فریاد کروں تجھ سے!

امی کی آنکھوں سے پھر جھڑی لگ گئی۔

امی کی آنکھوں سے پھر بھڑکی لگ گئی۔  
 ارفع جو ہاتھ پاؤں پھیلا کر سونے کی عادی تھی کروٹ لیے دونوں گھٹنے اپنے سینے سے لگائے گٹھڑی بنی ٹھنڈا



سہمی سی ان کے نزدیک ہی سو رہی تھی۔

ابابھی جاگ گئے۔ اسی کوچرہ دوپٹے سے ڈھاپے بیٹھے دیکھا تو اپنے بستر سے اتر کر نزدیک آ بیٹھے اور اپنا ہاتھ ان کے شانے پر دھرتے ہوئے دسوز لہجے میں آہستہ سے بولے۔ ”ان اللہم العاصرین۔“

امی سکڑ گئیں۔

”ارفع جاگ جائے گی۔“ ابانے دھیمی آواز میں کہا۔

امی کی سنسکیاں یکھتے کھٹم کھٹم گئیں۔ اپنی آنکھوں پر سے دوپٹا ہٹا کر انہوں نے ایک نظر گھڑی کی طرح بڑی ارفع پر ڈالی اور ان کا دل کھٹنے لگا۔

”اس سے تو اچھا تھا ہم نے اسے بیاہا ہی نہ ہوتا۔“ امی گھٹی گھٹی آواز اور دل شکستہ لہجے میں بولیں۔

”بیٹیوں کو بیاہے بغیر کوئی چارہ ہوتا ہے۔“ ابابکی آواز اسی طرح دھیمی تھی۔

آپابھی اٹھ بیٹھیں۔ آنکھ کھلتے ہی ان کا دل بے تحاشہ کھٹنے لگا تھا۔ یہ صبح عام صبحوں سے کتنی مختلف تھی۔ دل کو تڑپاتی اور اداس کرتی ہوئی! کچھ ایسا ہی احساس بہت قریبی رشتے داروں کی اموات پر ہوا تھا۔ یہ بھی تو ایک رشتے کی موت ہی تھی۔

”اٹھو پہلے تم وضو کر لو جماعت میں تو ابھی دیر ہے۔“ ابانے امی سے آہستہ سے کہا۔

آپانے بتی جلانی چاہی مگر امی نے کہا۔ ”رہنے دو، ارفع جاگ جائے گی۔“

آپانے امی کو چپل پہننے میں مدد دی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ہاتھ روم تک پہنچایا پھر قالین پر سے اپنا بستر سمیٹ کر اسے اپنے کمرے میں رکھنے چلی گئیں۔ واپس پلٹیں تو امی ہاتھ روم میں ہی تھیں۔ ابادھو کے لیے ان کے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ آپانے امی کے لیے چائنا بچھائی اور کمرے کے کھلے دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے پردوں کے پیچھے سے در آتے گلے اجیارے میں ارفع کا چہرہ دیکھتے ہوئے ان کا جی بھر آیا۔ ایک ہی دن میں وہ کتنی تحیف دکھائی دینے لگی تھی۔

امی ہاتھ روم سے نکلیں تو ان کے نماز کے لیے کھڑے ہو جانے کے بعد آپا خود بھی نماز کی تیاری کرنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

امی نماز کے بعد دونوں ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہی تھیں کہ ارفع بھی جاگ گئی۔ آنکھ کھلتے ہی دل پر دھموکا پڑا کہ اب وہ اس گھر کی چھت تلے نہیں تھی جو خواب کی صورت ٹوٹ گیا تھا! اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

دھیان مہتاب کی طرف گیا۔ دل مضطرب گیا۔

جانے کیوں مہتاب کی ستمگری کے باوجود اس کا دل مہتاب کے خلاف آمادہ نفرت نہیں ہو پا رہا تھا۔ شاید اس کی محبوب شاعرہ بھی درد کی اس منزل سے اسی طور گزری تھی

جو خواب دینے پہ قادر تھا مری نظروں میں

عذاب دیتے ہوئے بھی مجھے خدا ہی لگا

سینے میں درد کا ایک گول سا اٹھا اور دھواں بن کر اس کے وجود میں سرایت کر گیا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھی اور ٹانگیں سمیٹ کر اپنی پیشانی دونوں گھٹنوں پر ٹکی اور اپنے دونوں بازو اس نے سر کے گرد باندھ لیے۔

دل دکھ رہا تھا۔

زندگی بہت بے مقصد سی لگ رہی تھی۔

اندر، باہر، سونانا تھا۔

وہ خود کو راہم کر دہ مسافر کی طرح شکستہ پا اور دل گرفتہ محسوس کر رہی تھی۔

کتنی مضبوط اور پندار ذات کا احساس رکھنے والی لڑکی ہوا کرتی تھی وہ کبھی سوچا بھی نہ تھا اس نے کہ کوئی شخص اس کے پندار کو یوں ضرب لگائے گا کہ وہ پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی۔

آہ! دل کتنا دکھ رہا تھا۔

اور اس سناٹے کا سب سے بڑا الیہ یہی تھا کہ اپنا قاتل اسے قاتل نہ لگ رہا تھا۔ گھائل دل اسی کی چاہ میں تڑپ رہا تھا۔

خدا جانے ظالم کو بھی احساس خطا تھا کہ نہیں!

ارفع کی چشم تصور میں اس گھر کے بام و در و ترزاں تھے ہی جس شامتہ نہ جانے کیوں کرج سویرے اس گھر کے کچن کی خوشبو بھی اڑا لائی۔

پراٹھوں کی خوشبو! چائے کی مہک!

”مہتاب میں نے ناشتا بنا دیا ہے ناشتا کر لو۔“ والدہ کہہ رہی تھیں۔

میز پر ماں، بیٹا بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔

وہ خود کہاں کم ہو گئی تھی!

ماں، باپ، بھائی، بہنوں جیسے انوٹ رشتوں کو چھوڑ کر اس کنبے کی فرد بن جانے کے باوجود وہ ہاں کیوں نہیں تھی!

آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گود میں گرتے رہے۔

دفعتاً اسے اپنے سر پر ایک شفقت آمیز لمس کا احساس ہوا۔ اس نے بے ساختہ چونک کر سر اٹھایا۔ اباس کے نزدیک کھڑے تھے۔

”نماز پڑھ لو۔“

وہ نماز پڑھنے کی حالت میں نہ تھی مگر فطری حیائے اسے ابابکی بات پر دھیرے سے اثبات میں سر ہلانے پر مجبور کیا۔

”اچھا! فراکی ماں، نماز کے لیے جا رہا ہوں۔“ ابابکی ہمیشہ کی عادت تھی گھر سے دو قدم کے لیے بھی نکلتے گلتے تو امی کو مطلع کرنا فرض سمجھتے۔

امی جو رب العزت کے حضور دونوں ہاتھ پھیلائے بڑی دیر سے گز گڑا رہی تھیں اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے چائنا سے اٹھیں اور انہوں نے ارفع کے نزدیک آ کر اس پر آہستہ سے پھونکا۔

اس کا جی بھر آیا۔

امی تو اسے اور مہتاب کو اکٹھے دیکھ کر بھی زیر لب پڑھ کر چپکے چپکے پھونکے جاتی تھیں۔ کہاں گم ہو گئے تھے ان کے وہ سارے وظائف اور دم دعا میں!

امی پرسہ دینے والوں کی طرح چپ چاپ اس کے نزدیک بیٹھ گئیں پھر اچانک رونے لگیں۔ اسے اپنا غم بھلا کر امی کو صمد بنا پڑا۔

”بس امی..... مت روئیں..... میری قسمت میں یہی تھا۔“ اس نے اپنی رقت کو دباتے ہوئے کہا۔

”کیوں! کیوں تھا تمہاری قسمت میں یہی۔“ امی ماہی بے آب کی طرح تڑپیں۔ ”کیا گڑا تھا ہم نے کسی کام؟“

”پلیز ایسے مت روئیں..... ایسے مت روئیں۔“ وہ گز گڑائی اور اس نے امی کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے سے لگا لیا۔



بھیا کی عادت تھی بچوں کو ان کے اسکول پہنچانے کے بعد کچھ دیر می، ابا کے پاس آ کر ضرور بیٹھتے مگر اس روز وہ بچوں کے جاگنے سے پہلے ہی امی کے کمرے میں آ بیٹھے۔ آپا مسجد سے ابا کے آنے کے بعد ناشتا بنا کر کمرے ہی میں لے آئی تھیں۔

”رات بھر تم بھی جاگتے ہی رہے۔“ امی نے دلسوز لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بھیا مضطرب سے امی کے پاس بیٹھ گئے۔

”بہنو تم سے کچھ پوچھا کچھا؟“ امی نے آہستہ سے پوچھا۔

بھیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”طلاق کا انہیں مت بتانا ابھی..... پوچھیں تو کہہ دینا ارفع اور مہتاب میں جھگڑا ہو گیا ہے۔“ امی دھیمی آواز میں بولیں۔

”کیوں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت!“ ابا نے کہا۔ ”آج نہیں تو کل پتا چل ہی جائے گا سب کو۔“

”ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ بھیا نے تائید کی۔

”جب پتا چلے گا، چلے گا خود اپنے منہ سے کسی کو بتانے کی کیا ضرورت۔ مہتاب تو خود بہنو والہ تھا اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کی اس حرکت سے ہمارے دوسرے سہوہیا نوں میں کیسی کمی ہوگی ہماری..... داغ لگا دیا اس نے ہمارے خاندان کو۔“

”فکر نہ کریں بھگتے گا۔“ بھیا بولے۔ ”اللہ زیادتی کرنے والوں سے خود حساب لیتا ہے۔“

”ہاں۔“ ابا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مہتاب نے کی تو ہے زیادتی، اللہ کی حدوں کو توڑا ہے اس نے..... ارفع کا اور اس کا نزاع تو بہت معمولی تھا، عورت بد خو اور بد کردار ہو تب بھی قرآن مجید اصلاح احوال کی ترغیب دیتا ہے۔ مراحل بتا دیے گئے ہیں..... پہلے عورت کو زبانی تنبیہ اور فہمائش کی جائے نہ سمجھے تو ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے مرد اس سے دوری اختیار... کر لے پھر بھی نہ سدھرے تو مارے مگر اس طرح کہ عورت کے جسم پر کوئی نشان نہ پڑے۔ کوئی بڑی مصروب نہ ہو۔“

”اس نے تو ایک ہی جھگڑے میں ہم سب کی جان لے لی۔“ امی کی آواز احساس غم سے بوجھل تھی۔

”وقار بیٹے۔“ ابا نے بھیا کو مخاطب کیا۔ ”کل کا دن تو پریشانی میں گزرا۔ آج وہاں جا کر مہتاب سے پوچھا تو

جائے کہ اس نے اپنی انتہائی قدم آخر کیوں اٹھایا۔“

”بالکل جائیں بلکہ مہتاب کا گریبان پکڑ کر یہ سوال کریں۔“ امی نے ایک سرد اور کھینچی پھر بولیں۔ ”غیر واقعی

غیر ہی ہوتا ہے۔“

”بات غیر یا اپنا ہونے کی نہیں تربیت کی ہے۔“ بھیا نے امی کی بات پر کھپا پھر کچھ توقف سے بولے۔ ”صاعقہ کے لیے ہم بوجھ بھی غیر ہی تھے، اگر آپ اور ابا خانگی معاملات میں میری تربیت نہ کرتے، نہ سمجھاتے، بجھاتے مجھے تو کیا صاعقہ کے ساتھ میرا گزارا ہو سکتا تھا۔ کیا کسر چھوڑی تھی اس نے اور اس کے گھر والوں نے اپنی طرف سے میرے اور آپ سب کے دل میں نفرت پیدا کرنے میں..... مگر آپ کی اور ابا کی مصلحت کوئی نے گزارا کر دیا۔ مہتاب کی تو تربیت ہی نہیں ہوئی بلکہ وہ تو گھر کی عورتوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنارہا۔“

ارفع خاموش بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

کل سے اب تک کتنی مرتبہ اس کے کانوں میں ان گویوں کی پاٹ دار لے کی آواز کی بازگشت گونج چکی تھی جو

اس کی رخصتی کے وقت ہارسٹم اور ڈھولکی بجاتے اور پر سوز لے میں رخصتی کا گیت گاتے آدھمکتے تھے۔

رانی بیٹی راج کرے گی

کتنے اراٹوں، کتنی دعاؤں اور کتنی چاہتوں کے ساتھ بیٹیوں والے اپنی بیٹیوں کو رخصت کرتے ہیں مگر بے درد اور بے رحم لوگ انہیں کس بے رحمی سے مٹا ڈالتے ہیں!

کل صبح وہ کچھ اور بھی آج کچھ اور

کل صبح وہ سہاگن بھی آج اہاگن

کل صبح اس وقت تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اگلی صبح اس وقت ایک ٹوٹی ہوئی عورت ہوگی۔

گھر سے بے گھر ہوگئی تھی وہ۔

مہتاب سے رشتہ ختم ہو گیا تھا۔

زندگی جیسے آدمی، اور عورتی، بے روح اور بے رنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

کتنی بے گھر اور مضطرب وہ!

جس گھر میں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی وہاں آج خود کو ”مس فٹ“ محسوس کر رہی تھی۔

بھیا کچھ دیر بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ آپا چائے کے برتن سمیت کرا رافع کے پاس آ بیٹھیں۔

”ہوا کیا تھا؟“ ابا نے اپنا لہجہ انتہائی حزم و احتیاط میں سموتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

اس کی ہر ہر جیسی آنکھوں میں سرخی اور آنسو ایک ساتھ اٹھ آئے۔ آپا کو دوبارہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں گزشتہ روز پیش آنے والے دلخاش سانچے کی روئیداد آہستہ آہستہ امی، ابا اور آپا کے گوش گزار کر دی۔

”اس کجخت کو تھارے..... پاؤں پڑنے پر بھی رحم نہ آیا۔“ امی روہانی ہو گئیں۔

”میں نے ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے، خوشامد کی مگر انہوں نے ایک ننھی۔“ اس نے آنسوؤں سے میٹکی آواز میں کہا۔

آپا دم بخود تھیں۔

مہتاب کے گھر میں ارفع کی تنہائی اور بے بسی کا تصور ان کے دل کو جیسے اپنی مٹھی میں جکڑ کر ان کی ساری جان چوس لے رہا تھا۔

ہاتھ جوڑتی، بتڑتی، بلباتی، خوشامد کرتی اور مہتاب کے قدموں میں ڈھیر ہوتی ارفع!

خوف اور رنج سے اسے الٹیاں لگ جاتا۔

مہتاب کا بے رحمی سے کہنا۔ ”اپنی تنخواہ نہیں بتاتی تھی..... اب بتاؤ گی اپنی تنخواہ، اب بتاؤ گی اپنا اکاؤنٹ نمبر؟“

اوغدا! کیا بے رحم آدمی تھا وہ۔

پھر اندر کے رخ ٹھیک پر لگا تا لا دیکھ کر ارفع کا متوحش ہو جانا۔

مہتاب کی والدہ اور بہن کا سکراتے ہوئے کھر میں داخل ہونا۔

شدید رنج و الم کی حالت میں ارفع کا تنہا گھر سے نکلنا اور شام ہونے تک گھر سے باہر بیٹھ کر روتے رہنا۔

کیسی بے بسی تھی!

یہ ایک بڑھی لمبی اور اپنے پیروں پر کھڑی لڑکی کی داستان تھی۔

بے بال و پر عورتوں پر کیا گزرتی ہوئی!

امی احساسِ شکر گزاری کے ساتھ کہا کرتی تھیں۔ ”اللہ کا شکر ہے میری سب بیٹیاں اپنے گھروں میں سکھی



امی کے اس فخر اور طرانت کو اس قدر چپکے سے دکھائی نہ جانے کہاں سے اور کیوں لگ گئی تھی!

\*\*\*

اس روز آپا نے بھی چھٹی کی، بھابھی گھر پر ہی رہے۔ مہتاب کے گھر جانا تھا مگر مہتاب کی عدم موجودگی میں اس کے گھر جانا فضول تھا۔ ابانے دس بجے کے لگ بھگ اس کی جائے کار کے نمبر پر فون کیا تو پتا چلا وہ ڈیوٹی لگ چکی تھی۔ امی، ابا، بھابھی اور آپا شام کو مہتاب کے گھر گئے۔ گیٹ مہتاب نے کھولا اور انتہائی سردہری سے سلام کیا۔ اس کی آنکھوں میں بیگائی تھی اور چہرہ جذبات سے قطعاً عاری۔ نہ تجالت، نہ معذرت، نہ دکھ، نہ پچھتاوا۔ انہیں لاؤنچ میں بٹھا کر وہ اندر چلا گیا۔

”کون آیا ہے؟“ اندر سے مہتاب کی والدہ کی آواز لاؤنچ تک پہنچی۔

”اس کے گھر والے آئے ہیں۔“ مہتاب کی آواز سنائی دی۔

”رومانہ کو فون کرو کہ وہ آ جائے۔“

”آپ چلیں میں فون کر کے آتا ہوں۔“

”ملاحظہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیور اور مہر کی بات صاف صاف کرنا اور صاف کہہ دینا جب تک زیور کا حساب کتاب نہیں ہو جاتا بھیز نہیں اٹھا سکتے۔“

”ٹھیک ہے۔“

چھوٹا سا گھر تھا۔ اندر سے دونوں کی آوازیں لاؤنچ تک آ رہی تھیں۔

مہتاب کی والدہ بھی بیٹے کی طرح سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ لاؤنچ میں آئیں۔ نہ شرمندگی، نہ دکھ۔

تھوڑی دیر بعد مہتاب بھی آ بیٹھا اور ابھی بات شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ رومانہ اور اس کا شوہر بھی آ گئے۔

”مہتاب میاں!“ ابانے بات شروع کیا۔ ”جو ہوا وہ ہمارے لیے انتہائی غیر متوقع اور صدمہ رساں ہے۔ اگرچہ ارباع بتا چکی ہے لیکن پھر بھی میں یہ پوچھ رہا ہوں آپ سے کہ مصالحت کی کوئی گنجائش چھوڑی آپ نے یا.....؟“ ابانے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

اس سے پہلے کہ مہتاب کچھ کہتا رومانہ نے نفی میں سر ہلایا۔

مہتاب نے چند ثانیے سوچنے کے بعد نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔“

بھابھا چہرہ ہنستا اٹھا۔

”اس انتہائی اقدام کا سبب؟“ بھابھانے مہتاب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

مہتاب نے پہلو بدلنے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ دھری پھر بولا۔ ”اربع کا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔“

”کیا ٹھیک نہیں تھا؟“

”کبھی شیئر نہیں کیا۔ اپنی سہیلی راز میں رکھی۔ کبھی گھر کے لیے کچھ خرید کر نہیں لائی تھیں۔ میرے ایک کزن آئے تو ان کو چائے دئے پلانے کے بعد دوبارہ چائے کے لیے پوچھنے کو کہا، آپ اور چائے پیتیں تو بناؤں۔ کون مہمان یہ کہے گا کہ ہاں اور چائے بناؤ۔ اسے صرف اتنا پوچھنا چاہیے تھا ان سے کہ اور چائے پیتیں گے۔“

”اور؟“ بھابھی بولے۔

”اور“ مہتاب نے پہلو بدلا۔ ”ہمارے ایک اور کزن آئے۔ وہ اور ان کی سسر سامنے والے صوفے پر تھے اور ہم لوگ ادھر..... ارباع ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے ادھر بیٹھ گئی..... یہ ایسی لٹیٹھس کے خلاف تھا۔“

”درست!“ بھابھانے تائیدی پھر بولے۔ ”اور کچھ؟“

”اس کا بی بیوہ ٹھیک نہیں تھا۔ نہ مجھ سے نہ امی سے۔“

”آپ دونوں سے اس نے بھی بدتمیزی کی؟“

”کوئی بات خلاف مزاج ہو جاتی تو بات نہیں کرتی تھی، چپ سادھ لیتی تھی۔“

”میرے خیال میں یہ تو تو، میں، میں سے تو بہتر تھا۔“

”ایک روز امی نے کچھ کہہ دیا تو ان سے بولی، آپ مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کریں۔“

”یہ بھی تو بتائیں مہتاب کہ اس بات کی پاداش میں آپ نے اور آپ کی والدہ نے اس کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا۔“ آپا نے مداخلت کی۔

”ہماری ایک بھابی ہیں عزیزین بھابی۔ وہ مجھ سے کہنے لگیں مجھے آپ کی بھابی بالکل پسند نہیں آئیں۔“ رومانہ

اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔

”ضروری نہیں کہ ہر شخص کو ہر ایک پسند آ جائے۔“ آپا کو رومانہ کی بات بری لگی تھی۔

”یہ بتائیں ارباع مجھڑا الوٹھی، بدکردار مٹی یا آپ سے کوئی ایسی لمبی چوڑی فرمائش کرتی تھی جو آپ پوری نہیں کر

سکتے تھے۔“ بھابھا ذرا تیز ہو کر بولے۔

مہتاب خاموش رہا۔

”عورت بد خو، بد کردار ہو تب بھی قرآن کہتا ہے اصلاح احوال کی کوشش کرو، پہلے مرحلے میں عورت کو زبانی

فہمائش کی جائے، نہ سمجھے تو ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے مرد اپنا بستر اس سے جدا کر لے۔“ علقہ سوئے پھر بھی عورت

نہ سدھرے تو اسے مارے مگر اس طرح کہ جسم پر کوئی نشان نہ پڑے، کوئی ہڈی نہ ٹوٹے۔“ بھابھانے توقف کیا پھر غصے

سے بولے۔ ”یار! آپ نے ارباع کے خلاف جو شکایات کی ہیں وہ اسے اتنا بڑا مجرم تو نہیں ٹھہرائیں کہ آپ اسے قتل کر

ڈالتے۔ آپ نے تو اسے زندہ دو گور کر دیا ہے..... کچھ خوف خدا یا ر..... کچھ دنیا کی شرم ہی سہی..... ارباع کو کہیں سے

ہاتھ پکڑ کر نہیں لے آئے تھے تم، ایک بھرے گھر کی عزت تھی وہ اس سے اپنا رشتہ توڑنا ہی تھا تو جن سے تم نے اس کا

ہاتھ مانگا تھا پہلے انہیں اطلاع کرتے کہ میں یہ کرنے جا رہا ہوں۔ ہمیں بے خبر رکھتے ہوئے یہ واردات کیوں کی تم

نے۔ یاد رکھنا تم نے ہمارے ساتھ بھی زیادتی کی ہے، خدا کے ہاں بھی مجرم ٹھہرے ہو۔“ بھابھا کا غصہ لمحہ بے لمحہ بڑھتا چلا

گیا۔ ”بچو گے نہیں احتساب سے۔“

ابا دھیرے سے کھنکھارے پھر بولے۔ ”سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر مرد وزن آپس میں محبت

سے نہیں رہ سکتے ہوں تو ایک متصف مرد کی طرف سے اور ایک عورت کی طرف سے کھڑا کیا جائے اور دونوں کو بات

چیت کا پورا اختیار دیا جائے اگر اللہ رب العزت کو منظور ہوگا تو وہ ان دونوں کے توسط سے میاں بیوی میں صلح کے

اسباب پیدا فرمادیں گے کیونکہ اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔“

”آپ لوگوں نے تو اس خدا کی حکم کا پاس بھی نہ رکھا۔“ بھابھا کا غصہ فرو نہ ہوا تھا۔

”ہمارے بھائی کا آپ کی بہن سے گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔“ رومانہ نے کرخت لہجے میں کہا۔

”آپ چپ رہیے، میں مہتاب سے بات کر رہا ہوں۔“ بھابھا بولے۔

”میں بولوں گی، میرے بھائی کا معاملہ ہے۔“ رومانہ نے بدلتی سی بینہ تان کر کہا۔

امی اور آبا گھبرا گئیں۔

مرد، مرد کے اور عورت، عورت کے دو بدو ہو تو گوارا مگر عورت، مرد کے منہ کو آتی اچھی نہیں لگتی اور مرد، عورت کے دو بدو ہو تو نامناسب۔ عورت لاکھ ٹکراتی رہے مرد ایک بات کہہ دے تو عورت ذلیل اور بھی یوں بھی ہوتا ہے کہ



عورت بہت کچھ کہہ سکتی ہے اور مرد ایک ذرا سی بات میں قابل گردن زدنی سمجھا جاتا ہے۔

رومانہ کے تئیں اور اس کا لب ولہجہ دیکھ کر آپ کو یاد آیا۔ مہتاب کو کھاج کا سوت خریدوانے کے لیے بازار جاتے ہوئے فرزانہ نے کہا تھا۔ ”باجی ہماری منہ بھٹ ہیں۔ کسی کا خیال نہیں کرتیں جو منہ میں آئے کہہ دیتی ہیں۔“ اس روز ”کارنگر“ جاتے ہوئے فرزانہ نے اپنی والدہ، بھائی اور بہن کے بارے میں جو کچھ کہا تھا شاید اسے خود بھی احساس نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہی تھی اور شاید آپ کو بھی بین السطور معانی بھی سمجھ میں نہیں آتے اگر وقت کے ساتھ چہروں پر پڑی فحاشیں بتدریج نہ اٹھ گئی ہوتیں۔

فرزانہ کے الفاظ کے معانی اپنی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ کھل چکے تھے۔

کاش! نہ کھلے ہوتے۔

زندگی لاعلمی میں ہی چپ چاپ گزر جاتی تو کتنا اچھا تھا۔

کاش!

کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔

ایسی آسشت کے تئیں بھانپ کر متوحش ہوتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”چلو بیٹا چلو۔“ انہوں نے پہلے بھیا سے کہا پھر باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”چلیے۔“

”ہمارا زیور ہمیں دے دیں اور اپنا سامان اٹھالیں۔“ مہتاب کی والدہ نے کہا۔

بھیا نے روئے سخن ان کی جانب کرنے کی بجائے مہتاب کی طرف کیا۔ ”کل سے زیور کا شور سن رہا ہوں، کتنا زیور ہے آپ لوگوں کا؟“

مہتاب نے اپنی والدہ کی طرف دیکھا۔

”منہ دکھائی میں تمہاری، میری اور تینوں بہنوں کی طرف سے دی جانے والی چیزیں شامل کر کے تقریباً اتنی ہزار

کی مالیت کا زیور ہے۔“ والدہ بولیں۔

”اگر آپ لوگ زیور واپس نہیں کریں گے تو مہر کے پچاس ہزار کاٹ کر باقی رقم نقد ادا کر دیں۔“ مہتاب نے کسی مہاجن کی طرح جمع تفریق کی۔

”آپ کو زیور بھی مل جائے گا، مہر بھی مت دو۔۔۔۔۔ اور بولو۔“ بھیا کا غصہ برقرار تھا۔ ”اور ہمیں، جہیز کی بھی کوئی پروا نہیں، پڑا رہے ہیں۔“

”بیٹا چلو۔ یہ حساب کتاب بھی ہو جائے گا۔ زیور ہماری عزت اور رفیع کی زندگی اور مستقبل سے بڑھ کر تو نہیں۔ اسے تو جیتے جی ماریا دیے ان لوگوں نے۔ قصائی بھی جانور ذبح کرتا ہے تو کھال اتارنے سے پہلے ذبیحہ کا جسم ٹھنڈا پڑنے کا انتظار کرتا ہے۔ ان کو اتنا بھی قرا نہیں ہوا۔“ امی نے کہا۔

”ہاں مہتاب۔“ آپ بولیں۔ ”بے بہت افسوس ناک بات۔ کل جب آپ نے مجھے فون کیا تو ارفع کو طلاق دے دینے کی خبر سنانے کے بعد آپ نے مجھ سے بھی پہلی بات یہی کی کہ اسی ہزار کا زیور ہے، مہر کے پچاس ہزار کاٹ کر تیس ہزار واپس کر دیں۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ کے نزدیک ارفع سے زیادہ اہمیت زیور کی تھی۔۔۔۔۔ صرف اسی ہزار کا زیور مہتاب وہ بھی آپ کی والدہ، بہنوں اور خود آپ کی طرف سے ارفع کو منہ دکھائی میں دی جانے والی طلاق چیزوں کی قیمت شامل کر کے۔۔۔۔۔ یہ سراسر مادہ پرستی ہے۔ جتنے زیور کے لیے آپ بار بار پریشان ہو رہے ہیں، بے باقی ظاہر کر رہے ہیں۔ اتنا زیور ارفع پر سے سوا بقیہ بان۔۔۔۔۔ آپ کو صرف زیور کی فکر ہے، یہ نہیں سوچ رہے کہ آپ نے کیا کیا ہے! ایک لڑکی کی زندگی سے کھیل گئے ہیں آپ۔ ہم نے آپ سے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی تھی صرف ایک شرط تھی کہ

ارفع شادی کے بعد اسلام آباد ہی میں رہے۔ آپ لوگوں نے اطمینان بھی دلایا تھا کہ اسلام آباد میں گھر ہے مگر۔۔۔۔۔ آپ نے اس گھر سے اس کے جانے تک اسے گھر نہیں دیا۔ ہم گڑ گڑاتے رہے کہ کوئی ایسا ٹھکانا جہاں وہ آرام سے بیٹھ سکے اور اپنی نوکری بھی جاری رکھ سکے۔ اسے اپنے گھر میں بیٹھنے کے لیے وقت ملے مگر آپ نے ہماری نہ سنی۔ شاید گھر کا مسئلہ حل ہو گیا ہو تا تو گھر نہ ٹھٹھا۔ آپا چن بات کی رو میں بولی چلی گئیں۔

”نہیں، نہیں گھر کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔“ مہتاب بولا۔

”تھا۔۔۔۔۔ کیوں نہیں تھا۔“ آپا کو اب بھی مہتاب کی گھر کے مسئلے سے نظر پوشی پر غصہ آ گیا۔ ”شاید آپ لوگ یہاں سے دور کر دیں اور جگہ کسی اور گھر میں رہ رہے ہوتے تو آپ کی بہن اور ان کے شوہر کو آپ کے گھر کیلئے معاملات میں بات بے بات مداخلت کرنے اور ارفع کو آزار پہنچانے کا اتنا موقع نہ ملتا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ مہتاب نے نفی کی۔

”چلو بیٹی چلو اب ان سب باتوں سے کیا فائدہ۔“ ابا بولے۔

”ابا میں جانے سے پہلے ایک بات ضرور کہوں گی۔۔۔۔۔ جیسی تکلیف ہمیں پہنچائی گئی ہے خدا کرے یہ لوگ بھی اس تکلیف کا مزہ چکھیں۔“ آپا کی آواز بھر گئی۔ گواہی بات کہنا ان کے مزاج کے بالکل برخلاف تھا مگر شدت جذبات میں وہ خلاف مزاج بات کر گئیں۔ ارفع انہیں اپنی جان سے زیادہ پیاری تھی۔ جس گھر میں بیٹی دی گئی اس گھر سے امی، ابا، بھیا اور آپا زندگی ہارے ہوئے لوگوں کی طرح دل شکستہ اور سونپتہ جاں باہر نکلے۔

راستہ بھرائی، ابا، بھیا، آپا سب خاموش بیٹھے رہے۔ سب صدمے کی کیفیت میں تھے۔ مہتاب اور اس کے گھر والوں کی بیگانگی اور سردمہری بھی کے لیے باعثِ رنجِ شہری تھی۔ صدمہ تو تھا ہی مہتاب کے گھر سے واپسی پر شرمندگی بھی ساتھ تھی۔ کیا توہین آ میر سلوک کیا تھا مہتاب اور اس کے گھر والوں نے۔ امی، ابا، بھیا، آپا بھی کو مہتاب اور اس کے گھر والوں کے بدلے ہوئے رویے کو یاد کر کے کوفت ہو رہی تھی۔

”خواہ مخواہ آئے ہم لوگ۔“ امی سوچ رہی تھیں۔

”پوچھنا تو ضرور تھا۔“ ابا دل ہی دل میں خود کو جواز دے رہے تھے۔

بھیا جڑے کھینچے بیٹھے تھے۔

اپنی آنکھیں!

ایسی رسوائی!

زندگی میں اس سے پہلے ایسا مشکل مقام کب آیا تھا۔ عزت دار گھرانہ تھا۔ خاندان کی تاریخ میں دور دور تک طلاق کا کوئی واقعہ نہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلاق کا ڈرا وایا بیچ بیچ طلاق دے دینا خاندانی لوگوں کا طریقہ نہیں ہوتا، بیچ اور کم ظرف لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے۔

مہتاب کے گھر سے اپنے گھر واپس لوٹتے ہوئے آپا کو بار بار مہتاب کی آنکھوں سے جھلکتی بے گانگی اور اس کی والدہ، بہن اور بہنوئی کے چہروں سے مترشح سردمہری یاد آتی رہی۔ یہی سختی اور بے رحمی تھی ان کے چہروں پر انسانیت سے عاری!

آپا کا حساس دل بری طرح دکھ رہا تھا۔

”اتنے بدل جاتے ہیں لوگ!“ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں۔

یہی لوگ تھے، یہی چہرے۔۔۔۔۔ جب ارفع کا رشتہ لے کر آئے تو ان کا روپ کچھ اور تھا جب رشتہ توڑا تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔



ایک چہرے پر کتنی نمایاں چڑھا کر رکھتے ہیں لوگ!

آپاچی ہی جی میں اس دن کو برا کہہ رہی تھیں جب ان کی کو لیک سارا نے اپنی بہن کے انکار پر اس کے لیے آنے والا رشتہ ان کے گوش گزار کر کے کہا تھا۔ ”میڈم! میری بہن نے تو اپنا کورس مکمل ہونے تک شادی سے قطعاً انکار کر دیا ہے اور ان لوگوں کو بے جلدی اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی بہن کے لیے دیکھ لیں۔“

آپا کو خبر ہوئی کہ ایک دن وہ رشتہ ان کے پورے گھرانے کے لیے سوہان روح بن جائے گا تو وہ اس رشتے کا گھر میں بھی ذکر نہ کرتیں۔ ارفع کی متورم آنکھوں اور کسی بیوہ کی طرح سوگوار چہرے کا خیال انہیں از حد رنجیدہ کر رہا تھا۔

اس دکھ سے تو بہتر تھارفع کی شادی ہوئی ہی نہ ہوتی۔

اسی لیے روتے ہیں لوگ بیٹیوں کی پیدائش کو!

\*\*\*

گھر پہنچے تو ارفع کی اداس آنکھوں میں سوسال تھے۔ آپا کو یوں لگا جیسے وہ اس گھر کا، گھر والوں کا، مہتاب کا حال پوچھنا چاہتی تھی۔ جیسے وہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا مہتاب اور وہ گھر بھی اس کے بناتے ہی اداس تھے جتنی کہ وہ خود تھی!

آپا نے اس سے نظریں چرائیں۔

”کیا ہوا؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”وہ لوگ اس لائق تھے ہی نہیں۔“ آپا کیلے لہجے میں بولیں۔

”کس لائق؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”کہ ان سے رشتہ جوڑا جاتا۔“

”ہوا کیا!“

”ہونا کیا تھا..... تم سے انہیں جو بھی شکایت رہی ہو ہم لوگوں سے تو تمیز سے پیش آنا چاہیے تھا۔“ مہتاب نے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر رکھی تھیں۔ امی کا اندیشہ درست تھا۔

”کیا اندیشہ!“ ارفع چونگی۔

”امی کہا کرتی تھیں مہتاب کی آنکھوں میں ارفع کے لیے محبت نہیں دکھائی دیتی۔“ آپا نے کہا۔

”نہیں نہیں..... ایسی بات نہیں تھی..... وہ بس اپنی امی اور بہنوں کے بہکائے میں آگئے..... اٹھتے بیٹھتے ان کی امی ان سے بس ایک ہی بات کہے جاتی تھیں، تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ اس نے مہتاب کا بھرپور دفاع کیا۔

”اور تم یہ بات آج بتا رہی ہو! ایک دفعہ تو بتائیں۔“

”مجھے.....“ اس کی آنکھیں ڈنڈا لگیں اور آواز رندہ گئی۔ ”مجھے بھولے سے بھی ایسا ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔“

”بہر حال اب اس کے نام پر تفت بھیجیو۔ زندگی میں اگر کبھی، کسی مقام پر اس کا سامنا بھی ہو جائے تو اسے نفرت سے دیکھ کر گزر جانا۔“

اس نے ڈنڈائی آنکھوں سے آپا کو دیکھا اور اچانک اس کی آنکھوں میں سرخی امنڈ آئی۔

آپا کو انہیں دل پارہ پارہ ہوتا محسوس ہوا۔

ارفع بھی ایسی دل شکستہ نہ دکھائی دی تھی!

اباطول و دل گرفتہ اس کے پاس آ بیٹھے اور اس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

”خدا تمہیں صبر دے۔“

”ایک ماں کا دل دکھایا ہے مہتاب نے..... چچین سے نہیں رہے گا کبھی۔“ امی جو نزدیک ہی بیٹھی تھیں رونے لگیں۔

”ظالم کو بددعا دینے کی بجائے اپنے لیے صبر اور اجر کی دعا مانگو بھئی۔“ آپا بولے۔

”ماہ! امی نے ایک سرود آؤ گھنٹی۔“

آپا امی کے پاس جا بیٹھیں اور دھیرے دھیرے ان کے کندھے دیا نہ لگیں۔ ”میرے تو قصور میں بھی نہیں تھا کہ مہتاب اس قدر مادہ پرست آدمی ہوگا۔ اس وقت بھی اسے زیور کی فکر تھی۔ قصایوں کی طرح حساب کر رہا تھا۔ منہ دکھائی میں دی جانے والی چیزیں ملا کر ہمارا اسی ہزار کا زیور ہے، مہر کے پچاس ہزار کا تیس ہزار دے دیں اور اگر مہر نقد چاہیے تو زیور واپس کر دیں۔“ آپا نے مہتاب کے الفاظ دہرائے پھر بولیں۔ ”ابا آپ لوگوں کو مہر زیادہ کھسوا نا چاہیے تھا۔ میں یقین سے کہتی ہوں اگر مہر دو ڈھائی لاکھ بھی ہوتا تو مہتاب جیسا آدمی جو اپنے ذرا سے زیور کے لیے کل سے لمبا رہا ہے طلاق کا لفظ منہ سے نکالنے سے پہلے دس مرتبہ سوچتا۔ اسے ذرا یہ احساس نہیں کہ ہم لوگوں پر اس وقت کیا بیت رہی ہے۔“

”جی! ان کی طرف کا زیور تہارے لاکر میں ہے؟“ ابا نے ارفع سے انتہائی حزم و احتیاط سے پوچھا۔

”جی ابا۔“ وہ جیسی آواز میں بولی۔

”میرا خیال ہے کل ہی انہیں نکلوا کر دے دیا جائے..... مولانا صاحب سے پوچھ آؤں گا میں کہ تم اس ضرورت کے لیے عدت کے دوران گھر سے نکل سکتی ہو یا.....“ ابا کے لہجے میں پہلے سے بڑھ کر احتیاط تھی۔

اس نے بے ساختہ چونک کر ابا کو دیکھا..... عدت! اس لفظ کو بھی آتا تھا اس کی زندگی میں! ابا کو اس کی گھائل نظریں اپنے دل میں پیوست ہوتی محسوس ہوئیں۔

”ان کا زیور لوٹا دو اور اپنا حق مہر اگر تم مناسب سمجھو تو معاف کر دو۔“ ابا نے کہا۔

”گھر نہیں۔“ آپا بولیں۔ ”ایک پیسہ معاف کرنے کی ضرورت نہیں اس سنگدل اور بدتمیز آدمی کو۔“

”کیوں بیٹی؟“ آپا کے خلاف مزاج جارحانہ تیوروں نے ابا کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔

”دبس!“

”میں تو کہتا ہوں چیز کا ایک تنکا بھی نہ اٹھایا جائے ان کے گھر سے تاکہ ان کو پتا تو چلے کہ سب لوگ ان کی طرح مادہ پرست نہیں ہوتے۔“

”جو مادہ پرست ہوتے ہیں وہ بے حس بھی ہوتے ہیں ابا!“ آپا کی آواز رندہ رہی تھی۔ ”وہ مادہ پرست ہیں اور بے حس بھی۔ ذرا سوچو تو ابا، ارفع کو شک میں الٹیاں لگی ہوئی تھیں اور وہ مجھ سے اور وقار سے زیور کا حساب کتاب کرنے میں لگا ہوا تھا۔ زیور بھی کتنا، صرف اتنی ہزار کا! اسے آپ کیا کہیں گے ابا..... بچ پن، کم ظرفی، مادہ پرستی، جسے جسی یا ذلات! اور اسی سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ انہوں نے ارفع سے کن توقعات کے ساتھ شادی کی ہوگی! جو شخص اتنی ہزار کے زیور کے لیے جان چھوڑ دے رہا ہے، میری بہن کو زندہ درگور کرنے کے بعد کھڑا ہو کر پوچھتا ہے اب اپنا بینک ٹیلنس بتاؤ گی مجھے، وہ انسان کہلانے کا حقدار ہو سکتا ہے بھلا۔“ آپا جذبات کی روانی میں بولے چلی گئیں۔

”تمہارے ابا کہہ تو رہے ہیں ٹھیک۔“ امی بولیں۔

”کیا!“ آپا نے امی کو دیکھا۔

”جی! کہ چیز اٹھانے کی ضرورت نہیں۔“ امی نے توقف کیا۔ ”وہ چیزیں یہاں آئیں گی تو انہیں دیکھ کر رنج ہی ہوگا۔ بیٹیوں کو چیز اس لیے تھوڑی دیا جاتا ہے کہ وہ واپس آئے۔“ امی کی آواز بھرائی۔



آیا کوامی کے جواز سے متفق ہوتا تھا۔

و اتنی ارفع کے جہیز کی واپسی نے تو باعث رنج و کلفت ہی ثابت ہونا تھا۔

مصباح، اقصیٰ اور ارفع بہن کا گھر ٹوٹنے کا پڑا دینے کے لیے آگے پیچھے میکے آئیں۔ ارفع کو یوں لئے پئے اور مٹے دیکھ کر قینوں ہی بہت رنجیدہ ہوئیں۔ ارفع ان کی ماں جانی تھی، اس کا دکھ انہیں اپنے دل کی شریانوں میں اتارتا محسوس ہوا۔

\*\*\*

ابانے عدت کی بات چھیڑ کر ارفع کو جیس جیس میں ڈال دیا تھا۔ اسے تو اپنے سنے آفس میں ڈیوٹی جوائن کرنی تھی۔ کتنی تک دو دو کے بعد تو ڈیوٹیشن ملی تھی۔ دفتر میں وہ کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔ بقول ابا لوگ رو کر سنتے ہیں نفس کراڑتے ہیں، اپنی زندگی کا نو حسنا کر دوسروں کو ہنسنے کا موقع دینے سے کیا فائدہ تھا۔ نوکری بھی ضروری تھی بلکہ اب تو پہلے سے زیادہ اصرار تھا کہ کیا عدت اور ملازمت کے معاملات ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ وہ اسی سوچ بچار میں تھی کہ اگلے دن صبح فرزانہ کے شوہر کا فون آ گیا۔

”ابھی آپ لوگ سامان مت اٹھائے گا۔“ اس نے ابا سے کہا۔

”کیوں؟“ ابا کو اس کی بات معنی خیز محسوس ہوئی۔

”ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کو صبح کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ابا چوکنے۔

”مصلحت ہو جائے تو اچھا ہے صاحب۔“

”مصلحت! ابا بولے۔“ ”مصلحت کی اب کیا گنجائش۔“

”گنجائش ہے بڑے صاحب تبھی تو میں کوشش کر رہا ہوں۔ ویسے تو ڈاکٹر صاحب اپنے دماغ کے ہیں دوسروں

کی کم ہی سنتے ہیں مگر ہم کوشش کریں گے۔“

ابا تذبذب میں پڑ گئے۔

تین مرتبہ طلاق دے دینے کے بعد مصالحت کی گنجائش کہاں تھی۔

”کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟“

”مہتاب کے بہنوئی کا۔“ ابانے فرزانہ کے شوہر کی بات چیت اسی کے گوش گزار کر دی۔

اسی کے سمجھے ہوئے چہرے پر یکبارگی رونق آ گئی۔

”اگر گنجائش ہے تو اللہ کرے کوئی سبیل نکل آئے میری بچی کا اجڑا گھر دوبارہ آباد ہونے کی۔“ امی اپنا پلو پہننا

کرا پر دیکھتے ہوئے منہ میں بد بدانے لگیں۔

”بات سمجھ میں آتی نہیں۔“ ابا بولے۔ ”تین مرتبہ طلاق کہہ دینے کے بعد بھلا کہاں گنجائش رہتی ہے۔“

”ارے میاں گنجائش ہو گی تو فون کیا ہے۔ ہو سکتا ہے تین تین دوسرے کہہ دیا ہو۔ اپنی ارفع نے غلط سنا ہوا

میری بچی اتنی پریشان ہو گئی ہو کہ اسے دو یا تین کا ہوش ہی نہ رہا ہو۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ ابانے تائید کی۔

”اگر گنجائش ہے تو اللہ کے واسطے کسی بھی طرح مصالحت کی کوشش کریں۔ مگر بار بار نہیں بستے۔۔۔۔۔ بیٹی ذات

ایک بار جس گھر میں جائے وہاں سے مر کر ہی نکلے تو بھلی۔“

ابانے اثبات میں سر ہلایا۔

بھیا سے بات ہوئی تو انہوں نے بھی ابا سے وہی سوال کیا۔ ”تین دفعہ طلاق کے الفاظ ادا کر دینے کے بعد

مصالحت کا کیا سوال ابا۔“

”بیٹا کوئی نکتہ ہو گا ایسا جو انہوں نے یہ بات کی ہے۔“

بھیا بھی اچھے سے گئے۔

فرزانہ کے شوہر نے ارفع کو اس کے موبائل پر براہ راست بھی فون کر ڈالا اور اس سے بھی وہی بات کی جوابا سے

کہ تھی۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ مہتاب نے دوسرے کہا ہوا اور تمہارے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔“ امی نے اس سے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ کہا تو انہوں نے تین مرتبہ ہی تھا۔“ اس نے وثوق سے کہا۔

”پھر بھلا کیسے صلح ہو سکتی ہے۔“ امی کا چہرہ دوبارہ بچھ گیا۔

”ایسا کرو بیٹی! ابا نے کہا۔“ ”جو کچھ ہوا میں دیکھ کر دو مجھے۔۔۔۔۔ فتویٰ لے لیتے ہیں۔“

”ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ امی کی آنکھوں میں ایک نئی جوت جا گئی۔

”اللہ کرے کوئی گنجائش نکل آئے۔“ آپانے دل ہی دل میں دعا کی۔ ہنستا ہنستا گھر تین دن سے رنج و سو گواہی

میں ڈوبا ہوا تھا۔

دوپہر کو ڈاک سے ارفع کے نام ایک لفافہ موصول ہوا۔ لفافے کی دوسری جانب مہتاب کا نام اور پتے کی

موجودگی نے لفافہ کھولے بغیر ہی زبان حال سے بتا دیا کہ لفافے کے اندر کیا تھا۔

طلاق نامے پر بطور گواہان رومانا اور فرزانہ کے شوہروں کے دستخط تھے۔ پکے کاغذ پر طلاق نامے کی موصولی اس

سامنے پر مہر تصدیق بھی لگوا یا۔

”سمجھ میں نہیں آتا ایک طرف تو فرزانہ کے شوہر نے اس طلاق نامے پر بطور گواہ دستخط کر رکھے ہیں اور دوسری

طرف وہ مصالحت کی کوشش کرنے کی بات کر رہا تھا۔“ ابا اچھے اچھے سے لہجے میں بولے۔

”ابا یہ ارفع کے خلاف ان سب کی میز پر سازش تھی۔ ان سب نے مل کر اس پر چھری چلائی ہے۔ اب

مصالحت کی بات کر کے وہ اپنی آستین سے ارفع کے خون کے چھینٹے صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ بھیا کے

لہجے میں کئی کئی۔

ابانے کھٹی کھٹی ایک سر آہ کھینچتے ہوئے تائید میں سر ہلایا۔

”طلاق نامے میں واضح طور پر تین مرتبہ طلاق لکھ دینے کے بعد مصالحت کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔“ بھیا

نے کہا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ابا بولے۔

”ہو سکتا ہے فرزانہ کا شوہر سسرال کی شرما حضوری میں طلاق کا گواہ تو بن گیا ہو مگر بعد میں اسے پچھتاوا ہوا اور

اب وہ اس کا ازراہ مصالحت کی کوشش کر کے کرنا چاہتا ہو۔“ امی نے کہا۔

”امی خود کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کریں۔ طلاق اچانک نہیں دی گئی ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی

اور تیاری کی گئی۔ طلاق نامہ لکھنے کے لیے اسٹامپ پیپر پر درج تاریخ بتا رہی ہے کہ یہ آٹھ دن پہلے خرید گیا تھا۔ مہتاب

۔۔۔۔۔ کی بہنوں اور بہنوئیوں کو کچھ نہ کچھ سن گن تو ہو گی۔ فرزانہ کا شوہر اگر ارفع کا ہمدرد یا ہمارا ہی خواہ ہوتا تو اب

مصالحت کی بات کرنے کی بجائے اس وقت ہمیں باخبر کر دیتا۔“

بھیا کی بات غلط نہیں تھی۔ واقعہ یہی ہوا تھا۔ طلاق سے قبل ان سب نے باہم صلاح مشورہ کیا تھا۔ باقاعدہ

منصوبے کے تحت ارفع کا گھبراؤ کر کے اسے تاریک راہوں میں مارا تھا۔

”پھر بھی فتویٰ لے لو۔“ امی نیم در جا کی کیفیت میں تھیں۔



”کس بات کا فتویٰ؟“ بھانے امی کو دیکھا۔  
 ”مسلمان تو فرزانہ کا شوہر بھی ہے نا بیٹے، ہماری خاطر وہ اپنے ایمان کو تو خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ کوئی نہ کوئی  
 گنجائش تو ہوگی جو اس نے مصالحت کی کوشش کی بات کی ہے۔“  
 ”کوئی گنجائش نہیں امی۔“ بھیا کرے سے جانے کے لیے اٹھے۔  
 امی کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ جب سے ارفع گھر آئی تھی ان کی آنکھوں میں ہمہ وقت جل تھل سی تھی۔ امی کی  
 آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بھیا جاتے جاتے دوبارہ ان کے پاس بیٹھ گئے اور انہیں دلاسا دینے کو اپنا بازو ان کے  
 شانوں پر دراز کرتے ہوئے بولے۔ ”اچھا ٹھیک ہے فتویٰ لیے لیتے ہیں بلکہ ساتھ ہی قانونی مشورہ بھی۔“  
 مصالحت کے امکانات کی بات ہو رہی تھی۔ عدت کا معاملہ کچھ کچھ کر ہی رہ گیا۔

\*\*\*

فتویٰ لینے کے لیے ابانے محلے کے امام مسجد سے رہنمائی چاہی تو انہوں نے پوچھا ”آپ کس فقہ سے تعلق رکھتے  
 ہیں؟“  
 ”حنفی۔“ ابانے جواب دیا۔

امام مسجد نے ابا کو ایک دینی مدرسے کا پتہ دیا اور کہا۔ ”وہاں مولانا عبدالرحمان ہوں گے آپ ان سے مل لیں۔“  
 مولانا عبدالرحمان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ابا کو ایک قلم اور کاغذ کا دستہ لاتھیا۔ ”تفصیل سے اس پر لکھ  
 دیں تا کہ اسے فتوے کے لیے مفتی محمد عثمان صاحب کے سامنے پیش کیا جاسکے۔“  
 ”مفتی صاحب سے ملاقات ممکن ہو تو میں زبانی ان کے گوش گزار کر دوں۔“ ابانے بڑے عجز سے کہا۔  
 ”مسائل تحریر مفتی صاحب کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، وہ ہر ہر نکتے پر غور و خوض کے بعد فتویٰ دیتے ہیں۔  
 ضرورت پڑے تو ملاقات بھی کر لیتے ہیں۔“  
 ”جی بہتر۔“

طلاق نامے کی نوٹو کا پی ابا کی جیب میں تھی۔ انہوں نے مذکورہ کا پی جیب سے نکالی اور اس کی مدد سے تفصیل  
 کاغذ پر لکھ کر مولانا عبدالرحمان صاحب کے حوالے کر دی۔  
 ”آپ برسوں تشریف لے آئیں۔“  
 ”کل ممکن نہیں؟“ ابا کے لہجے میں بے تاب تھی۔  
 ”جی نہیں۔ کل یہاں علما کا اجتماع ہے۔“  
 ”جی بہتر۔“

غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔ دارالافتا سے نکل کر ابا کچہری جا پہنچے۔ شرمندہ شرمندہ، جھینپے جھینپے سے اور لوگوں  
 سے یوں نظریں چراتے جیسے سبھی کو رافغ کی طلاق کی خبر ہو۔ وہ ایک شیڈ تلے ایک وکیل کے روبرو جا بیٹھے۔  
 ”فرمائیے!“ سیاہ کوٹ والے نوجوان وکیل نے پوچھا۔ ابا سنبھل کر بیٹھ گئے۔  
 ”وکیل صاحب ایک مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“  
 ”جی کہیے۔“

ابا دھیرے سے کھٹکھارے اور یوں متذبذب دکھائی دینے لگے جیسے بات کرنا مشکل ہو۔ ”وکیل صاحب! ایک  
 شخص نے اپنی اہلیہ کو یک وقت تین طلاقیں دے دیں۔“  
 ”طلاق مغلط۔“ نوجوان وکیل نے کہا۔  
 ”جی..... جی..... کیا تین طلاقیں کے بعد مصالحت کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے۔“ ابانے پوچھا۔



درمیانی عمر کا ایک اور وکیل شیف تھے بنی اس مشورہ گاہ میں آ پہنچا۔  
 ”آئے سر“ اسے دیکھتے ہی ابا سے جو کلام نو جوان وکیل اپنی کرسی سے اٹھ گیا اور اس نے اپنی کرسی آنے والے سینئر وکیل کے لیے چھوڑ دی۔

”بیٹھو، بیٹھو۔“ نو وارد وکیل نے نو جوان وکیل کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔  
 ”سر! آپ کی عدم موجودگی میں تو آپ کی سیٹ پر بیٹھنے کی غلطی کر لیتا ہوں، آپ کی موجودگی میں اس پر بیٹھنے شرم آتی ہے مجھے۔“  
 ”بیٹھو یا روپیہ اہلہ۔“

”ایڈووکیٹ مس الاسلام۔“ نو جوان وکیل نے سینئر وکیل کا ابا سے تعارف کرایا۔  
 ابا کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ دوسرے وکیل کی جانب دراز کرتے ہوئے بولے۔ ”خاکسار کو شرف الدین کہتے ہیں۔“  
 ”تعارف رکھیے۔“

ابا بیٹھ گئے۔  
 نو جوان وکیل نے ابا کی مخالف سمت میں دیکھتے ہوئے باز بلند کہا۔ ”اقبال تین چائے تو منگو آؤ۔“ پھر ہمتن دوبارہ ابا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”جی سر! آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں کے بعد شرعی اعتبار سے تو مصالحت کی گنجائش نہیں رہتی تا وقتیکہ مطلقہ حلالہ نہ کرے البتہ قانونی لحاظ سے گنجائش ہے۔“  
 ابا نے چونک کر نو جوان کو دیکھا۔

”بات یہ ہے بزرگوار کہ صدر ایوب خان کے زمانے میں عائلی قوانین کے نام سے خانگی زندگی کے بارے میں قوانین نافذ کیے گئے تھے، ان کی زد سے تین طلاقیں کے بعد بھی مصالحت کی گنجائش بھی جاتی ہے۔ ایوب خان مرحوم کے نافذ کردہ اس قانون کے مطابق عائلی کوسل کو طلاق کی اطلاع دینا اور کوسل کی جانب سے مصالحت کی کوشش کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد ہی طلاق نافذ عمل بھی جاتی ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں ایسی کوئی بات یا شرط نہیں بلکہ جب شوہر نے طلاق دے دی تو وہ واقع ہوگئی خواہ مصالحتی کوسل کو اطلاع کی ہو یا نہ کی ہو۔“

”آپ کا کیا خیال ہے یہ درست ہے۔“ ابا جو نو جوان وکیل کی بات پر شش و پنج میں دکھائی دینے لگے تھے مذہب لہجے میں بولے۔  
 ”بات میرے درست یا غلط سمجھنے کی نہیں۔ میں نے آپ کو سادہ الفاظ میں آپ کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔“

”کسی انسان کے نافذ کردہ قانون کو خدا کے قانون سے تو متصادم نہیں کیا جاسکتا۔“ ابا نے کہا۔  
 ”درست۔۔۔۔۔ میں سو فیصد آپ سے متفق ہوں۔“ نو جوان وکیل نے کہا۔

”ایلیکٹرونی۔“ سینئر وکیل نے انتہائی نرم لہجے میں مداخلت کی اور ابا اور نو جوان وکیل دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ”خانگی معاملات کے سلسلے میں ایوب خان مرحوم کا نافذ کردہ قانون جسے ہم عائلی قوانین کے نام سے جانتے ہیں کسی فرد واحد کا نافذ کردہ قانون نہیں بلکہ ایوب خان نے اس کے لیے تمام مکتبہ ہائے فکر کے لوگوں سے رائے لی تھی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ ایک شخص بیٹھا اور اس نے ایوب خان کی خواہش پر راتوں رات عائلی قوانین کا مسودہ تیار کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں اس سلسلے میں انتہائی عرق ریزی سے کام کیا گیا ہوگا۔ ایوب خان گورنمنٹ نے جید عاملوں سے مشاورت کی ہوگی۔ دنیا بھر سے علمائے اسلام کی رہنمائی لی ہوگی۔ مینٹلز، کانفرنسز، مشاورت، رہنمائی غرض بھی

کچھ نہ کیا ہوگا اور ان علمائے انتہائی باریک بینی سے عائلی قوانین کا مسودہ بھی دیکھا ہوگا۔ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اسلامی شریعت سے متصادم کسی قانونی مسودے کی مخالفت کی جرأت نہ رکھتا ہوگا۔ اگر عائلی قوانین اسلامی شرع سے متصادم ہونے والا قانون ہے تو کیا کوئی شخص اتنی ہمت بھی رکھتا ہے یا اتنا ناقابلِ اندیش ہو سکتا ہے کہ اس تصادم کا وبال ریتی دنیا تک کے لیے اپنے سر لے سکے۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکتا۔“

سینئر وکیل کے لٹینین اندازِ تکلم اور پتی تلی گفتگو نے ابا کو خاصا متاثر کیا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا ابا اس وقت اس ہی باتیں سننا چاہتے تھے۔ امید دلائی اور ارفع کو دوبارہ اس گھر میں بسانے کی راہ دکھائی باتیں! نو جوان وکیل مسکرایا۔ ”سوری سر، آپ سے اختلاف کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ صدر اسلام سے موجودہ صدی تک تمام مسلمان اپنے تمام فقہی اختلافات کے باوجود ایک ساتھ تین طلاقیں کو قرآن و سنت کی رو سے طلاقِ مغلطہ مانتے آئے ہیں۔ تین طلاق بلفظ واحد کو جتنی قرار دینا پوری امت مسلمہ کے خلاف بغاوت ہے۔“

”ایسی بات نہیں۔“ سینئر وکیل نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں سختی نہیں۔ یہ اعتدال اور آسانوں کا دین ہے۔ اسلام خود کہتا ہے دین میں سختی نہیں۔“  
 ”لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنے کی خاطر اس کی اصل روح اور اصل شکل کو بدل دیا جائے۔ طلاق تمام حلال امور میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ گھر برباد ہو جاتا ہے۔ عورت اور بچے در بدر ہو جاتے ہیں مگر اس اجتماعی مرض کا علاج یہ ہرگز نہیں کہ طلاق کو مذاق بنالینے والے مریضوں کو آسانی فراہم کرنے کے لیے یہ کہہ دیا جائے کہ تین مرتبہ طلاق ایک ہی ہوتی ہے۔“

”تم جذباتی ہو رہے ہو۔“ سینئر وکیل نے پھر اسی قدر تدریس کہا۔ ”گھر ٹوٹنے کی ہلاکت کا اندازہ نہیں ہے تمہیں۔“  
 ”سر! یہ دنیا عارضی ہے۔ عارضی ہلاکت سے بچنے کے لیے دائمی ہلاکت کو گلے لگا لینا کہاں کی عقلندی ہے۔“  
 ”اچھا خیر۔“ سینئر وکیل نے اپنے تیوروں کو قطعاً گراں نہ ہونے دیا۔ ”بحث طویل ہو جائے گی، تم ان بزرگوار سے بات کرو میں آتا ہوں۔“  
 ”چائے آرہی ہے۔“

”ہو سکتا ہے چائے آنے تک میں بھی واپس آ ہی جاؤں۔“  
 ”جی!“ نو جوان وکیل نے روئے سخن ابا کی طرف کیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔  
 ”ہماری بحث میں آپ کا خاصا وقت ضائع ہوا۔“

”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ ریٹائرڈ آدمی ہوں۔ ریٹائرڈ آدمی کے پاس وقت کے سوا اور ہوتا ہی کیا ہے۔“  
 نو جوان وکیل نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کر کے ہاتھ میز پر رکھ لیے اور دھیرے سے کھٹکھٹا کر بولا۔ ”ہر شخص اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے۔ آپ نے مجھ سے مشورہ طلب فرمایا، میں نے آپ کو اپنے منہ پر رکھ کر جواب دے دیا۔“

”شکر ہے۔“ ابا نے کہا پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولے۔ ”اس مشورے کی فیس وکیل صاحب۔“  
 ”ارے نہیں، بڑے صاحب شرمندہ نہ کیجیے۔“  
 ”نوازش۔“ ابا اٹھ کھڑے ہوئے۔  
 ”چائے منگوائی ہے میں نے۔“  
 ”شکر یہ بیٹے، اجازت چاہوں گا۔۔۔۔۔ ویسے بھی چائے کم ہی پیتا ہوں میں۔“  
 ”چلیے جیسے آپ کی مرضی۔“



”ہاں۔“ ابا جاتے جاتے پلٹے اور ہچکچاتے ہوئے بولے۔ ”آپ نے ٹالٹی کونسل کا ذکر کیا تھا۔“

”جی..... جی.....“

”وہ کہاں ہوئی ہے۔“

نوجوان وکیل شیدتے چپوترے کے انتہائی کنارے پر آکھڑا ہوا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے ابا کو بتایا۔  
”آپ یہاں سے سیدھے جائیں، بائیں ہاتھ پر مڑ جائیں۔ پہلا پلازہ چھوڑیں دوسرے پلازہ کے سینٹر فلور پر۔“  
چیرمین ٹالٹی کونسل کا دفتر ہے۔  
”مہربانی۔“

ابا چپوترے سے اتر کر پختہ روش پر آگئے اور نوجوان وکیل کی بتائی ہوئی سمت میں آگے بڑھنے لگے۔ کچہری میں ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا مقدمات و مسائل اور قانونی مویشاکیوں ہی میں توابعی ہوئی تھی۔ پختہ شیدز تلے، روشوں پر، راہداریوں میں، کمروں میں، برآمدوں میں، فوٹو کالی ٹکالنے والی مشینوں کے نزدیک، کمپیوٹر کے آس پاس، پرانے دھرائے ٹائپ رائٹرز پر کھٹ پٹ کرتے ٹائپسٹوں کے اطراف میں، اسٹامپ وینڈرز کے سامنے، نوٹری پبلک کے چوٹی تختوں پر، چائے خانوں کے باہر، غرض ہر سوانسوں کی بھیڑ تھی۔ ابا اس جھکائے نظریں چرائے جتنا طروری سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ دل میں ایک خوف سا تھا۔ کوئی شناساں کیا تو! تو اسے اپنے کچہری آنے کا کیا سبب بتائیں گے۔

حالانکہ یہ پریشان ہونے والی بات نہ تھی۔ آدمی صرف جرم و سزا کے حوالے سے ہی تو نہیں سو دوسری ضرورتوں کے تحت بھی تو کچہری آ سکتا ہے۔ جائیداد کے کاغذات تیار کروانے، وصیت نامہ خوانے، کوئی درخواست ٹائپ کروانے، کسی دستاویز کی تصدیق کروانے مگر شریف آدمی نہ پریشان ہونے والی بات پر بھی کبھی کبھی یونہی پریشان ہوتا ہے جیسے اس وقت ابا تھے۔

نوجوان وکیل کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے ابا بالآخر چیرمین ٹالٹی کونسل کے دفتر تک جا پہنچے۔  
”جی فرمائیے۔“ کرسی پر بیٹھے بھاری تن و دوش والے ایک شخص نے ابا کو کمرے کی دہلیز پر دیکھ کر کہا۔  
ابا نے دزدیدہ نظروں سے ان دو خواتین کو دیکھا جو کمرے میں بڑی ایک چوٹی بیٹھی تھیں۔ ایک عمر دوسری نوجوان۔ دونوں کے چہروں پر بے رونق تھی۔

”چیرمین ٹالٹی کونسل تشریف رکھتے ہیں۔“ ابا نے پوچھا۔  
”آپ حکم کیجیے، میں چیرمین صاحب کا ریڈر ہوں۔“  
ابا کو بات کرنا مشکل محسوس ہونے لگا۔

ان دونوں خواتین کی طرف اپنی پشت کر کے ابا مذکورہ شخص کی میز پر جھکتے ہوئے آہستہ سے بولے۔ ”یہ وہی گیارہ آفس ہے نا جہاں..... شوہر اور بیوی میں صلح کرانی جاتی ہے۔“

”جی بالکل وہی ہے۔“  
”میں..... میں پوچھ سکتا ہوں..... آپ لوگوں کا کیا طریقہ کار ہوتا ہے۔“ ابا نے کمرے میں خواتین کی موجودگی کے خیال سے اپنی آواز نہایت دھیمی رکھی۔  
”آپ بیٹھیے..... جتنا تاہوں۔“

ابا بیٹھ گئے۔  
”دیکھیے صاحب عالی تو انہیں کے تحت ضروری ہے کہ جب کوئی مرد اپنی زوجہ کو طلاق دے تو وہ ٹالٹی کونسل کو اس بات کی اطلاع دے اور کونسل کی مصالحتی کوشش کا انتظار کرے۔ جب کوئی شخص ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ اس نے اپنی

زوجہ کو طلاق دے دی ہے تو ہم فریقین کو بذریعہ نوٹس یہاں بلا تے ہیں اور دونوں کو سمجھا بھجا کر مصالحت کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”مصالحت ہو جاتی ہے؟“

”کبھی ہو جاتی ہے کبھی نہیں ہوتی مگر آپ..... یہ ساری انکوائری کیوں کر رہے ہیں؟“ ریڈر نے ابا کو شک سے دیکھا۔

ابا تذبذب میں پڑ گئے۔ بتائیں یا نہ بتائیں۔

سائل بن کر پہنچے تھے تو دست سوال دراز کرنا ہی تھا۔

”سیری بیٹی کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہے۔ ان کی طرف سے مصالحت کی گنجائش ہونے کی بات نکلی تو میں قانونی مشورے کے لیے یہاں بھی آیا۔ ایک وکیل صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ٹالٹی کونسل کا تذکرہ کیا۔“ ابا کی آواز مستقل دھیمی تھی۔

”کیا نام ہے آپ کی بیٹی اور ان کے شوہر کا؟“

”شوہر تھا..... اب پتا نہیں رہا یا نہیں رہا۔“ ابا دل گرفتگی سے بولے۔

”نام؟“

”ڈاکٹر مہتاب۔“

”مہتاب فاروقی؟“

ابا نے چونک کر ریڈر کی طرف دیکھا۔ ”آپ کو کیسے معلوم؟“

”طلاق نامے کی کاپی ہمیں آج ہی ملی ہے.....“ اس شخص نے ایک فائل کھولی اور اس پر نظر مرکوز کرتے ہوئے استفسار یہ لہجے میں بولا۔ ”اربع شرف نام ہے آپ کی بیٹی کا؟“

”جی..... جی۔“

”ٹھیک ہے ہم فریقین کو مصالحت کے لیے ٹالٹی کونسل بلائیں گے۔“

”کب؟“ ابا کے لہجے میں یہ تاہی تھی۔

”یہ آپ کو میرے دوسرے ساتھی بتا سکیں گے کیونکہ پارٹیز کو نوٹس وہی ایڈوکیٹ کرتے ہیں۔ آج وہ چھٹی پر ہیں۔“

”میں کل آ جاؤں؟“

”جیسے آپ کی مرضی۔“

”مصالحت ہو جائے تو اچھا ہے۔“ ابا کو اپنی آنکھوں کے کنارے سیلتے محسوس ہوئے۔ ریڈر ان کی کیفیت تاثر

”اللہ بہتر کرے گا۔“ اس نے ابا کو تسلی دی۔

”ویسے ایک بات بتائیے۔“ ابا کے لہجے میں حد درجہ احتیاط تھی۔

ریڈر پھر ہم تن ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”کیا..... تین طلاقیں کے بعد ہونے والی صلح..... اسلامی نکتہ نگاہ سے درست ہوتی ہے؟“

”بڑے صاحب احمد اللہ اس دفتر کا اوپر سے نیچے تک سارا عملہ مسلمان ہے ماسوا سمیچر کے۔“

”صاحب! مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ شرعی مسائل کے سلسلے میں ہم پاکستانی مسلمان خاصے

جنوبیاتی ہیں، اپنے جارحانہ مزاج کے باعث ہم دین اسلام کو اس کی اصل گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے،

بلکہ ایک دوسرے کو سننے اور برداشت کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔“



خزاں کے مانند اتر رہا تھا۔ اس کی پلکیں بھیجنے لگیں۔ وقت انسان کے دل سے کیسے اس کی خواہشات، اس کی پسند، اس کی خوشیاں، اس کی مسکراہٹیں اپنی ظالم گرفت میں لے کر دل کو جیسے بالکل خالی کر دیتا ہے۔ کیوں ہوتا

اُس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑکی کے نزدیک کھڑے ہو کر باہر برسی ہوئی بارش دیکھنے لگی۔ کسی زمانے میں اسے بارش کتنی پسند تھی لیکن آج یہ موسم جیسے اس کے دل میں

”کل پھر حاضر ہوتا ہوں۔“ ابانے اٹھنے کا قصد کیا۔ ”دارالافتاء بھی گیا تھا انہوں نے پرسوں بلایا ہے۔“

”فتویٰ کہاں سے لے رہے ہیں آپ؟“ ریڈر نے پوچھا۔

ابانے اس دینی مدرسے کا نام لیا جہاں سے وہ ہو کر آرہے تھے۔

”ان کا فتویٰ تو یہی ہو گا کہ طلاق ہو چکی۔“ ریڈر نے ایک پرچی پر کچھ لکھا اور ابا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ یہاں سے بھی فتویٰ لیں۔“

ابانے پرچی لے کر اس پر لکھا تھا۔ ”دارالافتاء مرکزی جامع مسجد الحمدیہ“ ابانے ابھی ابھی نظروں سے ریڈر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مگر میاں، ہم تو فقہ حنفیہ کے ماننے والے ہیں۔“

”محترم اگر اسلام شدید بھوک میں بقدر ضرورت مردار کھانے کی اجازت دیتا ہے تو یہ طلاق کا مسئلہ ہے۔ ضرورت میں ایک مسلک کا دوسرے مسلک پر عمل کرنا جائز ہے۔“

ابا کا دل مطمئن ہو گیا۔

”کل کتنے بجے آ جاؤں؟“

ریڈر چند لمحوں کو سوچ میں پڑ گیا پھر ابا کو ہر روانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ اس عمر میں کہاں رہیں کریں گے۔ اطمینان رکھیے میں اپنے سامھی سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کی بیٹی اور داماد کو کسی قریبی تاریخ میں ٹالشی کر بلا لیں۔“

”بہت شکریہ..... بہت بہت شکریہ..... مہربانی۔“

ابا سر اپا تشکر بن گئے۔ آخری لفظ پر ان کی آواز بھرا گئی۔

یہ کیا کہہ دیا تھا ریڈر نے!

اس عمر میں!

ابا کا دل پھوڑے کی طرح دھکنے لگا۔

سوچا بھی نہ تھا کہ اس عمر میں ایک بیٹی کا گھر اجڑ جانے پر اس طرح کچھری میں آ کھڑے ہوں گے۔ وہ تو بہت کرتے تھے، ارفع کا گھر آباد ہو جائے پھر اطمینان! سکون! پھر چاہے اللہ دنیا میں رکھے یا اپنے پاس بلا لے۔ ارشاد شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ اور امی کتنے خوش رہا کرتے۔ شلے سبک بار لگتے، دل ٹھنڈا رہتا، افسوس پھر وہی چل پڑی تھی بلکہ اب تو زیادہ شدت کے ساتھ!

اس عمر میں ایسا ہو گا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

ابانے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر ڈھانپ لیے۔ ہچکیاں، سسکیوں میں بدلیں اور پھر یکنخت وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

اس عمر میں یہ کیا ہو گیا تھا!

مہتاب نے یہ کیوں نہیں سوچا تھا کہ صرف ارفع کا معاملہ نہیں تھا اُسے طلاق دے کر وہ پورے خاندان کو اذیت سے دوچار کرنے جا رہا تھا۔

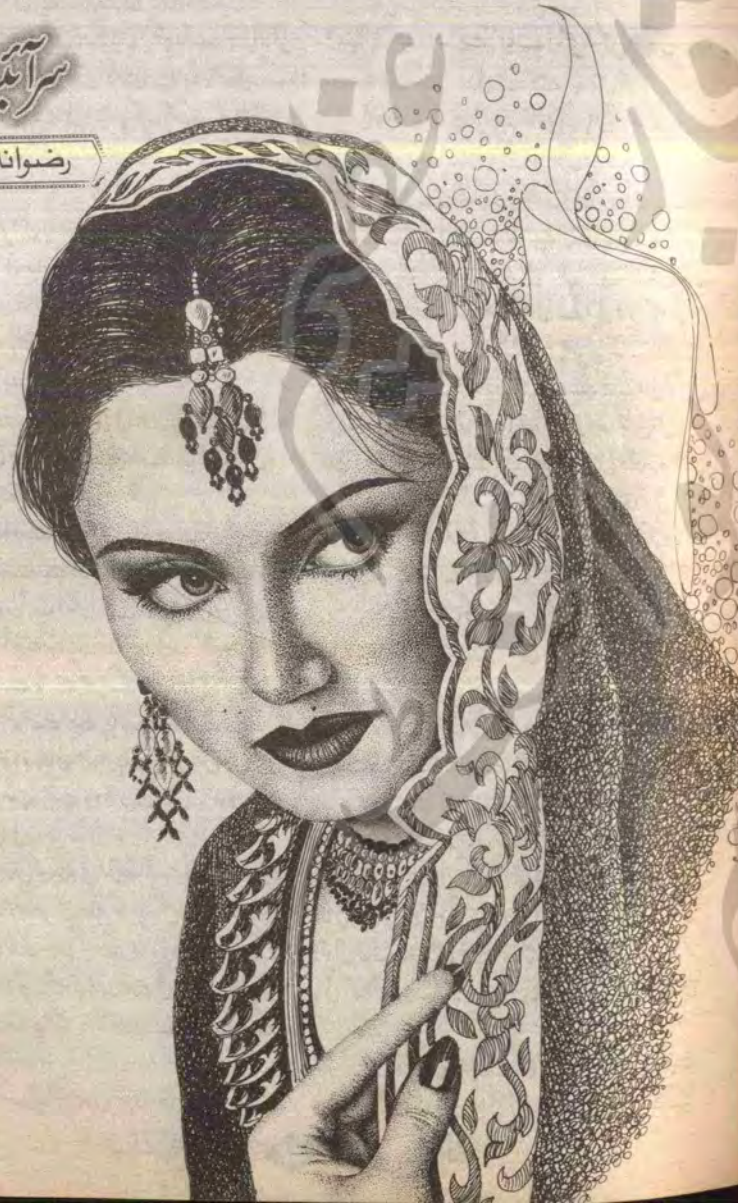
ابا رو رہے تھے

پھوٹ پھوٹ کر، بلک بلک کر

یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ آج کے بعد پھر کبھی نہیں روئیں گے۔

## سرآئینیہ

رضوانہ پرنس



بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



ہے یہ وقت اتنا سنگ دل، اتنا سفاک۔ اس نے بڑی بے بسی سے سوچا۔ یہی لاؤنج میں رکھے فون کی بجتی ہوئی پینل نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ گھر میں پہلے ہوئے بھیر سنانے میں فون کی تیز آواز اسے بہت عجیب سی محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو عیسرہ! کبھی ہو گڑیا؟“ شہروز بھائی کی شفیق آواز نے جیسے اس کی ساری اداسی اپنے اندر سمولی۔

”ہائے شہروز بھائی، یہ اچانک آپ نے کیسے فون کر لیا۔“ مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”بس تم اتنی یاد جو آ رہی تھیں اور پھر عید جوں جوں نزدیک آتی جا رہی ہے ہم لوگوں کو تمہاری ہی اتنی ہی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ تم کہاں اتنی دور چلی گئی ہو۔“ وہ بے ظاہر ہتے ہوئے کہہ رہے تھے لیکن ان کے ہر لفظ میں اس کی جدائی کا دکھ زور تھا۔

”میں خود سے تھوڑی سی آئی ہوں۔ آپ سب نے مجھے اتنی دور بھیج دیا۔“ وہ یہ کہتے ہوئے بے اختیار ہی رو پڑی کہ دل ویسے ہی بہت بھرا ہوا تھا۔

”ارے ارے بھئی! اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ اتنے پیارے سے دو لہامیاں کے ساتھ بھیجا ہے تمہیں اس پر یوں کے دیس میں۔ کوئی اکیلے تو نہیں ہو تم، وہاں تمہارا شہزادہ تمہارے ساتھ ہے۔“ شہروز بھائی اس کے رونے سے خاصے گھبرا گئے لیکن وہ اپنی بھراہٹ اس پر ظاہر کیے بغیر اسے بہت پیارے سمجھانے لگے۔

”لیکن شہروز بھائی میرا یہاں بالکل بھی دل نہیں لگ رہا۔ آپ سب بہت یاد آ رہے ہیں۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”شہروز بھائی کو پتا دل کتنا ہوا محسوس ہوا۔“ عیسرہ بیٹا، اب وہی تمہارا گھر ہے۔ تم کو ہر حال میں وہاں دل لگانا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہاں ارباز ہے تمہارے پاس تمہارے ساتھ۔ عیسرہ اب تمہاری ساری خوشیاں اسی کے دم سے ہونا چاہئیں۔“ وہ بڑے پیارے اسے سمجھانے لگے۔

”میں یہ سب جانتی ہوں شہروز بھائی لیکن پھر بھی

مجھے یہاں بہت تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ تین دن بعد عید ہے اور یہاں اس ملک میں کچھ جاتی میں چل رہا ہے۔ اس وقت وہاں کتنی رونق، کتنی گہما گہمی ہوگی۔ کتنا مزہ آ رہا ہوگا عید کی تیاری کرنے میں اور یہاں تو کچھ جاتی نہیں چل رہا کہ عید آنے والی ہے۔ آپ یقین کریں شہروز بھائی اس وقت میرے چاروں طرف اتنا گہرا سناہ اور خاموشی بچھائی ہوئی ہے جیسے عید نہیں محرم کے دن شروع ہونے والے ہیں۔“ وہ ایک بار پھر سسک کر رو دی تو شہروز ایک لمحے کو بالکل خاموش ہو کر رہ گئے۔

وہ ان کی بہت ہی جیتی جھوٹی بہن تھی، وہ ان سے نو برس چھوٹی تھی۔ وہ اس سے اپنے بچوں سے بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ اماں اور ابا کی ایک ایک کیڈنٹ میں اچانک موت کے بعد انہوں نے اپنی اپنی چھوٹی سی معصوم بہن کو جیسے اپنے کلبے میں چھپا لیا تھا۔ حالانکہ وہ بھی اس وقت محض اٹھارہ برس کے تھے جب ان لوگوں کی زندگی میں یہ بدترین سانحہ رونما ہوا تھا لیکن بس اس دن اس بھیا تک لمحے کے بعد ہی اس اٹھارہ سالہ نوجوان نے اپنے آپ کو ماں اور باپ دونوں کے روپ میں ڈھال کر اپنی ننھی سی بہن کی گویا تمام تر ذمے داریاں اپنے سر لے لی تھیں۔

روپے پیسوں کی ایسی کوئی کمی نہ تھی کہ بابا کی ٹھیک ٹھاک جائیداد بھی اور پھر آفس کی طرف سے بھی بہت کچھ ملا تھا۔ چچا اور ماموں سب ہی مخلص اور ہیپ فل تھے، سوان کی گھانڈیس اور موڈل سپورٹ کی وجہ سے انہوں نے بہت آرام سے اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی چھوٹی بہن کی بھی اتنے ناز و نرم اور پیار کے ساتھ پرورش کی کہ سب ہی حیران رہ گئے۔ رشتے کی ایک خالہ ان لوگوں کے ساتھ ہی رہتی تھیں لیکن شہروز بھائی کو عیسرہ کی چھوٹی سی چھوٹی بات کا اتنا خیال رہتا کہ بقول خالہ، ماں بھی ہوتی تو شاید شہروز جیسی محبت نہ کر پاتی کہ انہوں نے عیسرہ کی کسی بات پر نہ کہنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

یوں تو عیسرہ کو پورے خاندان کی بے پناہ محبت اور توجہ حاصل تھی لیکن بھائی کی محبت تو جیسے اس کے لیے

دنیا کی سب سے انمول نعمت تھی۔ اماں اور بابا کی جدائی کے گہرے گھاؤ کو شہروز بھائی کی محبت ہی نے تو بھرا تھا ورنہ وہ تو جیتے جی مر گئی ہوتی۔ ابھی اس نے میٹرک ہی کیا تھا کہ گھر میں شہروز بھائی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

وہ ان جلدی شادی نہیں کرنا چاہ رہے تھے لیکن خالہ کا بی بی بونٹی اور کنزروہ بھائی جا رہی تھیں اور پیار بھی رہنے لگی تھیں سو بہن کے اکیلے پن، اس کی تنہائی اور اس کی ذمے داری کے احساس نے انہیں مجبور کر دیا کہ جلد از جلد وہ اس گھر کے لیے ایک ذمے دار اور حساس لڑکی کو اپنی بیوی کے روپ میں لے آئیں جو ان کے دکھ سکھ کی ساسی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی بہن کو بھی پیار اور تحفظ دے سکے اور شہروز بھائی پھر گھر کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جائیں۔

شمرہ نے وفاقی ان کی زندگی میں آ کر ساری فکریں اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔ اس کے خوب صورت سے وجود نے شہروز کی زندگی میں پھول ہی پھول بکھیر دیے۔ وہ ایک بہت اچھی شریک زندگی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی اچھی بھابی بھی ثابت ہوئی۔

عیسرہ کو اس کے روپ میں ایک ماں، بہن اور دوست سبھی کا تو پیرا مل گیا اور پھر مزہ اور ننھی ٹوبہ کی دوسال کے اندر اندر آمد نے جیسے ان لوگوں کی خوشیوں کو چار چاند لگا دئے۔

شہروز بھائی کی نظر میں عیسرہ ہمیشہ ان کے بچوں ہی کی طرح رہی تھی۔ انہوں نے اس میں اور اپنے دونوں بچوں میں بھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا تھا بلکہ بھی سمجھی تو شمرہ کو عیسرہ کا پلازما زیادہ بھاری محسوس ہوتا لیکن وہ کچھ دار لڑکی تھی، شہروز کے جذبات کو سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ جلد ہی عیسرہ اپنے گھر کی ہو جائے گی، سو وہ جیسا کہ جیسے جذبات سے اپنے آپ کو دور رکھ کر اپنے جنت جیسے گھر کو درخ بنانے سے محفوظ رہی تھی۔ پھر ایسا ہی ہوا عیسرہ کی شادی چٹ منگنی پت پیاہ کے مصداق اچانک ہی طے پا گئی۔ رشتہ بے حد اچھا تھا۔

ارباز ایک بہت اچھی فیملی کا بڑھا کھسا کامیاب بزنس میں تھا۔ اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا، جو خوب چل رہا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ شہروز کے جگری دوست جمال کا فرسٹ کزن تھا۔

جمال کے بیٹے کی سالگرہ میں اتفاق سے ارباز اور اس کے ممی ڈیڈی بھی لندن سے آئے ہوئے تھے۔ ارباز کی ممی ان ہی دنوں ارباز کے لیے بڑی شد و مد کے ساتھ لڑکیاں دیکھنے میں مصروف تھیں۔ سالگرہ میں معصوم سی صورت والی عیسرہ انہیں دل و جان سے بھاگتی۔ جمال کے جانے بوجھے لوگ تھے چھان بین کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

ادھر شہروز بھائی بھی اس رشتے سے بے حد خوش تھے۔ ارباز کی شخصیت، اس کا کردار، اس کی قابلیت سب چیزوں سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ جمال کے ساتھ وہ ایک دوبار لندن اپنے آفس کے کام کے سلسلے میں جا چکے تھے۔

ارباز کی ممی لندن جانے سے پہلے ان دنوں کا نکاح کر دینا چاہ رہی تھیں تاکہ ویزا وغیرہ کی فارمیٹی پوری کی جا سکے۔ فیملی پر برسوں جمانے کے مصداق پندرہ دن کے اندر اندر شادی کی تاریخ ٹھہر گئی۔ ارباز کی ایک بہن کینیڈا میں اور ایک بھائی شارجہ میں سیشن تھے۔ دونوں ہی کو ہنگامی طور پر بلوایا گیا۔ امیر جنسی میں بھی بہت اچھی شادی ہوئی۔

ارباز خود بھی اس شادی سے بہت خوش تھا۔ پیاری سی شکل کی یہ بھولی بھالی لڑکی پہلی ہی نظر میں اس کے دل میں اتر گئی تھی اور یوں عیسرہ آنکھوں میں خاموش احتجاج لے لے ارباز کی بنادی گئی۔

شہروز بھائی نے خود اس سے اس رشتے کے بارے میں اس کی مرضی پوچھی تھی۔ تب اس نے آنسو بھری نگاہوں سے ان کو دیکھ کر صرف اتنا ہی کہا تھا۔

”شہروز بھائی میں اتنی دور جانا نہیں چاہتی۔ مجھے اپنے آپ سے جدامت کریں، پلیز۔“

شہروز بھائی نے بے اختیار اسے گلے سے لگ لیا۔

”گڑیا آج کل فاصلے سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ تمہارا جب



وہ اپنی امی کے ساتھ لاہور اپنے خالہ زاد کی شادی میں گیا تھا۔ ہفتے بھر بعد جب وہ لوگ لوٹے تو دروازے کے نیچے پڑے ہوئے اس سنبھرے لفافے نے جیسے اس کی زندگی سے سارا سنبھرا پن پھین لیا۔ ایک لمبے کوتاہ بالکل شاکد رہ گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا بچھا گیا۔ لڑکھڑا کر اس نے ماں کا سہارا لیا جو اس کے نزدیک ہی کھڑی تھیں۔

وہ ماں تھیں لمحوں میں بیٹے کا دکھ جان گئیں۔ وہ فوراً ہی شہروز کے گھر روانہ ہو گئیں۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ انہوں نے شہروز کے آگے عمیرہ کے رشتے کے لیے دامن پھیلا دیا۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی عمیرہ کی شادی طے پا جائے گی۔ ابھی تو اس نے کانچ میں ایڈیشن لیا تھا۔

شہروز نے دل ہی دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ عمیرہ کی شادی صرف ہفتے بھر بعد ہے اور کارڈ بھی بٹ چکے ہیں۔ اگر تاریخ طے ہونے سے پہلے ہی تائی اماں دست سوال دراز کر دیتیں تو ان کی پوزیشن کتنی اکورڈ ہو جاتی۔ رشتے داری اور ادب لحاظ کے ناتے انکار کرنا کتنا مشکل کام ہو جاتا لیکن اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، سوانہوں نے بڑی سہولت سے کارڈ بٹ جانے کا جواز بنا کر انکار کر دیا اور وہ مایوس دل برداشتہ واپس لوٹ گئیں۔

تائی اماں کے منع کرنے کے باوجود ہشام نے دل پر پتھر رکھ کر شادی میں شرکت کی۔ اپنی محبت کو ہمیشہ کے لیے کسی اور کے ساتھ رخصت ہوتے دیکھا۔ اس وقت اس نے اپنے آپ کو بے بسی کی اس انتہا پر کھڑے دیکھا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بھی بھی انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی مر جاتا ہے، اندر سے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ یہ احساس اے عمیرہ کی رخصتی کے وقت شدت سے ہوا۔ عمیرہ کی خوبصورت آنکھوں سے بہتے بے بس آنسو اسے اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ یوں ایک خاموش محبت کی کہانی بہت خاموشی سے ختم ہو گئی۔

اس وقت شہروز بھائی سے بات کرتے ہوئے تھا

دل گھبرائے آجایا کرتا، میں ٹکٹ بھیج دیا کروں گا لیکن بیٹا یہ رشتہ بہت ہی اچھا ہے۔ میں اس سے بہت مطمئن ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں اماں بابا کی روح کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گا۔ تم وہاں بہت خوش رہو گی۔“

کتنی خوشی اور کتنا مان تھان کے لمحے میں، وہ بس بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ اپنے بھائی کی خوشی، ان کے مان کی خاطر وہ اپنا دل تو کیا اپنی جان بھی قربان کر سکتی تھی۔ بھی تو اس نے اپنے نازک سے دل میں چھپی اس معصوم محبت کو بہت بے دردی کے ساتھ مار دیا۔ ان روشنیوں کو بجھا دیا جو کسی کے آنے پر اس کی آنکھوں میں جھللا اٹھتی تھیں۔

ہشام اس کا تایا زاوہی نہیں اس کے دل کے سنگھاس پر بیٹھا وہ ویوتا تھا جس کی شاید اس نے بچپن سے ہی پوچھا کی تھی اور اس کے جذبوں کی شدتوں کی خاموش زبان کو ہشام بھی بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ عمیرہ کے لب تو خاموش رہتے لیکن اس کی آنکھیں اس کے دل میں جیسے سب جذبات کچھ اس طرح سے بتا دیتیں کہ ہشام کو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ وہ عمیرہ کے گھر آنے کے بہانے ڈھونڈا کرتا اور عمیرہ کے دل کی ہر دھڑکن پل پل اس کا انتظار کیا کرتی۔

شہروز بھائی ان دونوں کے معصوم جذبات کو سمجھ ہی نہیں پائے۔ ویسے بھی ہشام ابھی اچھی طرح انٹیلیس نہیں ہوا تھا۔ ابھی تو اس نے جاب شروع ہی کی تھی۔ تایا ابا کے اچانک انتقال کی وجہ سے اسے اپنی ماں اور اپنے بہن بھائیوں کی خاطر تعلیم ادھوری چھوڑ کر جاب کرنی پڑی تھی کہ تایا ابا اپنے پیچھے کوئی قابل ذکر جائیداد یا بینک بیلنس نہیں چھوڑ گئے تھے اور پھر شہروز بھائی نے تو اپنی لاڈلی بہن کو ہمیشہ شہزادی کے روپ میں دیکھنا چاہا تھا۔ انہوں نے ہشام کے بارے میں اس نظر سے سوچا ہی نہ تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ ان کی معصوم سی بہن کے دل کی ہر دھڑکن بس ہشام ہی کو پکارتی ہے۔ انہوں نے ارباز سے اس کی بات طے کر دی۔

ہشام کو تو اچانک ہی اس کی شادی کا کارڈ ملا تھا۔



نہیں کیوں ایک دم سے ہی عیسرہ کو ہشام بھی شدت سے یاد آ رہا تھا۔۔۔ بھی تو اس نے وہ بے لفظوں میں تالی اماں کی خیریت پوچھ ڈالی۔

”وہ لوگ ٹھیک ہیں۔ ہشام کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا ہے، بڑی اچھی ترقی ہوئی ہے۔“

شہروز بھائی کے اس جواب پر اس کے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ تو اب جب بھی وہ اپنے ویس جانے لگے تو ہشام کو دیکھ بھی نہ پائے گی۔ ویسے بھی اس کی شادی کے بعد تالی اماں ان لوگوں سے خاصی بچ سی گئی تھیں۔ شہروز بھائی اور بھائی سے کافی دیر باتیں کرنے کے بعد جب اس نے ریسپور واپس رکھا تو دل بہل جانے کے بجائے کچھ اور اداس ہو گیا تھا۔

ان کا گھر جس علاقے میں تھا وہ کچھ زیادہ ہی پرسکون تھا۔ سب گھر خاموشی کی چادر اوڑھے جیسے سو رہے ہوتے۔ ان کے مکین بھی نہ جانے اندر کہاں روپوش رہتے تھے کہ بس بھی آتے جاتے ہی نظر آ جاتے تھے۔ اس کے دونوں طرف کے پڑوسی انگریز تھے اور وہ بھی اس ٹیپنگ کی جو اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔ ان فیکٹ جنہیں ایشین پسند نہیں ہوتے ہیں۔

وہ چپ چاپ آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ عید جب بھی نزدیک آتی تھی تو وہ کتنا ہنگامہ مچایا کرتی تھی۔ اپنی فرینڈز کے ساتھ تو کبھی بھیا بھائی کے ساتھ شاپنگ سینٹرز کے چکر لگ رہے ہیں۔ شاپنگ کے ساتھ رونقوں کو انجوائے کرنا، چائے، فالودہ کھاتے ہوئے لوگوں پر تبصرے کرنا، چوڑیاں پہننے جانا، کتنا مزہ کرتی تھی وہ۔ اس نے پلکوں پر آئے آنسوؤں کو بے دردی سے مٹا ڈالا۔

چھپیلی عید پر اس نے ہشام سے بھی تو زبردستی عیدی لی تھی۔ ہشام نے کتنا ستا کر اس کی مہندی لگی تھی۔ پر سو روپے کا نوٹ رکھا تھا۔ اسے یاد آیا، چھپیلی چاند رات کو وہ سب کمزمل کر رونقیں دیکھنے باہر نکلے تھے۔ ہشام سب کو لیز کر رہا تھا۔ کتنی رات گئے تک وہ لوگ گھومتے پھرتے رہے تھے۔ چھوٹی موٹی شاپنگ اور کھانا پینا بھی چل رہا تھا چونکہ بھائی بھی ساتھ تھیں اس

لیے شہروز بھائی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس رات ہشام نے سب لڑکیوں کو اپنی طرف سے چوڑیاں بھی پہنائی تھیں اور جب وہ اپنے لیے ایک چوڑیوں کا سیٹ پسند کر رہی تھی تو ہشام نے بہت خاموشی سے سرخ اور سبز چوڑیوں کا جگمگاتا ہوا حسین سائیٹ اس کی جانب بڑھا دیا تھا اور عیسرہ نے بھی اتنی ہی خاموشی سے اپنا پسند کیا ہوا سائیٹ واپس رکھ کر وہ سیٹ لے لیا تھا۔

عید کے دن گلابی سوٹ پر وہ سرخ و سبز چوڑیاں پہنے ہر ایک کی تنقید کا نشانہ بنی رہی لیکن اسے تو بس ایک چیز نے سب باتوں سے بے نیاز کر دیا تھا اور وہ چیز بھی ہشام کی آنکھوں سے چھلکتی خوشی اور وارفتگی۔

”آف، اس نے سر کو جھکا۔ اب میری شادی ہو چکی ہے پھر تم کیوں یاد آ کر مجھے پریشان کرتے رہتے ہو۔ اسے یاد آیا حالہ کتنی تھیں کہ اگر شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے کسی غیر کے متعلق سوچے بھی تو اسے سخت گناہ ہوتا ہے۔ نہیں نہیں اللہ میاں اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں، میں تو چاہتی ہوں کہ وہ بھی بھی یاد نہ آئے لیکن اگر وہ خود بخود یاد آ جاتا ہے تو پھر آپ مجھے

کیوں گناہ دیں گے۔ میں نے تو ہمیشہ اپنے دل پر قابو رکھا۔ زبان سے بھی کبھی اظہار نہیں کیا۔ دیواروں تک کو جاتے ہوئے ڈری۔ اپنے بھائی کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ اپنی ساری خوشیاں قربان کر دیں لیکن اس کی یاد اگر ایک ضدی بچے کی طرح بار بار آ کر مجھے ستاتی ہے تو کیا آپ میری ساری قربانیوں کو نظر انداز کر کے بلا قصور مجھے گناہ دیں گے۔ یہ تو آپ کے ہاتھ میں ہے تاکہ اس کی یاد میرے دل سے مٹا دیں۔ میرے بس میں

ہوتا تو میں کب کا ایسا کر چکی ہوتی۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رو پڑی۔ بھی ڈورنیل کی آواز پر اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھا۔

اسی وقت ارباز اپنی چابی سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر آ گیا۔ اس کی رونی رونی سی آنکھوں کو بغور دیکھا تو وہ نظریں چرا گئی۔

”کیوں رو رہی تھیں۔ کیا پاکستان یاد آ رہا



ہے؟“ وہ اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔  
 ”ہاں.....!“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
 آنکھیں ایک بار پھر برے کو تیار ہو گئیں۔  
 ”یار میں ہوں تا تمہارے پاس۔ چلو اٹھو میں  
 تمہیں کہیں گھملاؤں۔“ ارباز نے پیار سے اس کے  
 ہاتھ تھام لیے۔

نہیں ارباز اب تو افطار کا وقت ہونے والا ہے۔  
 میں نے ہلکی پھلکی افطاری اور کھانا بنا لیا ہے۔ آپ  
 فریش ہو جائیں جب تک میں ٹیبل لگاتی ہوں۔“ وہ اس  
 کے ان التفات بھرے چہلے پر کچھ تادم ہو کر بولی۔  
 ”نہیں ابھی آج ہم افطار باہر ہی کریں گے۔ تم  
 جلدی سے تیار ہو جاؤ، ابھی تو آدھا گھنٹا ہے۔ ویسے یار  
 لندن کے لوگوں کو روزے کا زیادہ ثواب ملنا چاہیے۔  
 دیکھو نہ گرمیوں کے اس موسم میں نوبے تک سورج ہی  
 غروب نہیں ہوتا۔“ وہ ہنستے ہوئے باہر کھڑکی سے  
 جھانکنے لگا جہاں بادلوں کی اوٹ سے سورج جھانک رہا  
 تھا۔



ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے وہ ارباز کو پاکستان  
 میں عید کی رونقوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ارباز  
 کے مٹی ڈیڈی اپنی بیٹی کے پاس کنیڈا گئے ہوئے تھے۔  
 اتفاق سے نواسے کی سالگرہ عین عید کے دن پڑ رہی تھی۔  
 اس لیے رینا نے بھداصر انہیں روک لیا تھا ورنہ وہ تو  
 اپنی ننئی ٹولی بہو کی پہلی عید اس گھر میں اس کے ساتھ ہی  
 منانا چاہ رہے تھے۔

ارباز کے ساتھ اتفاق یہ ہوا تھا کہ اس نے آج  
 تک پاکستان میں کوئی عید نہیں منائی تھی۔ جب بہت  
 چھوٹا تھا اور اس کے نانا نانی زندہ تھے تو ایک آدھ بار وہ  
 لوگ عید پر وہاں ضرور گئے تھے لیکن اسے کچھ زیادہ یاد نہ  
 تھا۔ عیرہ سے چاند رات کی رونقوں کا حال وہ بڑی  
 دلچسپی سے سن رہا تھا۔

”جج ارباز مجھے تو چاند رات کو زیادہ مزہ آتا  
 ہے۔ بس مجھے تو وہی عید لگتی ہے۔ پورے رمضان غضب  
 کی گہما گہمی اور شور شرابا رہتا ہے۔ شاپنگ سینٹر آدھی

آدھی رات تک کھلے رہتے ہیں۔ وہاں پر لوگوں کا  
 ازدحام ہوتا ہے۔ چاند رات کو تو دکان میں جج چار بیٹے  
 کھلی رہتی ہیں اور لوگ ایسے گھوم پھر رہے ہوتے  
 جیسے جج عید کے لیے انہیں اٹھنا ہی نہیں۔ لڑکے بھی  
 موٹے سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور چوڑیوں  
 اسٹال لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔“

اس نے ہنستے ہوئے بتایا تو ارباز بھی بے اختیار  
 مسکرا دیا۔ ”لیکن ارباز اتنی ڈھیر ساری رونقوں اور  
 ہنگاموں کے بعد عید کے دن میرا دل چاہتا تھا کہ بس  
 جاؤں۔ مجھے تو عید، چاند رات تک ہی زیادہ اچھی  
 ہے۔“ وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

ارباز بے ساختہ ہنس دیا۔ ”وااصل دن تو عید  
 ہوتا ہے اور وہی تم کو بورنگ لگتا ہے۔“  
 ”نہیں خیر اتنا بورنگ بھی نہیں لگتا۔“ وہ ہنسا  
 یادوں میں کھو کر بولی۔

اس دن وہ لوگ تیار ہو کر سب بزرگوں کے گھر  
 سلام کرنے جایا کرتے تھے کہ اماں بابا کے بعد ان ہی  
 لوگوں کی شفقتوں اور محبتوں کے سائے میں یہ لوگ بے  
 بڑھے تھے۔ وہ کتنے دل سے تیار ہوا کرتی تھی۔ کسی کی  
 خاموش نگاہوں کی تعریف، ان میں جھلکتا والہانہ چہرہ  
 اسے کتنا اچھا، کتنا خوب صورت لگا کرتا تھا۔ تاپا یا کے  
 گھر جاتے ہوئے دل میں کتنی معصومی خوشی ہلکورے  
 لینے لگتی تھی۔ اوہ، اس نے اپنی سوچ پر بھرا کر ارباز کی  
 جانب دیکھا تھا۔

”میں بہت بری ہوں، میرا اتنا چاہنے والا شوہر  
 میرے نزدیک ہی بیٹھا ہوا ہے اور میں پھر اس کے  
 بارے میں سوچنے لگی ہوں۔ اللہ میاں پلیز ایسا مت  
 کریں یہ میرے ہاتھ میں نہیں آپ کے ہاتھ میں ہے  
 پھر آپ کیوں مجھے اسے بھولنے میں مدد نہیں دے  
 رہے۔“

”ارے بھی کہاں کھو گئیں تم؟“ ارباز نے اس  
 کے آگے ہاتھ ہلایا تو وہ بس سر جھکا کر خض مسکرا دی۔  
 ”مجھے پتا ہے کہ تمہیں وہاں پر گزری عیدیں  
 آ رہی ہیں۔ یار باہر کے ممالک میں ایک سیبی تو خرا



ہے کہ ہمیں یہاں اپنے تہوار کا کوئی مزہ ہی نہیں ملتا۔ چھٹی تک نہیں ہوتی ہے۔ اکثر لوگ نماز پڑھ کر دفتروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ عید کا دن ہے آج۔“ وہ عیسرہ کی باتیں سن سن کر کچھ کڑھ کر بولا۔ اسی تفصیل تو می نے بھی سمجھی نہیں بتائی تھی۔

”ہاں ارباز یہاں تو کچھ پتا ہی نہیں چل رہا کہ ماہ رمضان آیا بھی تھا اور صوم بھی ہو رہا ہے۔ آج کل تو وہاں کی رونقیں دیکھنے کے قابل ہوں گی۔“ اس کے لہجے میں اداسیاں سمٹ آئیں اور ارباز اس کا اداس چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں خاموش سا ہو گیا۔

\*\*\*

ارباز کا فون آیا تو وہ کپڑے پر بس کر رہی تھی۔ ”صومعیرہ آج شام کو افطار اور کھانا نہیں بنانا ہمیں ایک افطار پارٹی پر جانا ہے۔“ ارباز کے بتانے پر وہ کچھ خوش ہو گئی۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ اپنے کسی ہم وطن کے گھر اپنے جیسے لوگوں سے ملے۔ پورا رمضان گزر گیا تھا لیکن وہ لوگ یہ مشکل ایک آدھ جگہ ہی افطار پر گئے تھے۔ ارباز کے حلقہ دوستی میں مسلمان بہت زیادہ نہ تھے اور تھے بھی تو وہاں افطار پارٹیوں کا کوئی خاص رجحان نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے کتنے بچے جانا ہوگا؟“

”بھئی اصل میں ان کا گھر میرے آفس کے بالکل ہی نزدیک ہے۔ آج ویک اینڈ ہے ٹریفک بہت زیادہ ہوگی، میرا تو آنے اور پھر فوراً ہی واپس جانے میں کباز ہو جائے گا۔ تم ایسا کرو شام ہونے سے پہلے پہلے میرے آفس آ جاؤ پھر ہم لوگ یہاں سے اکٹھے ہی چلے چلیں گے۔“

ارباز کے اس پروگرام پر وہ ایک لمحے کے لیے جھبز سی ہو گئی۔ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے ارباز ہنس دیا۔

”پاگل لڑکی! اپنے آپ میں کانفیڈنس پیدا کرو۔ یہاں پر کوئی ایک دوسرے کے آسرے پر نہیں رہتا۔ اپنے سب کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔ پاکستان کی طرح ٹھوڑا ہی ہے کہ ڈرائیور کو ڈر کر دیا اور خود

شان سے بیٹھ گئیں۔ یہاں تو بڑے سے بڑا آدمی ڈرائیور انور ڈھیں کرتا ہے بلکہ ایسا کچھ کونسلٹنٹ ہی نہیں ہے یہاں۔ اب ہمیں خود ہی سب جگہ آنے جانے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ کب تک چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے میرا منہ دیکھوگی۔“ اس کے اتنے لیے کچھ پر وہ شرمندہ ہی ہو گئی۔

”ارباز، میں کبھی اسکی نگاہیں نہیں ہوں نا، اس لیے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“

”ارے بھئی تم دو مرتبہ میرے ساتھ آفس آ چکی ہو۔ یاد ہے جب میں چھٹیوں پر تھا اور اپنے کسی کام سے مجھے آفس جانا پڑا تھا تو دونوں مرتبہ تم ساتھ تھیں۔“

”ہاں یاد ہے۔“ وہ ہنسنے لگے۔

”اور ہاں ایک بات تو ہم دونوں بس سے گئے تھے کار میں کچھ پرالیم کھی، ہے نا؟“ ارباز نے پُر جوش لہجے میں اسے یاد دلایا۔

”جی۔“ ہنوز اس کا لہجہ دم تھا۔

”تو پھر پرالیم کیا ہے۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر بس اسٹاپ ہے۔ بس ڈائریکٹ میرے آفس کے سامنے سے گزرتی ہے۔ آفس تم نے دیکھا ہوا ہے۔ بس اسی اسٹاپ پر اتر جانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ ہاں موبائل ضرور ساتھ رکھ لیتا اور جان اس بہادری کے بدلے میں، میں تم کو انعام کے طور پر ایک خوبصورت سا سرپرائز بھی دوں گا جو آفس میں تمہارا منتظر ہے۔“

”کون سا سرپرائز ارباز؟“ وہ سب بھول کر ایک دم سے خوش ہو گئی۔ ویسے بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے خوش ہونا کچھ زیادہ ہی آتا تھا۔

”بس تم آؤ گی تو تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔ بی بریو۔“ ارباز نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ ارباز کا آفس خاصا دور تھا۔ کم از کم بیٹھالیس منٹ کا تو راستہ تھا اور بس سے تو وقت اور زیادہ لگتا۔ اس نے جلدی جلدی اپنے کپڑے پر بس کیے۔ آسانی رنگ کے جارجٹ کے سادہ سے سوٹ کے ساتھ ہم رنگ جیولری نکالی۔ ابھی وہ

کپڑے بدلنے جا رہی تھی کہ کسی نے دروازے کی بیل بجائی۔ یہ اس وقت کون آ گیا۔ اس نے حیرت سے سوچے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے دو چھوٹے چھوٹے بچے کھڑے ہوئے تھے۔ پوچھتے پر پتا چلا کہ ان کی گیند گھر کے پچھلے حصے میں بنے ان کے چھوٹے سے گارڈن میں آئی ہے۔ اس کی اجازت ملنے پر ایک بچہ دوڑ کر اندر سے گیند اٹھا لایا۔

ابھی وہ دونوں بچے پلٹے ہی تھے کہ اچانک ایک بچہ کھوکھو کر لگی اور وہ منہ کے بل جا گرا۔ اس اچانک افتاد پر عیسرہ بے اختیار اس بچے کی طرف لگی۔ اس وقت ہوا خاصی تیز چل رہی تھی۔ عیسرہ نے بچے کو بھی اٹھا لیا ہی تھا کہ دھڑام سے دروازہ بند ہونے کی آواز پر اس نے بے حد گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ وہ آٹومیک ڈور ہوا کے زور سے بند ہو چکا تھا۔ عیسرہ بچے کو وہیں چھوڑ کر دوڑتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ گھبرا کر اس کو دھکا دیا لیکن دروازہ ہلاک ہو چکا تھا۔

اس نے اکثر لوگوں سے یہ قصے سنے تھے کہ دروازہ ہلاک ہو گیا۔ چابی اندر رہ گئی لیکن آج یہ قصہ خود اس کے ساتھ بھی پیش آ چکا تھا۔ یہ آٹومیک لاک کبھی اس کے لیے اتنی بڑی مصیبت بن جائے گا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

وہ دوڑ کر ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں کی طرف گئی کہ اکثر وہ انہیں کھول دیتی تھی لیکن آج وہ بھی بند تھیں۔ وہ چند لمحے سکتے کے عالم میں کھڑکی کی کھڑی رہ گئی۔ دونوں بچے پتا نہیں کب وہاں سے جا چکے تھے اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ حواس باختہ سی کھڑی دروازے کو دیکھ کر جا رہی تھی۔ پاؤں میں اس کے چپل بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ ننگے پاؤں ہی دروازہ کھولنے چلی آئی تھی۔

نیلے رنگ کے ٹریک سوٹ میں (کہ وہ گھر میں یہ پہنا کرتی تھی) ننگے پیروہ حیران پریشان کھڑی سوچ رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے گی۔ علاقے میں وہ کسی کو جانتی بھی نہ تھی۔ کیوں کہ ان کے گھر کے آس پاس زیادہ تر انگریزی ہی رہتے تھے۔ ان تین ماہ میں اس کی کسی سے علیحدگی بھی اتفاق سے نہیں ہوئی تھی۔ بس ارباز ہی

اکثر ان لوگوں سے آتے جاتے ہائے بیوکر لیتا تھا۔ اسے ارباز کے آفس کا فون نمبر زبانی یاد نہیں تھا کیوں کہ وہ کبھی آفس کے نمبر پر فون ہی نہیں کرتی تھی۔ ارباز کی ہدایت کے مطابق وہ ڈائریکٹ موبائل پر ہی اس سے بات کر لیتی تھی اور آج ارباز اپنا موبائل گھر پر ہی بھول گیا تھا اور جب ہی تو اس نے خاص طور پر موبائل اپنے ساتھ لانے کی تاکید کی تھی۔

وہ گھبرا کر دھڑ سے اُدھر گئی۔ کیا کروں، کہاں جاؤں میرے مالک۔ اگر ہمت کر کے ساتھ والوں کا دروازہ کھٹکھٹاتی بھی ہوں تو اس کا فائدہ کیا ہوگا۔ فون نمبر تو ڈائری میں ہے اور ڈائری اندر گھر میں ہے۔ ٹہل ٹہل کے اس کے پاؤں مثل ہو گئے تو وہ وہیں دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔

وہ کیسے ارباز کو بتائے کہ وہ مشکل میں پڑ گئی ہے۔ اس صلیبے میں پنا چپل کے، پنا پیسوں کے وہ ارباز کے آفس بھی نہیں جاسکتی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور وہ بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ دل ہی دل میں ان بچوں کو ہزار صلواتیں سنا رہی تھی جن کی گیند نے اسے اس پریشانی میں لاپھینکا تھا۔

اچانک ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سی پھوار برس رہی ہے۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ایک کالے دیو کی مانند اسے ڈر رہا تھا۔ اس لندن کے موسم کا بھی قسمت کی طرح کوئی اعتبار نہیں۔ ایک دم سے اپنا رنگ بدل لیتا ہے۔ یوں بھی شام ہونے والی تھی، اوپر سے کالی گھٹاؤں نے فضا میں کافی اندھیرا سا محسوس دیا تھا۔ خوف اور وحشت اسے اپنے رگ و پے میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اس وقت یقیناً چھ سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ ایک گھنٹے سے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ ارباز کتنا پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اس وقت تو اسے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا، اس نے دہل کر سوچا۔ اندر وقفے وقفے سے فون کی بجتی تیز بیل اسے صاف سنائی دے رہی تھی اور وہ بے چارگی سے دروازے کو کٹکے جا رہی تھی۔ یقیناً ارباز فون



کر رہے ہوں گے۔ وہ موبائل پر بھی ٹرائی کر رہے ہوں گے اور دونوں جگہ سے کوئی رسپانس نہ ملنے پر کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ وہ بے بسی سے رو پڑی۔ اپنی بے بسی اور ارباز کی پریشانی کے بارے میں سوچ کر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

یا اللہ! کیا منحوس دن تھا آج کا۔ وہ صبح سے اپنے وطن کی عید کو یاد کیے جا رہی تھی اب اسے سوائے ارباز کی پریشانی کے کچھ اور یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ ہشام کی یاد اس کے دل سے مٹا دے تو اس وقت اللہ میاں نے ہشام کی یاد مکمل طور پر اس کے دل سے مٹا کر اس میں صرف اور صرف ارباز کی فکر اور اس کی پریشانی بھر دی تھی لیکن کتنے انوکھے طریقے تھے۔ بادل زور سے گرے اور ایک دم سے بارش بہت تیز شروع ہو گئی تھی۔ وہ بری طرح سے بھیگ رہی تھی لیکن اس کی اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ساتھ والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا سکے۔ بھیجی سامنے سے آتے دو لمبے چوڑے نیگروں کو دیکھ کر اس کا دل بالکل ہی بیٹھ گیا۔

ارباز نے بتایا تھا کہ یہ کالے بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کو بہت آرام سے لوٹ لیتے ہیں اور ضرورت پڑے تو مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ ان کی قوم کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوتی ہے۔ وہ لمبے زلے کے ساتھ ان کو نزدیک آتے دیکھتی رہی۔

وہ دونوں اس کے نزدیک آ کر ایک لمحے کو رکے۔ پھر اسے یوں بے سرو سامان اتنی ناگفتہ حالت میں کھڑے دیکھ کر انتہائی حیرت سے ایک نے کوئی سوال کیا لیکن وہ جوان کو دیکھ کر ویسے ہی بہت زیادہ سہم گئی تھی ان کے اس طرح اپنے پاس کھڑے ہو جانے پر ایک دم سے ہی بہت زیادہ خوفزدہ ہو کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔

وہ دونوں اسے یوں دوتا دیکھ کر کافی گھبرا گئے۔ ایک نے فوراً ہی اپنا موبائل نکالا اور کسی سے تیز آواز میں بات کرنے لگا۔

عمیرہ کا تو جیسے دم ہی نکل گیا۔ وہ یقیناً اپنے اور

ساتھیوں کو بلا رہا تھا۔ وہ پوری آواز سے چلا چلا کر رونے لگی۔ بارش کی آواز اور اپنے رونے میں مشغول ہونے کے سبب اس نے یہ سننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کس سے اور کیا بات کر رہا ہے۔

وہ دونوں اس کے یوں رونے پر اور حواس باختہ ہو گئے اور بتائیں کیا کہتے جھکتے تیز تیز قدموں سے پیچھے ہوئے آگے نکل گئے۔

عمیرہ نے آنسو پونچھے ہوئے تھوڑا سا سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ پولیس کی گاڑی کے تیز سائرن کی آواز سے پورا ایریا گونج اٹھا۔ ایک پولیس کار زانے سے اس کے نزدیک آ کر رکی اور اس میں سے دو پولیس والے برآمد ہوئے۔

وہ ہنگامی تھی دیکھتی رہ گئی۔ کیا وہ لوگ اسے کوئی چور، کوئی خراب عورت تو نہیں سمجھ رہے۔ اس نے ان پولیس والوں کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ اگر انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا تو ارباز کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ میں کہاں گئی۔ وہ ایک بار پھر تڑپ کر رہ دی۔

تب ایک پولیس والے نے بہت نرمی اور ہمدردی سے اس کا مسئلہ پوچھا اور اپنی مدد کی آفر کی تو جیسے اس کی جان میں جان آ گئی۔

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے ابھی اپنا مسئلہ بتانا شروع ہی کیا تھا کہ ارباز کی کار بہت تیزی سے پولیس کی کار کے پیچھے آ کر رکی اور وہ بے حد حواس باختہ تقریباً دوڑتا ہوا عمیرہ کے نزدیک آ گیا۔ اسے اچانک ہی اپنے سامنے پا کر عمیرہ کو ایسا لگا گیا تیز چلتی ہوئی زمین پر نچنے پاؤں چلتے ہوئے ایک دم سے کوئی بہت ٹھنڈا سا سایہ مل جائے۔

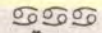
ارباز نے بے پناہ پریشانی کے عالم میں بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا جب کہ وہ بچوں کی طرح روئے جا رہی تھی۔ ”بولو عمیرہ کیا ہوا، سب خبریت ہے نا۔“ وہ بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔

پولیس مین بھی حیرت سے ان دونوں کی طرف متوجہ تھے۔ تب اس نے آنسوؤں اور سسکیوں کے

درمیان ارباز کو ساری بات کہہ سنائی۔

”اوہ گاڈ!“ ارباز نے سکون کی ایک طویل سانس لی اور دونوں پولیس والوں سے بہت معذرت کی۔

وہ دونوں مسکراتے ہوئے اپنی کار کی جانب بڑھ گئے۔ انہی کی زبانی عمیرہ کو پتا چلا کہ ان کالوں نے پولیس کو فون کر کے اس کی مدد کرنے کو کہا تھا اور وہ ناحق ان پر شک کر رہی تھی۔



ارباز کی ہنسی نہیں رک رہی تھی اور وہ کھپکھپاتی ہوئی اسے روکھی ہوئی نظروں سے دیکھنے جا رہی تھی۔ ارباز کے اوپر جو ان ڈیڑھ دو گھنٹوں میں گزری تھی اسے بس اس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ پریشانی کی ایک حد کراس کر گیا تھا۔ ایسے برے برے ہسپتال کی خیالات اس کے دل کو ایک مغریت کی مانند جکڑ رہے تھے کہ اس سے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ پانچ بجے سے گھر اور موبائل دونوں پر عمیرہ کو ٹرائی کر رہا تھا لیکن دونوں فون پر نو رسپانس تھا۔ بہت ٹرائی کرنے کے بعد اور عمیرہ کے آفس نہ پہنچنے پر اس کی پریشانی عروج پر پہنچ گئی۔ اس کو پکارتیں ہو چلا تھا کہ عمیرہ کے ساتھ کوئی برا حادثہ ہو چکا ہے۔ وہ گاڑی اڑاتا ہوا گھر پہنچا تو دروازے پر کھڑی پولیس کار نے تو جیسے اس کے شے کو یقین کی زبان دے دی، اس کی جان ہی تو نکال دی لیکن اب جب کہ ذہن و دل کو سکون حاصل ہوا تھا تو عمیرہ کی حرکات اور حالت زار کا سوچ سوچ کر اس کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ عمیرہ اس کے یوں لگتا رہنے پر اب پانچ بج روٹھ گئی تھی۔ آنکھوں میں حسب معمول آنسو آ گئے۔

”ارے ارے بھی خفا ہونے کی نہیں ہو رہی ہے، چلو میں تم کو وہ سر پرانز دے ہی دوں جو کہ میں آفس میں دیتے والا تھا۔“

”کون سا سر پرانز؟“ وہ اپنا غصہ بھول کر بڑے تجسس سے انہیں دیکھنے لگی۔

تب ارباز نے جیب سے پی آئی اے کے دو ایئر کنڈ نکال کر اس کے سامنے لہرائے۔ ”جناب ہم کل

تم بن ساجن

اک اور برس بھی بیت گیا اب آ جاؤ۔۔۔۔۔

ایسا نہ ہو کہ

جبر میں ڈوب کے

میری سانسیں رک جائیں

شاعرہ: رابعہ اسلم، رحیم یار خان

صبح کی فلائٹ سے پاکستان جا رہے ہیں کہ تم چلا کو بیگم نے وہاں کی چاند رات کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ مابدولت کا دل تہارے ساتھ یہ چاند رات منانے کو بے تاب ہو گیا کہ مجھے بھی تو حق ہے نا اس رات کو انجوائے کرنے کا۔ ”وہ شرارت بھری خوشی سے اسے بتا رہا تھا۔“

”ہائے سچ۔“ اس سے مارے خوشی کے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

”ہاں بالکل سچ۔ بس اب تمہارے پاس صرف چند گھنٹے بچے ہیں اس رات کے جس میں تمہیں پیٹنگ کرنی ہے۔ صبح تو بجے کی فلائٹ ہے ہماری۔“

”اف ارباز! آپ کتنے اچھے ہیں۔ یہ چاند رات میری زندگی کی سب سے انوکھی اور خوبصورت چاند رات ہو گی۔“ وہ فرط جذبات سے اس کے گلے لگ گئی اور کتنی حیرت کی بات بھی کہ اس وقت ہشام کی یاد، اس کا خیال اس کے دل میں کہیں دور دور تک نہ تھا۔

بس ارباز کے ساتھ پاکستان جا کر چاند رات منانے کا خیال، شہر زبھا، بھائی اور بچوں سے ملنے کی خوشی کے علاوہ اس کے دل میں کچھ نہ تھا۔ ارباز کے بازوؤں کے حصار میں ملنے والے تحفظ نے اسے اس وقت جو سکون دیا تھا، جو خوشی بخشی تھی یہ اللہ کی ہی بخشش ہوئی تھی جس نے اس کے بے کل دل کو ایک انوکھے طریقے سے خوشی بخش کر اس کو یہ بتا دیا تھا کہ جس کی نیت صاف ہو اللہ

ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔





## کارداں اپنا

اسما قادری

ناولٹ



”سوری بھائی! احمر معیرو کی خود پر جی سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے رفعت نے شرمندگی سے کہا۔  
 ”کیوں نہیں آئی وہ؟“ احمر کے انداز میں دبا دبا غصہ تھا۔ جس کے لیے اتنے ڈھیروں کام چھوڑ کر آیا تھا  
 اسے سامنے نہ پا کر غصہ اور بھنجلاہٹ کا شکار ہونا بڑا فخر  
 رہا تھا۔  
 ”اے آج اپنے گاؤں جانا تھا اس لیے وہ جلد  
 گھر چلی گئی۔“ رفعت نے بتایا۔





”تو تم مجھے انعام کر دیتیں۔ کم از کم میرا وقت تو ضائع نہیں ہوتا۔“ احمد جس لہجے میں بات کر رہا تھا وہ اس کے مزاج کا حصہ قطعی نہیں تھا لیکن نورالحین کو نہ پا کر جو مایوسی ہوئی تھی وہ کسی نہ کسی صورت تو سامنے آئی ہی تھی۔

”میں بہت دیر سے آپ کے موبائل پر ٹرائی کر رہی تھی لیکن آپ کا موبائل آف تھا۔“ رفعت نے صفائی پیش کی تو اسے یاد آیا کہ کسی نئے جھنجھٹ میں پھنسنے سے بچنے کے لیے اس نے اپنا موبائل آف کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طے شدہ کاموں کے سوا اسے کچھ نام تک کسی اور مصروفیت کا شکار ہونا پڑے لیکن اب جیسے ساری بھاگ دوڑ اور جدوجہد بیکار چلی گئی تھی۔

”اچھا چلو، تم تو نیٹھو گاڑی میں تاکہ میں تمہیں گھر پر ڈراپ کر دوں۔“ اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے رفعت سے نرم لہجے میں کہا وہ بیچاری کوئی تصور نہ ہوتے ہوئے مجرم بنی کھڑی تھی۔ ”شکر ہے آپ کو خیال آ گیا ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ مجھے رکشایا چاہیے کہ خود ہی گھر جانا ہوگا۔“ رفعت نے برابر والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بھائی کو بتایا۔ ”سوری یار! بس غصے میں یاد ہی نہیں رہا کہ ساتھ لہجے کے لیے جانے کے چکر میں تم اپنی گاڑی تو لے کر ہی نہیں آئی ہو۔“ وہ قدرے شرمندہ ہو کر گاڑی اشارت کرنے لگا۔

”یہ تو بہت خطرناک پتویشن ہے بھائی! آپ کی طرف سے مستقبل کے لیے کچھ اچھے سنگلز نہیں مل رہے۔“ رفعت نے کہا۔

”اچھا، وہ کیسے؟“ احمد نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ جس کے نہ ہونے پر آپ کا یہ حال ہوا ہے وہ ہوگی تو کیا ہوگا۔ آپ تو اس کے سامنے ہمیں بالکل ہی بھلا دیں گے۔“ رفعت بولی۔ ”یہ تو فیکٹ ہے۔“ رفعت کی بات پردہ شرارت سے مسکرایا۔

”کیا.....؟ اس کا مطلب ہے میں ماما کے سامنے آپ کی فیور کرنا چھوڑ دوں۔ آپ کے تو ارادے ہی

تیک نہیں ہیں۔“ رفعت نے مصنوعی غلگی کا اظہار کیا۔ ”اب تمہاری فیور کی ضرورت رہی بھی نہیں۔ ڈیڈی ماما کے سامنے میرا مقدمہ جیت چکے ہیں۔“ احمد اسے مسلسل چھیڑ رہا تھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں، دوسری پارٹی تو میرے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے خلاف ایسے ایسے دلائل ہیں کہوں گی کہ وہ آپ کے لیے ”ہاں“ کہہ ہی نہیں سکے گی۔“ رفعت کی دھمکی بڑی زور دار تھی۔ احمد نے فوراً بائیں ہاتھ سے اپنا کان پکڑتے ہوئے اس سے معافی مانگی پھر دونوں بہن بھائی ہنس پڑے۔

”ایک بات پوچھوں بھائی؟“ رفعت نے دیکھا کہ اس کا موزی بھال ہو چکا ہے تو محتاط انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

”پوچھو.....“ راؤنڈ اباؤٹ سے گاڑی گھمانے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”آپ نے نورالحین سے شادی کا فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ تو لیا ہے نا؟ میرا مطلب ہے کہ کہیں بعد میں ایسا نہ ہو کہ آپ کو اپنا فیصلہ غلط لگنے لگے۔“ رفعت نے کہا۔

”تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟“ اس کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے احمد نے پوچھا۔

”بس..... مجھے لگتا ہے کہ نور اور ہماری فیملی کے ماحول میں بہت زیادہ ڈیفرینس ہے۔ وہ لوگ بہت زیادہ کنزرویٹو ہیں۔ اب آج کی مثال ہی دیکھ لیں۔ نورالحین نے کچھ برس ساتھ چلنے سے انکار کرنے کے بعد مجھے پروا میں کر دیا کہ اگر اسے گاؤں میں بھی جانا ہوتا تو وہ ہمیں جوائن نہیں کرتی کیونکہ اس کا ماحول اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تو میں سوچ رہی تھی کہ کہیں یہ ڈیفرینس وقت کے ساتھ ساتھ مزید بڑھتی ہی نہ جائیں۔“ رفعت نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”تم پریشان مت ہو میں نے یہ ساری باتیں سوچ لی ہیں اور میرا خیال ہے کہ اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ تھوڑا تھوڑا ہم دونوں کمپروماز کریں گے تو ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کر ہی لیں گے پھر

مجھے اپنی محبت کی طاقت پر بھی یقین ہے۔ میری محبت ہر مسئلے کو حل کر دے گی۔“ وہ بے حد پریقین تھا۔

”اور اگر خدا نخواستہ وہاں سے انکار ہو.....“ احمد کے چہرے کا رنگ اتنی تیزی سے بدلا کہ رفعت اپنا جملہ مکمل نہ کر پائی۔

”اس سبب سے دیکھا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں سوچا اور یہ تو ہرگز بھی نہیں سوچا کہ وہ میری نہیں ہو سکے گی۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ رفعت کا دل سہم سا گیا۔ اس نے پہلی بار اپنے بھائی کے انداز میں کسی بچہ کے لیے اتنی شدت دیکھی تھی۔

”اے اللہ! میرے بھائی کے دل کو آبدار کرنا۔“ اس نے چپکے سے دعا مانگی۔

\*\*\*

”ہم بلائیں تو پڑھائی کا بہانہ ہوتا ہے اور اپنی سہیلی کے لیے دیکھو کیسے بھیجی چلی آئی ہے۔“ وہ مطلب شاہ کے ساتھ حویلی چنپی تو زینت اور مہر نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”ٹھکو بے حد میں کر لیجے گا پہلے تو لیں۔“ وہ ہنسی ہوئی زینت آپا کے گلے لگ گئی تو وہ اسے خود سے چمٹا کر پیار کرنے لگیں۔

”تھوڑا سا پیار ہمارے لیے بھی بجا دیں آپا!“ مہر نے نوکا تو زینت نے اسے خود سے الگ کیا۔

”یہ چھوٹی ہے، اس لیے بالکل بچوں جیسی لگتی ہے۔“ زینت نے آنکھوں میں پیار سموتے ہوئے نورالحین کے چہرے کو دیکھا۔

”میں بھی آپ لوگوں کو بہت مس کرتی ہوں۔“ مہر کے گلے گلے لگی اس نے کہا۔

”بس رہنے دو یہ منہ دیکھ کے باتیں اگر یاد آتی ہوتی تو اتنے اتنے دن بعد اپنی شکل نہ دکھاتیں۔“ مہر نے اسے چھیڑا۔

”آپ جانتی ہیں چھوٹی آپا! میں آپ لوگوں سے اتنی دور کر لیے رہ رہی ہوں ورنہ مجھے بھی اچھا تو نہیں لگتا اپنے گھر اور اپنے لوگوں سے دور رہنا۔“ نورالحین نے سنجیدگی سے بہن کی بات کا جواب دیا۔

”دیکھی! ہم تو بس یونیورسٹی تھیں چھیڑ رہے ہیں ورنہ کیا ہم جانتے نہیں ہیں تمہیں۔“ زینت شاہ فوراً اس کی دلجوئی کو آگے بڑھیں۔

”اور کیا آیا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں بلکہ سچ پوچھو تو ہمیں تمہارے شہر جا کر پڑھنے کی اتنی خوشی ہے کہ اپنی زندگی کی محرومیاں بھی کم ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔“ مہر نے بھی زینت شاہ کا ساتھ دیا۔

”اماں! اور بابا جان سے مل چکی ہوتی؟“ نورالحین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھاتے ہوئے زینت شاہ نے موضوع گفتگو تبدیل کیا۔

”جی بس سلام دعا ہی ہوئی ہے۔ لالہ کو بابا جان سے کوئی ضروری بات چیت کرنی تھی اس لیے میں نے زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لالہ کو بابا جان سے ملاقات کے بعد آج ہی شہر واپس بھی جانا ہے۔“ اس نے ان کے سوال کا جواب دیا اور پھر پوچھنے لگی۔ ”آپ لوگوں کے بچے کہاں ہیں؟“

”ہمارے بیٹے صاحب تو اپنے باپ کے ساتھ شکار پر گئے ہوئے ہیں اس لیے تشریف نہیں لائے۔ مہر کی بچیوں کا یہ پڑھائی کا وقت ہے۔ استانی زبیدہ آئی ہوئی ہے انہیں پڑھانے۔“ جواب زینت شاہ نے دیا۔

”آپ کے صاحبزادے سارا وقت ان ہی کاموں میں لگے رہتے ہیں یا کچھ پڑھائی وغیرہ کی طرف بھی دھیان ہے ان کا؟“ نورالحین نے بہن سے دریافت کیا۔

”بس سمجھو اب پر کتنے ہی جا رہے ہیں۔ ایڈمیشن ہو گیا ہے کالونینٹ میں کلاسز شروع ہوتے ہی روانہ کر دیے جائیں گے۔ کتنی کے چند ہی دن رہ گئے ہیں اس لیے باپ نے کہا کہ چلو پچھوڑے دن عیاشی کر لے۔“ زینت شاہ نے اسے تسلی دی۔

”شکر ہے معظم بھائی کو اپنے بیٹے کی پڑھائی کا تو خیال ہے ورنہ ادنیٰ غیاث نے تو بچیوں کے ساتھ بے حد زیادتی کر رہی ہے۔ سرے سے انہیں اسکول ہی نہیں جانے دیتے۔“ نورالحین نے شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے بھائی کے رویے پر انفسوس کا بھی اظہار



کیا۔

”سارا فرق بنے اور بیٹی کا ہے اگر غفران کی جگہ معظم بھائی کی کوئی بیٹی ہوتی تو ان کا رویہ بھی غیاث جیسا ہی ہوتا یہ تو پھر لالہ کا احسان ہے کہ انہوں نے غیاث کو بچپوں کو گھر پر تعلیم دینے کے لیے ہی راضی کر لیا ورنہ تو اس کے بھی قائل نہیں تھے۔ لالہ کے احترام میں انہوں نے اتنی بات بھی مان لی۔ میں تو اسی پر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔“ میرے افسردگی سے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں چھوٹی آنا! آپ کی بیٹیاں انشا اللہ بہت اچھی تعلیم حاصل کریں گی۔ لالہ کوشوں میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ نے چاہا تو ایک دن کامیاب بھی ہو جائیں گے پھر دیکھیے گا اس گاؤں کے لوگوں خصوصاً عورتوں کی تقدیر کیسے بدلتی ہے۔“ نورالحین نے بہن کو دلاسا دیا۔

”ہاں، بتایا تو تھا لالہ نے کچھ۔ اب دیکھو بابا جان ان کی بات مانتے ہیں یا نہیں۔“ مہر کچھ بے یقین سی تھی۔

”انشا اللہ مان جائیں گے آخر میری تعلیم کے لیے بھی لالہ نے انہیں راضی کر ہی لیا تھا۔“ نورالحین پر غم تھی۔

”یہ راضی نامہ کتنی کڑی شرط پر ہوا تھا۔ شاید تم بھول گئیں۔“ مہر کے لہجے میں کئی ابھری۔

”میں کیسے بھول سکتی ہوں بھلا؟“ نورالحین کا لہجہ دھیمہ ہو گیا۔

”آخر تم دونوں کس حوالے سے گفتگو کر رہی ہو؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔“ بڑے صبر سے ان کی باتیں سنتی زینت شاہ کوئی سراہا تھ نہ آنے پر بالآخر جھنجھلا کر پوچھ بیٹھیں۔

”لالہ نے گاؤں میں تعلیم، صحت اور روزگار کے معاملات کو بہتر بنانے کے لیے کچھ منصوبہ بندی کی ہے۔ گورنمنٹ کے کئی افسران ان کے اس منصوبے سے متفق ہیں لیکن کیونکہ علاقہ بابا جان کا ہے اس لیے ان کی اجازت کے بغیر کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔ لالہ آج کل بابا جان کو اسی سلسلے میں قائل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔“

نورالحین نے مختصر انہیں بتایا۔

”خیال تو اچھا ہے لیکن مشکل ہی ہے کہ بابا جان اس پر راضی ہوں بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے چاہا سائیں، معظم اور غیاث کو بھی اس پر اعتراض ہوگا۔“ زینت شاہ نے تشویش کا اظہار کیا۔

”آپ فکر مت کریں معظم بھائی اور ادا غیاث سے تو لالہ نے بالا ہی بالا کچھ بات چیت اور معاہدے کر لیے ہیں۔ اصل معاملہ بابا جان اور چاچا سائیں کا ہے اس کے لیے لالہ بھی بہت ترامد ہیں کہ اللہ نے چاہا تو کامیابی انہی کی ہوگی۔“ نورالحین مطمئن تھی۔

”اگر یہ بات ہے تو ہمیں تو خوشی ہی ہوگی۔“ زینت شاہ نے کہا۔

”آپ سچ کہہ رہی ہیں آپا! شاید اسی طرح خوشی ہمارا نصیب بن جائے ورنہ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ ہمارے زیر دست رہنے والے تمام مظلوموں کی آپیں سیدھی ہم سیدزادیوں کو ہی آکر لگتی ہیں جو خوشی ہمارا نصیب ہی نہیں بن پاتی۔“ مہر آج کل کرب کے جس دورے گزر رہی تھی اس کے لہجے کی آزدگی اسی کی دین تھی۔ زینت شاہ اور نورالحین اس آزدگی کو محسوس کر کے اپنی اپنی جگہ چپ سی بیٹھی رہ گئیں۔

\*\*\*

”تم یہ کن معاملات میں الجھے ہوئے ہو مطیب شاہ! ہماری مرضی اور اجازت کے بغیر تم خود سے اتنے اہم فیصلے کیسے کر سکتے ہو؟“ کاغذات کا پلندا ایک طرف رکھتے ہوئے قائم شاہ نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں بابا جان! میں آپ کی مرضی کے بغیر کچھ کرنے کی گستاخی کر ہی نہیں سکتا۔ آپ اگر میری بات ٹھنڈے دل سے سنیں تو آپ کو میرا ہر عمل درست محسوس ہوگا۔“ وہ نہایت نرمی سے ان کے ساتھ مخاطب تھا کیونکہ آج اس نے اپنا مقدمہ ہر حال میں ان سے جیت کر جانا تھا۔

”کیا سنوں میں تم سے.....؟ یہی کہ تم میرے مزار سے اٹھا کر اسکولوں، کالجوں میں بھر دو گے۔ وہ لوگ جو آج جھک جھک کر ہمیں سلام کرتے ہیں کل



نظر میں ملا کر ہم سے بات کریں گے، عورتیں بے حجاب ہو جائیں گی۔“ وہ اپنی ناراضی کا بھرپور اظہار کر رہے تھے۔

”ایسا کچھ نہیں ہو گا آپ میرا یقین کریں۔“ مطیب شاہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن پھر اندر داخل ہوتے سید امیر شاہ کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔

”السلام علیکم چاچا سائیں۔“ وہ احتراماً اپنی جگہ سے اٹھا۔

”علیکم السلام! کیا حال چال ہیں پتر؟ تو، تو بالکل شہر کا ہی ہو کر رہ گیا ہے کبھی آ کر گاؤں میں زمینوں کا حساب کتاب بھی دیکھا کر۔“ امیر شاہ نے بیٹے سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ بڑے بھائی کے چہرے کے بگڑے زاویوں کا بھی جائزہ لیا۔

”آپ کا پیغام ملتے ہی سیدھا آ رہا ہوں۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ مطیب شاہ بھی آیا ہوا ہے۔ سب خیر تو ہے نا ادا سائیں۔“ بالا خرا انہوں نے بھائی سے پوچھ ہی لیا۔

”ہم کیا کہیں، تم اپنے بیٹے سے ہی سونو بلکہ پہلے یہ سب دیکھ لو۔“ سید قائم شاہ نے کاغذات امیر شاہ کی طرف بڑھائے۔ امیر شاہ کے کاغذات کا جائزہ لینے تک کمرے میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔ وہاں اگر کوئی آواز تھی تو صرف کاغذات کے اٹلے جانے کی ہلکی سی آواز۔

”یہ سب کیا ہے پتر؟“ بالا خرا امیر شاہ نے کاغذات سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ بدلتے ہوئے وقت کا تقاضا ہے چاچا سائیں!“ وہ جواب کے لیے تیار تھا۔

”مطلب.....؟“ امیر شاہ نے حیرت سے دریافت کیا۔

”مطلب یہ کہ اب حالات جس تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں آپ لوگوں کو بھی اپنی حکمت عملی تبدیل کرنی پڑے گی۔ آئندہ سالوں میں مریدوں اور مزارعوں کو طاقت اور عقیدت کے ٹل پوتے پر دبا کر رکھنے والی سیاست نہیں چلے گی۔ گھر، گھر کی دی بیچ رہا ہے۔“

”تو کیا ہم خود ساری سہولیات مہیا کر کے ان لوگوں کو اپنے سروں پر چڑھا لیں۔ وہ وقت جو آج سے بیس پچیس سال بعد آتا ہے۔ آئندہ دو تین سال میں لے آئیں؟“ وہ سانس لینے کو ذرا سار کا تو سید امیر شاہ نے تند سے پوچھا۔

”نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ آنے والے وقت کے لیے نئی حکمت عملی تیار کر لیں۔ آپ لوگوں کے مطالبہ کرنے اور بغاوت کرنے سے پہلے ہر سہولت ان کو مہیا کر دیں تاکہ وہ آپ کے احسان مند ہوں۔ ظلم اور جبر کے بوجھ تلے دبنا بندہ احتجاج کر سکتا ہے۔ احسان تلے دبا ہرگز نہیں جو احسان مند ہو گا وہ آپ کی کوشش کے بغیر خود بخود ہی آپ کے آگے جھکتا چلا جائے گا۔“ وہ ان کے کمر و پہلوؤں سے خوب اچھی طرح واقف تھا سو اسی سمت سے حملہ کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

”بات کچھ، کچھ سمجھ تو آ رہی ہے لیکن اگر نتیجہ اس کے خلاف نکلا تو.....؟“ امیر شاہ زیادہ ہی اس کی باتوں کے زیر اثر آ چکے تھے۔

”آپ مجھ سے کھو لیں، نتیجہ اچھا ہی نکلے گا پھر آپ حکومت کے طرز عمل کی طرف بھی توجہ دیکھیں۔ بڑے بڑے سرداروں کو وہ لوگ خاطر میں نہیں لا رہے اپنے قبیلوں پر راج کرنے والے اور حکومتوں کو اپنی مرضی سے چلانے والے آج کل تنقید کا شکار ہیں اور آپ دیکھ لیں جب بھی ان کے خلاف فرد جرم سنائی جاتی ہے اس میں سب سے اوپر یہی الزامات ہوتے ہیں کہ یہ لوگ

اپنے زیر نگین افراد کو تعلیم، صحت اور روزگار کے مواقع فراہم نہیں کرتے۔ آپ دیکھیے گا انہی الزامات کو بنیاد بنا کر ایک دن بڑے بڑے طوفان اٹھائے جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں وہ طوفان آنے سے پہلے آپ اپنی تیاری کر لیں تاکہ اپنی جڑوں پر کھڑے رہ سکیں ورنہ قصہ پارینہ بننے میں تو بادشاہوں کو بھی دیر نہیں لگتی۔“ وہ بہت بڑبڑاتا تھا۔

”تم ہمیں بے وقوف بنا کر اپنی بات بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو مطیب شاہ؟“ قائم شاہ اب بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔

”میں ایسی جرات کیسے کر سکتا ہوں بابا جان! میں تو صرف آپ کو تھاقتا تھا رہا ہوں بلکہ اگر آپ میری کئی بات پر عمل کرتے ہیں تو دیکھیے گا آپ کی حکومت سے قربت کیسے بڑھتی ہے بلکہ ہم تو اپنے گاؤں میں آنے والی تبدیلیوں کو مثال بنا کر کرنی وی چیلو پر دکھائیں گے پھر دیکھیے گا آپ کی شہرت اور مقبولیت میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔ وہ جو ڈیرے سرحد میں ہے چاچا سائیں کی ایکشن میں کھینچا تائی چلتی ہے اور کبھی وہ بھی چاچا سائیں کا مایاب ہوتے ہیں تو یہ مسئلہ بھی ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔“ وہ ہر طرف سے انہیں سبز باغات دکھا کر لپکا رہا تھا۔

”دیکھ بھی مطیب شاہ! امیر اور ادا سائیں کا وقت تو بس اب سمجھ کہ ختم پری ہے آگے تو اور سجاد شاہ ہیں اس زمین جائیداد کے وارث بڑا ہونے کی وجہ سے گلدی نشین تو ہی ہو گا یعنی ایک طرح سے جو تو آج بڑا ہے وہ کل تو نے ہی کاٹا ہو گا۔ اس لیے جو بھی کرنا سوچ کر کر۔“ سید امیر شاہ نے ایک طرح سے اپنی رضامندی کا عندیہ دیا۔

”آپ فکر نہ کریں چاچا سائیں! میں نے سب کچھ بہت اچھی طرح سوچ لیا ہے۔“ وہ اتنی آسانی سے ان کے قائل ہو جانے پر دل ہی دل میں خوش ہوتا مؤدبانہ بولا اور پھر سید قائم شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ کا کیا فیصلہ ہے بابا جان؟“

”امیر شاہ کی بات ٹھیک ہے کہ تمہیں ہی ایک دن

یہ سب کچھ دیکھنا ہے لیکن اصل بات تو یہی ہے کہ تم واپس گاؤں آؤ اور یہ سب سنبھالو۔“ نیم دلی سے رضامندی دیتے ہوئے انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا۔

”اس کی آپ فکر ہی نہیں کریں۔ آئندہ ڈھائی تین سال میں جب تک یہ منصوبے مکمل ہوں گے میں بھی گاؤں لوٹ آؤں گا۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔ ویسے اب تک کی گفتگو میں یہی بات سب سے زیادہ عجیب تھی کہ وہ گاؤں واپس لوٹنے کا ارادہ پورے خلوص دل سے رکھتا تھا۔ باقی چاچا سائیں اور بابا جان کو راضی کرنے کے لیے اس نے جتنے بھی دلائل دیے تھے وہ چاہے حقیقت سے جتنے بھی قریب ہوں اس کی اپنی نیت میں ایسا کوئی کھوٹ نہیں تھا کہ وہ گاؤں والوں کو اپنے احسانات تلے دبا کر ان پر حکمرانی کی خواہش رکھتا ہو۔ یہ سب تو بابا جان اور چاچا سائیں جیسی ذہنی اور دلچ رکھنے والوں کو ان کے طریقے سے راضی کرنے کی ایک ترکیب تھی جو قسمت سے کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

\*\*\*

”اگر تم نہیں آتیں تو میں خت خفا ہو جاتی تم سے۔“ صغریٰ نے نورالحین کے گلے لگتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”کیسے نہیں آتی میں؟ تمہاری شادی کی سب سے زیادہ خوشی تو مجھ ہی کو ہے۔“ نورالحین نے صغریٰ کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے اس کا مان رکھا۔ زرد گونا گے دوپٹے میں سانولی سلونی صغریٰ کی چھب ہی آج نرالی لگ رہی تھی۔ خوشی کے رنگوں نے اس کے چہرے کو جگمگا ڈالا تھا۔

وہ آخر خوش کیوں نہ ہوتی عزیز احمد جو اس کا سگا ماموں زاد تھا جس کے ساتھ بچپن سے اس کی نسبت طے تھی، ہمیشہ کے لیے اسے ملنے والا تھا۔ نوکر بے ساختہ ہی اپنے نکاح کا دن یاد آیا۔ کیا تھا اس دن اس کے دل میں سوائے درد کے اور وہ جانتی تھی کہ اس درد نے اس کے چہرے پر کوئی روپ نہ آنے دیا ہو گا۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ صغریٰ نے اپنے چہرے پر



مکی اس کی نظروں کا سکوت محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔  
”یہی کہ تم نے یہ اتنی دھیر ساری خوبصورتی کہاں  
سے چرائی۔“ صغریٰ کی ٹھوڑی کو اپنے دائیں ہاتھ سے  
تھامتے وہ مسکرا کر بولی۔ صغریٰ کے چہرے پر بھی ایک  
شرمیلی سی مسکراہٹ چھا گئی۔

”اے صغریٰ! بی بی کو بھانپتی کیوں نہیں۔ تیری  
مت بالکل ہی ماری گئی ہے کیا؟“ صغریٰ کی ماں اس کی  
دونوں بہنوں کے ساتھ ہاتھوں میں خاطر مدارت کے  
لوازمات اٹھائے اندر داخل ہوئی تو نور کو ابھی تک کھڑا  
دیکھ کر صغریٰ پر بگڑنے لگی۔

”ارے خالہ، جانے دیں۔ اب تو یہ بچاری اس  
گھر سے رخصت ہونے والی ہے کیا جاتے جاتے بھی  
اسے ڈانٹ رہی ہیں۔“ صغریٰ کا ہاتھ تھام کر وہ اس کے  
ساتھ ہی اس کے چنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”لڑکی ذات ہے بی بی، رنگ ڈھنگ سدھار کر  
ہی سسرال روانہ کر دو تو ٹھیک ہے ورنہ وہاں اس نے  
میری ناک کٹوا دینی ہے۔“ اپنی دونوں چھوٹی بیٹیوں  
کے ساتھ مل کر کھانے پینے کی اشیاء لکڑی کی ایک میز پر  
رکھتے اس نے نور العین کو جواب دیا۔

”آپ فکر نہیں کریں خالہ، ہماری صغریٰ بہت  
سمجھدار اور نیک دل لڑکی ہے دیکھیے گا دونوں میں سب  
کے دل اپنی محبت میں کمرے کی پھردیسے بھی یہی کون سا کسی  
غیر کے گھر جانے والی ہے۔ آپ کے اپنے سنگ بھائی کا  
گھر ہے۔“ جنھیں جیسے وہ آپ کا میکا ہے ویسے ہی صغریٰ  
کا بھی۔ ”نور العین نے صغریٰ کی ماں کو تسلی دی۔

”یہی تو نہیں ہوتا اس دنیا میں۔ سنگے مامے،  
چاچے کا گھر بھی بیٹی بیٹے کے بعد غیر ہو جاتا ہے لیکن  
خیر لڑکیاں بالیاں کہاں جیتی ہیں ان باتوں کو۔ آپ یہ  
لڈو کھائیں۔“ صغریٰ کی ماں نے بات کا رخ ہی بدل  
دیا۔

”بہت مزے کا ہے خالہ، یقیناً آپ نے خود ہی  
بنائے ہیں۔“ تھوڑا سا لڈو توڑ کر منہ میں رکھتے ہی  
نور العین نے انہیں سراہا۔

”مہربانی بی بی، آپ کو اچھا لگا ورنہ وہی عام سے

لڈو ہیں جو اتنے برس سے ہر خاص موقع پر بناتی ہوں۔  
صغریٰ کا ابا تو کہتا ہے، انوری، تجھے کچھ اور بنانا ہی نہیں  
آتا اس لیے جب دیکھو یہ لڈو بنا کر ہمارے آگے رکھ  
دیتی ہے۔“ انوری نے سادگی سے کہا۔

”ہائے نہیں خالہ، یہ تو بچ بچ بہت مزے کے  
ہوتے ہیں۔ میں تو صغریٰ سے ہمیشہ فرمائش کر کے آپ  
کے ہاتھ کے بنے یہ لڈو منگواتی تھی۔“ نور العین کی  
پسندیدگی انوری کا خون بڑھا رہی تھی۔ ایسے میں اسے  
چھوٹی بیٹی کا بار بار شانہ بھلا کر اپنی طرف متوجہ کرنا بہت برا  
لگا سو جھڑک کر پوچھنے لگی۔

”کیا مصیبت ٹوٹ پڑی ہے تجھ پر جو میرا موٹہ حاکم  
الگ کرنے پر تلی ہے؟“

”اماں! میری ساری سہیلیاں انتظار میں بیٹھی  
ہیں۔“ وہ بسوری۔

”ہاں تو بولی دے ان سے تھوڑا انتظار کر لیں۔  
ابھی تو بی بی آ کر بیٹھی ہیں۔ آتے ہی کیا تیری بے خبری  
سہیلیوں کے راگ سنا کر ان کے کانوں میں درد کروا  
دوں۔“ انور نے بیٹی کو گھر کا۔

”خیریت، کیا مسئلہ ہے؟“ نور العین نے صورت  
حال کو کچھ، کچھ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”بس بی بی! دماغ خراب کر رکھا ہے ان دونوں  
کی سہیلیوں نے، روزانہ شام سے آ کر ڈیرا ڈال لیتی  
ہیں گانے بجانے کے لیے۔“ انوری نے جواب دیا۔

”تو آپ آج منع کیوں کر رہی ہیں۔ گانے دینا  
انہیں میں بھی تھوڑی دیر سن لوں گی۔“ نور العین نے  
فرمائش کی تو صغریٰ کی دونوں بہنوں کے چہرے پر رونق  
دور گئی۔

”جواب بلا لے اپنی سکھیوں کو۔ بغیر گانے تو ان  
کا کھانا ہضم نہ ہوگا۔“ انوری نے بیٹی سے کہا تو وہ تیزی  
سے کمرے سے باہر نکلی ذرا ہی دیر میں کئی لڑکیاں شرمیلی  
لجائی اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔

”سلام بی بی!“ ایک، ایک کر کے نور العین کو  
سلام کرتے ہوئے انہوں نے فرش پر پچھی در پی پر بیٹھنا  
شروع کر دیا۔

”اب کچھ سنا بھی دو بی بی انتظار کر رہی ہیں۔“  
لڑکیاں کسر پھسر کرتی آپس میں صراخ مشورہ کرنے میں  
مصرف تھیں انوری سے صبر نہ ہوا تو فوراً ہی انہیں ٹوک  
بیٹھی۔ لڑکیوں کے درمیان بھی شاید اس عرصے میں  
معاملہ طے ہو گیا تھا۔ درمیان میں بیٹھی لڑکی نے ڈھولک  
پر تھاپ لگائی اور نغما ”ہولال میری پت رکھو“ کی آواز  
سے گونجنے لگی۔ ڈھولک کی تھاپ اور ایک درم سے جیتی  
تالیوں نے سماں سا پابندہ دیا تھا نور العین ٹھوڑی کے  
تھپے پائیں ہاتھ کی مٹھی ٹکائے اشتیاق سے انہیں گاتا  
رکھنے لگی۔ حویلی میں کسی تقریب کے موقع پر اس قسم کی  
روٹی اور گھما گھمی کبھی نہیں لگتی تھی اور گاؤں کے عام  
گھروں میں ہونے والی تقریبات میں وہ لوگ شرکت  
نہیں کرتے تھے۔ کسی خاص ملازم کو عزت بخشتی بھی ہوتی  
تو کھڑے کھڑے سرسری طور پر اس کے گھر کی تقریب  
میں چکر لگایا جاتا ایسے میں نور العین کو زندگی کے یہ رنگ  
کہاں دکھائی دے سکتے تھے۔ صغریٰ کی شادی میں  
شرکت تو اس کی صغریٰ سے قربت اور بیٹھی جی کی خدمات  
کے صلے میں ملنے والی خصوصی رعایت تھی۔ آج نایوں  
میں بھی اماں نے اسے پابند کر کے بھیجا تھا کہ وہ ایک  
ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جائے گی۔ اماں کی خصوصی  
ملازمہ رحمت اس کے ساتھ یہاں آئی تھی اور باہر اس کی  
منتظر بیٹھی تھی۔

”بی بی! حویلی سے گاڑی آ گئی ہے۔“ نور العین  
کو رحمت کے آ کر اطلاع دینے پر وقت گزرنے کا  
احساس ہوا، دل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ حویلی واپس  
جانے کے لیے کھڑی ہوئی۔

”ابھی سے جاری ہوا بھی تو اماں کے گھر والے بھی  
نہیں آئے۔“ صغریٰ نے اسے اٹھتے دیکھ کر احتجاج کیا۔  
”جہمیں میری مجبوری کا معلوم تو ہے صغریٰ،“  
نور العین نے بے بسی سے کہا ورنہ خود اس کی بھی خواہش  
تھی کہ صغریٰ کی رسم میں شرکت کرنی۔

”پھر کب آؤ گی؟“ صغریٰ نے اس کا مسئلہ سمجھتے  
ہوئے دھیرے سے پوچھا۔  
”انشاء اللہ کل جیسے ہی موقع ملے گا چکر لگاؤں گی۔“

”اب کچھ سنا بھی دو بی بی انتظار کر رہی ہیں۔“  
لڑکیاں کسر پھسر کرتی آپس میں صراخ مشورہ کرنے میں  
مصرف تھیں انوری سے صبر نہ ہوا تو فوراً ہی انہیں ٹوک  
بیٹھی۔ لڑکیوں کے درمیان بھی شاید اس عرصے میں  
معاملہ طے ہو گیا تھا۔ درمیان میں بیٹھی لڑکی نے ڈھولک  
پر تھاپ لگائی اور نغما ”ہولال میری پت رکھو“ کی آواز  
سے گونجنے لگی۔ ڈھولک کی تھاپ اور ایک درم سے جیتی  
تالیوں نے سماں سا پابندہ دیا تھا نور العین ٹھوڑی کے  
تھپے پائیں ہاتھ کی مٹھی ٹکائے اشتیاق سے انہیں گاتا  
رکھنے لگی۔ حویلی میں کسی تقریب کے موقع پر اس قسم کی  
روٹی اور گھما گھمی کبھی نہیں لگتی تھی اور گاؤں کے عام  
گھروں میں ہونے والی تقریبات میں وہ لوگ شرکت  
نہیں کرتے تھے۔ کسی خاص ملازم کو عزت بخشتی بھی ہوتی  
تو کھڑے کھڑے سرسری طور پر اس کے گھر کی تقریب  
میں چکر لگایا جاتا ایسے میں نور العین کو زندگی کے یہ رنگ  
کہاں دکھائی دے سکتے تھے۔ صغریٰ کی شادی میں  
شرکت تو اس کی صغریٰ سے قربت اور بیٹھی جی کی خدمات  
کے صلے میں ملنے والی خصوصی رعایت تھی۔ آج نایوں  
میں بھی اماں نے اسے پابند کر کے بھیجا تھا کہ وہ ایک  
ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جائے گی۔ اماں کی خصوصی  
ملازمہ رحمت اس کے ساتھ یہاں آئی تھی اور باہر اس کی  
منتظر بیٹھی تھی۔

”بی بی! حویلی سے گاڑی آ گئی ہے۔“ نور العین  
کو رحمت کے آ کر اطلاع دینے پر وقت گزرنے کا  
احساس ہوا، دل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ حویلی واپس  
جانے کے لیے کھڑی ہوئی۔

”اب کچھ سنا بھی دو بی بی انتظار کر رہی ہیں۔“  
لڑکیاں کسر پھسر کرتی آپس میں صراخ مشورہ کرنے میں  
مصرف تھیں انوری سے صبر نہ ہوا تو فوراً ہی انہیں ٹوک  
بیٹھی۔ لڑکیوں کے درمیان بھی شاید اس عرصے میں  
معاملہ طے ہو گیا تھا۔ درمیان میں بیٹھی لڑکی نے ڈھولک  
پر تھاپ لگائی اور نغما ”ہولال میری پت رکھو“ کی آواز  
سے گونجنے لگی۔ ڈھولک کی تھاپ اور ایک درم سے جیتی  
تالیوں نے سماں سا پابندہ دیا تھا نور العین ٹھوڑی کے  
تھپے پائیں ہاتھ کی مٹھی ٹکائے اشتیاق سے انہیں گاتا  
رکھنے لگی۔ حویلی میں کسی تقریب کے موقع پر اس قسم کی  
روٹی اور گھما گھمی کبھی نہیں لگتی تھی اور گاؤں کے عام  
گھروں میں ہونے والی تقریبات میں وہ لوگ شرکت  
نہیں کرتے تھے۔ کسی خاص ملازم کو عزت بخشتی بھی ہوتی  
تو کھڑے کھڑے سرسری طور پر اس کے گھر کی تقریب  
میں چکر لگایا جاتا ایسے میں نور العین کو زندگی کے یہ رنگ  
کہاں دکھائی دے سکتے تھے۔ صغریٰ کی شادی میں  
شرکت تو اس کی صغریٰ سے قربت اور بیٹھی جی کی خدمات  
کے صلے میں ملنے والی خصوصی رعایت تھی۔ آج نایوں  
میں بھی اماں نے اسے پابند کر کے بھیجا تھا کہ وہ ایک  
ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جائے گی۔ اماں کی خصوصی  
ملازمہ رحمت اس کے ساتھ یہاں آئی تھی اور باہر اس کی  
منتظر بیٹھی تھی۔

”جھپٹی بی بی اتنا پوچھتی ہیں صغریٰ اب آ جاو جی تو  
ان کی گاؤں کی کسی اور لڑکی سے دوستی نہیں۔“ در پی  
بیٹھی لڑکیوں میں سے ایک نے رنگ و حسد سے ملے  
جذبات کے ساتھ اپنے برابر بیٹھی لڑکی سے سرگوشی کی۔  
صغریٰ ان کی سرگوشیوں سے بے خبر نور کے آنے کی خوشی  
اور مستقبل کے روپیلے خوابوں کے سحر میں کھوئی ہوئی  
تھی۔

”سنا ہے جان اور نینسی شادی کرنے والے  
ہیں۔“ رابعہ کی زبان سے نکلے اس جملے نے اسے ایک  
جھٹکے سے اپنا ہتھکا ہوا سر اٹھانے پر مجبور کیا۔ وہ پچھلے پانچ  
منٹ سے اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن مطیب  
شاہ اس کی موجودگی کو محسوس کر لینے کے باوجود بھی اس  
سے لائق سا بیٹھا ہوا تھا مگر اب اس کی سماعتوں میں جو  
کچھ اتر اٹھا وہ اپنی لائق کی ہرگز بھی قائم نہیں رکھ سکتا  
تھا۔

”جہمیں شاید میری بات کا یقین نہیں آیا؟“ اپنی  
بات کا رد عمل مطیب شاہ کے چہرے پر دیکھ کر وہ طعنے  
مسکرائی لیکن مطیب اسے کوئی بھی جواب دینے کی  
پوزیشن میں نہیں تھا۔

”میں نے تو جہمیں بہت پہلے ہی خبردار کر دیا تھا  
لیکن اس وقت تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔“ رابعہ  
نے ہمدردی کی آڑ میں ایک اور طعنے کا تیرہ برسا یا لیکن وہ  
اب بھی اسے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ وہ کہے اسے  
بتاتا کہ وہ بات جس کا یقین وہ اسے دلانے کی کوشش کر  
رہی ہے وہ خود اپنے آپ کو باور نہیں کروا پا رہا حالانکہ  
نینسی نے کتنا صاف کہا تھا۔

”میں تمہارے ساتھ ایک گھر بنانے کا خواب



دیکھتے گئی تھی شاہ! لیکن اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ میں تمہاری حقیقت سمجھ چکی ہوں۔ میں جان گئی ہوں کہ میرا انتخاب غلط تھا۔“

اور مطیب شاہ! اس مقام تک لا کر چھوڑے جانے کا شکوہ بھی نہیں کر سکا تھا۔ ”غلط انتخاب“ اپنے لیے یہ الفاظ سننا کتنا تکلیف دہ تجربہ تھا۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ نینسی نے تو بہت آرام سے اسے ”غلط انتخاب“ قرار دے کر اپنے خوابوں سے دامن جھٹک لیا تھا لیکن وہ اپنے خوابوں کی کرجیاں سمیٹے سمیٹے ہلکان ہو گیا تھا۔

”کیوں اس بے وفا کے لیے خود کو جلاتے ہو۔ میری طرف دیکھو، میں کب سے تمہاری منظر ہوں۔ میرے بن جاؤ شاہ! میں تمہارا ہر غم بھلا دوں گی۔“ رابعہ نے جذبات سے منجور لہجے میں کہتے ہوئے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا یا لیکن مطیب شاہ کو جیسے کرنت نے چھو لیا۔ رابعہ نے بتا نہیں دانت یا نادانت آج نینسی کی مخصوص خوشبو لگائی ہوئی تھی لیکن مطیب شاہ جانتا تھا کہ وہ نینسی نہیں رابعہ ہے اس لیے بدک کر کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے چلتا پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ فی الحال نینسی کی ذات سے جڑی کسی بھی شے کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہا تھا۔ نینسی جان سے شادی کرنے والی ہے اس خبر پر اس کا کیا رد عمل ہونا چاہیے وہ نہیں جانتا تھا اس وقت اسے صرف ایک بات سمجھ آ رہی تھی اور وہ یہ کہ وہ خود کو اس طرح سے آکسولیٹ کر لے کہ اس تک نینسی کی کوئی خبر نہ آ سکے۔ زبان سے خواہش ادا ہونے سے پہلے ہر شے پالینے والا مطیب شاہ کو خود اپنی ذات کے رنجیک ہونے کا احساس زخم زخم کر رہا تھا۔

\*\*\*

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مزید تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلا جاؤں۔“ عمر احسان نے نیپل کی چکنی سطح پر نظریں ڈکائے مطیب شاہ کو بتایا۔

”ویری گڈ۔ یہ تو بہت اچھا فیصلہ ہے، لیکن یہ سوچ کر جانا کہ تمہیں واپس ہمیں آنا ہے۔ تم جیسے شخص کو کھونا نہ میں انورڈ کر سکتا ہوں اور نہ ہمارا ملک۔“ مطیب شاہ

نے اسے سر ہانپنے کے ساتھ آئندہ کے لیے پابند بھی کیا۔ ”مجھ میں کیا ہے مطیب بھائی! میں تو بہت عام سا شخص ہوں۔ میرے جیسے بتا نہیں سکتے ہوں گے اس ملک میں۔“ وہ کچھ آرزو سا لگ رہا تھا۔

”تم کیا ہو عمر! تمہیں نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے دنیا میں تم جیسے بہت لوگ ہوں لیکن میرے لیے ان میں سے کوئی بھی تم جیسا نہیں ہو سکتا تم سے چودل کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ لیکن تم نے میری زندگی کو انجانے میں ہی ایک بالکل نیا رخ دیا ہے میں جب تم سے ملا تھا تو اندر سے بہت ٹوٹا پھوٹا اور کمزور تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سکون کیسے ملتا ہے لیکن تمہارے ساتھ نے مجھے سکون کا راستہ دکھایا۔ میں نے جانا کہ مقصد زندگی کیا ہے۔ میرے اندر اچھائی تھی لیکن اس اچھائی کو صحیح رہنمائی کہاں سے ملنی ہے میں نے تم سے سیکھا۔ میں تمہیں دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ تم اتنی کم عمری میں اتنے منظم اور سمجھدار کیسے ہو لیکن پھر جب تمہیں فالو کرتے ہوئے میں خود قرآن کی طرف متوجہ ہوا تو میرے لیے زندگی کی راہیں روشن ہوتی چلی گئیں۔ میں نے اپنی اور اپنے بزرگوں کی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کے لیے کچھ پلانز بنائے۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کی زندگی کی مشکلات دور کر کے اپنی آخرت کو آسان بنانے کی راہ ڈھونڈوں لیکن اس سارے عمل میں تم میرے ساتھ، میرے شانہ بشانہ نہیں ہو گے۔ یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا۔“ مطیب شاہ نے کہا۔

”سوچا تو میں نے بھی کبھی نہیں تھا کہ ابایوں مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے لیکن دیکھیں وہ چلے گئے۔ واپس لوٹنے کا کوئی وعدہ کیے بغیر۔“ عمر احسان کی آنکھوں میں پانی چمکنے لگا تھا۔ مطیب شاہ اس کی حالت پر کڑھ کر رہ گئے۔ عمر احسان جیسا شخص خود کو دنیا کی اتنی بڑی سچائی باور نہیں کروایا ہے گا، وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

”تم جس کیفیت کا شکار ہو اس میں تمہیں میری کوئی بھی بات سمجھ نہیں آئے گی۔ اس لیے بس اتنا کہو گا کہ باہر جا کر پڑھنے کا جو فیصلہ کیا ہے اسے حصول علم کے لیے خالص کر دو کیونکہ فرار مسائل کا حل نہیں اور دکھ تو بالکل ایسی چیز نہیں جس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش



کی جائے۔ یہ تو دل میں بس کر دل کو متور کرنے والا جذبہ ہے۔ وہ دل جس کو دکھ کا اندھن جلانے کے لیے میسر آ جائے بڑا احمول ہوتا ہے کیونکہ وہ دل خود جل کر دوسروں کی راہیں روشن کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ مجھے یقین ہے تم بھی ایک دن اپنے فرار میں ناکام ہو کر واپس یہاں لوٹنے کا سوچو گے اور جب ایسا سوچنے لگو تو پلٹنے میں دیر نہیں کرنا کم از کم یہ سوچ کر ضرور کہ ایک شخص بہت شدت سے تمہارے لوٹنے کا منتظر ہے۔“ مطہب شاہ نے چند جملوں میں پوری حکایت دل سنا ڈالی تھی۔ عمر احسان نے محسوس کیا کہ مطہب شاہ نے اس کے دل کو کسی ان دیکھی ڈور سے باندھ کر اپنا پابند کر لیا ہے۔

\*\*\*

”ارے حبیب! آؤ بھئی بڑے دن بعد چکر لگایا۔“ اس وقت ڈاننگ ٹیبل پر گھر کے تمام ہی افراد موجود تھے کچہر انگلی میں کی رنگ گٹھائی وہاں چلی آئی۔ سب سے پہلے رفعت کی نگاہ اس پر پڑی تو اس نے خوشدلی سے اس کا استقبال کرتے اپنے برابر رکھی خالی کرسی کھسکا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”آئی تو پھر بھی میں ہی ہوں۔ تم میں سے تو کسی کو زحمت نہیں ہوئی کہ پلٹ کر میری خیریت ہی پوچھ لو۔“ جب نہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے شکوہ کیا۔

”یہ تو واقعی زیادتی کی بات ہے۔ تم لوگوں کو بچی کا اتنا خیال تو کرنا چاہیے۔“ معیز احمد نے اس کی طرف اداری کی۔

”سوری یار! آج کل مصروفیت ہی اتنی ہے۔“ شاچک، ٹیلر کے چکر بس اسی میں سارا دن گزر جاتا ہے۔ یہ رفعت کی چچی تو اپنی میڈیکل کی پڑھائی کو بہانہ بنا کر ایک طرف ہو جاتی ہے اسکیلے مجھے ہی سب کچھ فیس کرنا پڑتا ہے۔“ مدحت نے وجہ بیان کرتے ہوئے معذرت کی۔

”تم ان کی باتوں میں مت آؤ حبیب! مصروفیت کا تو بہانہ ہے ورنہ آج کل انہیں تم تو کیا ہم بھی یاد نہیں۔ دیکھ نہیں رہی ہو کیسی چمک رہی ہیں۔“ رفعت نے بہن کی توجہ کھینچ کر توجہ کو پھیلایا۔

”خیر یہ تو اس کا حق ہے۔ تمہاری شادی ہونے لگی تو تمہیں بھی کسی اور کو یاد رکھنے کی فرصت نہیں ملے گی۔“ حبیب نے چڑھائی میں آنے کے بجائے مدحت کی سائیڈ لی اور رفعت کی بڑھائی ڈش میں سے ایک کباب اپنی پلیٹ میں نکالا۔

”اور مدحت! تم کیوں اتنی غیریت برتی رہیں۔ اگر یہ بڑھاکوئی لی تمہارا ہاتھ بٹانے کے لیے وقت نہیں نکال سکتیں تو تم مجھ سے کہیں۔“ کھیرے کا ٹکڑا منہ میں رکھتے اس نے بے حد انصافیت سے مدحت سے کہا۔

”تم سے ہی کہہ گی بیٹا! ابھی تو بس تیاری شروع کی ہے۔ جب تک میری ہمت ہے میں اس کا ساتھ دے رہی ہوں آگے جب کام بڑھے گا تو تمہیں ہی ہاتھ بٹانا پڑے گا۔“ صاحب نے ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اس کی دلجوئی کی۔ بھلے سے بیٹے کی خواہش اور کچھ مادی فوائد کی چاہ نے انہیں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ انہیں اپنی اکلوتی بھانجی سے بے حد پیار تھا۔

”اور کا تو آگے بہت ہے۔ مدحت کے بعد احمر کی شادی کی تیاریاں بھی کرنی ہیں، اس کے لیے بھی تو تمہاری ہی مدد میں گئے یہ لوگ۔“ معیز احمد کے ہنسنے جب کے رخساروں پر شفق سی دوڑادی۔ ٹیبل پر موجود تمام افراد شفق کے ان رنگوں سے نظریں چرا گئے۔ احمر نے ایک شکوہ کنان نظر معیز احمد پر ڈالی لیکن وہ بہت اطمینان سے اپنی پلیٹ پر جھکے ہوئے تھے۔ احمر جڑ سا ہو کر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن اب اس کی کھانے پر توجہ جیسی توجہ نہیں تھی وہ کسی بہت گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سوچ کے یہ رنگ اس کے چہرے سے واضح طور پر جھلک رہے تھے لیکن وہاں موجود تمام ہی نفوس معیز احمد کی بات کے زیر اثر تھیں اس لیے کسی نے احمر کی کیفیت پر توجہ نہیں دی۔ کھانا بے حد خاموشی سے ختم کیا گیا۔ کھانے کے اختتام پر رفعت نے ماحول کی سنجیدگی کر توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ آواز بلند پوچھا۔

”جائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”باتی لوگوں کا جو بھی خیال ہو لیکن میری اور حبیب کی

جائے مت بنواتا ہم دونوں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہے ہیں۔“ احمر کے جواب پر حبیب کے چہرے پر حیرت دوڑ گئی۔ اتنا چابک سانس آنے والا یہ پروگرام اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ احمر سے باوجود بے تکلفی کے ایسی نوبت کسی نہیں آئی تھی کہ وہ اسے کوئی خصوصی پروٹوکول دے۔ اس لیے بھی وہ قدر سے تذبذب کا شکار تھی۔

”احمر کہہ رہا ہے تو چلی جاؤ بیٹی! کوئی حرج تو نہیں ہے اس میں۔“ معیز احمد نے اس کی جھجک کو بھانپتے ہوئے فوراً ہی اسے حوصلہ دیا تو وہ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

”سیف! میرے بیٹے کی سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اور میرا والٹ لے کر آؤ۔“ حبیب کو تیار دیکھ کر احمر نے ملازم لڑکے کو آواز لگا کر ہدایت دی۔ ذرا ہی دیر میں وہ مطلوبہ چیزیں لے کر چلا آیا۔

”آ جاؤ حبیب!“ سیف کے ہاتھ سے چابی اور والٹ لیتے ہوئے وہ حبیب سے مخاطب ہوا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ڈاننگ روم سے باہر نکل گیا۔

”کیا بات ہے تم سب لوگ اتنے عجیب، عجیب سے کیوں لگ رہے ہو؟“ حبیب جو اس کے پیچھے ہی اٹھ کر آئی تھی پورے تھک پیچ کر پوچھنے لگی۔

”میں تم سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس بات کا تعلق صرف میرے اور تمہارے مستقبل سے ہے اس لیے میں کسی اور کے سامنے اسے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔“ احمر نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اس کے لیے دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ حبیب خاموشی سے اس کے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھی۔ احمر کے انداز بتا رہے تھے کہ بات کافی سنجیدہ نوعیت کی ہے۔ اس لیے وہ باوجود چاہنے کے اپنے دل میں کوئی خوش کن تصور قائم نہیں کر پا رہی تھی۔

\*\*\*

”مہر آج کل مستقل بیہوش رہ رہی ہیں کیا؟“ مہر کی بیٹیوں کو کئی ہیں اٹھائے ایک کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر نوراحین نے زینت سے پوچھا۔

”ہاں، کیا کرے بے چاری۔“ زینت شاہ نے

ایک سرد آہ بھری اور بولیں۔ ”غیاث آج کل اپنی دوسری بیوی کے چاؤ چوٹیلے اٹھانے میں مگن ہے۔ بیٹے کی چاہت میں بیٹیاں بالکل بھولی ہوئی ہیں اسے۔ پہلے بھی کوئی خاص پیار محبت تو کرتا نہیں تھا بچپن کے ساتھ لیکن آج کل تو مہر بتیاری تھی چچیاں آنکھوں میں خار کی طرح کھٹک رہی تھیں۔ بیٹا ابھی آیا نہیں ہے دنیا میں صرف آس ہے تو اس پر یہ حال ہے۔ بعد میں پتا نہیں کیا کرے گا غیاث بہر حال بچپن کو ماحول کے تناؤ سے بچانے کے لیے مہر کچھ عرصے کے لیے یہاں آ گئی ہے۔ بعد میں دیکھو کیا کرتی ہے۔“ زینت آ پانے تفصیل سے بتایا۔

”تو بابا جان اور اماں نے بات نہیں کی ادا غیاث سے اس سلسلے میں۔ ایک تو پہلے ہی انہوں نے دوسری شادی کر کے آیا کا دل دکھایا دوسرے اب ان کی اور بچیوں کی حق تلفی چھی کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے انہوں نے اپنی خواہش سے مجبور ہو کر دوسری شادی کر لی لیکن بیویوں کے درمیان انصاف سے کام تو لیں جو لوگ دو بیویوں کے درمیان انصاف کرنا نہ جانتے ہوں ان کے لیے تو اللہ نے بھی صاف حکم دے رکھا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شادی نہ کریں اور یہاں تو بیوی کے ساتھ ساتھ اولاد کا حق بھی مارا جا رہا ہے۔ کیا منہ دکھائیں گے ادا غیاث اللہ کو روزِ حشر۔“ نوراحین کے لہجے میں غصہ تھا۔

”اللہ کو منہ دکھانے کی یہاں فکر ہی کس کو ہوتی ہے بس اسی دھن میں گئے رہتے ہیں کہ برادری میں اپنا شملہ اونچا رہے۔ مہر نے تین، تین بیٹیوں کا باپ بنا کر غیاث کی کو منجھ پٹی کر دی ہے وہ اس کو نظر انداز کر کے اپنی دوسری بیوی کے ناز صرف اسی لیے اٹھا رہا ہے کہ اس سے اسے بیٹا ملنے کی امید ہے۔ رہی اماں اور بابا جان کے بات کرنے کی تو وہ لوگ تو خود الٹا مہر سے ناراض ہیں کہ وہ حالات کے ساتھ سمجھوتا کیوں نہیں کر رہی۔“ زینت شاہ کی بات سن کر نوراحین کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

”یعنی ظلم بھی آپا پر ہو اور سمجھوتا بھی دہی



کریں۔“  
”دیکھو گڑیا ابیہ تو ازل سے عورت کے نصیب میں لکھا ہے اور ہمارے ہاں عورت جس کی کہیں شہوانی نہ ہوتی ہو اس کا تو احتجاج کرنا بالکل بے معنی ہی بات ہے۔ جلد یا بدیر سمجھوتا سہرے ہی کرنا ہوگا۔“ زینت شاہ کے لہجے میں تجر بہ بول رہا تھا۔  
”مگر بڑی آپا! کم از کم ادا غیاث کو اپنے روپے کی بد صورتی کا احساس تو ہونا چاہیے اور آپا کو چھوڑیں لیکن کم از کم اپنی بیٹیوں کو تو پوچھیں۔“ نورالحین نے انفسوس سے کہا۔

”ہم کیا کہہ سکتے ہیں سوائے دعا کرنے کے۔“  
زینت شاہ نے بات ہی ختم کر دی۔  
”میں لالہ سے کہوں گی کہ وہ ادا غیاث سے بات کریں۔ لالہ سے تھوڑا دوسرے ہیں وہ۔ ان کی بات سن کر کم از کم بیٹیوں سے تو اپنا سلوک ٹھیک کریں گے۔“  
نورالحین بہن کے لیے بے حد دھکی اور جذباتی ہو رہی تھی اور بات بھی بھیج۔ مہر کی پچیاں اپنا گھر چھوڑ کر یہاں رہنے سے کھلا گئی تھیں ان کا حال ڈال سے الگ ہو جانے والی کلیوں کا ساتھ جن کی لاکھ تمہائی کروٹیں کر ہی نہیں دیتیں۔ ان کو اس عالم میں پہنچانے کا ذمے دار وہ باغیاں تھا جو ان ٹھکی کلیوں کی تمہائی چھوڑ کر کسی اور سمت میں اپنا ودھیاں لگا چکا تھا۔

\*\*\*

”تعلیم نے ان سب کا کیا بگاڑ لیا ہے جو میں تمہارے بدل جانے کی امید کروں۔ میں جان مٹی ہوں کہ میرا انتخاب غلط تھا۔“ نینسی کی باتیں بازگشت بن کر اس کا پیچھا کرتی تھیں۔ کتنا چاہتا تھا اس نے نینسی کو کیا کیا خواب دیکھے تھے اس کے حوالے سے۔

”جان اور نینسی شادی کرنے والے ہیں۔“  
راہجہ کی دی ہوئی اطلاع..... کیا تھا جان میں ایسا جو نینسی نے اس کے مقابلے میں جان کا انتخاب کیا۔ عادی شرابی اور ہر روز ایک نئی تلی کے پیچھے بھاگنے والا جان..... مذہبی اور نسلی تعصب کا شکار شخص..... جس نے نینسی کو ٹریپ کر کے مطیب شاہ سے جدا کر دیا۔

”کیا اسنے عرصے کے ساتھ میں نینسی نے میرے بارے میں کچھ نہیں جانا تھا۔ میرے کردار کی جتنی محبت، کسی بھی شے کی اس کی نظریں قدر نہیں۔ اگر وہ مجھ کو نہیں جان سکتی تھی تو کم از کم خود کو تو جانتی رہے گی وہ جان کے ساتھ۔ جان جیسا شخص جو عورت ہی کرنا نہیں جانتا۔ اسے کون سا احساس ہو سکتا ہے۔“ ہزاروں شکوے اور فکریں میں جو نینسی کی ذات کے حوالے سے اسے دامن گیر تھیں۔ کتنے دن گئے تھے اسے یونہی فلیٹ میں بند ہو کر پڑے۔ اس نے باہر نکلتا ہی چھوڑ دیا تھا۔ فون پر مسلسل آسٹریگ مشین کی بھی، اخبار آتا لیکن یونہی جڈل کی صورت میں رہتا۔ ٹیلی ویژن کھولنے کا اسے خیال ہی نہیں آتا تھا۔ مکمل طور پر ہر انسانی رابطے سے کٹا ہوا تھا۔ خوراک کی صورت کافی اور سیکش کے سوا اس نے ان دنوں میں کوئی شے اپنے حلق سے نیچے نہیں اتاری تھی۔ وہ ایک ایسی زندگی گزار رہا تھا جس میں خود اس سے اپنے زمانے ہونے کا احساس چھین گیا تھا۔ اس حالت میں وہ جانے اور کتنا عرصہ رہتا جو اس دن یونہی پاکستان سے آنے والی ٹیلی فون کال وصول نہ کر لیتا۔

”کب واپس آؤ گے بیٹا! کب تمہاری پڑھ پوری ہوگی۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری آس لیے یہ آٹھ گھنٹیں تھرک مٹی میں جا سوں۔“ وہ اماں تھیں ہمیشہ کی طرح اس کے لیے بے قرار۔ اپنے معمول کے سوالوں کے ساتھ لیکن ان معمول کے سوالوں نے ہی اس کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ یہاں کسی کم عقل اور بے وفا کی خاطر اپنا آپ بڑا کر رہا تھا اور وہاں دن رات اس کی خاطر دعاؤں میں گن رہنے والی ہستی کے جذبے رائگاں جا رہے تھے۔ وہ یہاں نینسی کی خاطر تو نہیں آیا تھا۔ بے شک اس نے نینسی کی خاطر بہت سے خواب دیکھے تھے لیکن کچھ خواب وہ اپنے پیچھے رہ جانے والوں کی آنکھوں میں بھی بے سہرا کر آیا تھا۔ اماں، بابا جان تینوں بیٹیوں کی جدائی کا غم سہی وہ بہتیاں اسی سلوک کی منتظر تھیں وہ اپنی ذات کے غم میں ڈوب کر ان کے خواب

ارمان داؤ پر لگا دیتا۔ وہ جیسے غفلت کی نیند سے جاگا تھا۔ یہ بھگارتی تھی جس نے اسے ہر پروٹی مداخلت سے غافل کر دیا تھا۔

نینسی یونیورسٹی میں نظر کیوں نہیں آ رہی۔ راہجہ کے پاس اس کے لیے کیا اطلاعات ہیں۔ اسے کسی بات سے غرض نہیں رہی تھی۔ وہ پوری لگن سے اپنے نصب العین کے حصول کے لیے کوشاں تھا۔ یہ انتہک محنت اور لگن ہی تھی جس کے سہارے اس نے بہت نمایاں کامیابی کے ساتھ اپنا پی ایچ ڈی مکمل کیا اور اس کے بعد وہ پھر ایک دن مزید وہاں نہیں ٹھہرا تھا۔ نینسی کی باتیں چلتی بن کر اس کے اندر موجود تھیں۔ وہ واپس لوٹنے سے اپنے ساتھ بہت سے عہد کر کے لوٹا تھا اپنے ہر عزم اور عہد کو پورا کرنے کے لیے اسے مسلسل جدوجہد کرنی تھی جس کے لیے وہ پوری طرح تیار تھا۔

\*\*\*

”تم حیران ہو گی کہ میں تمہیں یوں سب کے درمیان سے اٹھا کر یہاں کیوں لے آیا؟“ اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں جب کہ سانسے والی کرسی پر بیٹھا وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ جب نے کوئی جواب نہیں دیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ جو کچھ کہتا ہے وہ احرمیز کہہ ڈالے۔

”تمہیں معلوم ہے کہ ما اور عالیہ آئی میرے اور تمہارے بارے میں کیا خواہش رہتی ہیں اگر ممما کا بس چلتا تو وہ مدحت کے ساتھ ساتھ میری شادی بھی طے کر کے اپنی اس خواہش کی تکمیل کر لیتیں لیکن میرے انکار نے انہیں مجبور کر دیا۔“ احمر کی بات نے جبہ کو چونکنے پر مجبور کیا۔

”آئی ایم سوری جب..... لیکن سچ یہی ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ احرمیز کا انداز بے حد معذرت خواہانہ تھا۔

”کیا میں وجہ جان سکتی ہوں؟“ جب نے خود کو سنبھالتے ہوئے سا انداز میں پوچھا۔  
”بالکل اگر تم نہ بھی پوچھیں تو میں تمہیں وجہ ضرور بتاتا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میرے انکار کے پیچھے تمہارے

لیے ناپسندیدگی کا جذبہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم ایک آئینڈیل لڑکی ہو جس میں اتنی ڈھیر ساری خوبیاں ہیں کہ کوئی بھی شخص تمہیں اپنی شریک حیات بنانے ہوئے فکر محسوس کرے گا۔“

”لیکن تم یہ فکر حاصل نہیں کرنا چاہتے۔“ جب نے آرزوگی سے اس کی بات کاٹی۔

”میں مجبور ہوں..... ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عام حالات میں، میرا انتخاب تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں نہیں ہے سچ تھا یا احرمیز اس کی دلجوئی کر رہا تھا۔

”بابی یہ سچہ۔۔۔۔۔ میں کسی کو پسند کرنے لگا ہوں بلکہ پسند کا لفظ تو معمولی ہے سچ یہ ہے کہ میں کسی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اتنی شدید محبت کہ اب اس کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ احرمیز کی آنکھیں خواب رنگ ہو رہی تھیں۔

”کون ہے وہ؟“ جب نے سرگوشی میں پوچھا۔  
”رفعت کی کلاس فیلو، نورالحین۔“ احرمیز کے لبوں نے نورالحین کا نام بہت نرمی اور چاہت سے ادا کیا تھا۔ جب ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ اس کا یہ سنجیدہ اور خیر و مساکین نرم خو تو ہمیشہ سے تھا لیکن چاہت کے رنگوں نے اس کی فطری نرمی کے ساتھ مل کر اسے اور بھی سنوار دیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ دل کے قریب محسوس ہو رہا تھا۔ جب نے نظریں چرائیں۔  
”چلو، گھر واپس چلیں۔“ وہ یکدم ہی کھڑی ہو گئی۔

”تم نے باندھ تو نہیں کیا ہے؟“ احرمیز گھبرا کر پوچھنے لگا۔

”واٹ ریش، تم نے مجھے اتنا احق سمجھ رکھا ہے کہ میں مہذب انداز میں کی جانے والی ایک بات کو سمجھ نہ سکوں۔“ گاڑی کی طرف جاتے ہوئے جب نے قدرے تیز لہجے میں جواب دیا۔

”سوری جب!“ گاڑی میں بیٹھ کر اسے اشارت کرتے احرمیز نے آہستہ سہجہ سے کہا۔  
”اس کی ضرورت نہیں ہے احرام! میں نے تمہاری بات اچھی طرح سنی بھی ہے اور سنی بھی ہے۔ یہ صورت



کسی کے بھی ساتھ پیش آ سکتی ہے۔ تمہارے بجائے میں بھی ہو سکتی تھی تو کیا ایسی صورت میں تم مجھے انڈر سٹینڈ کرنے کے بجائے بطور کرتے، ایک ایسا معاملہ جو انسان کے اختیار میں ہی نہیں ہوتا اس کے لیے اس پر الزام تراشی کرنا یا اسے مجرم ٹھہرانا کہاں کی عقلندی ہے اور میرا خیال ہے میں کافی عقلمند لڑکی ہوں اس لیے مجھ سے تمہیں ایسی کسی بے وقوفی کی امید ہونی بھی نہیں چاہیے۔“ خیر نہ کہا۔

”تم بہت ناس لڑکی ہو جیہ!“ وہ اس کی باتوں پر ہلکا ہلکا ہو گیا تھا سو بہت دل سے اسے سراہا۔  
”تم تو کہو گے۔ میں نے اتنی آسانی سے تمہیں اس کیس سے باعزت بری جو کر دیا۔“ خیر نے لہجے میں شوخی سموتے ہوئے کہا تو احترام پس دیا۔ جیہ کا بلند قد بھی اس کے ساتھ ہی گونجا۔ ہستے ہستے اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔ اس نمی کے پیچھے کیا احساس تھا شوخ سی دھن پرستی، بجا احترام میرے بے خبر ہی رہا۔

\*\*\*

”کب پوری ہو گی تیری پڑھائی۔ اس پڑھائی کے چکر میں جو ملی کے لیے مہمان ہو کر رہ گئی ہے۔ مہینوں کے بعد آئی ہے اور ہوا کے جھونکے کی طرح لٹ جاتی ہے۔ یہ بھی خیال نہیں آتا کہ اماں کا دل یہاں کتنا بے چین رہتا ہوگا۔ تو نے اپنی پڑھائی کی خاطر ماں کو تنہا کر رکھا ہے اور تیرا لالہ دوسروں کو پڑھائیاں کروانے کے واسطے نہیں بھولا ہوا ہے۔ ساری زندگی گزر گئی اس کی جدائی سب سے سب سے پہلے بورڈنگ میں پھر ملک سے باہر اور اب دوسرے شہر میں۔ اولاد والی ہو کر بھی میں تو سونی ہی ہوں۔ میرے سارے بچے مہمانوں کی طرح یہاں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔“ نورالحین واپسی کے لیے اپنا بیک بیک کر رہی تھی کہ صالحہ شاہ اس کے کمرے میں چلی آئیں اور اسے سامان باندھتے دیکھ کر رشک کر رہ گئیں۔

”بس اماں! اب تو تین سال کی ہی بات ہے جہاں اتنا عرصہ صبر کیا ہے یہ تھوڑا سا وقت اور نکال لیں پھر میں، لالہ اور بھائی سب مستقل یہیں آپ کے پاس

آ جائیں گے۔“ نورالحین نے ان کے گلے میں بازو جامل کرتے ہوئے انہیں تسلی دی۔  
”ہاں، مطیب بھی یہی کہہ رہا تھا۔ پتا نہیں عمل بھی کرتا ہے یا نہیں مجھے تو اس کے واپس آنے کا اعتبار ہی نہیں۔“ صالحہ شاہ بے یقین سی تھیں۔  
”لالہ پر اعتبار نہیں تو مجھ پر کر لیں نہ صرف میں خود واپس آؤں گی بلکہ انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر آؤں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“ نورالحین نے کہا۔

”تمہارا آنا بھی خیر کیا..... آؤ گی تو سسرال روانہ ہو جاؤ گی۔ تمہاری چاچی تو ویسے ہی بڑی مشکل سے صبر کر رہی ہے۔ ہر تیسرے چوتھے روز پوچھتی ہے کہ تو رکی پڑھائی کب ختم ہوگی۔“ اماں کی بات پر نور مجھے مجھے انداز میں پیچھے ہٹ گئی۔ زندگی کی یہ تلخ حقیقت ہر بار اس کی خوشی کے ٹھونکوں کو کھاجاتی تھی۔ اب بھی وہ کتنی خوش تھی اماں کو یوں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر۔ اماں کبھی کبھی تو یوں محبت کا اظہار کرتی تھیں۔

”مجھ سے کہہ رہی تھی کہ بری کے سارے جوڑے اور زیورہ شہر سے بنواؤں گی۔ نور اتنے عرصے سے شہر میں رہ رہی ہے اسے گاؤں کی چیزیں پسند نہیں آئیں گی۔“ صالحہ شاہ اس کے بدلتے تاثرات سے بے خبر دیورانی کی باتیں سناتے جا رہی تھیں۔ نورالحین کو اس اذیت سے دروازے پر ہونے والی دستک نے نکالا۔

”شاہ جی پوچھ رہے ہیں کہ آپ تیار ہیں؟“ جو ملی کی ایک ملازمہ تھی جو مطیب شاہ کا پیغام لے کر آئی تھی۔

”ہاں..... کیوں کہ بس ابھی آتی ہوں۔“ نورالحین نے جواب دیا تو ملازمہ واپس چلی گئی۔  
”اجازت اماں!“ نورالحین نے صالحہ شاہ سے پوچھا۔

”ہاں بچہ! جاؤ، اللہ سائیں خیر سے لے جائے اور خیر سے واپس لائے۔“ انہوں نے نورالحین کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئیں۔  
”اچھا میرا آبا، چلتی ہوں۔“ نورالحین باہر آ کر

بڑی بہن سے ملنے لگی جب کہ صالحہ شاہ بیٹے کو رخصت کر رہی تھیں۔  
”اللہ تمہیں۔“ مہر نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے دعا دی۔  
”اماں! کبھی آپ بھی تو میرے پاس شہر رکنے کے لیے آئیں۔ میں تو جب موقع ملتا ہے جو ملی کا چکر لگا ہی لیتا ہوں لیکن آپ تو وہاں آئی ہی نہیں۔“ صالحہ شاہ نے یقیناً دوری کا شکوہ کیا تھا جس کے جواب میں مطیب شاہ یہ بات کہہ رہا تھا۔

”لالہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں! آپ شہر آ کر بہت سارے دن ہمارے پاس رہیں اس طرح آپ ہمارے نزدیک بھی رہیں گی اور ہمارے کام بھی چلتے رہیں گے۔“ نورالحین نے فوراً بھائی کی تائید کی۔  
”تمہارے بابا جان سے کہہ کر دیکھوں گی۔ اگر وہ ساتھ چلنے پر راضی ہوئے تو ٹھیک ورنہ تم لوگوں کو تو پتا ہی ہے کہ مجھے کیسے ہر دم ان کے ساتھ لگے رہنا پڑتا ہے میرے سوا کوئی اور ان کے کاموں کی نگرانی نہیں کر سکتا۔“ صالحہ شاہ نے جواب دیا تو وہ سب بہن بھائی مکرانے لگے۔ یہ حقیقت تھی کہ قائم شاہ کے عزائم کا ہر رنگ بس صالحہ شاہ ہی سمجھتی تھیں۔ کب انہیں کس چیز کی ضرورت ہے، انہیں ہی خبر ہوتی تھی۔

”بس تو آپ بابا جان کو راضی کر لیں آئے پر۔“ نورالحین نے شرارت سے کہا اور انہیں پیار کر کے باہر کی طرف بڑھ گئی۔ مطیب شاہ بھی اس کے ساتھ ہی تھیں۔  
”لالہ! تھوڑی دیر بیٹھی جی کی طرف لے چلیں۔ صبح صغریٰ نے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ آئی ہوئی ہے۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے نورالحین نے بھائی سے فرمائش کی۔  
”تمہارا دل نہیں بھرا صغریٰ سے ملاقاتیں کر کر کے۔“ مطیب شاہ نے اسے چھیڑا۔

”میری اس سے ڈھنگ سے ملاقات ہوئی ہی کہاں؟ کہنے کو میں اس کی شادی میں شرکت کے لیے یہاں آئی تھی لیکن اماں نے کھٹے دو کھٹے سے زیادہ مجھے وہاں جانے ہی نہیں دیا۔“ نورالحین نے اداسی سے بتایا۔

”اماں بھی اپنی روایات سے مجبور ہیں۔ تمہیں اور مجھے تو پھر بھی سمجھو بہت زیادہ چھوٹی ملی ہوئی ہے۔“ مطیب نے گاڑی بیٹھی جی کے گھر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ذرا دیر میں وہ دونوں ان کے چھوٹے سے گھر میں تھے اور وہاں بالکل سیل سیل گئی تھی۔ اماں خاندان کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان معزز مہمانوں کی خاطر کس طرح کریں۔

”کسی تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں ٹھٹھی جی! ہمیں ابھی شہر جانا ہے بس نور کو ذرا دیر کے لیے صغریٰ سے ملاقات کروانے کے لیے لے آیا تھا۔“ مطیب شاہ کو بالآخر دخل اندازی کرنا پڑی۔ دوسری طرف نور صغریٰ سے پوچھ رہی تھی۔

”خوش تو ہو صغریٰ؟“  
”بہت.....“ صغریٰ کی نگاہیں خوشی اور شرم سے جھکی جا رہی تھیں۔

”اپنے میاں جی کو لے کر ہمارے پاس شہر آتا۔ کچھ دن رہنا پھر ہم تمہیں خوب وہاں کی سیر کروائیں گے۔“ صغریٰ سے رخصت ہونے سے پہلے نورالحین نے اسے آخر کی بھی جس کے جواب میں وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

\*\*\*

”نیوٹن کے پہلے قانون حرکت کے مطابق کسی بیرونی غیر متوازن قوت کی غیر موجودگی میں ساکن جسم ساکن رہے گا اور متحرک جسم یکساں دلائی سے خط مستقیم میں حرکت کرتا رہے گا۔“ مطیب شاہ اس وقت فرسٹ ایئر کو نیوٹن کے قوانین حرکت پڑھا رہا تھا۔ معمول کے مطابق طلباء پورے انہماک سے اس کی طرف متوجہ تھے۔  
”قانون کے پہلے حصے کو سمجھنا تو آپ کے لیے مشکل نہیں کیونکہ یہ آپ کا عام مشاہدہ ہے کہ ساکن بڑی ہوئی چیزیں اس وقت تک حرکت نہیں کرتیں جب تک ان پر کوئی بیرونی عامل اثر انداز نہ ہو البتہ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی گیند بھیجی جائے تو وہ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد رک جاتی ہے۔ بظاہر گیند کو کوئی روکنا بھی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گیند پر بہت سے



بیرونی عوامل اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں مثلاً ہوا کی رکاوٹ، کشش ثقل اور گرہ کا کھل اگر یہ عوامل نہ ہوں تو حرکت کرتی ہوئی گیند یا کوئی دوسرا جسم ہمیشہ خط مستقیم میں یکساں ولائیت سے حرکت کرتا رہے گا۔ قانون کی وضاحت دیتے ہوئے کلاس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

”بات سمجھ رہے ہیں آپ لوگ؟“  
”ہیں سر۔“ کچھ طلباء نے جواب دیا اور کچھ سر کو تھپتی انداز میں ہلانے لگے۔

”اچھا تو بتائیے یہ لاکس نے بنایا؟“ مطیب شاہ نے پوچھا۔

”نیوٹن نے۔“ بیک وقت کئی آوازیں ابھریں۔

”غلط..... نیوٹن نے تو صرف اسے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ قانون بنانے والی ہستی تو کسی اور کی ہے۔“ مطیب نے مسکراتے ہوئے ان کا جواب رد کیا۔

”وہ کون ہے سر؟“ طلباء حیران تھے۔ انہوں نے

جب بھی قوانین حرکت پڑھے تھے۔ نیوٹن کا نام ان قوانین کے ساتھ جڑایا تھا لیکن اب اس بات کا انکار کر رہے تھے تو تعجب کا مقام تو تھا ہی۔ کسی نئے ہونے والے انکشاف کو سننے کے لیے مضطرب سے ہوا اٹھے تھے۔

”اللہ تعالیٰ اور کون؟“ مطیب نے ان کے تجسس کو دیکھتے ہوئے ہنس کر سادگی سے جواب دیا۔

”ہاں، وہ تو سب کو ہی معلوم ہے۔“ بچوں کے تجسس کے غبارے میں سے یکدم ہی ہوا اٹھ گئی اور ایک طالب علم نے یہ آواز بلند اس بات کا اظہار بھی کر دیا۔

”صرف معلوم ہونا کافی نہیں، ہمیشہ ذہن میں

رہنا بھی ضروری ہے کیونکہ بات بھی غلطی سے جب اس بات کو یاد رکھا جائے کہ قانون اللہ کا بنایا ہوا ہے اور اسے توڑنے والا ہمیشہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ چاہے اس قانون کا تعلق اخلاقی اقدار سے ہو چاہے عینی عناصر سے۔

جہاں انسان نے اللہ کے بنائے ہوئے قانون کو توڑا وہیں اسے سزا ملی۔ ابھی جو ہم نے قانون پڑھا ہے اسے توڑنے کا نتیجہ میں نے بہت بار اپنی سڑکوں پر دیکھا ہے۔

”یہ آپ لوگوں کا عام مشاہدہ ہوگا کہ کسی بس سے اترتے وقت مرد صرف رفتار کم کر دیا کر بھی اتر جاتے ہیں اور خواتین، رک جانے والی بس اگر معمولی سا جھکا بھی لے لے تو فوراً گر جاتی ہیں اور لوگ ڈرائیور کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں اس حادثے میں ڈرائیور کے ساتھ ساتھ وہ خاتون خود بھی ذمے دار ہوتی ہیں۔“

”وہ کیسے سر؟“ ایک طالب علم نے پوچھا۔

”قانون کے دوسرے حصے کو غور سے دیکھو، اس کے مطابق متحرک جسم اپنی حرکت قائم رکھتا ہے۔ چلتی ہوئی بس میں ہونے کی وجہ سے انسان اس متحرک بس کا

ایک حصہ ہوتا ہے اور بس کے ساتھ ساتھ خود بھی خط مستقیم میں سفر کر رہا ہوتا ہے لیکن ہماری خواہش یہ کہتی ہے کہ جب بس سے اترتی ہیں تو اپنا رخ پیچھے کی جانب

رکھتی ہیں۔ یعنی حرکت کی سمت سے مخالف سمت میں۔ اب قانون کے مطابق تو وہ اس وقت ایک ایسا جسم نہیں

جو حرکت میں تھا اور اسے متحرک رہنا تھا لیکن مخالف سمت میں رخ کر کے اترنے سے قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور جسم کو زور دار جھکا گئے کی وجہ سے حادثہ پیش

آ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف مرد بس کی حرکت کے سمت میں اپنا رخ رکھتے ہیں اور ایک دم سے خود کو روک لینے کی کوشش کرنے کے بجائے بس کی حرکت کی سمت

میں ہی دو تین قدم کا فاصلہ طے کرتے ہوئے تکلیف سے خود کو روک دیتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش بیرونی عامل ہوتی ہے جو ان کے متحرک جسم کو روک کر بغیر و خوبی بس اسٹاپ پر اتار دیتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے ہٹ کر عمل کرے گا

تو اسے قانون قدرت توڑنے کی سزا بھی ملتی پڑے گی اور سزا بھی ایسی جو موقع پر ہی مل جاتی ہے کسی عدالت اور پیشی کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

”انٹرسٹنگ سر۔“ بچوں نے اس کی بات ختم ہونے پر بے ساختہ ہی سین آئیز لہجے میں کہا۔

”دلچسپ تو ہے لیکن کارآمد اس وقت ہی ہوگا جب اسے عمل کا حصہ بناؤ گے۔ اس بات کو اپنا اصول بنا لو کہ جہاں بھی تمہیں کوئی ٹھوکر لگے، نقصان پہنچے، پلٹ کر دیکھو تم نے اللہ کا کوئی قانون تو نہیں توڑا ہے کیونکہ اللہ

اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ وہ کبھی ظلم نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ اس نے تو کبھی کسی بستی پر اس وقت تک عذاب بھی نہیں بھیجا جب تک وہاں کوئی ڈرانے والا بھیج کر وہاں کے رہنے والوں پر اپنی جنت تمام نہ کر دی۔ وہ اپنی مخلوق سے بے حد محبت کرتا ہے اس لیے اسے بے

سبب تکلیفوں میں مبتلا نہیں کرتا۔ ہاں آزمائش کا معاملہ الگ ہے۔ اگر کوئی تکلیف آزمائش کے طور پر انسان کی زندگی میں آ جائے تو اسے صبر سے اس تکلیف کو سہہ کر

اللہ سے مدد کی درخواست کرنی چاہیے۔“ مطیب شاہ بہت روانی سے کہہ رہا تھا۔ عمر احسان کا وہ انداز جس پر

بسی وہ حیران ہوا کرتا تھا اب اس کی اپنی شخصیت کا حصہ بن گیا تھا۔ اب وہ بھی دین کو سائنس سے ریلیٹ کرنے کا ہنر جانتا جا رہا تھا۔

\*\*\*

”آج شام اماں اور بابا جان آ رہے ہیں۔ بابا جان تو خیر پہلے بھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے آ جایا کرتے تھے لیکن اماں پہلی بار آ رہی ہیں۔ تمہیں پتا ہے ان کی

شادی کو پچیس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصے میں وہ کتنی کی چند بار ہی خوبی سے باہر گئی ہیں۔ شہر تو بھی آئیں ہی نہیں پہلی بار میرے اور لالہ کے

اصرار پر آ رہی ہیں۔“ نور العین بہت جوش و خروش کے ساتھ رفعت کو بتا رہی تھی۔

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ میں ماما کو بتاؤں گی تمہارے والدین کی آمد کے بارے میں وہ اور ڈیڈی، مدحت آپ کی شادی کا کارڈ خود دینے آ جائیں گے اس بہانے ان کی تمہارے والدین سے ملاقات بھی

ہو جائے گی۔“ رفعت نے اس کی بات پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو جواباً وہ بھی خوش دلی سے بولی۔

”ہاں، ہاں، بالکل اماں اور بابا جان تو بہت خوش ہوں گے اگلے آئنی سے مل کر۔“ لیکن رفعت معجز کے والدین کی آمد کی اصل وجہ کیا تھی یہ تو اگلے دن ان کے گھر آنے پر ہی اسے معلوم ہوا۔ کاش رفعت نے اس کے سامنے اپنے والدین کی آمد کا مقصد بھی بیان کر دیا

ہوتا تو وہ وہیں اسے روک دیتی۔

”معاف کیجیے گا معزز صاحب! ہماری بیٹی کا نکاح میڈیکل میں داخلے سے پہلے ہی اس کے چچا زاد سے ہو چکا ہے۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی ہم اسے رخصت کر دیں گے اور اگر ایسا نہ ہوتا تب بھی ہم آپ کو انکار کے سوا کچھ نہیں دے سکتے تھے۔ ہماری بیٹیاں خاندان سے باہر ہرگز بھی نہیں بیانی جاتیں۔ یہ روایت بھی ہے اور اصول بھی۔“ سید قائم شاہ کے بظاہر ہنصرے ہوئے لہجے میں

کیسا غضب بول رہا تھا یہ وہی لوگ جان سکتے تھے جو ان کے مزاج آ سنا تھے۔ البتہ شک صحبت اور معزز احمد کو بھی خوب لگا تھا۔ نور العین کو اپنی بہو بنانے کے حوالے سے وہ جانے کتنے خواب دیکھ چکے تھے۔ اب اس ناکامی

نے ہواؤں کے رنگ اڑتے ان میاں بیوی کو جیسے یکا یک زمین پر لپٹا تھا، وہ بہت مایوسی کے عالم میں واپس لوٹے تھے۔

## توجہ فرمائیں

فیصل آباد کے بک سیلرز،  
دکان دار اور ہائر حضرات

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت اور ماہنامہ دلکش

کے حصول کے لیے ہمارے ڈسٹری بیوٹر

نیو ملک بک سینٹر

ایم آر صف برادر دکان نمبر 8 عرفات بزنس سینٹر  
پچھری بازار فیصل آباد سے رجوع فرمائیں

موبائل: 0333-6539585

فون: 041-2610961-2619580

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت اور ماہنامہ دلکش

کے حصول کے لیے ہمارے ڈسٹری بیوٹر

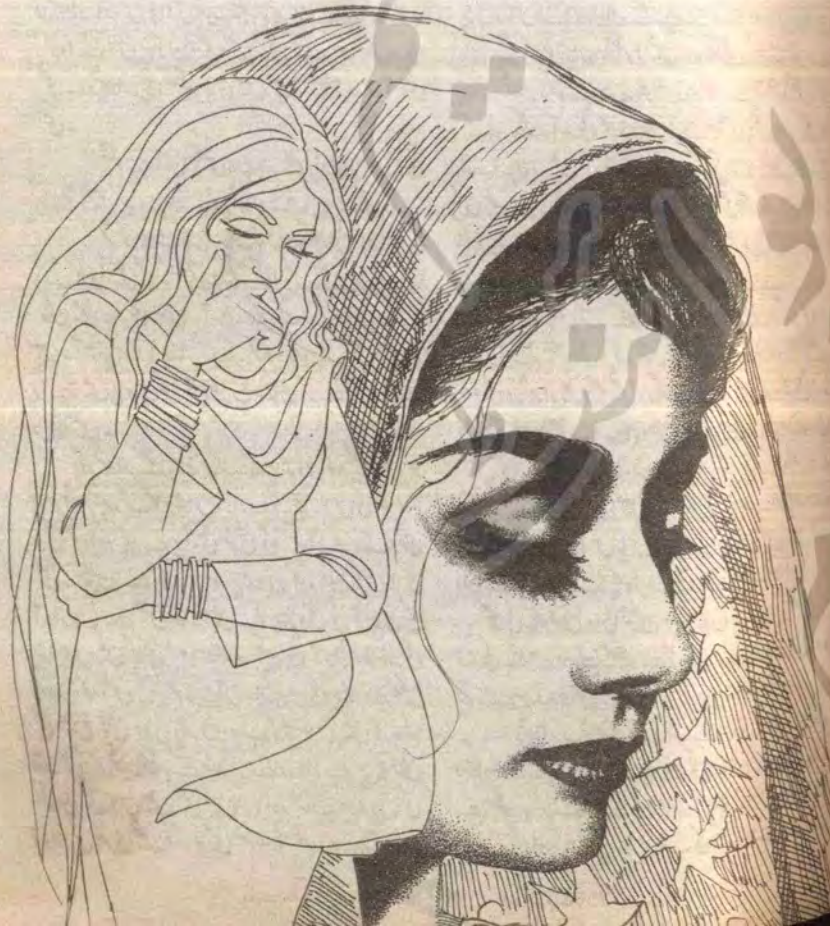
ایم آر صف برادر دکان نمبر 8 عرفات بزنس سینٹر



دُور شہوار نے باہر آ کر جھانکا۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے قدرے اندھیرا ہو رہا تھا۔ شپ سے ایک قطرہ اس کی بڑھی ہوئی پتلی پر آن گرا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ آسمان پر گٹھا ٹڈی آرہی تھی۔ بجلی کے لشکارے ہر لحظہ بادلوں کا سینہ چیر کر اپنے وجود کا پتا دے رہے تھے۔ تیز ہوا کا جھونکا آیا اور سامنے لگا آلوچے کا درخت دوہرا ہو ہو کر زمین کو چھونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی پانی کی بو چھاڑ آئی اور دُور شہوار کے پاؤں جھجک گئے۔ پانچ

## شاہ بہاراں صبح چمن

بلقیس ظفر



بھی فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے مشورے کے محتاج نہیں۔“ قائم شاہ نے غیض کے عالم میں کہا۔  
”لیکن نور نے سجاد شاہ سے نکاح صرف شرط پر کیا تھا کہ آپ اسے میڈیکل میں داخلے کی اجازت دیں گے۔“ مطیب شاہ اتنی آسانی سے ماننے والا نہیں تھا۔

”ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا نور نے نہ صرف میڈیکل میں داخلہ لیا بلکہ دو سال بھی مکمل کر لیے۔ یہ ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرے گی۔ ہم نے یہ وعدہ تو نہیں کیا تھا۔“ وہ قائم شاہ تھے مطیب شاہ کے باپ۔ ان کے پاس اس کی ہر دلیل کا جواب تھا۔

”پلیز بابا جان! آپ ذرا ٹھنڈے دل سے کام لیں۔ نور کا تیسرا سال چل رہا ہے چند سال کی اور بات ہے۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو جائے گی۔ ماں باپ تو بیٹیوں کا مان ہوتے ہیں۔ کیا آپ اپنی بیٹی کی یہ معمولی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے۔“ اس بار زمین شاہ نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو بیٹی! ہمارے ہاں بیٹیوں کی خاطر عزت بھی واؤ پر نہیں لگائی جاتی۔ ہمارے ہاں کی بیٹیاں ہمیشہ عزت کی خاطر قربان ہوتی چلی آئی ہیں۔“ بہو سے بات کرتے ہوئے قائم علی شاہ کا لہجہ ذرا دھیمہ پڑا تھا لیکن فیصلے کی تختی اپنی جگہ محسوس ہو رہی تھی۔

”میں آپ کو گارنٹی دیتی ہوں بابا جان! نور کو کسی ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گی جس سے ہمارے خاندان کی عزت پر کوئی حرف آئے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر اس کے کردار میں کوئی بھول ہوتا تو سب سے پہلے مجھے اعتراض ہوتا۔ آخر میں اس کی ہونے والی نند ہوں۔ یہ میرے بھائی کی عزت ہے، میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ میرے بھائی کی عزت پر حرف آئے۔“ زمین شاہ کی دلیل نے سید قائم شاہ کو تذبذب میں ڈال دیا۔

باقی آئندہ

”ایسا کیوں ہوا نور! ان لوگوں کی جرأت کیسے ہوئی یہ سوال لے کر ہمارے در پر آنے کی؟“ صباحت اور معین احمد کی واپسی کے بعد نورالحمین کی بابا جان کے سامنے طغی ہوئی تھی۔  
”میں نہیں جانتی بابا جان!“ نورالحمین نے جھکے سر کے ساتھ جواب دیا۔

”تم جانتی ہو اس لڑکے کو جس کے لیے تمہاری پہیلی کے ماں باپ ہمارے پاس آئے تھے۔“ ان کا یہ سوال بہت نازک تھا لیکن جواب تو نورالحمین کو بہر حال دینا ہی تھا۔

”وہ کبھی کبھار رفعت کو لینے کالج آتا ہے۔ میں نے صرف دور سے دیکھا ہے بھی بات نہیں کی۔“ جو جگ تھا اس نے بتا دیا۔

”اس کی ماں کہہ رہی تھی ہمارے بیٹے کو نورالحمین بہت پسند ہے۔ ہم اس کی خواہش پر ہی آپ سے آپ کی بیٹی مانگ رہے ہیں۔ اس کی بات سن کر ہمیں لگا کہ کسی نے ہمارے منہ پر ٹانچہ مار دیا ہو۔ لگتا تھا کسی بھی لمحے کوئی اور گستاخ جملہ کہہ دے گی۔ شہر والوں کی یہی بے شرمی ہے جسے ہم سخت ناپسند کرتے ہیں اور اسی لیے اپنی اولاد کا کبھی ان کے درمیان رہنا پسند نہیں کرتے اور اب ہم نے سوچ لیا ہے کہ ہم انہیں اپنے ساتھ واپس گاؤں لے جائیں گے۔ بس ہو چکا تمہارا شوق پورا۔ بہت پڑھائیاں کر لیں تم نے۔“ سید قائم شاہ کے فیصلے نے نورالحمین کو سہکتا کر دیا۔ وہ اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے لائق بھی نہیں رہی۔

”یہ زیادتی ہے بابا جان! آپ نور کو ایک ایسی بات کی سزا دے رہے ہیں جس میں اس کا کوئی قصور نہیں اور پھر ہوا ہی کیا ہے؟ صرف ایک رشتہ تو آیا تھا نا۔ آپ نے اپنی مجبوری بتا کر معذرت کر لی۔ اس بات میں کسی انتہائی فیصلے کی گنجائش کہاں نکلتی ہے؟“ مطیب شاہ جواب تک احتراماً خاموش تھا۔ بہن پر ہونے والی زیادتی پر چپ نہیں رہ سکا۔

”ہم تم سے کچھ نہیں کہہ رہے مطیب شاہ! نورالحمین ہماری بیٹی ہے۔ اس کے بارے میں ہم کوئی



اٹھائے وہ اندر کو بھاگی اور طوفان کو دیکھ کر جلدی جلدی در پیچ بند کرنے لگی۔ شہینہ بیگم نے چن سے آ کر کہا۔

”موسم بڑا خراب ہو رہا ہے۔ ڈرائنگ روم کے دروازے تلے بوا تو لیا ٹھوس دو، کہیں پچھلی بارش کی طرح قالین نہ بھجک جائے۔“ دونوں ماں بیٹیاں تیزی سے چزیں سیٹنے لگیں۔ باہر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔

اگلی صبح بارش رک چکی تھی۔ نیلے آسمان پر آفتاب اپنی طلائی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ بہار کی خوبصورت صبح روشنی تھی۔ بکے کھن پر ہر طرف پتے اور ڈالیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جنہیں ملازمہ لڑکی پر دین سیٹ رہی تھی۔ درشہوار اور اس کی امی شہینہ بیگم باہر پڑے بیچ کو صاف کروا کے اس پر آن بیٹھی تھیں، ہلکی خشک ہوا چل رہی تھی۔ درشہوار اپنی گھٹکرے والی نیس سینٹے سینٹے عاجز آ چکی تھی۔

”شکر ہے آج چھٹی ہے ورنہ میرا دل بالکل کالج جانے کو بیٹن چاہ رہا تھا۔“ درشہوار نے ماں سے کہا۔

”تم تو ہمیشہ کالج جانے سے کتراتے ہو۔ آج بارش کا بہانہ مل گیا۔“ شہینہ بیگم مسکرائیں۔ ”اچھا میں ذرا کچن میں جا رہی ہوں۔ آج کچے قنے کے کباب بنائے ہیں۔ آنا چاہو تو آ جانا۔“ یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئیں۔ راستے میں پروین کو اچھی طرح صفائی کرنے کی ہدایت دیتی گئیں۔

درشہوار ننھے منے بہار کے پرندوں کو دیکھنے لگی جو ادھر ادھر پھدک کا سیٹیاں بجا رہے تھے۔ اس کی نظر ان پر پڑی تھی اور چہرے پر حقیقی خوشی کی مسکراہٹ دمک رہی تھی۔ بچپن سے ہی اسے پرندوں اور ان کی پیاری آوازوں سے عشق تھا۔ اس نے چنڈول کی آسمان کی پنہائیوں میں گونجتی، موسیقیت بکھیرتی آواز، فاختہ کی دوسو کوکو، بلبل کی ترنم ریزیاں، چڑیوں کی چکار اور کوئل کی شورخ چلتی ہوئی پکار ان سب کو کیٹشوں میں بھر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ شہینہ بیگم سے ضد کر کے دروازے پر جوبیل لگوائی تھی اس میں بھی چڑیوں اور مختلف پرندوں کی آوازیں بکھری تھیں اور یونہی نیم دا آنکھوں سے آسمان

کی جانب دیکھتے دیکھتے وہ ماضی کی اٹھاہ وادیوں میں گری۔

وہ ماضی جو اس کے ابو کے ہر شفقت و ہمدردی کے پیار سے گندھا تھا، وہ اس میں گونگی۔ اسے ہر کوئے کھدرے سے اپنے باپ کا وجود یاد تھا۔ وہ اور جانا فزاقیتہ سنا کی دے رہے تھے۔ یہ گھر ان کی جنت تھی جس میں خوشیاں ہی خوشیاں، دل کا سوسا اور طمانیت تھی۔ خالص محبت کے جگنو جگنتے تھے اور طرف جیسے رنگین تلیوں کا رقص تھا۔ یہ ایک بے مثال گھر تھا جس پر بھی غم کا سایہ نہ پڑا تھا یہاں کے کلین دکھ نہ نا آشنا تھے کہ ایک روز بے خبری میں ان پر قیامت پڑی۔ اس کے ابو ہمیشہ کے لیے چلے گئے اور ان کے ماں بٹی کی خوشیاں، مسکرائیں اور جگنو جگنتے گئے۔ شہینہ بیگم کے جب حواس بجا ہوئے تو فرانسز خانے آنے لگے۔ آمدنی کا ذریعہ صرف پیشکش تھی اور کچن تھا۔ اپنے رشتے داروں سے کسی قسم کی مدد لینے کی غیرت نے روک دیا۔ یہ قیمت بھی کچھ ادا نہیں انہوں نے مختلف آپشنز پر غور کیا اور آخر اپنی تعلیم کو میں لاتے ہوئے انہوں نے بیچنگ کا فیصلہ کیا۔

تین سال گزر گئے۔ وہ پڑھا رہی تھیں، گھر کے دووں نے سنبھال رکھا تھا۔ ماں کی ہمت اور مزاجی درشہوار میں بھی تھی وہ گھر کے کام میں مدد کرتی اور دل لگا کر پڑھتی۔ اسے ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ فراغت کے وقت وہ اپنی بیچریز کے بچہ کے پاس جا رہی تھی اور انہیں دانہ کھلاتی۔ گھر کے چھوٹے کچن کے آس پاس جو کھیا ریاں تھیں ان میں ان کے لگائے ہوئے پھول تہتہ لگاتے تھے اور.... گلابی پھولوں والی نیلے دیواروں پر لہراتی تھیں زندگی کے زبردست جھکے سے لڑکھانے کے بعد اب قدرے سیٹ ہو چکی تھیں۔

درشہوار نے ایم اے کر کے کمپیوٹر کورس کیا۔ اخبارات میں اشتہارات پڑھنے لگی۔ اس نے اپنے سے مشورہ کر کے ایک حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ ملازمہ کرے گی اور ماں کی روز و شب کی اس مشقت کا

وے گی جو انہوں نے اس کی تعلیم اور پرورش کے سلسلے میں تنہا اٹھائی تھی۔ وہ اپنی ماں سے بے تحاشا محبت کرنے کے علاوہ ان کی احسان مند بھی تھی۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کی محرم راز اور سہیلیاں بھی تھیں۔ ہر معاملے میں ایک دوسرے کو مشورے دیتیں۔ ان کی صلاحیتیں ایک دوسرے کے لیے وقف تھیں۔

کافی دن اخبارات میں سرکھانے کے بعد ایک روز درشہوار کو حسب مناسبت ملازمت کا اشتہار نظر آ ہی گیا۔ یہ اسی شہر کے ایک بہت بڑے کاروباری گروپ کی طرف سے تھا۔ جاب بھی اسٹنٹ سیکریٹری کی۔ شرائط نہایت ہی معقول اور مناسب۔ ماں سے مشورہ کرنے کے بعد درشہوار نے درخواست بھیج دی۔ اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا۔

شفیع کمال گروپ آف انڈسٹریز کے عالی شان دفتر میں جب وہ داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔ انتہائی قیمتی ڈیکور سے سجایا کمرہ کسی محل کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ وسیع و عریض کلاس ٹائپ میز پر ایک طرف نہایت ترتیب سے قائم پڑے تھے۔ دوسرے کونے پر سیاہ گلدن میں سرخ اور سفید گلاب مسکرا رہے تھے۔ درشہوار کی نظر پھولوں سے پڑے کاغذات پر پڑی جو سیاہ خم دار یا لپس سے ڈھکا ہوا تھا۔ درشہوار کے پاؤں کی آہٹ پر اس شخص نے سر اٹھایا ایک لمحہ آنے والی کو دیکھا اور زیر لب کہا۔ ”بیٹھ جاؤ.....“ آس پاس رکھی کرسیوں میں سے ایک پر وہ بیٹھ گئی۔ حلق خشک ہو رہا تھا، نہ جانے کیوں، حالانکہ وہ ایک خود اعتماد لڑکی تھی۔ فائلوں پر جھکا ہوا سر اٹھا اور دو ذہین آنکھیں اسے دیکھنے لگیں پھر ایک بھاری آواز گونجی۔

”میں نے تمہاری سی وی پڑھ لی ہے۔ زیادہ سوالات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تمہیں ہمارا آفس خوش آمدید کہتا ہے۔ کل سے آنا شروع کر دو۔“

درشہوار شکر کے الفاظ کہنے کو بھی کہ ایک خاتون چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سارا کمرہ مغط ہو گیا۔ درشہوار نے اسے دیکھا اور اس کی نظر واپس پلٹنا بھول گئی۔ اس کے سامنے ایک انتہائی افسانہ خاتون

کھڑی تھی۔ سولہ سنگھار سے آراستہ، سیاہ جینو اور سرخ بلاؤز میں ملبوس، سر کے اوپر رنگے ہوئے سرخ بالوں کی چھتری سی بنی ہوئی تھی، کانوں میں بالشت بھر لیے آؤیزے۔ قصہ مختصر وہ جدیدیت کا شاہکار تھی اور بالکل ایک ٹیرلر لک رہی تھی۔ اس نے درشہوار کو نظر انداز کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے کاغذات کی طرف باس کی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

”سر! یہ دیکھ لیجئے، آپ کی مرضی کے مطابق کر دیا۔“ سر، یعنی خرید کمال نے سرسری انداز سے کاغذوں کو دیکھا اور بولے۔

”ٹھیک ہے.....“ پھر انہوں نے آنے والی خاتون کا درشہوار سے تعارف کرایا۔ ”یہ ہماری نئی اسٹنٹ سیکریٹری ہیں درشہوار.....“ وہ ر کے ”اور بس شہوار، یہ ہیں میری بی بی ایس مس نعمانہ قیسر۔“ یہ کہہ کر وہ گویا اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو کر پھر سے کاغذات پر جھک گئے۔

نعمانہ نے شہوار کو بغور دیکھا اور دلی زبان سے ”گلیڈ ٹو میٹ یو“ کہہ کر کاغذات سنبھالنے لگی۔ شہوار نے بھی ”پلم ہیز“ کہہ کر گویا قرض اتار دیا اور اپنے ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

دفتر میں اس کا یہ پہلا دن تھا جو خاصا خوشگوار اور اطمینان بخش تھا سوائے مس نعمانہ کے جو اسے بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ اس کے اپنے خیالات کے مطابق وہ آفس سے زیادہ کسی اسٹوڈیو کے لیے مناسب تھی۔ بہر حال اس نے اپنے ذہن سے نکال دیا۔ یہ شکر ہے اس کا کمرہ ابھی الگ تھا جب کہ درشہوار باس کے طویل و عریض کمرے ہی کے ایک کونے میں فٹ ہو گئی تھی۔

فریڈ کمال کو بھی یہ سادہ سی، مٹین اور پُر وقار اسٹنٹ پسند آئی تھی۔

درشہوار نے تفصیلاً اپنے پہلے دن کا تجربہ امی کے گوش گزار کیا اور آخر میں سادگی سے بولی۔ ”مجھے اس آفس کا ماحول پسند آیا ہے۔ میرے لیے دعا کریں کہ اچھی طرح اپنے فرائض نبھاسکوں۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم اپنی نئی ذمہ داریوں سے



بخوبی عہدہ برآ ہو سکو گی۔“ اس کی امی نے مچا اعتماد دلچے میں کہا۔ ”مجھے تمہاری صلاحیتوں اور اللہ کی رحمت پر بھروسہ ہے۔“

اور یوں زندگی کا یہ نیا دور اسے ساتھ لیے چلنے لگا۔ وہ نہایت محنت اور دیانتداری سے کام کرتی تھی۔ آفس میں آنے کے بعد جو فائلوں اور ٹائپ رائٹر یا کمپیوٹر پر سر جھکا کر تو اس وقت سر اٹھاتی جب آفس سے جانے کا وقت ہو جاتا۔ فریڈ کال سے بات چیت نہایت مختصر اور ٹو دی پوائنٹ ہوتی تھی۔ وہ خود بھی کم گو تھے اور کام میں مصروف رہتے۔ نعمانہ اکثر آتی۔ کبھی کبھی اس کے ہمراہ فائلوں کا پلندا اٹھائے ایک خوشرو نو جوان بھی ہوتا۔ یہ اس کا اسٹنٹ امجد تھا جس کے متعلق شہوار کو بعد میں پتا چلا کہ نعمانہ کی ہی سفارش پر اسے رکھا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہتا۔ صرف نعمانہ خود ایسی تھی جو اپنے قہقروں اور باتوں سے ماحول کو تازہ رکھتی۔

چند ماہ گزر گئے۔ در شہوار اپنی جاب سے پوری طرح مطمئن تھی۔ شاندار آفس، معقول تنخواہ، مراعات اور باس کا حسن سلوک۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ اپنے کام اور ذمے داریوں میں کھتی جا رہی تھی۔ وہ خوب دل لگا کر کام کرتی، جواب میں اسے ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ ملتی باس کی طرف سے اور صرف یہ ایک تبسم اس کے لیے دنیا کی تمام نعمتوں سے زیادہ تھا۔

شمینہ بیگم نے ملازمت چھوڑ دی اور اب پوری طرح گھر اور بیٹی میں کھو گئی تھیں۔ وہ بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے اخراجات کم کر کے بینک میں روپیہ جمع کرتی جا رہی تھیں۔ اپنے شوہر کی یاد میں جو رہتے ہوئے بھی وہ بیٹی کے مستقبل سے غافل نہ تھیں۔ خاندان والوں سے ان کے تعلقات ضرور تھے لیکن سرسری سے۔ وہ اپنی مشکلات اور مصائب کے متعلق کسی سے کچھ کہنے کی قائل نہ تھیں۔ اپنی ذمے داریوں کا بوجھ تنہا وہ اپنے نازک کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھیں۔

☆☆☆

نعمانہ بہت کم در شہوار سے بات کرتی۔ یہ باتیں

اکثر طنز و ہجارت میں گنڈھی ہوتیں۔ وہ اس کے سوا لہاس کا مذاق اڑاتی اور خود نئے سے نیا لباس جو جدید فیشن کے مطابق ہوتا زیب تن کرتی۔ اس نیم عریاں پوشاک میں لہرائی، بل کھاتی وہ ادھر سے ادھر آتی جاتی۔ اس کی زیادہ تر توجہ اپنے باس پر مرکوز رہتی۔ ان کے سامنے بیٹھ کر اپنی دونوں کہیاں میز پر رکھ کر پالش کیے ناخن والے ہاتھ اٹھا کر باتیں کرتی رہتی۔ لطیفے سناتی۔ اسٹیکس اکثر وہی لاتی جو باس اور خود اس کے لیے مخصوص ہوتا۔ کبھی بھول کر بھی اس نے در شہوار سے صلاح نہیں کی تھی۔ نعمانہ کا حکم آفس کے اندر اور باہر چلتا تھا اور اسے اپنی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ در شہوار اس کی خواہ مخواہ کی حاکمیت کو پسند نہیں کرتی تھی مگر خاموش رہتی۔ ایک روز وہ معمول سے زیادہ در آفس میں مستمکن رہی۔ اس کی مسلسل باتیں جو اکثر انگلیش میں ہوتیں، قہقہے جو بلند بانگ تھے فضا میں گونجنے رہے۔ فریڈ کمال کی دھبی اور بھاری آواز کبھی کبھی سنائی دیتی ورنہ وہ صرف سننے پر قناعت کرتے۔ نعمانہ جب واپس تشریف لے گئی تو باس نے دور کونے میں کمپیوٹر میں مصروف اپنی میز پر بیٹھی در شہوار کی طرف نظر اٹھائی اور پوچھا۔

”اس شور وغل میں تم کام کیسے کر لیتی ہو؟“ در شہوار نے حیرت سے سر اٹھایا۔ انہوں نے کبھی آفس کے کام کے سوا اس سے ذاتی سوال نہ کیا تھا۔

”جی.....؟“ اس نے آنکھیں جھپک کر پوچھا۔ ”میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتنی باتوں اور بلند آہنگ قہقروں کے درمیان ذہنی یکسوئی ذرا کم ہی حاصل ہوتی ہے۔“ ان کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ در شہوار نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”سر..... گزشتہ چند ماہ میں، میں ان چیزوں کی عادی ہو گئی ہوں۔“

”خوب.....“ تبسم ابھی موجود تھا اور وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ ”حالات کے مطابق خود کو ڈھال لینا بہت بڑی بات ہے۔“ انہوں نے کہا۔ در شہوار کو یوں لگا جیسے مارے خوشی کے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ یہ الفاظ نہ



تھے شہد کی بوندیں تھیں جو اس کے کانوں میں ٹپک گئیں۔  
 پھولوں کا انبار تھا جو اس کے اوپر آن گرا اور اسے اپنی  
 مہک سے مہل کر گیا۔ اس کا دل سر پٹ دوڑنے والے  
 گھوڑے کی طرح بے قابو ہو رہا تھا۔ چہرے پر سرخی کی  
 چٹنی تھی اور ہاتھوں میں بے ساختہ سی لرزش۔ اس کا پورا  
 بدن سرشاری کی کیفیت میں تھا۔

”اور خاص طور پر جب ماحول کی نفاست اور  
 خوبصورتی ان آن وانڈ باتوں سے بری طرح ڈھکی ہو  
 رہی ہو۔“ ذرا سنبھر کر باس نے کہا۔

درشہوار نے ایک مرتبہ پھر چونک کر باس کو دیکھا۔  
 یہ کیسا لہجہ تھا؟ یہ کیسے نامانوس سے الفاظ تھے جو پہلے کبھی  
 ادا نہ ہوئے تھے؟ تجیر کی شدت اس کے حواس پر غالب  
 آ رہی تھی۔

”تم کبھی آفس سے فارغ ہو کر تفریح بھی کرتی  
 ہو؟ میرا مطلب ہے سیر وغیرہ؟“ آج غالباً باس کا لہجہ  
 اس لیے قدرے مختلف تھا کہ وہ ان باتوں کا بوجھ ذہن پر  
 سے اتارنا چاہتے ہیں جو شاید انہیں پسند نہیں  
 درشہوار نے سوچا اور حوصلہ بحال کر کے بولی۔

”جی سر..... یہ جو قریب ہی پارک ہے کبھی کبھی  
 وہاں چلی جاتی ہوں۔“

”وہ پارک تھوڑا ہے جنگل ہے پورا۔“ فرید کمال  
 نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔ ”اس میں درختوں اور  
 جھاڑیوں کی بھرمار ہے۔ پھول کم ہیں درخت زیادہ۔“

”جی..... اور پرندے بھی ہیں۔“ درشہوار نے  
 دہلی آواز میں کہا۔ اتنے میں پیون کا غذا کا پلندا لے  
 کر آ گیا اور گفتگو کا یہ جاں فزا سلسلہ ختم ہو گیا۔ درشہوار  
 پھر اپنے کام پر جھک گئی، دل کی دھڑکنوں میں اک نئی  
 لہریں لگی۔

اس مٹھے مٹھے لہجے سے

ہوئی ہے دل داری سی

دستک دل دروازے پر

بن گئی اک سرشاری سی

دل آگن میں برے موتی

کھل گئی اک پھلوا ری سی

لہجے کی پروائی سے  
 جگمگاتی ہے ہریالی سی  
 جگمگاتی لفظوں کے  
 جگمگاتی دیوالی سی

”کچھ دن اور سرک گئے۔ وہ اب آفس جانے کی  
 شدت سے منتظر رہتی، کیوں؟ یہ اسے خود بھی معلوم نہ  
 تھا۔ آفس کی مصروفیات، اشتغال سب ویسے ہی تھے پھر  
 فرق کہاں تھا۔ نعمانہ اپنے ہوشربا انداز سے سارے  
 ماحول کو مٹھی میں لیے تھی۔ اس کا اسٹنٹ امجد برابر اس  
 کا ہاتھ بٹاتا اور دوڑ دوڑ کے کام کرتا۔

”تمہیں معلوم ہے نعمانہ قیصر جیسی خاتون کو یہاں  
 کیوں رکھا گیا ہے؟ حالانکہ میں اس قسم کی آزاد روی کو  
 پسند نہیں کرتا۔“ ایک دن فرید کمال نے پھر درشہوار کو  
 مخاطب کیا اور اس کا سارا جسم کان بن کر سننے لگا۔

”اس لیے کہ ان محترمہ کی پی آرز بردست ہے۔“  
 انہوں نے خود ہی جواب دیا۔

”میرے اس کاروبار میں جتنے لوگوں سے کام  
 پڑتا رہتا ہے ان سب سے اس کی واقفیت ہی نہیں اس  
 سے زیادہ کچھ ہے اور بزنس میں ایسے لوگ اہم ہوتے  
 ہیں۔“ انہوں نے بات ختم کر کے اپنی ساحر آنکھوں  
 سے اسے دیکھا اور کاندھوں پر جھک گئے۔ ایک اطمینان  
 سا شہوار کے دل میں اتر گیا۔ وہ نعمانہ کی باتوں کی  
 کرچیوں پر چلنے کو مجبور تھی لیکن ان چند جملوں سے جھین  
 کم ہو گئی۔ وہ کچھ دیر سکون کے جھونکے کا مزہ سچ رہی۔

گزشتہ مہینوں میں کئی دفعہ نعمانہ اور فرید ہوٹلز میں  
 گئے لیکن نعمانہ اسے کبھی ہمراہ نہ لے گئی۔ لے جانا تو ایک  
 طرف رہا وہ اس سے صلاح بھی نہ کرتی تھی۔ شہوار خود کو نظر  
 انداز کیے جانے پر رنجیدہ تو ہوتی مگر خاموش رہتی۔

نعمانہ کی حکومت ہر طرف تھی۔ اس ویک اینڈ پر پی سی  
 میں ایک زبردست محفل کا انعقاد تھا۔ شیع کمال گروپ کا  
 اجتماع اور اس کے بعد شاندار ڈنر۔ نعمانہ کا ہوش اڑا  
 دینے والا لباس اور بہترین میک اپ ایسا تھا کہ اس کی  
 طرف سے نظر نہیں ہٹتی تھی۔ جاتے ہوئے غلاف معمول  
 فرید کمال اپنے پروتار انداز اور متوازن چال سے چلتے



اس کو نے میں آئے جہاں شہوار اپنے کام میں منہمک تھی۔ ان کے قریب آنے پر وہ کھڑی ہو گئی۔ شاید کوئی ضروری کام ہو..... وہ منتظر رہی۔

”چلو..... تم بھی ہمارے ساتھ۔“ وہ نرم دہمی آواز شہوار کی طرح برسی۔

”جی.....؟“ شہوار کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ”میں.....؟“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا اور بے اختیار اس کی نظر اپنے ہلکے کاسی لباس کی طرف لگی۔ فرید اسے غور سے سرتا دیکھتے ہوئے بولے۔

”یہ لباس بالکل ٹھیک ہے۔ ڈھول کی بے ہنگم آواز میں جلتی رنگ کی مترنم سیٹیاں بھی ہونی چاہئیں۔“ وہ مسکرا کر نغمہ کی طرف مڑے۔ ”کیا خیال ہے نغمہ؟“ ان کی آواز میں خفیف سا حکم تھا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ اٹھائی۔ لباس کا احترام لازمی تھا۔

اور امید و بیم کے درمیان جمواتی شہوار بھی اس لمبی چوڑی کار میں بیٹھ کر جی پی سی جانے کو تیار کھڑی تھی۔

وہ بی سی کی شاندار عمارت کے سامنے رکے۔ اور ققموں سے جھللاتی لفٹ میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل کا ڈیکور اس قدر دلکش تھا کہ شہوار مبہوت رہ گئی۔ وہ پہلے گھبی اس ہوٹل میں نہیں آئی تھی۔ جمہوروں کی طرح جیکے بلورین فانوس، جگمگا تا ماحول، بھلیں کرسیاں، دبیز قالین، ادھر ادھر سالیوں کی طرح پھرتے باوردی بیرے۔

شفیع کمال گروپ کے سبھی افراد موجود تھے۔ نغمہ نہ ہنس نہ سب سے مل رہی تھی۔ شہوار کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ اس کے کانوں میں لٹکتے ہوئے باشت بھر گئے آویزے اس کے عریاں شانوں پر جم رہے تھے۔ لباس کا ہر رنگ سرخ گلوں کا گلوبند جھلک کر رہا تھا۔ لباس پر نکلے ستارے اس کی ہر حرکت پر چمک جاتے۔ شوخ قمری لب اسٹک اور ویسی ہی نیل پالش سے جی انگلیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ بار بار قہقہوں سے سفید دانت زیادہ چمکدار نظر آتے۔ ایک کلائی میں اس نے مٹوئی کی لڑیوں سے مزین بریسلٹ پہن رکھی

تھی۔ جسم پر لگایا ہوا عطر دھو میں مچا رہا تھا۔ شہوار بھی رہی تھی کہ نغمہ ناڈل کیوں نہیں بنی۔

گروپ کے سب عہدیدار فرید کمال سے پتہ کر رہے تھے جو برنس کی کامیابی کو ظاہر کرتی تھیں۔

بچ میں نغمہ کے قہقہے بھی گونج اٹھتے۔ کامیابی اور کمال سے اس کا چہرہ کھنار ہو رہا تھا۔ شہوار قدرے سامنے سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا حلق خوشحال گھراں سے ضرور تھا مگر ایلٹ کلاس سے نہیں۔ اب جو اس ماحول کی گہرائی میں جھانکنا تو کچھا اچھا نہ لگا۔ یہ ضرورت سے زیادہ بے باکی، عریانی اور مدح و عورت کا اختلاط ہے پسند نہ آیا۔ وہ اپنی فطرت کی سادگی اور حیاداری میں کبھی رہتی اور اسی میں گن رہتی تھی۔ وہ فطرتاً کم گوئی اور دل اس عادت سے مطمئن تھی۔

محفل اپنے عروج پر تھی۔ بیش قیمت سونوں ٹائیوں اور جواہرات جڑی انگوٹھیاں پہنے، بھاری تن قوش والے کاروباری لوگ برنس مارکیٹ اور اشیاء کے اتار چڑھاؤ کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ ایک شاندار اجتماع تھا جس میں ہر ضلع کے لوگ تھے۔ محبت میں جڑی روشنیاں کمرے کو منور کر رہی تھیں۔ بڑے بڑے برقی فانوس روشن تھے۔ ہوٹل کا شاندار ڈیکور آنکھوں پر چندھیائے دیتا تھا۔ ایک طرف اپنے ساز و سامان سمیت ہوٹل کا موسیقار بیٹھا حاضرین کی فرمائش پر دھواں نغے سنا رہا تھا۔ اب ڈنر کا وقت ہو چکا تھا۔ سب معزز مہمان ایوان طعام میں چلے گئے۔ ایک بے حد طبع میز کے گرد بھلیں کرسیوں پر سب لوگ فروکش ہو گئے۔ بیرے کھانا لا کر رکھ رہے تھے۔ اشتہا انگیز خوشبوؤں سے کمرہ مہکتے لگا۔ میز پر جگہ جگہ بلورین گلدانوں میں بڑی نفاست سے پھول سجے تھے۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا اور کام و بہن کی خدمت بھی۔ سیٹھ الیاس جن کی فیکٹری بھی اپنی پلیٹ میں بیانی ڈالتے ہوئے بولے۔

”بھئی فرید، داد دیتا ہوں تمہارے ذوق کی۔ زبردست ڈشیں بنوائی ہیں، واہ.....! خوشبو سے ہی آگیا۔“

”تو بس پھر خوشبو سے ہی پیٹ بھر لو۔“ فرید

والی کرسی پر بیٹھ کر فیکٹری والے میاں سعید نے کہا۔ اس پر سب ہنس پڑے۔ مردانہ قہقہوں میں نغمہ کی سرکشی بھی سب سے نمایاں تھی۔ وہ ایک خوبصورت ڈیکوریشن میں کی طرح سب کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ مشروبات کی فیکٹری کے مالک خلیل شیخ اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آ رہے تھے۔

”یار، تمہارے اس بیچنے نے تو معجزہ کر دکھایا۔“ اسپورٹس کے سامان والے سیٹھ ایاز نے فرید کو مخاطب کیا۔

”تھینکس.....!“ متین لہجے میں جواب ملا۔ ”ایاز بھائی جانتے نہیں، برنس سٹیکٹ ہیں۔“ ایک اور صاحب بولے۔ ”شفیع کمال گروپ کو انہوں نے اوج کمال تک پہنچایا۔“

”واہ واہ..... کیا شاعری ہے، کمال اور اوج کمال۔“ شیخ خلیل نے داد دی اور شامی کباب شور بے میں ڈبو کر کھانے لگے۔ سیٹھ ایاز مرغی سے نہرو آ رہے تھے۔ فرید نے نظر اٹھا کر شہوار کو دیکھا وہ سر جھکائے پلیٹ میں رکھی تھیں اور مائیز سلا کو کانٹے سے اٹھا کر منہ میں ڈال رہی تھی۔ دونوں اشیاء کی مقدار کم تھی۔ فرید نے چائیز رائی کی ڈش اس کے قریب سرکادی۔ شہوار نے چونک کر دیکھا۔

”لے لیجیے، تکلف نہ کریں۔“ وہ آہستہ سے بولے۔ شہوار کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

”وہ ہم سے ہوئے ہم کو اللہ اللہ.....“ یہ مصرع نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں آ گیا۔ اس نے تھوڑے سے چاول اپنی پلیٹ میں لے کر ایک تھکر نگاہ فرید پر ڈالی۔ ان کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اس چھوٹی معمولی سی حرکت سے زندگی جیسے سُر میں آ گئی۔ آس پاس کی ہر جاندار اور بے جان چیز گنگٹانے لگی۔ دل کی ہر گھڑکن میں یہ کیسی دلوانوڑی گئی۔ ہوٹل کی ساری خوبصورتی، موسیقار کی دھنیں، ہنستے بولتے لوگ اچانک اچھے لگنے لگے۔ رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر روانہ ہوئے۔ فرید کمال، نغمہ اور شہوار اکٹھے نکلے۔ راستے میں انہوں

نے شہوار کو اس کے گھر اتار دیا۔ کار فرید کمال، نغمہ اور ڈرائیور کو لے کر فریڈ نے بھرتی غائب ہو گئی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ آس کی مصروفیات کے اندر رونقیں بھی شامل ہو گئیں تھیں اور شہوار ان کی وجہ سے دیر میں آئی تھی۔ امی اس کے انتظار میں کھل رہی تھیں۔ پریشانی ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔ شہوار دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور فنکشن کا حال کہہ سنایا۔ وہ اپنی ماں کے گرد بازو لپیٹے انہیں لیے اندر آ گئی اور پوری تفصیل سے انہیں ساری باتیں کہہ سنائیں۔ شمیم بیگم غور سے سن رہی تھیں۔ اب ان کے چہرے پر سکون اور اطمینان کے ساتھ خفیف سا تسک بھی تھا۔

”گویا تم اس فنکشن سے خوب لطف اندوز ہوئیں۔“ انہوں نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”جی امی..... کالج کے چھوٹے موٹے فنکشنز کی عادی تھی۔ اب یہ بڑی گید رنگ بھی دیکھی، اچھا تجربہ تھا۔“ شہوار کا لہجہ خوشگوار تھا۔ اس نے تقریب کی ایک تفصیل، ہوٹل کی زیب و زینت وہاں کا شاندار ماحول، موسیقی سب کہہ سنائی۔

”چلو ہمارا بیٹا خوش ہو گیا اور یہ بہت بڑی بات ہے۔“ شمیم بیگم نے محبت سے کہا۔

”امی.....“ شہوار نے قدرے جھجک کر کہا۔ ”سب سے بڑی بات تو مجھے اس تقریب کی یہ لگی کہ اس میں ہر طرف جام نظر آنے والی ونگریں نہ تھیں۔“ اس نے متانت سے بات پوری کی۔ شمیم بیگم کے چہرے کا سکون گہرا ہو گیا۔ طمانیت سے انہوں نے ایک طویل سانس لی اور بولی۔

”واقعی یہ بات انتہائی قابلِ قدر ہے اور یہی کھٹک میرے دل میں تھی۔“

”ہونی تو نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ فرید کمال یعنی باس خود بڑی اچھی منچر کے مالک ہیں۔“ شہوار نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے اور ایک خاص حد میں رہتے ہیں۔ نغمہ کے متعلق میں نے آپ کو بتایا تھا۔ وہ کافی ایڈوانس ہے لیکن یہ اس کی حرکتوں کو



پسند نہیں کرتے۔ صرف کاروباری ضرورت کے تحت اس کو رکھا ہے، جیسے شین کا کوئی پرزہ ہو۔“ شمین بیگم اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ سونے کے لیے کمرے میں چلی گئیں۔

شمین بیگم کو بیٹی کے مستقبل کی پریشانی بھی تھی۔ انہوں نے کسی معقول رشتے کے لیے اپنی بیٹی دوستوں کو کہہ رکھا تھا مگر شاید حالات کی طرف سے بندش تھی۔ کام بن نہ پا رہا تھا۔ رشتے بھی برسات کی بھیگی چارپائی کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک پائے کو سیدھا کر دو تو دوسرا اٹھ جاتا ہے، یہی لڑکا اچھے عہدے پر فائز ملا تو انتہائی گروہ خاندان بھی موبھی۔ اور اگر خاندان اور صورت اچھی ہوئی تو لڑکا برسر روزگار نہیں۔ غرض کوئی نہ کوئی کی رہ جاتی تھی اور شمین بیگم ابتدائی بے مبری کے بعد اب کچھ کچھ مہر کی عادی ہو چکی تھیں۔

ادھر آفس میں نعمانہ کی حاکمیت اعلیٰ دیے ہی چل رہی تھی۔ سارے عملے کو اس نے اپنی گلیسر شخصیت سے منشی میں لے رکھا تھا۔ شہوار کوئی دفعہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آتی لیکن وہ اندازہ نہ لگا سکی کہ یہ چمک کس وجہ سے تھی..... عیاری، مکاری، سازش، لالچ یا کسی اور خطرناک وجہ سے۔ اگر وہ اس برٹس گروپ کی چیئر مین ہوتی تو یقیناً اس کا نوٹس لیتی لیکن وہ بے اختیار تھی۔ بے بسی سے صورت حال کو دیکھتی اور خاموش ہو رہتی۔ نعمانہ کی اس سے چٹمک بھی جاری تھی۔ ایک سرد جنگ جس کا اور کسی کو علم نہ تھا۔ وہ کچھ اس انداز سے شہوار پر فقرے کستی جو صرف اسی کو چبھتے اور کسی کو پتا نہ چلتا۔ دراصل وہ اپنے بے تحاشا میک اپ، زیورات اور شوخ لمبوسات سے بچی خوبصورتی کے باوجود شہوار کے مہوت کر دینے والے ملکوتی حسن سے خائف رہتی تھی۔ وہ فرید کمال کو صرف اپنے قابو میں رکھنا چاہتی تھی۔ کسی اور کا عمل دخل اسے منظور نہ تھا۔ حالانکہ اس سلسلے میں شہوار بالکل بے ضرر تھی۔ وہ محض اپنے کام سے کام رہتی۔ اس کی دلکش شخصیت کسی اور پر کس طریقے سے اثر انداز ہو رہی ہے اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ جب کہ نعمانہ اپنی ذکاوت حس سے بہت کچھ جان چکی تھی

اور اس کے مداوے کی ترکیبیں آزمایں تھیں۔ شہوار کی طرف اٹھنے والی فرید کمال کی ہر نظر ایک خاموش پیغام ہوتا تھا جسے نعمانہ بخوبی سمجھتی تھی۔ اپنے کام میں مگن، اپنے خیالات میں گم شہوار کی اس منزل پر نہ پہنچ پائی تھی۔ البتہ اپنے محسوسات کا بخوبی علم تھا۔ ان بلندیوں پر چڑھتی ہوئی وہ کن میدان تک آن پہنچی تھی۔ اسے سوچ کر وہ کانپ جاتی اس کا انجام کیا ہو گا۔ نعمانہ کا حسن اور ادا میں تو کسی پتھر کو کچلا دینے پر قادر تھیں اور ادھر اس کے پاس کیا تھا۔ خاموش احساسات، پندار میں لپٹا الفت، جس میں اظہار تھا نہ نعمانہ کی سی بے باکی۔ وہ اپنی اس مثال اپنے وجود میں چھپائے تھی..... اور غنچے کو جب تک انہیں کیا جائے اس کی خوشبو کہاں پھیلی ہے۔

ان کے جملے اچھے چمکتے چمکتے تھکرو شکل سے نغے مہر بلب ہیں وہ سارے جذبے وجود خالی ایام جیسا! سدا کھلائے تھے جس نے کشن مہک رہا ہے جو پھول بن کر میرا تصور وہ میرا گل بدن وہ باغ جیسا وہ راغ جیسا ہزار باتیں نہ جن کی اشکریہ نہ جن کے معنی نہ جن کی توجہ ضرور تھا کہ تمہیں سنائیں مگر ہے مشکل کہاں سے لائیں وہ نطق ایسا بلاغ ایسا عملے کے ارکان سے وقفا وقفا جو باتیں وہ سناتی اس سے فرید کمال کے متعلق اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ اپنی والدہ اور بیوہ بین کے ساتھ رہتے ہیں، والدہ حیات نہیں خاندان کے لوگوں سے ان کا کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔ ان کی عادات و خصائص کو وہ خود دیکھ اور سمجھتی تھی۔ قدرتی بات ہے جس سے تعلق خاطر ہو اس باتوں اور عمل سے دلچسپی خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ وہ خیالات سے بے خبر مگر اپنے محسوسات کا ادراک

تھی۔ یہ حالات کی عجب ستم ظریفی تھی۔ اس روز وہ جب آفس سے واپس اپنے گھر کی تو دو اجنبی خواتین اس کی اہلی کے پاس سے اٹھ کر جارہی تھیں۔ جب وہ باہر چلی گئیں تو شہوار نے پرسی سا پوچھا۔

”امی یہ کون ہیں؟ میں نے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔“

”وہ مجھ سے سویٹر کا نمونہ لینے آئی تھیں۔ کسی محفل میں مجھے پہننے دیکھا تھا کچھ سال۔“ انہوں نے سوچ کر جواب دیا۔

”اچھا کچھ کھانے کو دیجیے، بہت بھوک لگی ہے۔“

شہوار نے پرس اور کچھ فائل صوفے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”آج تو کرائی نہیں آئی؟“

”وہ کہیں شادی پر گئی ہے۔“ شمین بیگم کچن میں جاتے ہوئے بولیں۔ شہوار نزدیک والے بڑے صوفے پر ڈھیر ہوئی۔

”یہ لو اپنی پسندیدہ چیز۔“ شمین بیگم نے میز پر ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔ ”آج میں نے تمہارے لیے تیار کیا۔“

”ارے امی زندہ باد۔“ شہوار نے اچھل کر بیٹھتے ہوئے کہل پوریاں کھاتے ہوئے وہ ان کی تعریف کرتی دھ پھر بولی۔ ”امی جیسا آپ کے ہاتھ میں ذائقہ ہے، میرے ہاتھ میں کیوں نہیں؟“

”اس لیے کہ بارہا جیز بنانے سے ٹریننگ مل جاتی ہے اور ہاتھ میں خود بخود ذائقہ آ جاتا ہے۔“ شمین بیگم نے محبت سے کہا۔ ”پرکیش کسی بھی ہنر کی تکمیل کے لیے ضروری ہوتی ہے۔“

”ہوں، ہوں۔“ شہوار بھرے منہ سے بولی۔

”پھر کھانے کے بعد وہ آرام کے لیے لیٹ گئی۔ زندگی خوبصورت تھی مگر کہیں اس میں کمی تھی۔ شہوار اپنی زندگی میں سوچتی رہی اور پھر سوئی۔



فرید کمال کو فیکٹری وراثت میں ملی تھی جسے اپنی گن اور محنت سے انہوں نے ترقی کے اس مقام پر پہنچا دیا تھا

کہ ان کی فیکٹری کے فرنچیز کی دور دور تک مانگ تھی۔ ان کی فیکٹری میں بننے والی آرائشی اشیاء اپنی خوبصورتی، پائیداری اور نفاست میں بے مثال ہوتی تھیں۔ خوش قسمتی سے انہیں عملہ بھی نہایت دیانتدار اور فرض شناس ملا تھا۔ لہذا کاروبار میں ترقی لازمی تھی۔ اپنی فیکٹری سے ان کی اس محنت اور لگن میں اب ایک نیا اور نوکساخار پیدا ہو گیا تھا۔ ایک نئے جذبے نے دل کے اندر سر ابھار کر انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ان کی پوری ہستی سرشار سی ہو گئی تھی۔ زندگی میں ایک دلربائی، حسن اور مہک سی آگئی تھی۔ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں..... وہ سوچتے۔

موسم بدلنے لگا تھا۔ گرمیوں نے سردیوں کو جگہ دے دی تھی۔ رات کو سیاہ آسمان پر سنہرا چاند دمکا تو دن کو گلاب کی کیاریوں میں نومبر کے خوشنما پھول جھومتے نظر آتے۔ ہواؤں میں خنکی اور مہک دونوں ہوتیں۔ سبزیوں سے بھرے کھیت آنکھوں کو بھلے لگتے۔ پیڑوں پر لیموں اور ہرے مالے نظر آنے لگے تھے۔ صبح کے وقت سنہری دھوپ کی ہلکی سی حرارت جسموں کو گرما دیتی۔ باغوں میں مقامی پرندوں کی چپک چپک کے ساتھ سرد ممالک سے ہجرت کر کے آنے والے مانی گریٹر برڈز کی سیٹیاں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ بڑے عرصے کے بعد شہوار اپنے پسندیدہ باغ میں پہنچی۔ آفس میں آج کسی وجہ سے جلدی چھٹی ہو گئی تھی۔ اس نے بیچ پر بیٹھ کر اپنا بیک کندھے سے اتارا۔ اس میں ننھا سا رنگارنگ تھا جس میں وقفا وقفا بھری جانے والی پرندوں کی آوازیں تھیں۔ اس نے اسے آن کر دیا باغ سریلی سیٹوں اور مترنم چپکاروں سے گونج رہا تھا۔ پرندے ادھر سے ادھر اڑائیں بھرتے پھر رہے تھے۔ شہوار انہیں دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ سرخ، سبز، سلینی، زرد، سفید غرض ہر رنگ کے پرندے تھے۔ وہ ان میں جو بھی کہ اچانک چپٹی کے گھنے جھاڑ کے پیچھے سے اسے انسانی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔ اس آواز کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ یہ نعمانہ تھی۔ وہ کسی سے گفتگو کر رہی تھی۔ آواز اتنی صاف تھی کہ شہوار کو بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے غور



سے سننا شروع کیا۔

”میں پوری محنت کر رہی ہوں۔“ نغمہ نے کہا۔  
”جی ہاں۔“ نغمہ نے کہا۔  
”تم ہاؤ سائن کی نقل کہاں تک پرکھت ہو گی؟“

”انتا آسان نہیں ہے یہ کام۔“ دوسری آواز  
اجھڑی تھی۔ جسے شہوار نے بدقت سے لیکن پہچان لیا۔ وہ  
بول رہا تھا۔ ”محنت کے اتنے اچھے ہوئے سے سائن  
ہیں کہ بس کچھ پوچھ نہیں۔ میں نے ایک ماہر ترین آدمی  
سے رابطہ کر رکھا ہے جو دستخطوں کی نقل کرنے میں استاد  
ہے۔ اس نے آج تک جتنے بھی سائن کی نقل کی انہیں  
کوئی پہچان نہیں سکا لیکن اس دفعہ وہ بے چارہ بھی چکرا  
گیا ہے، خبر نہیں کس قسم کے سائن ہیں تمہارے پاس  
کے، قابو میں ہی نہیں آ رہے۔“

”میرا پاس..... اور تمہارا نہیں؟ تم بھی تو اسی کے  
آفس میں کام کرتے ہو؟“ نغمہ نے کہا۔ ”اسی پلان کو  
مکمل کرنے کے لیے تو میں تمہیں یہاں لائی تھی۔ شکر  
ہے فرید نے مان لیا۔“ وہ ہنسی۔

”ہاں..... پتا نہیں اس فنیک سے کب گلو خلاصی  
ہو گی۔“ اجھڑی آواز آئی۔ ”اور ہم آرام سے کب اپنی  
دنیا بسائیں گے۔“ سچ فنی! میں تو انتظار کرتے کرتے  
تھک گیا۔“

”تھوڑا صبر کرو۔ اس کا پھل بھی تو میٹھا ہے اور کتنا  
میٹھا! چھ کروڑ۔ مانی گاڈ! بس اجھڑی دیر اور.....  
منزل دور نہیں۔“ نغمہ نے نشہ بار لہجے میں کہا۔

”خدا کرے ہم دونوں کی محنت بار آور ہو اور  
ہم.....“ اجھڑی آواز دونوں کے دھیمے تھمتوں میں مغل  
مل گئی۔ ”پھر فرید کمال فیکٹری کا سارا اثاثہ ہمارا ہوگا، اور  
شہوار جیسے نیند سے جاگ اٹھی۔ گو میں بڑا ریکارڈر چل  
رہا تھا اور پرندوں کی آوازوں کے ساتھ نہایت صفائی  
سے نغمہ اور اجھڑی کی باہمی گفتگو بھی ریکارڈ ہو چکی تھی وہ  
منجھدی بیٹھی رہی۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ وہ  
مکمل طور پر درختوں اور جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی۔  
اس نے تو یہ جگہ اس لیے ڈھونڈی تھی کہ اس کج میں  
پرندے کثرت سے تھے اور ان کی آوازیں ریکارڈ

کرنے کے لیے یہ جگہ آئیڈیل تھی۔ یہ نہیں معلوم  
قدرت نے ایک خطرناک سازش کو بھی اس کی  
حرکت سے فاش کرنے کا ذریعہ بنا دیا تھا۔  
دونوں کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ شاید چلے  
اپنی طرف سے انہوں نے ایک نہایت پوشیدہ  
کی بھی گھر.....

تدبیر کنندہ ہندوہ تقدیر کند خندہ!  
شہوار نے بے خیالی سے ریکارڈر آت کیا۔  
بیک میں رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا پرس بھی  
میں تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پرندوں کی چکا  
کے ساتھ ہی غالباً نغمہ اور اجھڑی کی باہمی گفتگو بھی ریکارڈ  
ہو چکی ہے۔ اب وہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر اس شپ  
چاہتی تھی۔

گھر پہنچ کر اس نے کھانا کھایا۔ امی سے دن  
حال پوچھا۔ ان کی اپنی طبیعت دریافت کی اور اس بات  
کے انتظار میں رہی کہ کب وہ دوپہر کے کھانے کے  
آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں جاتی ہیں۔ آ  
باتیں کرنے کے بعد وہ انہیں اور اپنے کمرے میں جا  
پلنگ پر لیٹ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انہیں نیند آ گئی۔  
نے دے پاؤں جا کر ان کے کمرے میں جھانکا۔ وہ  
خبر سو رہی تھیں۔ شہوار نے اپنے بیڈروم آ کر دروازہ  
کر کے اس کی چٹنی چڑھائی۔ میز پر پڑے بیک میں  
ریکارڈر نکالا اور پلنگ پر بیٹھ کر اسے آن کر دیا۔ والیم  
رہی تا کہ آواز باہر نہ جا سکے۔

شپ میں سے پہلے تو چند منٹ پرندوں کی  
اور سریلی جھکار سنا لی دیتی رہی پھر لیکن نغمہ نے  
اجھڑی..... شہوار پوری یکسوئی اور غور سے سننے لگی۔  
ایک لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد  
آواز سنائی دی۔ ان کی مکمل گفتگو کو شہوار نے  
ریکارڈنگ میں کوئی کمی یا خالی نہ تھی۔ اس نے  
کی سانس لے کر ریکارڈر آف کر دیا اور خود سوچوں  
کھوئی۔

یہ دوائے افرا دی جمید بھری گفتگو تھی جو اپنے  
کے خلاف ایک خطرناک سازش تیار کر رہے تھے۔

مالی طور پر تیار کرنے کی ساز باز میں مصروف تھے۔ اس  
مالک کے خلاف جو انہیں روزگار مہیا کر رہا تھا جس کے  
ساتھ ان کے دوہ دونوں مل رہے تھے۔ شہوار کو ایک ایک  
بات یاد آ رہی تھی۔ کس طرح فرید کمال نے ان پر اپنی  
تواؤشات کی تھی۔ نغمہ جیسی عورت کو مکمل عزت اور  
احسانات دے رکھے تھے۔ شفیق کمال گروپ کی کمان  
پوری طرح اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اس پر بھروسہ  
کرتے تھے اور کس طرح نغمہ ان کے بھروسے کو تار تار  
کرنے کے ساتھ ساتھ کفر فرید کمال کی عزت اور مال و دولت  
کو بنانے پر لگی تھی اور فرید اس سے بالکل بے خبر تھے۔  
شہوار نے ایک لمبی سانس لی اور بستر پر لیٹ گئی۔ وہ  
دوسرے دن دفتر جا کر اس سازش کے مکمل ثبوت یعنی  
شپ کے ساتھ انہیں اس خطرناک فتنے سے آگاہ کرنا  
چاہتی تھی۔ وہ اس غداری سے انہیں خبردار کرنا چاہتی تھی  
اس لیے کہ وہ اس کے بھی پاس تھے۔ کیا صرف پاس؟  
اندر سے ایک سوال اجھڑا اور شہوار کے رخسار سرخ ہو  
گئے۔ وہ ایک راز جو دل کے نہاں خانے میں مستور تھا  
اب اس کی رگ رگ میں خون بن کر دھڑکنے لگا تھا۔  
اس کی پیشانی پر اس خنکی میں بھی پسینہ آ گیا۔ کیا یہ جذبہ  
یک طرفہ تھا؟ اس نے سوچا۔ شاید.....! اس نے چپکے  
سے پتلی پر بہہ آنے والے آنسو کو انگلی سے پونچھ لیا۔

☆☆☆

نومبر کے نیلے آسمان پر سنہری چاند روشن تھا۔ نغمہ  
میں چاندنی کانٹوں طاری تھا۔ اپنے بیڈروم کا دروازہ  
کھول کر فرید کمال باہر میز پر آگئے اور نظر بھر کر پورے  
چاند کے تابناک چہرے کو دیکھا۔ دل کے گوشے میں  
جسما ایک خیال ہمک کر باہر آ گیا۔ وہ بھی اس چاند کو  
دیکھ رہی ہوگی۔

در شہوار! کسی نے کیا خوب نام رکھا ہے اس کا۔  
واقعی وہ ایک دلربا، چمکدار موتی ہے۔ زندگی اور ماحول  
جس کے ہونے سے منور ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ تو اپنی  
محافظات کے حصد میں مستور رہتی ہے۔ شرم و حیا کے  
خیمے میں چھپی ہوئی تعلقات کے پردے میں نہاں۔ اس دلربا

## بیرون ملک مقیم تاجریں

جاسوسی سسپنس پاکستانیہ

سرگزشت اور کش

## رسالہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائریل

اپنا پیسہ ڈالنا محنت کھینچنے حاصل کریں

ڈاک خرچ میں 100% اضافے کی وجہ سے فیروم مالک  
کے لئے ڈاک رسالہ کی شرح مندرجہ ذیل ہوگی

ایشیا یورپ اور افریقہ کے لئے ڈاک

رسالہ ڈاک خرچ تقریباً 3080/- روپے

12 شماروں کی قیمت 420/- روپے

ڈاک رسالہ 3500/- روپے

امریکا، آسٹریلیا، آئرلینڈ، نیوزی لینڈ کے لئے ڈاک

رسالہ ڈاک خرچ تقریباً 4080/- روپے

12 شماروں کی قیمت 420/- روپے

ڈاک رسالہ 4500/- روپے

لئے ڈرافٹ اور منی آرڈر اور اس کے تاہم، ذیل میں درج  
ہے پھر ارسال کریں۔ یہ کہ راجی میں قاتل ادائیگی ہونا ضروری  
ہیں۔ بیرون شہر ادائیگی کی صورت میں کو بیڑ چارٹر اور بینک  
کمیشن کے 500 روپے بیرون ملک ادائیگی والے ڈرافٹ  
وغیرہ پر اس مدد میں 1500 روپے کا اضافہ کر لیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ اپیلی کیشز

63-C PHASE II EXTENSION,  
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,  
KARACHI 75500  
PHONES: (92) (21) 5802552,  
5804200 FAX: 5802551,  
E-MAIL: jdpgroup@hotmail.com



کو کس زبان میں سمجھاؤں کہ مجھے وہ زبان ہی نہیں آتی۔  
شاعر نہیں ہوں کہ کہہ سکوں۔

میرے خوابوں کے بھر دوں کو سجانے والی  
ترے خوابوں میں کہیں میرا گزر رہے کہ نہیں  
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو  
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں  
کہیں ایسا نہ ہو پاؤں مرے ٹھہرا جائیں  
اور تری مرمر میں بانہوں کا سہارا نہ ملے  
اشک بچتے رہیں خاموش سیاہ راتوں میں  
اور تیرے ریشی آج کل کا کنارہ نہ ملے  
پیار پر بس تو نہیں ہے میرا لیکن پھر بھی.....

اور یونہی دیکھتے دیکھتے چاند ڈوب گیا۔ فرید اپنے  
کمرے میں آگئے۔ سوچتے اور کدوئیں بدلتے رہے۔  
آخر انہیں نیند آگئی۔ ایک ڈسٹر بڈ نیند۔

اگلے روز جب وہ آفس پہنچے تو شہوار پاس آ کر  
خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔  
فرید کمال نے نگاہ اٹھائی۔

”کوئی کام؟“ نرم لہجے میں انہوں نے پوچھا۔  
”جی سر..... لیکن میں..... میں اس کے لیے تہائی  
چاہتی ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ آنکھیں جھکی  
ہوئی تھیں۔ فرید کمال حیران رہ گئے۔ تہائی! کتنا ریشمی  
سلفظ تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتی ہے آخر؟ انہوں نے سوچا  
اور بولے۔

”فحیک ہے۔“ اور انہوں نے اٹھ کر دونوں باہر  
کھلنے والے دروازوں کی چٹخیاں چڑھا دیں۔ وہاں آ  
کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”اس کرسی پر بیٹھ  
جاؤ اور جو بات کہنا چاہتی ہو کہو۔“ وہ میز پر کہیاں ٹیک  
کر آئے ہو بیٹھے۔

شہوار نے بیگ کھول کر اس میں سے ریکارڈز نکالا  
اور آہستہ سے آن کر دیا۔ پرندوں کی آوازیں سن کر فرید  
متحیر تھے کہ اچانک نعمانہ اور پھر امجد کی آوازیں آنے  
لگیں۔ در شہوار کی نگاہیں ان کے چہرے پر جمی تھیں  
جہاں باری باری شدید حیرت، غصہ، نفرت اور اشتعال  
کے رنگ ظاہر ہو رہے تھے۔ شہوار کا دل انہی کے ساتھ

دھڑک رہا تھا۔ ان کی سوچ اس کی سوچ بن چکی تھی  
ٹیپ ختم ہو گیا۔ انہوں نے اسے آف کیا اور اٹھ کر  
ہوئے۔ انہوں نے اپنی سیاہ آنکھوں سے  
دیکھا۔ ان کے چہرے ہوئے لب کھلے اور ان سے  
نکلے۔

”تم نے اتنا بڑا احسان مجھ پر کیا ہے کہ  
پاس شکر ہے کے لیے الفاظ نہیں۔“ انہوں نے ایک  
سانس لی۔ ”تم نے میری عزت، مقام، آغا سب  
بچا دیا ورنہ میں اس سازش سے بے خبر رہ کر سب  
بیٹھتا..... اچھا اب اجازت۔ مجھے اس سلسلے میں  
ضروری اور فوری اقدامات کرنے ہیں  
خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر وہ مڑے شہوار بھی اٹھ کھڑی  
اور دے لفظوں میں بولی۔

”اللہ آپ کو ہر نقصان سے بچائے۔“ انہوں نے  
ایک فکڑنگا اس پر ڈالی اور باہر نکل گئے۔ ”خدا آپ  
حفظ و امان میں رکھے۔ میرے ہم، میرے آقا  
حافظ۔“ بے صدا دعا اس کے دل سے نکلی اور وہ  
ان کے پیچھے بند ہوتے دروازے کو دیکھتی رہی۔  
کمال نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ آوازیں اس  
کب اور کیسے ٹیپ کیں۔

اگلے روز اسے فون پر آفس بلا کر انہوں نے  
ساری داستان سن کر پھر دس بارہ روز تک ایک  
چکراتے رہے۔ عدالت، ماہرین سے مشورے،  
اٹاؤں کی دوسری جگہ منتقلی۔ ان دنوں آفس پرند  
تمام عمل کو بشمول در شہوار ٹاپ کے خطوط لے کر  
سخت ضروری کام کے تحت آفس کو دو دھنچے کے  
کیے جانے کی اطلاع تھی۔ شمینہ نیگم کے استفسار پر  
نے سادگی سے خط کے مندرجات بتا دیے۔ اسلیت  
بتاسکی۔ جھج مانع آگئی۔

ان چند دنوں میں وہ جیسے انتظار کی صلیب  
رہی۔ آخر اخبارات کے ذریعے اسے پتا چلا کہ نعمانہ  
امجد کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ امجد نے بیان  
”ہم دونوں (یعنی نعمانہ اور وہ) کافی عرصے سے  
کمال کے پیچھے ہیں، بلکہ ہم نے ان کے ہاں ملا

بھی اسی لیے کی تھی۔ نعمانہ میری معیت رہے۔ ہمیں پیسے کی  
ضرورت تھی اس مقصد کے لیے فرید کمال کو تاکا۔ ان  
کے ایاؤں کا پتا لگایا۔ اس کی مالیت معلوم ہوئی تو جن  
پنکوں میں ان کا اکاؤنٹ تھا ان کا کھوج لگایا۔ اب ان  
سے جعلی دستخطوں کی مہم میں مصروف تھے کہ پکڑ لے  
گئے۔

امجد کے بیان اور ان دونوں کی ریکارڈنگنگو کا  
واضح ثبوت پیش ہو جانے پر دونوں کو چھ ماہ قید اور  
جرمانے کی سزا ہو گئی اس فیصلے کے بعد سارے عمل نے  
سکھ کا سانس لیا۔ مجرم ان کے حسب منشاء کیفر کردار کو پہنچ  
چکے تھے۔ سب کی ہمدردیاں اور وفاداریاں مکمل طور پر  
فرید کمال کے ساتھ رہیں۔ کیونکہ وہ ایک بے حد اچھے  
پے ماسٹر اور اپنے تمام عمل کی ضرورتوں کا خیال رکھنے  
والے تھے۔ ان سے کسی کو کوئی شکایت نہ تھی لہذا سارے  
لوگ انہیں مبارکباد دینے آئے اور خدا کا شکر ادا کرتے  
رہے کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس خوشی میں فرید  
کمال نے انہیں بوس دیا۔ آفس اب مکمل چکا تھا، اس کی  
رونقیں بحال اور کام کی مصروفیات پھر سے شروع ہو گئی  
تھیں۔ سب اپنے اپنے کام میں مگن ہو گئے۔

☆☆☆

”مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں سے تم نے آوازیں  
ریکارڈ کیں۔“ ایک روز فرید کمال نے شہوار سے کہا۔ وہ  
فوراً اپنا پرس سنجال کر کھڑی ہو گئی۔ وہ خوش تھی کہ اس  
کے آقا کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ اس سلسلے میں خواص کا کیا  
رول تھا اس کے متعلق اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔ دونوں  
باہر کھڑی کار میں آن بیٹھے۔ راستے میں بائیں بھی ہوئی  
رہیں جو شہوار کے کہنے کے متعلق تھیں۔ آخر کار پارک  
آ گیا۔ دونوں اتر آئے۔ شہوار نے انہیں گائیڈ کیا اور  
اس جگہ تک لے آئی جہاں سے اس نے ریکارڈنگ کی  
تھی۔

”اچھا تو یہ مورچہ تھا جہاں سے تم نے میری  
حفاظت کے سامان مہیا کیے۔“ فرید مسکرا کر بولے۔  
شہوار کے ہونٹوں پر تبسم تھا مگر وہ خاموش رہی۔ اس نے  
جھاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

## نیا سال مبارک

مہینوں کی پرانی مثال اوڑھے  
جھیل کے پرانے کنارے پر کھڑا  
سیٹی بجاکر  
چاند کو نیچے بلارہا ہے  
جنوری کے بدن پر  
ماچی شہنائیاں پیٹ کر رہی تھیں  
اور نیچے  
پہاڑی گاؤں میں  
نئے برس کا جشن تھا

شاعر: ابرار عمر

مرسلہ: نزہت جبین فیاض، کراچی

”اور یہاں وہ دونوں اپنی طرف سے روپوش  
بیٹھے تھے مگر ان کی آوازیں ہوا کے دوش پر تیری جھٹک  
پہنچ گئیں۔“ فرید کمال نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بیچ پر  
ممکن تھے۔ یکا یک انہوں نے سر اٹھایا، بالوں کی ایک  
سیاہ لٹ ان کے ماتھے پر آن کر گئی تھی۔ دوسرا چہرے  
شہوار کے چہرے کو اپنے حصار میں لیے تھیں۔ اپنی  
بھاری آواز میں انہوں نے کہا۔

”جانتی ہو شہوار اس سارے سلسلے میں تم میرے  
لیے کیا بن چکی ہو؟ تم جو اول دن سے میرے دل میں  
آن اتری تھیں۔ میرے ہونٹ نہ جانے کیوں نہ مکمل  
کے۔ میں کچھ نہ کہہ سکا کہ تم میری زندگی ہو..... میری  
تمام آرزوؤں کا واحد مرکز۔ شہوار..... تمہارے لیے  
دامن پھیلانا چاہتا ہوں۔ تمہیں مانگنے کے لیے تمہاری  
امی سے ملنا چاہتا ہوں، ہے اجازت؟“ شہوار کا گلابی  
چہرہ جھک گیا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا اثبات  
میں۔

دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے  
دور تک نگاہ میں ہیں مکمل کھلے ہوئے



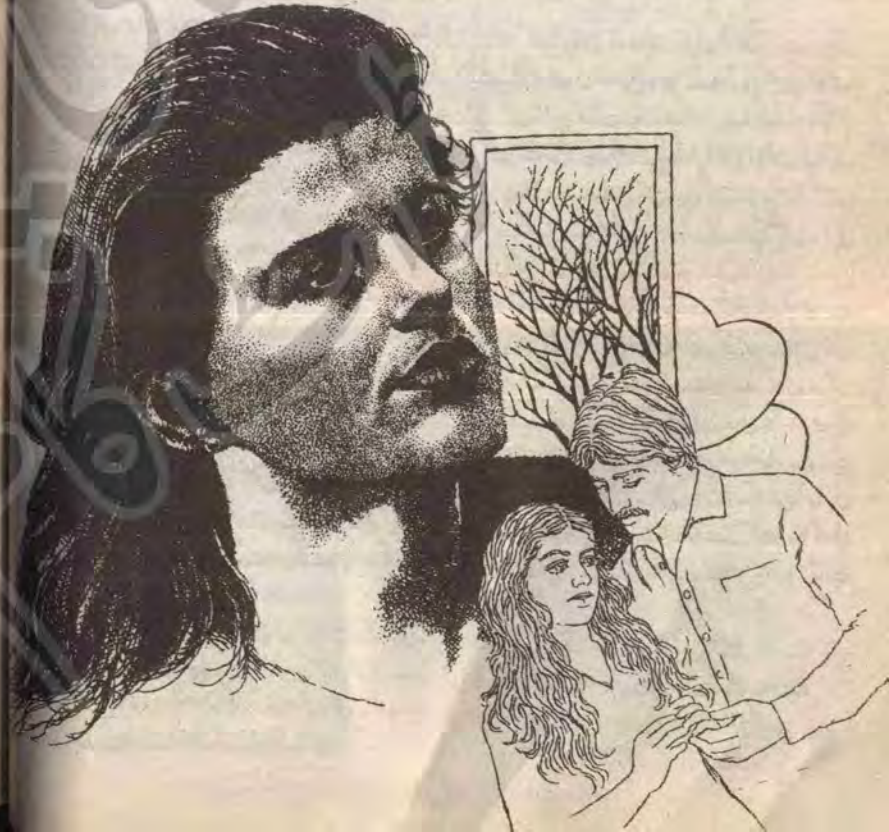


دستکاری اسکول میں بھی وہ سب سے پہلے اسکول پہنچتی تھی، وہ کمرہ اور ایک برآمدے پر مشتمل اس اسکول کی صفائی ستھرائی اسی کے ذمے تھی۔ دونوں کمرہ کا فرش پکا تھا مگر برآمدے کا فرش پکا تھا اور

برآمدے سے آگے بہت چھوٹا سا محض چند فرلانگ کا کچا ہی محن تھا۔ شہینہ کمرہ میں جھاڑو لگا کر، فرش پر پوسا لگاتی، ڈسٹنگ کرتی، برآمدے کے کچے فرش پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے جھاڑو لگاتی تھی۔ رضوانہ باجی کے اسکول

## خواب آنکھیں خرواش چہرہ

سائبرہ عارف





آنے سے قبل وہ اسکول کو صاف ستھرا کر دیتی تھی۔ یہاں ایک ماسی عنایت بی بی بھی تھی جو لڑکیوں کو بازار سے سوئی، دھواگاہنگی، فریم اور دیگر اشیا لکرو دیتی تھی، پہلے یہ صفائی ستھرائی اسی کے ذمے تھی مگر اب وہ مزے سے بیٹھی رہتی تھی یا بازار کا بہانہ کر کے صبح صبح غائب ہو جاتی تھی اور جب شہینہ سارا کام منٹا لیتی تھی تو آ جاتی تھی۔

اور اب یہاں رخسانہ باجی کے گھر بھی اسی طرح کی روٹیں تھیں۔ ان کا گھر بہت بڑا تھا، بار لڑکے کے اندر ہی ایک کمرے میں بنایا گیا تھا۔ اسے تو گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ پارلر میں جھانک بھی سکے۔ کبھی جو پارلر میں آ بھی جاتی تھی تو دوبارہ گھر کے کسی کام سے بلایا جاتا تھا۔ صفائی، برتن دھونا، کپڑے دھونا، کھانا بنانا، وہ فل ٹائم ملازمہ تھی۔

شروع شروع میں تو اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے وہ پارلر میں کام کیسے آتی ہے یا گھر کا کام کرنے، وہ بری طرح الجھتی تھی بلکہ الجھا دیتی تھی۔ ہر کام محنت سے کرتا، بہتر سے بہتر کرتا اس کی عادت تھی اور اسی عادت کا فیضان تھا کہ رخسانہ باجی کا گھر دنوں میں ہی چمکنے لگا تھا۔ ہر کام وقت پر ہو رہا تھا اور بہت ہی اچھے طریقے سے ہو رہا تھا۔ وہ تو گویا سکھ میں آ گئی تھیں۔ پچھلے چھ ماہ میں چھ سے زیادہ کام والیاں تبدیل کر چکی تھیں، کسی کو پیسوں پر اعتراض تھا تو کسی کو کام کی زیادتی پر کچھ صرف برتن دھونے پر رضامند ہوتی تھیں تو کچھ پکن کے کام پر ہی مان رہی تھیں۔ باقی کاموں کے لیے الگ ماسیاں رکھنا بھی آسان نہ تھا اور رخسانہ باجی جیسی کنوئس عورت کے لیے پیسہ سب سے بڑی پرولم ہوتا ہے۔

اور اب..... مفت کی یہ ملازمہ، بے زبان گائے، جس کی دھتکی رگ پر انگلیاں جمائے رخسانہ باجی اسے اپنی مرضی سے چلا رہی تھیں۔ ان کی زندگی اتنے سکون میں پہلے بھی نہیں تھی نہ پیسے کی فکر نہ تنخواہ کا رولا..... نہ چوری چکاری کا خوف..... شہینہ کو ایک نظر میں انہوں نے پرکھ لیا تھا کہ وہ ہاتھ چالاک جانتی ہے نہ زبان چلانا اسے آتی ہے اور جہاں یہ دونوں ہتھیار کند ملیں تو پھر

مقابل کی جیت یقینی کیوں نہیں ہوگی۔ اس سے صرف رخسانہ باجی ہی نہیں بلکہ سبھی گھر والے بہت مطمئن اور خوش تھے۔ اسے پریشان اور شکر کر کے، اس کی آنکھوں کی الجھن اور ہچرے کی پریشانی پڑنے اور دیکھنے کی کسی کو بھی فرصت بھی نہ ضرورت۔

وہ جلدی جلدی سارا کام نمٹا کر پارلر آئی کہ کچھ نہ کچھ نادیدہ آتی ہے کٹھن کی گھر یہاں اسے دیکھتے ہی وہ آرڈر دے لگتی تھیں۔

”شہینہ ذرا جلدی سے فرش سے یہ سارے بال تو اکٹھے کر دو۔“

”ہاتھ روم میں دیکس کی پٹیاں پڑی ہیں، وہ دھولو جلدی سے۔“ وہ فرش صاف کر کے فارغ ہوئی تو دوسرا حکم ملتا تب وہ حسرت سے کام کرتی لڑکیوں کو دیکھتی، کتنی تیزی سے رخسانہ پلٹک کر رہی ہے، فائزہ پارلر میک اپ میں مصروف ہے، شازیہ ایک لڑکی کو مہندی لگا رہی ہے اور وہ..... ہاتھ روم کی صفائی کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، یہاں کے حالات تو سلائی اسکول سے بھی بدتر تھے۔ وہاں علی الصباح صفائی کے بعد بھلے وہ تمام دن تریا پی ہی کرتی تھی مگر ساتھ ساتھ کڑھائی، سلائی کے حلقے مٹونے بھی تو دیکھتی رہتی تھی، معلومات ہی حاصل ہو جاتی تھیں مگر یہاں تو وہ ایک ملازمہ محض ملازمہ ہی بن کر رہ گئی تھی۔ اسے تو اب تک شیشے کے سامنے کھڑے ہونے کا بھی موقع نہیں دیا گیا تھا۔ اس کی انگلیاں دھواگے سے انجان تھیں۔

”پتا نہیں سارے بے درد، بے رحم لوگ مجھے ہی کیوں ملتے ہیں؟ میری مصیبت میں کمی کیوں نہیں ہو رہی؟ میری آزمائش کب ختم ہوگی؟“ اکثر ویسٹر وہ یہ گلہ خدا سے ضرور کرتی تھی ماسے تو آج کل دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا گھر میں بھی سے یہ بات چھپانی پڑ رہی تھی اور یہاں کام کیسے کا کوئی چانس نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہی بات اسے بری طرح پریشان کر رہی تھی۔

اس روز نادیدہ آتی صبح صبح کسی کے گھر دلہن میک اپ کے لیے چلی گئی تھیں اور جب رخسانہ باجی اپنے دستکاری اسکول چلی گئیں تو اس نے جلدی جلدی سارا

کام ختم کیا اور پارلر میں آ گئی یہاں صرف رخسانہ بیٹھی ہوئی تھی اور کسی غلطی میگزین کی تصویریں دیکھنے میں مگن تھی۔

”ارے آپ اکیلی بیٹھی ہوئی ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تو وہ چونکی۔

”ہاں، دونوں لڑکیاں نادیدہ آتی کے ساتھ گئی ہوئی ہیں۔“ رخسانہ نے کہا۔

”اور کوئی کلاٹ بھی نہیں آئی.....“ بے اس نے بغور تفصیل سے پارلر کا چاروں طرف سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ وہ دو ماہ میں آج پہلی بار پارلر میں اتنی دیر تک اور اتنے آرام سے بیٹھی تھی۔ چاروں اطراف لگی ہوئی مختلف ماڈلز کی تصاویر، دلہنوں کے خوبصورت پوز، شیشے کی الماریوں میں سجی میک اپ کی خوبصورت اشیا سب کچھ کتنا اڑکینو تھا۔ گھومتے والی اس کرسی پر بیٹھ کر دیوار گیر آئینے میں خود کو دیکھنا سورا دیکھنا اس کی خواہش نہیں ہوئی۔ وہ رخسانہ کو حیرت سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی جو اپنے اسٹپس میں کئے بالوں میں برش کرنے کے بعد آئینے میں انہیں مختلف اشکال سے سنوار رہی تھی۔ اس کی بات پر سر کرا سے دیکھا۔

”یہ وقت خواتین کے گھر بلیو کام کاج کا ہوتا ہے۔ اس وقت تو پارلر پر کم ہی رش ہوتا ہے، صرف وہی لڑکیاں آتی ہیں جنہوں نے شادی یا کسی فنکشن میں جانا ہوتا ہے یا جن کی اپنی شادی ہوتی ہے۔ صبح رش تو شام میں ہوتا ہے۔“ رخسانہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ بغور اسے دیکھا بھی تھا۔ ”کتنا عرصہ ہوا ہے تمہیں یہاں آئے.....؟“

”تقریباً دو ماہ ہونے والے ہیں۔“ ایک حسرت کی خود بخود دلچسپی میں اتر آئی تھی۔

”اور ان دو ماہ میں تمہیں یہ بھی پتا نہیں چلا کہ پارلر پر کتنا رش کس وقت ہوتا ہے؟“ رخسانہ بولی۔

”مجھے کبھی پتا چلتا۔ میں یہاں رہوں تو پتا چلے نا۔ میں تو گھر میں کام کر رہی.....“ مایوسی اور افسردگی سے وہ کہتے کہتے یکدم ٹھنک کر خاموش ہوئی تھی۔ اسے رخسانہ سے یہ سب نہیں کہنا چاہیے۔ رخسانہ، نادیدہ کے

پارلر میں کام کرنے والی لڑکیوں سے سب سے سبتر تھی بلکہ نادیدہ جب کسی کے گھر پر دلہن میک اپ کے لیے جاتی تھی تو اپنے پیچھے پارلر رخسانہ کے حوالے ہی کر جاتی تھی۔ اس طرح وہ اس کی دست راست تھی اور وہ بے وقوف اسی سے نادیدہ کی بات کرنے لگی تھی۔

”کیا ہوا؟ تم ڈر کیوں گئی ہو.....؟ ڈر موت، بے فکر رہو میں تمہاری بات راز رکھوں گی۔“ رخسانہ نے کہا۔

”نہیں..... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس کے حوصلہ دلانے کے باوجود وہ سنبھل گئی تھی۔

”تم بہت بے وقوف ہو، موصوم، سادہ، زمانے کی چالاکیوں اور عیار لوں سے انجان اور تم جیسی بدھو ہی رخسانہ نیکم کا شکار ہوئی ہیں۔ میں تمہارے بارے میں سب جانتی ہوں، اس روز جب پہلی بار رخسانہ باجی تمہیں لے کر یہاں پارلر آئی تھیں اور جو کچھ ہم نے ان سے کہا تھا اور انہوں نے تم سے وہ سب میں سن رہی تھی مگر تب مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اس قدر بے وقوف ہو گی کہ اتنے دنوں میں اپنے ساتھ ہونے والی واردات کو پہچان ہی نہیں پاؤ گی..... بہت خوش فہم لڑکی ہو تم۔“ رخسانہ کی بات پر وہ منہ کو لے حق دق دیکھ رہی تھی۔

”یہ رخسانہ باجی کا گھر ہے اور ان کی بیٹی نادیدہ کا پارلر اگر تم یہ سوچ کر یہاں آئی ہو کہ چند ماہ میں ماہر بیوٹیشن بن کر اپنا پارلر کھول لو گی تو تمہاری بہت بڑی خوش فہمی بلکہ غلط فہمی ہے۔ بغیر فیس کے یہاں کچھ نہیں سکھایا جاتا ہے اور تم جیسی مفت کی نوکرائی کو بھلا یہ سب سکھا کر اپنے پیروں پر کھڑا زاریں گی رخسانہ باجی۔“ رخسانہ کی بے رحم اور اندر تک چر دینے والی باتوں پر اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے تھے۔

”دیکھو، میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں ہے، میں تو تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں، حقیقت سے باخبر رکھنا چاہتی ہوں، مجھے دلی دکھ ہوتا ہے تم جیسی مصیبت زدہ اور محنت لڑکی کا کیسے استعمال کر رہی ہے یہ عورت، میں بہت دنوں سے تمہیں یہ سب بتانا چاہتی تھی کیونکہ میں خود اس دور سے گزر چکی ہوں بلکہ یہاں آنے والی ہر کمزور،



ضرورت مند اور غریب لڑکی کو یہ عورت اسی طرح اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ سارا سارا دن گھر کا کام کروایا جاتا ہے۔ فیس بھی لے کر ایمانداری سے کام نہیں سکھایا جاتا جو بے چاری لحاظ کرتی ہیں، وہ تم جیسی ہوتی ہیں۔ جو پانچ چھ ماہ کے انتظار کے بعد تنک آ کر خود ہی یہاں سے چلی جاتی ہیں اور یہ پانچ چھ ماہ بھی مجبوراً اس لیے گزارنے پڑتے ہیں کہ نادیہ پانچ ماہ کی فیس ایڈوانس لے لیتی ہے اور اس طرح بندے کو باندھ کر مارتی ہے کہ وہ تڑپ بھی نہ سکے، کام بھی نہیں سکھاتی اور فیس بھی ہڑپ.....“ ریحانہ اسے ایک ان ہونی داستان، ایک بے حد ہی مگر لرزہ خیز کہانی سنارہی تھی، وہ تو حیرت اور دکھ سے لگ گئی۔

”تو..... تو تم؟“ شمین نے پوچھا چاہا۔  
”میں نے یہاں سے کام نہیں سیکھا، مجھے تو نادیہ نے مجبوراً رکھا ہوا ہے، پارلر کا سارا کام تو میں ہی سنبھالتی ہوں، میرے بغیر تو یہ پارلر ایک دن نہیں چل سکتا اور یہی اس کی مجبوری ہے۔ ویسے بھی میں نے ضرورت مند ہوں نہ مجبور، یہ نوکری میرا شوق ہے جس دن نادیہ نے میرے ساتھ چوں چوں کی، ایک پل میں یہاں سے چلی جاؤں گی، بس یہ مجبوری ہے اس کی۔ ویسے یقین کرو میں نے آج تک کبھی اس کی کسی بات میں دخل نہیں دیا، اپنے کام سے کام نہ رکھا ہے وہ جو چاہے کرے، مالک ہے اس پارلر کی مجھے کیا، مجھے تو اپنی تنخواہ سے غرض ہے جو سات سے بھی آٹھ تک لیٹ نہیں ہوئی اور آج..... آج پہلی بار میں یہ سب باتیں تم سے کر رہی ہوں۔ تمہیں بتا رہی ہوں کہ ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ، ورنہ ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔ تم یہاں سے کچھ نہیں سیکھ سکو گی، محض وقت اور اپنے آپ کا زیاں ہے یہاں رہنا۔“

”تو..... تو میں..... میں کیا کروں.....؟“ وہ سسک اٹھی۔ کہاں جاؤں، کس سے کہوں..... میرے حالات کا تمہیں علم نہیں ہے ریحانہ کہ میں کس قدر مجبور ہوں مگر ہر شخص نہ جانے کیوں مجھ سے ہی دھوکا کرتا ہے، مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ مجھے ہی مارتا ہے میں تنہا ہے سہارا ہوں نا..... بے سہاروں کو کون سہارا دیتا ہے، ہر کوئی پکلتا ہوا

آگے گزر جاتا ہے پتا نہیں کب، کب اس ظلم کی حد ہوگی انصاف اتنی دیر سے ملے گا..... کیوں؟“  
”ایسا نہ کہو..... ایسا نہ کہو.....“ ریحانہ کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ اس نے اس قدر مجبور اور لاجپا انداز میں روتے ہوئے ایسی بے بسی سے کہا تھا کہ وہ لرز اٹھی، اسے ساختہ اس کا کندھا تھپکا تو وہ روتے ہوئے اس کے شانے سے آگئی تھی۔

”تم تو بہت معصوم ہو، بہت نیک ہو..... اللہ کی قسم کی آہ اور دعا بھی رو نہیں کرتا، عرش سے ٹکراتی ہیں تم جیسے بے بس لوگوں کی فریادیں، مایوس نہ ہونا، مایوس ہو جاؤ گی تو ختم ہو جاؤ گی۔ سزائیں کئے گا آگے نہیں بڑھ سکتی گی جب کہ تمہیں تو بہت آگے جانا ہے، محنت کرنی ہے ایک مقام حاصل کرنا ہے، اپنے لیے، اپنے گھر والوں کے لیے، ہاں.....“ ریحانہ نے کہا۔

”ہاں.....“ اس نے سر ہلایا، ریحانہ کی باتوں نے اس کے اندر مرتی ہوئی روح کو زندہ کر دیا تھا۔  
”مگر کیسے..... میرے پاس پیسے نہیں ہیں، میں فیس نہیں دے سکتی ہوں، کسی چکی کام کی فیس ادا کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے پھر کیسے؟ کیسے میں کام سیکھ سکتی ہوں، یہاں تو ہر شخص ہی اپنا ہنر بیچتا ہے جو زیادہ دولت والا ہے وہ تو سیکھے بغیر بھی سب کچھ حاصل کر سکتا ہے مگر میں..... مجھے کون اللہ واسطے سکھائے گا۔“ شمین نے کہا۔

”اللہ واسطے، اللہ کے نیک بندے ہی سکھائے۔“  
”ہیں اور ہم جیسے گناہگار تو نہیں، تم فکر مت کرو میں تمہیں ضرور سبز رحمان کے پارلر کا ایڈریس دے دیتی ہوں وہاں چلی جانا، میں نے بھی وہاں سے ہی سیکھا ہے۔ وہ بہت نیک اور خدا ترس خاتون ہیں، یقیناً تمہاری مدد کریں گی تم میرا حوالہ بھی دینا بلکہ میں خود خوں پر بات کروں گی ان سے۔“ ریحانہ نے ایک نیا راستہ دکھایا تھا۔ ایک نئی امید کی کرن اس کی تھیلی پر کھئی تھی مگر وہ بھی بے یقین تھی مایوس تھی، ناامید تھی بے در پے دھوکا چروں پر چڑھے نقاب اور ان کے نیچے چھپے عیار اور سرخ فریب سے گرد آلود پھرے۔ امید ہوئی بھی تو کیسے حوصلہ

بھی کہاں سے۔

”یقین نہیں آ رہا نا، تم شاید اسے بھی جھوٹ اور محض دھوکا یا میری سلی سمجھ رہی ہو..... تم بہت حساس ہو اور حساس دل والے جب کسی کے ہاتھوں دھوکا کھاتے ہیں تو پچھلے مسئلے سے بھرتے ہیں مگر تمہیں سنبھلنا ہے، تمہیں خود کو مضبوط بنانا ہے خود کو طاقتور ثابت کرنا ہے۔ ابھی شاید تمہیں میری باتیں دھوکا لگیں، جھوٹ محسوس ہوں تم نے ایسی ہی باتیں رخسانہ کے منہ سے بھی سنی تھیں اور نادیہ کے منہ سے بھی مگر میں اپنی باتوں کی سچائی کا یقین تمہیں خود نہیں دلاؤں گی بلکہ تمہیں خود بخود اس وقت یقین آجائے گا، جب تمہارا کام ہو جائے گا تب تم بے شک مجھ سے ملنے آنا.....“ ریحانہ کی باتوں میں سچائی تھی، امید تھی، حوصلہ تھا۔ اس کا خوش فہم دل ایک بار پھر یقین کر لینے پر آمادہ تھا اسے ریحانہ اپنی نجات دہندہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے لمحوں میں ریحانہ کو اسی مقام پر بخا دیا تھا جہاں وہ پہلے رخسانہ باجی اور پھر نادیہ کو بٹھا چکی تھی۔

”یہ لو..... یہ باجی کا کارڈ ہے تم جلد از جلد ان سے ملو جا کر۔“ ریحانہ نے اسے ایک کارڈ تھمایا تو اس نے مضبوطی سے اسے تھام لیا اور پڑھنے لگی۔

”اوہ یہ تو بہت دور ہے، میرے گھر سے تو بہت ہی دور ہے۔“ اس نے پریشانی سے ریحانہ کو دیکھا۔  
”ہاں دور تو ہے مگر کام کے لیے تو اس سے بھی دور جاتے ہیں لوگ۔“ ریحانہ نے کہا۔

”بے شک، بے شک مگر میں ایسی کی میں نے تو گھر میں کسی کو یہ نہیں بتایا کہ میں پارلر میں کام کر رہی ہوں۔ بیوی اور ذاتی دور تنہا جانے کی اجازت مجھے امی سے بھی نہیں ملے گی۔“

”اوہ یہ تو بہت مسئلہ ہے، بہر حال سوچ لو..... دیکھ لو..... اس کارڈ کو ابھی اپنے پاس رکھ لو، ہو سکتا ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے ویسے اگر تم ان خاتون کے پاس پہنچ جاؤ تو سمجھو تمہاری زندگی سنور جائے گی۔“ ریحانہ اسے متواتر حوصلہ دے رہی تھی، ہمت بندھا رہی تھی اور اس کی باتوں پر یقین تو اسے بھی ہو گیا تھا مگر جگہ

دور ہونے کی وجہ سے اس کی ساری خوشی ختم ہو گئی تھی۔ اتنی دور اکیلے جانے کی اجازت کون دے گا۔ وہ گہری سوچ میں غرق تھی، اسی وقت دو تین خواتین پارلر میں داخل ہوئیں، ریحانہ ان کی طرف متوجہ ہوئی تھی جب کہ وہ ابھی ہوئی بیوی پارلر کے کونے میں پڑی کرسی پر آ بیٹھی تھی۔

”تم یہاں صرف جھاڑو بوجھا کرنے، کپڑے دھونے اور برتن باغیچے کے لیے رکھی گئی ہو اور یہی کرتی رہو گی۔“ ریحانہ کے تیزی سے چلتے ہاتھوں پر نظر تو جھی تھی مگر ذہن اس کی باتوں کی بازگشت میں تیز رہا تھا۔

”جتنا کام تم صبح سے شام تک کرتی ہو کام والیاں اس کام کے تین ہزار سے کم ہرگز نہیں لیتیں۔ نادیہ کی فیس ہندو سوا ماہانہ ہے تم تو فیس کے پیسے پورے کرنے کے بعد بھی ان پر احسان کر سکتی ہو مگر تمہیں یہ سب کرنے کے لیے ہمت حوصلہ چاہیے جو تم میں نہیں ہے۔ بہتر ہے یہاں سے نکل جاؤ، جہاں، بہتری کے مواقع ہوں، وہاں قسمت ضرور آ زما نی چاہیے۔“ وہ گہری سوچ میں غرق تھی۔ ریحانہ نے ایک دو بار سے دیکھا بھی مگر اسے اس کی نظروں کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

”شمین..... ادھر آنا۔“ ریحانہ نے پکارا تو وہ چونکی۔

”یہاں ہاتھ رکھو..... میں ان کی پبلنگ کر لوں..... آپ چھوڑ دیں۔“ اس نے کلائنٹ کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے شمین سے کہا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ادھر دایاں ہاتھ رکھ لو۔“ شمین نے ریحانہ کی ہدایت کے مطابق دایاں ہاتھ ان محترمہ کی آنکھ کے پونٹے پر رکھا اور بائیں ہاتھ سے ابرو ہٹھک کر اوپر کیا تاکہ اسکن ٹائٹ رہے اور دھاگے سے تکلیف بھی نہ ہو۔ ریحانہ کے مہارت سے چلتے ہاتھ کی حرکت پر نظر جمائے وہ سارا عمل دیکھتی رہی تھی۔

”یہ بہت مشکل کام ہے۔ اتنی آسانی سے نہیں آتا۔“ نادیہ نے ایک بار اسے جلتا یا بھی تھا۔  
”بالکل بھی مشکل نہیں ہے صرف ایک ہفتہ بلکہ



اس سے کم وقت میں، میں ریحانہ جیسی مہارت حاصل کر سکتی ہوں، کوئی مجھے چاہے تو دے۔“ اس نے آہ بھر کر اپنے ہاتھ پیچھے ہٹالیے، داکٹر طرف والی ایرومان کی صورت ہو گئی تھی اور اب بائیں طرف وہی عمل ہو رہا تھا۔

اس روز گھر واپسی پر وہ بہت ڈسٹر ب تھی۔ بہت سی تکلیف دہ باتوں کا جاننا ہمارے لیے اذیت ناک ہونے کے ساتھ ساتھ ناپسندیدہ بھی ہوتا ہے، نہ جانے کیوں کہوتی کی طرح آنکھیں بند کر لینے کو دل کرتا ہے مگر زندگی ایک تھی نہ پل کے گزر جاتی اس طرح ایک طویل مسافت اور راہ کی آبلہ پائی..... کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اس نے امی سے بات کی اور نتیجہ حسب توقع تھا۔

”پاگل ہوئی ہو کیا؟ اتنی دورا کیلے آنا جانا آسان نہیں ہے اور جو کسی کو علم ہو گیا تو.....؟“

”تو.....! تو کیا ہوگا! کیا ہوگا۔ کچھ بھی نہیں ہوگا! آپ خواہ مخواہ ڈرتی ہیں۔ میں، میں سلطان کو ساتھ لے کر چلی جا کر دیکھوں گی مگر امی میں خود کو یہاں ضائع نہیں کروں گی۔ اللہ نہ مہربانی کی، کرم کیا، ریحانہ کے دل میں رجم آ گیا۔ اس کی باتوں نے مجھے عقل سکھا دی، میں بے وقوف اسی آس میں جی رہی تھی کہ کل بہتر ہو جائے گا، کل نہیں تو پرسوں ضرور حالات بدل جائیں گے، کچھ دیر بعد، چند ہفتوں بعد ضرور میں کام سیکھ لوں گی لیکن یہ تو محض میری خوش فہمی تھی، مجھے تو اس مقصد کے لیے رکھا ہی نہیں گیا، میں جو کام کر رہی ہوں، وہی انہوں نے مجھ سے کروانا ہے امی اور میں..... میں مزید خود کو بے وقوف نہیں بننے دوں گی، مجھے کچھ کرنا ہے، کچھ بننا ہے۔“ وہ مضطرب تھی، بے انتہا پریشان اس کے اندر کچھ کرنے کا جذبہ اٹھنے کو تیار تھا۔ نجمہ نے بغور بیٹی کو دیکھا۔ اس کا لہجہ اٹل تھا اور ضدی بھی کچھ کر گزرنے کا عزم لیے ہوئے اور اسی رنگ کو دیکھ کر وہ کچھ خوف زدہ ہی ہو گئی تھیں۔

”بیوی تھیلی پر برسوں نہ جاؤ شہینہ، کچھ پانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑی ہے، وقت لگتا ہے اپنے آپ کو

منوانے میں، اس طرح جلد بازی، غصہ اور اشتعال تو بہت نقصان دہ ہے ہمارے لیے، ذرا آرام سے سوئی، سنبھل کر فیصلہ کرو۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا..... ہمارا آخری اور اکلوتا ٹھکانا ہے یہاں سے نکال دیا گیا تو سڑک پر جا بیٹھیں گے پھر سارے کارنامے کر لینا پورے۔“ ماں کی عقلی بھری ڈانٹ پر اس نے ہونٹ کاٹ کر سر جھک لیا تھا، نجمہ نے جو اسے یوں مایوسی سے منہ لٹکائے دیکھا تو دل کو کچھ ہوا۔

”میری محسوس ہوئی، اتنی سی عمر میں کیا، کیا سوچتی ہے کیا کیا کرنا چاہتی ہے۔ ہمارے لیے صرف ہمارے لیے، ہائے رہا یہ دن بھی دیکھتے تھے۔“ انہوں نے آہ بھر کر اپنے میل میل کے دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں۔ ”امی ایک بار..... صرف ایک بار مجھے جانے کی اجازت تو دیں، میں وہاں جا کر سسر رحمان سے ملتی ہوں اگر تو وہ بھی رخسانہ باجی جیسی ہوئیں واپس آ کر دوبارہ نہیں جاؤں گی اور اگر وہ غلط اور کچی ہوں تو پھر میں وہاں جانا شروع کر دوں گی۔ دور ہے تو کیا ہوا..... نزدیک والے اگر بے کار ہیں تو پھر دور جانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نورین کے ساتھ چلی جاؤں کر دوں گی۔“ اس نے فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ ہر طرح کا رسک لینے پر تیار تھی۔

”میں کیا کہوں، مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے!“ نجمہ واقعی بری طرح پھنسی تھیں۔ یہ حالت ان کے لیے بھی بے حد تکلیف دہ تھی بہت عذاب سے گزر رہے تھے دن رات۔ وہ بھی اس جہنم سے چھٹکارا چاہتی تھیں یہاں دن رات کام کر کے بھی لعنت ملا مت، طعنے اور بددعائیں، نفرت، ناپسندیدگی ملتی تھی جو بدیوں کی محسوس سے بڑھ کر دل کو درد دیتی تھی، جسم و جان کو چور چور کر دیتی تھی، وہ تنہائیں تھیں، چار بچے بھی ساتھ تھے اور ان چاروں کو بھی یہی رویہ اور لہجہ خوفزدہ رکھتے تھے، دکھ دیتے تھے۔ بچوں کی سہمی ہوئی شکلیں اور سوکھے کمزور جسم نہ کھانے پینے کو مناسب ملتا تھا نہ پہننے کو ڈھنگ کا بڑھتی عمر تھی اور چاروں ہی بچے اپنی عمر سے بہت کمزور اور چھوٹے تھے۔ شہینہ بڑی تھی، نجمہ دار، باشعور سب

سمجھتی تھی، دیکھتی تھی اور اماں سے احتجاج بھی کرتی تھی۔ اس کی انا، عزت نفس مجروح ہو کر بہلائی تھی ایک آگ سی ہر دم بھڑکتی تھی اس کے اندر وہ اس ذلت بھری زندگی سے ٹکنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی ماں کو یہاں سے نکالنا چاہتی تھی، اسے بہن بھائیوں کے لیے، بہت کچھ کرنا چاہتی تھی مگر عظیم اور تجربے کی ہی ہر جگہ آڑے رہتی تھی۔ کم عمر تھی لوگوں کی پہچان اور پرکھ بھی نہیں تھی جو چار لفظ ہمدردی کے کہتا تھا اسی کو اپنا نجات دہندہ سمجھ لیتی تھی۔ رخسانہ باجی سے دھوکا کھایا، نادیہ آئی پر یقین کر لیا، نادیہ سے دھوکا کھا کر اب ریحانہ کے کہنے پر سسر رحمان کو آ زمانے چلی گئی۔

”آپ کیوں اتنی پریشان ہیں، فکر نہ کریں صرف دعا کریں مجھے آپ کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے، باقی ہمارا خدا ہمیں دیکھ رہا ہے سب دیکھ رہا ہے۔“ بھی نہ بھی تو ہمارے حالات بھی بدلیں گے، ضرور بدلیں گے۔“ اس نے ماں کو اتنا ابھارا پریشان دیکھا تو بے ساختہ ان کا ہاتھ تھام کر تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی اور نجمہ جو اپنے خدشات اور فکرات اس سے کہنے والی تھی اس کی بات سن کر یکدم خاموش ہو گئیں۔ اپنی بیٹی کی آنکھوں میں جلتی امید کی کرن کو بھجانا انہیں بہت تکلیف دہ لگا۔

”ٹھیک ہے تم ایک بار جا کر ان سے مل لو، دیکھ لو پھر بات ہوگی۔“ اس وقت وہ اسے اسی طرح بہلا سکتی تھیں۔ مزید بحث مباحثہ مناسب نہیں تھا سو اجازت دے دی اور وہ اپنی امی کی بات سن کر کس قدر خوش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ بہت عرصے بعد نجمہ کو نظر آئی تھی۔

”اللہ میری بیٹی کو کامیاب کرنا، اس کی مدد کرنا، اس کے ارادے بہت نیک ہیں اسے اس کے ارادوں میں کامیاب کرنا۔“ وہ بہت دیر تک اس کے لیے دعا مانگتی رہی تھیں۔



اگلے روز اس نے جلدی جلدی دوپہر تک رخسانہ باجی کے گھر کا سارا کام نبھایا اور نورین کو لے کر وہاں

سے نکل پڑی۔ نادیہ آئی کو اس نے ضروری کام کا کہہ کر آدھی چھٹی ماہیک لی تھی، نورین بھی بارہ بجے اسے بلانے پارلر آ گئی تھی۔

”مامی نے تو کچھ نہیں کہا؟“ پارلر سے نکلتے ہی اس نے سوال کیا۔

”نہیں..... ماما تو آج صبح صبح نماز آتی کے ساتھ بازار چلی گئی تھیں، صائمہ اپنے کمرے میں تھی انہیں تو پتا ہی نہیں کہ میں تمہارے پاس آئی ہوں، ویسے بھی امی کہہ رہی تھیں میں سنبھال لوں گی تم جاؤ۔“ نورین نے کہا۔

”دعا کرو نورین..... ہم جن سے ملنے جا رہے ہیں وہ بہت اچھے لوگ ہوں، ہمارے کام کے۔“ شہینہ بولی۔

”دعائیں تو بہت کرتی ہوں شہینہ آئی میں..... آپ کی ہمت اور کوشش کی کامیابی کے لیے، اب تو اس جہنم میں رہنا بھی نہیں جاتا، مجھے تو لگتا ہے ایک دن ہم ایسی تکلیف دہ زندگی گزارتے گزارتے مر جائیں گے۔“ نورین نے ایسے مایوس لہجے میں کہا تھا کہ وہ بے ساختہ ”اللہ نہ کرے“ کہہ گئی۔

”نہیں..... مایوسی اچھی نہیں ہوتی نورین، تم دیکھنا ایک دن ہم ضرور یہاں سے نکل کر اپنے گھر جائیں گے جہاں ہم بہت آرام سے، سکون سے اپنی مرضی سے زندگی گزاریں گے، تم دیکھنا وہ دن ضرور آئے گا۔ مجھے یقین ہے۔“ وہ بہت مطمئن اور پُر امید لہجے میں اسے تسلی دینے لگی اور اپنی باتوں میں انہیں سفر ختم ہونے کا پتا بھی نہیں چلا۔

”مجھے تو یہی گھر لگتا ہے۔“ اس نے سیاہ گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر لگی نیم پلیٹ پڑھی اور پھر اپنی منہی میں دبے کارڈ کو بغور پڑھا۔

”یہی ہے.....“ اس کی آواز میں جوش اور کپکپاہٹ ابھر آئی تھی اس کا دل یکدم بہت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اس نے بغور گھر کا بیرونی جائزہ لیا۔ سفید ماربل کی یہ خاصی بڑی کٹھی تھی گیٹ اور اس کی دیواروں پر نیکیں چڑھی ہوئی تھیں۔ باہر بیرونی دیوار کے ساتھ بھی



چھوٹی کیاری میں خوبصورت، خوشنما پھول لگے ہوئے تھے، اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے بتیل بجائی نورین گیٹ کے قریب لگے بورڈ کو بغور پڑھ رہی تھی۔

”رابعہ بیوٹی پارلار اینڈ ٹریننگ سینٹر“ وہ ابھی بے شکل یہی پڑھ پائی تھی کہ گیٹ کا چھوٹا دروازہ زوردار جھلکے سے کھلا تھا۔

”جی فرمائیے.....“ آنے والی نو عمر سی لڑکی نے سر تا پا ان دونوں کو دیکھ کر پوچھا تھا۔ اس کے حلیے اور انداز سے لگتا تھا کہ وہ یہاں کی ملازم ہے۔

”وہ ہمیں مسز رحمان سے ملنا ہے۔“ اس نے مدعا بیان کیا تو اس لڑکی کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

”ہاں جی ہوراس ہے، کیا کام ہے؟“ وہ شکی نظروں سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔

”کام ہم انہیں ہی بتائیں گے، ہمیں ریحانہ نے بھیجا ہے تم جا کر انہیں بتا دو۔“ شمیمہ نے اعتماد سے مضبوط لہجے میں کہا۔ ریحانہ کے نام پر وہ چونک گئی۔

اس کی تفتیش ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ شمیمہ نے جھلاہٹ سے اسے دیکھا۔

”میں ریحانہ کی دوست ہوں..... اب آنے دو گی یا نہیں.....؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

”نہ جی نہ..... میں ایسے مالکوں سے کچھ بغیر کسی اجنبی کو اندر نہیں آنے دیتی ہوں، آپ ادھر ہی انتظار کرو۔ میں باجی سے کچھ کے آتی ہوں۔ ریحانہ کی دوست.....“ آخری جملہ اس نے زیر لب کہتے ہوئے دوبارہ ان دونوں کو دیکھا اور گیٹ اندر سے بند کر کے چلی گئی۔

”آف خدا..... یہ کیا پولیس والوں کی طرح سوال جواب کر رہی تھی؟“ نورین نے حیرانی سے کہا۔

”اور تفتیش بھی.....“ شمیمہ نے ہنس کر اس کا جملہ مکمل کیا۔

”اب یہ محترمہ واپس آ جائے۔“ کچھ دیر بعد اس نے دعا کی اسے بہت بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

رحمان کو نہیں بتایا۔“ نورین نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”دوبارہ بتیل دیں؟“ نورین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ضرور..... یہاں آ کر میں ان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی جو ہوتا ہے وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ فی الحال تو ان سے ملنا ہی مشکل ہو رہا ہے۔“ شمیمہ نے بڑبڑاتے ہوئے کال بتیل پر ہاتھ رکھا۔

”جی.....“ چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ آٹھ تو سال کا صحت مند گول منول بچہ، گورا چٹا منہ نکالے پوچھ رہا تھا۔

”بیٹا ہمیں مسز رحمان سے ملنا ہے۔“ اس نے مدعا بیان کیا۔

”دادو سے.....؟“ اس کے سوال پر وہ حیران ہوئی۔

”ہاں.....“ اس نے پونہ سر ہلادیا۔

”اندرا آ جائیں.....“ وہ پیچھے ہو کر انہیں اندر آنے کا راستہ دے رہا تھا اس نے بس لاک پیل سوچا پھر بالآخر خیر کرنا کہتی اندر داخل ہو گئی۔ سارا راستہ وہ آیت انکری، چاروں فل اور درود شریف کا ورد بھی کرتی آئی تھی۔

”وہ کہاں ہیں.....؟“ بچہ بھاگنے کی تیاریوں میں تھا، اس نے جلدیے پوچھا۔

”پارلر میں ہیں۔“ اس نے معصومیت سے آنکھیں مٹکانیں۔

”اور پارلر کدھر ہے؟“ اس کے علاوہ وہ یہ تمام سوالات کسی اور سے نہیں پوچھ سکتی تھی کہ اسے کوئی اور نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

”آدھر ہے۔“ اس نے کمال مہربانی سے ہاتھ کے اشارے سے کہا اور بھاگ لیا، اس نے تھوڑا سا مزکر دیکھا، تنگ سی لٹائی گلی یہاں موجود تھی۔

”حلق تڑکیا، نادیہ پینہ پونچھا، پارلر میں اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ کیسے مسز رحمان سے بات کرے گی۔ دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا، سارا اعتماد ختم ہو گیا تھا۔ نورین اسے جہاد دیکھ کر اسے گھور رہی تھی۔

”اونا آئی۔“ اس نے حیرت سے اسے ٹوکا۔

”چلو.....“ اس کے کہنے پر وہ چونکی پھر بے ساختہ ہی کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی لمحہ بھر کو اندر موجود بھی لوگوں نے ان دونوں کو دیکھا تھا۔

”ہمیں..... مجھے مسز رحمان سے ملنا ہے۔“ اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے لہجے میں کپکپاہٹ آ گئی ہے۔

”باجی سے..... باجی اندر ہیں۔ کوئی کام ہے؟“ پارلر پر کام کرنے والی لڑکی نے نخوت سے انہیں دیکھ کر پوچھا تھا۔

”خدا یا پھر تفتیش.....“ اس نے چر کر سوچا۔

”جی، بہت ضروری ہے کام ہے۔“ اب کے اعتماد سے کہا تھا۔

”اندرا چلی جاؤ.....“ فیشل کرتے اس کے ہاتھ جتنی تیزی سے چل رہے تھے آنکھیں بھی اتنی تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔

”اندرا کہاں.....؟“ وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر خاموشی سے پارلر کے اندرونی دروازے کو پار کر کے باہر آ گئی مگر..... باہر ایک اور کمر تھا بڑا سا ہال نما جس میں سرخ قالین بچھا ہوا تھا، ایک طرف خوبصورت آئرن کا صوفہ رکھا تھا اور دوسری طرف فل سائڈ ڈریسنگ آئینہ تھا۔

قالین پر کٹن اور تیکے ترتیب سے رکھے تھے اس نے بل بھر جیسے کمرے کا جائزہ لیا۔ کرا خالی تھا۔

”ہاں بیٹا، کیا بات ہے۔“ نرم، مہربان، بکھلا لہجہ ساتمٹوں سے طر آیا تو وہ یکدم پٹی۔

”آپ.....! آپ مسز رحمان ہیں.....؟“ اس نے اپنے گمان کو یقین میں بدلنے کے لیے پوچھا۔

آپ کے پاس بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔“ اس نے ان کی ٹھکراہٹ اور نرم لہجے سے خاصا حوصلہ پایا تھا۔

”ریحانہ..... اچھا، اچھا..... کیسی ہے وہ.....؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی بالکل ٹھیک ہے۔“

”بیٹھو بیٹا، آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔“ انہوں نے اسے کہا تو اسے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک کمرے کے وسط میں ہی کھڑی ہے۔ جھجکتے ہوئے وہ آئرن کے صوفے پر ٹک گئی، مسز رحمان خود بھی اس کے قریب دوسرے سنگل صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”ہاں، اب یو یو ریحانہ تمہاری کیا لگتی ہے؟“

”جی وہ..... وہ جس پارلر پر آج کل کام کر رہی ہیں وہاں میں بھی.....“ اس کے حلق میں لفظ پھنس سے گئے تھے۔

”اچھا اچھا..... ٹریننگ لے رہی ہو۔“ انہوں نے خود ہی اس کی ادھوری بات کر مطلب نکالا۔

”جی مقصد تو یہی تھا مگر.....“ اس نے بل بھر کوسر جھکا کر سوچا پھر آہستہ آہستہ ساری بات انہیں بتا دی، اپنی ساری کہانی ان کے سامنے کھول دی، کئی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آئے کئی بار پھندا لگا کئی بار لفظ لبوں سے نکل نہیں سکے، کئی بار چہرے کا رنگ بدلا مگر وہ کہانی جو اسے سنائی تھی سنا کر ہی دم لیا۔

”اوہ..... سچ..... بہت افسوس ہوا تمہاری بات سن کر، اللہ تعالیٰ رحم کرے، سب کے دکھ تکلیف دور کرے۔“ انہوں نے سن کر بہت افسوس اور دکھ سے کہا تھا۔

”آپ میری مدد کریں باجی..... خدا کے لیے آپ میری مدد کریں، میں ساری عمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔ میں نہیں دے سکتی ہوں مگر میں اس کا حق ضرور ادا کروں گی۔ میں آپ کا..... آپ کے گھر کا سارا کام کر دیا کروں گی، بس آپ مجھے کام سکھا دیں، مجھے اپنے گھر والوں کی زندگی کی خاطر کام سیکھنا ہے باجی، میں.....“ اس سے بات مکمل نہیں ہو سکی تھی، وہ



ضبط کر رہی تھی مگر اب یکدم رو پڑی تھی۔

”ارے ارے..... اوہ جی رونا تو بند کرو..... رو کیوں رہی ہو، میں نے انکار کیا ہے کیا؟“ ان کے جملے نے اسے ٹھٹھا دیا تھا، روتے روتے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”یہ پانی لو..... خود کو سنھالو پھر بات کرتے ہیں.....“ انہوں نے چھوٹی سی تپائی پر دھریا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پکڑ لیا۔

”ہاں، اب بات کرو۔“ پانی پی کر اور چہرہ صاف کر کے وہ خاصی حد تک سنبھل گئی تھی۔

”باجی، میں بہت ضرورت مند ہوں میں کام سیکھنا چاہتی ہوں میں محنت سے نہیں گھبراتی ہوں مگر مجھے کوئی اب تک مخلص بندہ ہی نہیں ملا، میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے آپ بے شک ریحانہ سے پوچھ لیتا میں۔“

”مجھے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے بیٹا، میری عمر اور میرا تجربہ اتنا ضرور ہے کہ جھوٹ، سچ کو پرکھ سکے، چہرے دیکھتے ہیں تمام عمر اور چہروں کو ہی پرکھا ہے اور مجھے اپنی پرکھ پر بھی افسوس ہوا ہے نہ شرمندگی۔“ سچ، جھوٹ تم جانے دو..... محنتی اور ضرورت مند ہو، حساس اور دردمند دل بھی رکھتی ہو، کم عمر ہونے کے باوجود گھر والوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ ہے تم میں، تمہاری کہانی سن کر افسوس ہوا۔ بہر حال تم کل سے آ جاؤ۔“ مسز رحمان نے کہا۔

”جی.....!“ ان کے منہ سے آخری بات سن کر تو وہ حیرت سے بے ہوش ہونے والی تھی، اتنی آسانی سے مان گئیں ایک منٹ میں فیصلہ کر لیا۔ نہ احسانات کی فہرست گنوائی، نہ اسے زیر بار کیا، نہ کام کا لالچ نہ فیس کا خوف۔

”یقین کر لو بیٹا..... میں نے تمہاری باتوں سے اندازہ لگا لیا ہے کہ تم میں خودداری اور انانیت ہے۔ میں تمہاری مدد کسی بھی اور طریقے سے کروں گی تو تمہیں قبول نہیں ہوگی اور یہی وہ پوائنٹ ہے جس نے تمہارے

حق میں مجھ سے فیصلہ کروایا ہے۔ ایسی خودداری لڑکیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور محنتی بھی..... لہذا تمہیں کام نہ دینا اخلاقی جرم ہوگا، زیادتی ہوگی۔ میں خود کو کوئی بہت بڑا جی یا حاکم طاعتی تو نہیں سمجھتی ہوں مگر کوشش ضرور کر رہی ہوں کہ ضرورت مند سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں، یا پھر اللہ مجھے ہمت دے اور استقامت دے۔“ اتنی عاجزی، اتنی انکساری، اور اتنا محبت بھرا اعتراف، کس قدر بے پیکار انداز میں اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے اسے اعتماد دیا تھا کہ اس نے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس کی داستان بے شک بہت دکھ بھری تھی مگر دکھوں کا ازالہ اور اٹھک شوٹی کا حوصلہ بھی تو کسی کسی میں ہوتا ہے۔

”نورین، مسز رحمان کے پارلر سے نکل کر ایک بالکل بدلی ہوئی شہینہ تھی۔ یہاں آتا ہے کار نہیں کیا تھا۔ مسز رحمان کی باتوں نے بہت حوصلہ دیا تھا امید بڑھاتی تھی وہ اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھی اسے بہت ہی مہمان ہستی لگی تھیں۔ جن کی نرم اور محبت بھری باتوں نے اس کو حوصلہ دیا تھا۔ اسے اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی وہ اس کی مشکلات کو سمجھ گئی تھیں اور جلد از جلد اسے ٹرینڈ کرنے کی جو بات انہوں نے کی تھی اس نے تول کو بہت ہی خوش کر دیا تھا۔ نورین نے واپسی کے تمام راستے میں وہ انہی کی باتیں کرتی آئی تھی۔

\*\*\*

”مگر یہ جگہ دور بہت ہے..... تم روزانہ کیسے آیا جایا کرو گی، پیدل تو خاصی دیر لگتی ہے۔“ نورین نے فکر مندی سے کہا۔

”کوئی بات نہیں نورین، جب کام سیکھنا ہے اور سکھانے والے بھی سچ مل گئے ہیں تو پھر ایسی مشکلات سے کیا ڈرنا، تھوڑا بہت مسئلہ تو ہوگا مگر میں کچھ نہ کچھ لوں گی، ہماری طرف کی کوئی لڑکی مل جائے تو ہم اسے ہی چلے جایا کریں گے کیونکہ تمہارا بھی روزانہ میرے ساتھ آنا مشکل ہے۔“ شہینہ نے کہا۔

”میں کیسے آؤں گی..... ماما کو پتا چل جائے گا اور وہ تو قیامت کھڑی کر دیں گی۔“ فی الحال تو شہینہ بھی آبی اس بات کو چھپانا پڑے گا۔“ چھوٹی سی نورین

کی بات پر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی، صحیح کہہ رہی تھی وہ بھلا اس کا روزانہ ساتھ آتا کہاں ممکن تھا اور اس طرح تو گھر والوں کو بھی علم ہو جائے گا۔ وہ بری طرح الجھی۔

”خیر اللہ مالک ہے.....“ کوئی حل نہ پا کر اس نے سر جھکا اور سب کچھ خدا پر چھوڑ دیا۔

”تم جاؤ گی کیسے؟ کس کے ساتھ۔“ اسی نے بھی ساری بات سن کر فوراً یہی سوال کیا تھا۔

”اوہو!..... نکل آئے گا کوئی نہ کوئی حل اس کا بھی۔ مجھے جانے تو دس ہفتہ دس دن فی الحال تو نورین ہی میرے ساتھ جائے گی۔“ شہینہ نے کہا۔

”نورین کے جانے سے تو بہت مسئلہ کھڑے ہو جائیں گے، نہ نہ تمہاری ماما تو..... ہاں، ایک حل ہے تمہارے ماموں صبح دس بجے دکان پر جاتے ہیں اگر وہ اسکوٹر پر نہیں۔“ اسی کہتے کہتے خاموش ہو گئی تھیں، کیسی ناممکن باتیں وہ سوچ رہی تھیں، پریشانی میں تو انسان کو ان ہونی باتیں سمجھتی ہیں۔

”ہاں، یہ ہو سکتا ہے، یہ ہو جائے تو سارے مسئلے ہی حل ہو جائیں مگر ماموں سے بات کون کرے گا اور ماموں سے کیا بھانہ بتائیں گے، رخسانہ باجی کا پارلر تو دور نہیں ہے جو اسکوٹر پر جانا پڑے، ماما تو بال کی کھال سمجھتی ہیں۔“ شہینہ نے کہا۔

”ماموں سے بات میں کروں گی بلکہ ساری بات بتا بھی دوں گی۔“ نورین نے ایک بار پھر اس حیران کر دیا تھا یہ کہہ کر نگر.....“ وہ جھٹی تھی۔ ”مامی سے بات کون کرے گا۔“

”میں.....“ نجمہ کی بات پر دونوں نے چونک کر اپنی اُمی کو دیکھا۔

”ہاں..... شادو سے بات میں کروں گی۔“ یکدم ہی نجمہ نے فیصلہ کیا تھا ان کی بیٹی تھی خوفزدہ بھی، ڈری ہوئی..... اس کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا اور وہ اپنی بیٹی کی خاطر اتنی بات تو بھائی سے کر ہی سکتی تھیں، نجمہ نے بہت بے خوف اور غرور ہو کر سوچا تھا اور ماں کو اتنا پر اعتماد کچھ کر شہینہ کو یکدم یوں محسوس ہوا تھا جیسے منزل بہت قریب

آگئی ہو اور راستے کی ساری رکاوٹیں، پریشانیاں اور مصیبتیں ختم ہو گئی ہوں مگر اس راہ پر خاری صوبتوں سے اتنی آسانی سے چھٹکار کہاں ملنے والا تھا ہے۔

نجمہ نے جو بڑے اعتماد سے اپنی بچیوں کو تسلی دی تھی بہت بہادری اور بے خوفی سے شادو سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ کی کمزور لمحے کی گرفت تھی ورنہ وہ بھائی سے بھلا اس طرح کی بات اتنے دھڑلے سے کہاں کر نے کی ہمت رکھتی تھی اور یہی ہوا تھا اگلے دو روز شادو کا موڈ نہ جانے کیوں بہت ہی برا اور بگڑا ہوا تھا، وہ بات بے بات نجمہ سے الجھ رہی تھی اور کونے، بد دعاؤں کے ساتھ بچوں پر ہاتھوں کا استعمال بھی ہو رہا تھا۔ سوکھی سڑی کمزوری کی ڈھالی سالانہ جو اس گھر کی شاید بے حد بے ضرر مخلوق تھی۔ شادو کی زوردار ٹھوکر کھا کر آگے کی طرف گری تو تھا چارپائی کے پائے سے جا ٹکرایا۔ اس کی زوردار چیخ ابھری تھی اور جب نجمہ نے دوڑ کر باہر آ کر اسے سیدھا کیا تو وہ ماتھے سے نکلنے والے خون سے بھری ہوئی تھی نجمہ نے کانپتے ہاتھوں سے اس کے نیم مردہ وجود کو اٹھا کر نلکے کے نیچے کر دیا، پانی کی تیز دھار میں بھی لہو کی آمیزش ہو رہی تھی نجمہ کا میلا دو پٹا جگہ جگہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ نورین بہن کو ایسی حالت میں دیکھ کر زور زور سے رونے لگی تھی۔ اس لمحے شہینہ کا سارا ضبط، ساری برداشت ختم ہو گئی تھی اس نے جھپٹ کر ٹائیہ کو ماں کے ہاتھوں سے چھینا۔

”بہن کریں امی، اس طرح اس کا خون نہیں رکے گا، مر جائے گی یہ اور مری جائے تو اچھا ہے، یہ بے چاری کسی کو کیا تکلیف دیتی ہے۔ اس کو بھی تکلیف ہے۔“ وہ غصے سے بولتی ٹائیہ کو لے کر دوسری کھلی میں موجود ڈاکٹر کے کلینک پر لے آئی تھی۔

”اوہو بہت گہرا زخم ہے یہ تو..... حد ہو گئی، اتنی کمزور بیٹی ہے اور اتنا خون نکل چکا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے بہت فکر مندی سے اسے دیکھا تھا اس کی مرہم پٹی کروا کے اور دو دوائی لے کر ڈاکٹر کا..... ہدایت نامہ برائے خوراک بلکہ اچھی خوراک وہ واپس پٹی تو ماما اپنے تخت پر بیٹھی بڑبڑا رہی تھیں۔



”میرے گھر میں رہتے ہیں اور مجھ پر ہی آنکھیں نکالتے ہیں یہ احسان فراموش۔ ذرا سی چوٹ کیا گئی، سارا خاندان تڑپ اٹھا، مرتب نہیں جائے گی یہ..... میرے کچھ پر بھاری پتھر پڑے ہیں کوئی نہیں اٹھے گا، چار دن ہوئے ہیں اس دیدہ ہوائی کو باہر جاتے ہوئے اور حوصلہ دیکھو..... گھر سے باہر نکلنے والی لڑکیوں کی شرم و حیا ختم ہو جاتی ہے۔ بڑا حوصلہ ہوتا ہے ان میں باہر نکلنے کا۔“ ماما کی اس بات پر اس کے تن پیدن میں آگ سی بھڑکی تھی جی چاہا پلٹ کر کہے..... ”واقعی بہت حوصلہ ہے تمہاری بیٹیوں کا جو باہر نکل کر سارے کام شرم و حیا سے کر کے آتی ہیں۔“ بہت سی باتیں، ڈھیروں سوال اور پھر ان کے جواب جو اس کے اندر طوفان کی طرح چکراتے پھر رہے تھے مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ اس نے خاموشی سے ٹانہ کو تکیے پر لٹا دیا۔ کز تو وہ پہلے ہی تھی۔ اب تو بالکل زرد ہو گئی تھی۔ نیند کے نشے کے زیر اثر سو رہی تھی۔ اس نے دوائیوں والی شیشیاں طاق میں دھریں اور پھر دوبارہ اس کے قریب آ گئی۔ امی نہ جانے کس کام میں مصروف تھیں وہ تو اپنی بیٹی کو دیکھتے بھی نہیں آتی تھیں۔ جرأت ہی نہیں تھی اتنی کس کام چھوڑ کر اسے تڑپتے کر لاتے بے چین دل کی تسلی کے لیے بچی کو دیکھ لیتیں۔

”میں جاؤں گی..... میں ضرور جاؤں گی، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔“ ٹانہ کے چہرے پر نظریں جمائے اس نے ایک بار پھر اپنے عزم کو دہرایا تھا یہ ظلم وہ کب تک برداشت کر سکیں گے پاؤں کے نیچے چھوٹی آجائے تو وہ بھی کاٹتی ہے اور ماما کے روز بروز بڑھتے ہوئے ظلموں پر وہ کب تک خاموش رہیں گے۔ ”میری معصوم بہن.....“ اس نے ٹانہ کے زرد چہرے کو چھوا، اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔

”وہ دیکھ رہا ہے نا..... وہ اوپر بیٹھا دیکھ رہا ہے، ہمیں بھی اور ماما کو بھی۔ تمہارا خون ضرور رنگ لائے گا۔ اس ظلم کا حساب ہو گا۔ ضرور ہو گا تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا تو خدا کی پر سے میرا یقین اٹھ جائے گا۔“ وہ روتے ہوئے بے ربط جملے بول رہی تھی اس ظلم

نے اسے تو ذکر رکھ دیا تھا۔ بہت دکھ ہوا تھا اسے ماما کے اس طرز عمل سے، ذرا سی بچی کو بے رحمی سے مار کر بھی وہ شرمندہ نہیں تھیں۔ الٹا سینہ زوری دکھاتے ہوئے انہیں شرمندہ کرنے کی کوشش میں تھیں۔



اس واقعے نے جہاں مجھ کو بے اعتبار لایا تھا وہیں ان کے خوف میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شادو اس کے بچوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ یہ ڈر انہیں راتوں کو ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ ٹی کی بار چاروں بچوں کو ٹوٹل ٹوٹل کر دیکھتی تھیں اندھیرے میں اپنی تسلی کرتی تھیں پھر ان چاروں کو اپنے قریب لگائے لیٹ جاتی تھیں۔ غمین ماما کی اس کیفیت سے بہت پریشان تھی۔ شاید وہ نفسیاتی کیس بنتی جا رہی تھیں۔ تمام دن تو وہ بچوں کی پروا نہیں کرتی تھیں انہیں دیکھتی یا پلائی تک نہیں تھیں اور رات کو تنہائی میں وہ انہیں بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ انہیں اپنے ساتھ لگاتیں، اپنے قریب رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ ماما کی اس کیفیت سے پریشان تھی۔ اپنی اس پریشانی کا ذکر مسز رحمان سے بھی کیا تھا وہ غلوں اور محبت کا پیکر کتنے غور و تحمل اور توجہ سے اس کی بات سن لیں۔ ”تمہاری ماما خوف کا شکار ہے۔ اعتماد کی کمی خوف کو جنم دیتی ہے۔ اپنے بچوں سے بے تحاشا پیار کے باوجود دن بھر شخص تمہاری ماما کے خوف سے وہ تمہیں نظر انداز کر دیتی ہیں اور رات میں جب تنہا ہوتی ہیں تو ان کی خود اعتمادی سامنے آتی ہے تب وہ ڈرے بغیر کم لوگوں کو پیار کرتی ہیں اور تمام رات تمہیں ہاتھ لگا لگا کر کم لوگوں کے وجود کا یقین چاہتی ہیں۔ اپنی ماما کو اپنی موجودگی کا احساس دلاؤ۔ انہیں حوصلہ دو، بہت بڑھاؤ..... وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ مسز رحمان نے بہت آرام سے اس کی بات سن کر اسے مشورے سے نوازا تھا اور ان کی بات نے اسے بہت حوصلہ دیا تھا۔

ماما کی عجیب و غریب اور بالکل انجان سی حرکات سے تو وہ بہت خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ”خدا خواست امی کے دماغ پر تو ٹانہ کی چوٹ کا اثر تو نہیں ہو گیا۔“ وہ سہم کر سوچتی تھی مگر اب مسز رحمان کی بات پر اطمینان ہوا تھا۔

”میں نہیں آؤں گا اتنی دور تمہیں لینے۔“ تین دن تو فریبت سے گزر گئے تھے مگر چوتھے روز سلطان پارلر سے واپسی پر آکر گیا تھا۔ اس کا انداز بڑا دلچسپ تھا۔ وہ حیران کر گئے۔ ایسا بے خوف انداز اور خود سہم لہجہ۔ ”میں تھک جاتا ہوں..... اور میری پڑھائی کا بھی رن ہوتا ہے۔“ فرخ بھائی مجھے ڈانٹ رہے تھے کہ اگر میں نے اب مزید کوئی کچھڑی کی تو وہ مجھے ماریں گے۔ اس کی بات پر وہ چوکی۔

”فرخ.....! تم اب بھی اس سے بڑھتے ہو۔“ اسے اپنی لاعلمی پر افسوس ہوا تھا اور حیرت تھی۔ وہ اپنی ہی پریشانیوں میں ابھی اس سے لائق ہو گئی تھی کچھ امی نے بھی تسلی دہی تھی اب سلطان بہت سمجھدار، عقل مند ہو گیا ہے، دل لگا کر پڑھتا ہے اور روزانہ اسکول بھی شوق سے جاتا ہے، امی اس کی طرف سے بہت مطمئن تھیں۔ اس نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہیں جانا مگر اب اس کی بات پر اپنی بے پروائی بہت بری طرح محسوس ہوئی تھی۔

”میں کل سے نہیں آؤں گا۔“ اس نے دوبارہ دمکی دی۔

”بکواس نہ کرو، نہیں آؤں گا کچھ، ایک نام تو تمہیں آنا ہوتا ہے صبح تو ماماں کے ساتھ ہی آتی ہوں پھر بھی تمہیں تکلیف ہے۔ پڑھا کو کہیں کا، یہاں سے جانے کے بعد پڑھ لیا کرو۔“ اس نے ٹھکی اور غصے سے اسے ڈانٹا۔ ”احساس ہی نہیں ہے بہن کا۔ شکر ہے صبح کا مسئلہ ہو گیا۔“ نورین نے ماماں سے رات کے کھانے پر بات کی تھی جب ماما صبح اپنی صاحبزادیوں کے اسٹارٹس پر اپنے پسندیدہ ڈرامے دیکھ رہی تھیں۔

”ماماں میری بات سن کر کچھ دیر تو خاموش رہے اور میرا دل..... تو بہ میرا دل تو جیسے بند ہونے والا تھا ماماں نے جانے کیا سوچ رہے تھے میں تو بہت زیادہ ڈر رہی تھی کہ کہیں مار دیا شروع ہو جائے مگر ماماں بولے تو بہت ہی آہستگی سے صرف اتنا پوچھا کہ صبح کا وقت کیا ہے میں نے بتا دیا، کچھ دیر انہوں نے سوچا پھر بولے ٹھیک ہے میں اسے لے جاؤں گا مگر یہاں سے نہیں۔ وہ

گھر سے تو رخسانہ کے اسکول ہی جایا کرے گی اسکول سے میں پک کر لوں گا اس طرح کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا اور ہمارا کام بھی ہو جائے گا۔“ ماماں کی بات پر وہ سو جان سے قربان ہوئی تھی جب نورین نے واپس آ کر اسے خوشخبری سنائی تھی۔

”ٹھیکہ آئی! ماماں بہت اچھے اور رحمدل انسان ہیں، انہیں ہماری حالت کا بخوبی احساس ہے مگر وہ صرف اور صرف ماما کی وجہ سے اور گھر کے سکون کی وجہ سے نہیں ملنے سے کتراتے ہیں، ورنہ..... نورین نے ماماں کی طرف داری کی۔

”ہاں..... شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو.....“ ٹھیکہ پہلی بار اس سے متفق ہوئی تھی۔

”تم ماما کو جانتی ہونا۔ وہ تو ماماں کا بھی لحاظ نہیں کرتیں، اسی لیے تو وہ بے چارے ڈرتے ہیں۔“ نورین کی بات پر اس نے چونک کر اسے بہت چھوٹی بہن کو دیکھا۔ اس عمر میں اس کی سوچ جس قدر پختہ تھی اس کا مشاہدہ کتنائی تھا تو وہ بہت زیادہ عقل مند تھی یا پھر اسے حالات نے گہرا شعور عطا کیا تھا۔ وہ ٹھیکہ کے مقابلے میں زیادہ باشعور، سمجھدار اور تیز تھی۔ اس میں قوت فیصلہ بھی بہت زبردست تھی۔ وہ اکثر نامکمل باتوں کو مکمل کر دکھاتی اور ٹھیکہ حیران رہ جاتی تھی۔ ماماں کو راضی کرنے والا کارنامہ تو واقعی باکمال تھا۔

”میں امی سے جا کر تمہاری شکایت کروں گی۔ تم بہت بدتمیز اور بد لحاظ ہو رہے ہو، اپنی آپنی کا تو خیال نہیں ہے اور وہ فرخ بھائی بہت گنے گنے ہیں تمہارے۔“ اس نے غصے اور طرے سے ڈانٹا۔

”ہاں، ہیں وہ میرے گنے۔ وہ بہت اچھے ہیں مجھے چیزیں بھی دیتے ہیں اور پیسے بھی۔“ سلطان کی بات پر وہ ایک بار پھر بری طرح ٹھکی گئی سر جھٹک کر اس نے خود کو سنبھالا تھا۔

”فرخ اور اتنی ہمدردی، محبت! کیوں..... کیوں؟“ اس ابجمن کا سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ فرخ کا سلوک اگر سبکی گھر والوں کے ساتھ اچھا ہوتا تو وہ مان بھی لیتی کہ اس کی محبت یا غیرت جاگ گئی ہوگی۔ ان



کے ساتھ تو اس کا رویہ بالکل بھی نہیں بدلا تھا۔ اتنا ہی ظالمانہ، تحقیر آمیز اور نفرت بھرا تھا اور سلطان سے ساری ہمدردیاں اور محبتیں۔ یہ کیا پکڑ تھا، غم روزگار نے اسے ان چند ماہ میں اس طرح الجھا دیا تھا کہ وہ سلطان کی طرف سے بھی غافل ہو گئی تھی مگر اب اس کی باتوں نے دوبارہ تفتیش میں مبتلا کر دیا تھا۔ گھر آ کر اس نے سب سے پہلے امی کو سلطان کی بات بتائی۔

”مجھ کہتا ہے، یہ فرخ آج مجھے بھی کہہ رہا تھا کہ پھوپھی اگر وہ پڑنے لگا ہے، توجہ دیتا ہے اپنی پڑھائی پر تو اس کا اس طرح بیزار غرق نہ کریں۔ شہینہ کے لیے اس کا مستقبل کیوں تباہ کرتی ہیں اور شہینہ کون سا کوئی سیلوں دور جاتی ہے نزدیک ہی تو ہے خود ہی آ جایا کرے گی مگر اس کے نانغہ نہ ہوں..... ورنہ میں اسے پڑھاؤں گا بالکل نہیں پھر گلہ نہ کرنا۔ ساری دنیا کو ہماری شکایتیں لگتی ہے اور اب آپ کے اکلوتے بیٹے پر توجہ دے رہا ہوں تو اسے دوبارہ آوارہ بنا رہی ہے۔“ نجمہ بیگم بولیں۔

”مجھے فرخ کی یہ ہمدردیاں بھضم نہیں ہو رہی ہیں۔ نہ جانے کیوں دل وہم کرنے لگا ہے۔“ شہینہ تشویش سے بولی۔

”کیسا وہم.....!“ اس کی فکر مندی پر نجمہ چونکیں جب کہ وہ کہیں اور پہنچی ہوئی تھیں۔

”ایسے ہی وہم نہ کر، اللہ جب کسی کے دل میں رحم ڈالتا ہے تو یونہی ظالموں کو رحم دل بنا دیتا ہے، میں تو خدا کا شکر ادا کرتے نہیں بھلتی ہوں کہ اس نے سلطان کی پانہ پکڑ لی ہے پڑھاتا ہے، اسکول کا کام کراتا ہے، استاد سے جا کر ملتا ہے۔ سلطان تو بہت سدھر گیا ہے۔ دن بھر کی آوارہ گردی ختم۔ فرہاد کے ساتھ تمام دن کھیلتا تھا، پڑھتا ہی نہیں تھا اسکول سے نام کٹ گیا تھا۔ اب ساری برائیاں ختم ہو گئی ہیں۔ اتنے آرام سے فرخ کے کمرے میں جا کر پڑھتا ہے کہ آواز تک نہیں آتی۔ بہت اچھا ہوا جو اس نے اس لڑکے کو قافلوں پر لایا اور تم بھی تو اس کی وجہ سے پریشان نہیں۔ اس کی پڑھائی کی فکر کرتی تھیں اب سب فکریں بھول جاؤ خواہ وہم نہ کرو اور

جہاں تک تمہاری وابستگی کا تعلق ہے تو تم کسی لڑکی کے ساتھ آ جایا کر دیا پھر کوئی اور صلہ سوچو، سلطان کی تعلیم اور مستقبل زیادہ ضروری ہے۔“ نجمہ نے تفصیل سے بتایا۔

”مجھے بھی احساس ہے امی..... بہت احساس ہے مگر کیا کروں اتنی دور سے اکیلے کیسے آؤں گی۔“ نجمہ نے کچھ صلہ تو کھل آئے گا، کسی سے پوچھوں گی کوئی لڑکی ہماری طرف کی رہنے والی ہوئی تو مل کر آ جائیں گے مگر چند دن تو گزرنے ہی ہوں گے نا.....“ اس کی بھی مجبوری تھی۔ وہ تنہا نہیں آ سکتی تھی اور چاروں میں وہ کسی سے اپنی مجبوری کیا بیان کرتی۔

”چند دن.....“ مگر فرخ اسے مزید ایک دن کی بھی مہلت نہیں دے گا تم ایسا کرومچ ہی اپنی باجی سے بات کرو۔“ ماں کی بات پر وہ چپ کی چپ رہ گئی وہ بھی بیٹے کے سدھر جانے پر بے انتہا مطمئن تھیں اور فرخ کو چھوٹی بھر بھر دعائیں دیتی تھیں کہ اس نے بالا خر پھوپھی کے بیٹے کا اپنے بھائی کی طرح خیال رکھا اور ماں کی تمام تر لعن طعن اور غصے کے باوجود سلطان کو پڑھانا نہیں چھوڑا تھا۔

”ہوں.....“ اس نے ہکا بھکا ہنسا سے مسئلہ اسے خود ہی حل کرنا تھا مگر اتنی جلدی باجی یا کسی سے بھی اپنے مسئلے کہنا اسے بہتر نہیں لگتا تھا اور اب۔

”ٹھیک ہے میں باجی سے بات کروں گی۔“ اس نے آہستگی سے کہہ کر ٹانہ کو گود میں اٹھالیا تھا۔ نجمہ اسے مصروف دیکھ کر باہر نکل گئی تھیں اور وہ ٹانہ کو گود میں لٹائے سوچے جا رہی تھی۔

خوش قسمت سی سے اور اللہ کی خاص مہربانی سے اسے مسز رحمن جیسی عورت مل گئی تھیں جو اس کی مجبوریوں کا احساس کرتی تھی اور اسے کام سکھانے میں مخلص بھی تھیں۔ ان تین چار دنوں میں ہی اسے یوں لگتا تھا جیسے اسی رفتار سے اگر فرخ بنگ لیتی رہی تو بہت جلد..... بہت جلد وہ ماہر ہو جائے گی اور پھر منزل دور نہیں ہوگی۔ وہ سب کچھ جس کی اسے خواہش ہے مل جائے گی مگر یہ خود اس وقت کیسے کئے گا۔ کتنا مشکل ہے اس گھر میں سائنس

لینا۔ زندگی اتنی بوجھل اور دشوار ہو جائے گی تو انہیں محج معن میں یہاں آ کر محسوس ہوا تھا اور اب جب وہ زندگی کا بوجھ خود اٹھانے کی کوشش کرنے لگی تھی تو وقت مزید بے رحم اور حالات مزید ظالم ہو رہے تھے، ایک کے بعد ایک الجھن اور پریشانی۔

”فرخ اور سلطان.....“ بیٹی سوچتے سوچتے اس کی دہائی رو پھر بھٹکی تھی۔ ”یہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے، مجھے سلطان پر نظر رکھنی چاہیے۔“ نہ جانے کیوں اسے فرخ اور سلطان کے درمیان یہ تعلقات کی استواری بھنم نہیں ہو رہی تھی۔

”ابھی اس معاملے کو چھیڑنا مناسب نہیں ہوگا، کچھ دن بعد دیکھوں گی ذرا سیٹ ہو جاؤں پھر اصل بات کا پتا لگاؤں گی۔“ اس نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کیا تھا مگر اس کے تیر لگانے سے قبل ہی فرخ کو اس کے مسز رحمن کے پار جانے کی خبر ہو گئی تھی۔

اس شام وہ حسب معمول گھر میں داخل ہوئی تو خلاف معمول فرخ کو صحن میں ماں کے تخت کے قریب بیٹھے پایا۔ ”اس وقت تو یہ گھر میں ہی نہیں ہوتا تھا پھر آج.....“ وہ سوچتی ہوئی اپنے کمرے میں جانے لگی تھی کہ فرخ نے زور سے اسے لکارتا تھا وہ ٹھیک کر پکڑی۔

”ادھر آؤ.....“ ویسے تو وہ ہمیشہ ہی بہت غصیلے اور بارعب انداز میں بات کرتا تھا مگر آج تو لہجہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ خوف سے یکدم اس کا دل دھڑکا۔

”جی.....“ بڑے حوصلے سے اس نے نظر اٹھائی تھی وہ کھا جانے والی سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔

”کہاں سے آرہی ہو تم؟“ اس کے سوال پر وہ چونکی۔

”میں کام سے.....“ وہ بھٹائی۔

”کون سے کام سے.....؟“ اس کی آنکھیں خوں رنگ تھیں۔ اس کا بدن پسینے میں ڈوب گیا۔

”میں رخسانہ باجی کے گھر سلائی کے لیے جاتی ہوں۔“ وہ ایک ہی سانس میں بتا گئی۔

”سلائی سینکھنے یا نائی کا کام سینکھنے۔“ اس نے طنز سے کہا تو وہ چونکی۔

”تم اس سے سلائی کڑھائی نہیں سیکھ رہی ہو بلکہ بیوٹی پارلر کا کام سیکھ رہی ہو۔“ وہ یکدم دباڑا تھا اور لہجہ بھر کو اس کا دل ڈوب سا گیا تو یہ جان چکا ہے سب۔

”ہائے میرے اللہ..... تو یہ تو بہ..... کیسی دیدہ ہوائی، بے شرم لڑکی ہے، گھر سے نکلتی ہے کچھ اور کہہ کر اور جاتی کہیں اور ہے، اللہ کی شان بیوٹی پارلر کا کام سیکھ رہی ہے رانی..... اور ہمیں بتایا تک نہیں، اجازت لینا، پوچھنا تو دور کی بات ہے، ہمیں یہ کون سا اپنا بھتیجی ہے، بڑا بھتیجی ہے، یہ تو خود بڑی عقل مند، سیانی اور بڑی ہے، اسے کیا ضرورت ہے کہ ہم سے کچھ پوچھے، ہم کیا لگتے ہیں اس کے، اپنی مرضی کرتی ہے، اپنی مرضی..... اب یہ تانیوں والا کام سیکھ کر سارے خاندان کا نام روشن کرے گی، جوتھو کریں گے برادری والے ہم پر کہ لڑکی کو کیا کام سکھا رہے ہیں۔“ ماں تو اس انکشاف پر جیسے ہلپلا اٹھی تھیں۔

”میں تمہاری ٹانگیں تو زردوں گا اگر تم مجھے دوبارہ پارلر جاتی نظر آئیں، عزت ہے ہماری چار بندوں میں..... تم تو ہو ہی..... میرے دوست طنز کر رہے تھے مجھ پر، طعنہ دے رہے تھے ہنجر کر تو زندہ ہے، میری بہن ہوئی تو کاٹ ڈالتا گردن اس کی۔“ وہ دانت پیستے ہوئے اسے کہہ رہا تھا اور اس لمحے اس نے بمشکل خود پر قابو پایا تھا۔ ”میری بہن ہوئی تو.....“ اس کا ایک ہی فقرہ پھانس بن کر چھٹا تھا۔ جی چاہا کہہ دے ”تمہاری بہنوں کے جو کہوت ہیں۔ وہ معلوم ہو جائیں تمہیں تو کسی ایک کی بھی گردن سلامت نہ رہے۔“ مگر وہ اس وقت اب کھول کر اپنی شامت خود بلانے کے لیے حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ فرخ دھمکی دے کر چلا گیا تھا اور اب میدان میں ماں تھیں۔

”ارے اس میسٹی کی میسٹی ماں کو دیکھو..... بیٹی کے راز پر کیسا پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس نے..... بھائی بھائی کرتے محبت جتاتی ہے اور بھائی کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ میں نے تو اجازت دے دی تھی سلائی کڑھائی سینکھنے کی، چلو لڑکیوں کو یہ ہنر تو آنا چاہیے،



بیہ کراٹھ گھر بھی جانا ہے مگر اس لڑکی کے تو چھن ہی درست نہیں ہیں، سرفی پاؤڑ کا کتنا شوق ہے اسے.....  
نجمہ اور نجمہ، کان کھول کر تم دونوں سن لو..... صبح سے یہ اسکول نہیں جاتے گی۔ یہ گھر سے باہر نکلے تو میں اس کی ٹانگیں تڑا دوں گی.....“ ماما نے چیخے ہوئے بہن میں آنسو بہاتی نجمہ کو وارن کیا تھا جن کی ٹانگوں کی جان تو فرخ کی دھاڑ سے ہی نکل گئی تھی اور اب ان کی کمرورینم جان مردہ ٹانگیں اٹھنے سے بھی انکار کرتی تھیں، وہ راکھ میں انگلیاں چلاتے ہوئے برقی آنکھوں سے نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں، شاید کھوئی ہوئی خوشیاں یا بڑی ہوئی تقدیر۔ جس کے بہتر ہونے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ بہتری کی ہر کوشش ناکام اور ہر صورت نامراد ہو رہی تھی۔

”میں صرف کام سیکھنے جاتی ہوں ماما..... اور سیکھوں گی بھی کیونکہ مجھے بڑی مشکل سے اور سفارش کے بعد اس پارلر میں کام سیکھنے کا موقع ملا ہے۔“ اس نے بے حد ہمت سے ماما کو اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ ویسے بھی فرخ کے جانے کے بعد اس کے خوف میں بتدریج کمی ہوئی تھی۔

”ہائے ہائے، ہمت، دیکھو اس لڑکی کی، دیدہ دلیری دیکھو، سیکھوں گی..... سکھاؤں گی میں تمہیں..... ضرور سکھاؤں گی“ کام،“ تم صبح نکل کے دیکھنا گھر سے، واپس نہیں میرے گھر کی دلیز پار کر سکو گی۔“ ماما کی تن بدن میں اس کی بات نے آگ لگا دی تھی، اس کی جرأت پر وہ ناگن کی طرح بل کھا گئی تھیں، اتنے خوفناک انداز اور تیوروں سے دھمکی دی تھی کہ ثمنینہ کا وجود پل بھر میں پانی بنا تھا اور اندر رکھیں کوئی چلا کوئلہ نجمہ کی انگلیوں میں یکدم آ گیا تھا، وہ اپنے ہاتھ کو اپنے دوپٹے سے دباتے ہوئے اپنی تکلیف برداشت کر رہی تھیں۔

”دفع ہو جاؤ اب یہاں سے، منہوش شکل گم کرو، بے حیا، بزدل کو جواب دینی ہے، بے غیرت ابھی سے یہ چھن ہیں تو آگے بیوی پارلر کا کام سیکھ کر تو نہ جانے کون سے چاند چڑھائے گی۔“ ماما کی بات پر اس کا

دل تڑپ اٹھا تھا۔ سارے بدن میں لہو کی گردش آہستہ آہستہ بن گئی تھی۔

”کاش..... کاش میں جواب دے سکتی ہوں کاش میں اتنی ہمت رکھتی، کاش میں اس طرح میں ہوتی کہ آپ کو بتا سکتی، کون بے غیرت ہے اور غیرت مند، کس کے چھن اچھے ہیں کس کے برے۔“ ثمنینہ نے سوچا۔

”ماما میں نے کہا تھا.....“ اس نے اسی وقت ان بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ آج مکمل کربات ہو جائے۔

”تم جاؤ اندر ثمنینہ.....“ وہ ابھی غصیلے لہجے میں یہاں تک ہی کہہ پائی تھی کہ نجمہ کی آواز پر چونک کر رکھی وہ سرخ آنکھیں لیے اذیت سے مجبور چہرے کے ساتھ چن کے دروازے سے باہر کھڑی تھیں۔

کچھ کہنا چاہا مگر ماں کی آنکھوں میں چھپی وارنک اور انکار دیکھ کر خاموش سے اپنے کمرے میں آ گئی، حالانکہ آج اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ماما سے صاف صاف بات کرے گی۔ اس روز روز کی چوری سے اور کل کی سے تو جان چھوٹنے کی جو بھی ہوتا ہے، ہو جائے۔ کون سا گناہ کر رہی ہے، اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں تو مارے گی۔ خود کو ماما کے رحم و کرم پر چھو دیا تو نہ صرف ضمیر مردہ ہو جائے گا بلکہ پوری ثمنینہ بدل جائے گی، انا، خودداری اور عزت نفس سب بھرا جائے گا۔ زکوٰۃ اور خیرات کے پیسوں سے پیٹ بھرتا ہو گا۔

ذلت اور اذیت کے دن رات اور اس پر بھی ماما کی احسان۔ یہ زندگی گزارنے سے تو بہتر تھا کہ وہ مرنے جاتی، اسی لیے تو اس نے سوچا تھا کہ وہ ابھی ماما سے ساری بات صاف صاف کر لے گی مگر.....!

”ارے ہمارے خاندان میں سات پشتوں میں کسی نے یہ نایاں والا کام نہیں کیا، تمہیں بھی بھائی کی عزت کا احساس نہیں ہے نجمہ۔ میرا بیٹا فرخ سخت غصے میں تھا، بیشکل اسے سمجھا کر ٹھنڈا کیا ہے اگر اسے دوبارہ ثمنینہ کو گھر سے باہر دیکھا تو نہ جانے کیا کر دے گا اس لیے بی بی مجھے سمجھانے کے بجائے جا کر اپنی ماما کی خاں بی بی کو عقل دو، کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہے

عزت والوں کے گھر عزت سے رہے، میں ایسی آوارہ گردیاں اور عیاشیاں قطعاً برداشت نہیں کروں گی۔“ ماما کی زبان انکار اے اگل رہی تھی، نہ جانے نجمہ نے کیا کہا تھا کہ وہ مزید غصے میں آ گئی تھیں۔

”عزت والے.....“ ثمنینہ کو یہ الفاظ کوڑے کی طرح اپنے بدن پر لگے تھے۔ ”عیاشیاں“ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا، اس لمحے اسے باہر بیٹھی جلا وصفت اپنی ماما اور ہر اعلیٰ اس کی زبان دونوں اس قدر بری اور..... نفرتی بھری لگی تھیں کہ اس کا بس چلتا تو وہ دونوں کو ہی کاٹ ڈالتی۔

”اے اللہ تو نے ہمیں اتنا مجبور کیوں بنایا ہے، کیوں اس قدر بے بس کر دیا ہے، اس جیسی ظالم بے رحم عورت کے در پر لا چنچا..... کیوں؟ کیا گناہ کیا تھا ہم نے! ہم بول بھی نہیں سکتے، ہم حق بات کہہ نہیں سکتے، کیوں، اتنا مظلوم کر دیا ہمیں اور اسے اتنا طاقتور، اور ظالم.....“ اس کی ماں کی ہارے جواری کی طرح گردن گرائے، مرے مرے قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی تھی، بے اختیار ڈھیر ڈھکے اس کے لبوں سے نکلے تھے۔ آن کل وہ ویسے بھی خدا سے شکوہ شکایات کچھ زیادہ کرنے لگی تھی، انسان جب بھرے پیٹ ہوتا ہے، دنیاوی غموں اور فکروں سے بے پروا، مالامال ہوتا ہے تو اسے خدا کا شکر یاد کرنا اتنی جلدی نہیں آتا، جتنا کہ پر نگہ کرنا شکوہ کرنا.....

”امی..... آپ نے ماما کو صاف صاف صاف کہہ دینا تھا کہ میں کام پر جاؤں گی، ضرور جاؤں گی..... میں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں گنوا سکتی ہوں، چاہے کچھ ہو جائے۔“ اس نے ماں کو مایوس و نامراد، غمناک و کھنکھنے سے جتایا تو انہوں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کیا ممکن تھا اس ایک نظر میں، وہ کانپ اٹھی، بے بسی، مظلومیت، ہار، دکھ، اذیت اور غم۔

”امی.....“ اسے لگا اس کا دل پھٹ جائے گا، اس نے ماں کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”میں مجبور ہوں..... کچھ نہیں کر سکتی ہوں.....“ نجمہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر سسکیاں

تھیں۔

”اگر ابھی ہم نے بار ماں لی، پیچھے ہٹ گئے تو..... تو شاید کبھی بھی اس جہنم سے نہیں نکل سکیں گے اور یہی یہ عورت چاہتی ہے، ہمیں تمام عمر اپنا محتاج رکھنا چاہتی ہے، دبا کر تو کروں کی طرح ہم سے کام لینا چاہتی ہے، زکوٰۃ اور صدقات کے جو پیسے اسے ہمارے نام پر ملتے ہیں، ان سے ہاتھ دھونا پڑے گا اسے، مفت کا وظیفہ کسے برا لگتا ہے امی، حلال و حرام تو بعد کی باتیں ہیں، یہ عیش یونی نہیں ہو جاتے اور آپ کہتی ہیں میں کچھ نہ کروں، اتنا اچھا موقع کتنا دوں، محض اس لیے کہ یہ عورت ہم سے لڑے گی، ہمیں تنگ کرے گی۔“ وہ بہت غصے میں تھی اس وقت اسے ماں کی بزدلی بھی بری لگ رہی تھی۔

”وہ ہمیں گھر سے نکال دے گی۔“ نجمہ بولیں۔

”نکال دے..... میں جانتی ہوں امی اس کی اس دھمکی میں کوئی دم نہیں ہے، وہ صرف ڈراتی ہے ہمیں، گھر سے نکالنا ہوتا تو بہت پہلے نکال چکی ہوتی۔ ہر بار صرف دھمکیاں نہ دیتی۔“ ثمنینہ تیز تیز لہجے میں بولی۔

”تم بے وقوفوں والی بات کر رہی ہو ثمنینہ..... اب کی دفعہ شادو بہت غصے میں ہے، اس کے تیور بتا رہے ہیں وہ جو کہہ رہی ہے کبھی لے گی اور اگر اس نے اپنی بات سچ کر دکھائی تو تب تم کیا کرو گی..... سڑک پر بیٹھ کر یہ سب باتیں اور منصوبے ایک پل میں ہوا ہو جاتے ہیں، چھت اور سر چھپانے کا سہارا بس یہ یاد رہتا ہے باقی سب کچھ حق کہہنا پینا بھی بھول جاتا۔“ نجمہ بہت مایوس تھیں، رنجیدگی سے کہتے ہوئے انہوں نے گہری سانس لی تھی، ثمنینہ چند لمحے کو خاموش ہوئی۔

”امی..... آپ چاہتی ہیں کہ میں پارلر نہ جاؤں.....“ اس نے بہت بھیدگی سے پوچھا تھا۔

”اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں۔“

”راستہ تو ہے اور میں وہ راستہ ضرور استعمال کروں گی، اس آخری حرے کو ضرور آزماؤں گی۔“ اس نے بہم لہجے میں دعویٰ کیا تھا، نجمہ چونک گئیں۔

”کون سا راستہ..... کیا! کیا کرو گی تم؟ نجمہ نے



پوچھا۔

”امی..... ماما ہمیں دھمکیاں دے سکتی ہیں تو ہم بھی انہیں دھمکا سکتے ہیں، میں یہ زکوٰۃ والی بات ماموں کو بتا دوں گی۔“ اپنی طرف سے اس نے بڑا دھماکا کیا تھا۔  
”اور تمہارا کیا خیال ہے، وہ مان لیں گے۔“ نجمہ بے اختیار ہنسی تھیں، طنز سے اسے گھورا۔  
”کیوں، کیوں نہیں مانیں گے۔“

”وہ میرا مان جایا ہے شینہ..... میں جانتی ہوں اس کی رگ رگ کو..... دو دن تم اس کے اسکول پر بیٹھ کر نہ جانے کیا سمجھنے لگی ہو..... اسے مجھ سے ہمدردی ضرور ہے تم لوگوں پر ترس بھی آتا ہوگا اسے مگر ایسی بات نہ تو شادو مانے کی اور نہ ہی میرا بھائی، لانا بھی تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور جو چاکری کا سکون یہاں مل جاتا ہے وہ بھی جائے گا۔ تم پتی ہو شینہ..... تم بہت معصوم ہو، تم زمانے کی چالاکیوں کو کیا جانو.....“ نجمہ بہت مایوس اور افسردہ تھیں اور شینہ ان کی بات سن کر یکدم ٹھنڈی پڑ گئی تھی، اپنے تئیں اس نے بڑا دھماکا کیا تھا۔

”نہ مانے، کوئی نہ مانے مگر امی آپ یہ جان لیں، میں اس موقع کو ضائع نہیں کروں گی، اگر آج یہ موقع میرے ہاتھ سے نکل گیا تو تمام عمر ہم سب اس جہنم میں جلتے، کڑھتے گزار دیں گے، تمام عمر..... آپ کو بھی معلوم ہے اچھی طرح معلوم ہے یہ بات.....“ شینہ نے حتیٰ لچھے میں کہا۔

”ہاں معلوم ہے مگر یہاں سے نکل کر تو جہنم میں بھی کوئی ٹھکانا نہیں ملے گا۔“ نجمہ بولیں۔

”مل جائے گا..... اللہ بہتر کرے گا، انشاء اللہ سب بہتر ہو جائے گا۔ آپ دعا کریں میں بھی حاجت کے نقل پڑھ کر سورۃ یٰسین پڑھ کر دعا کرتی ہوں، آپ کو کیا دہے نانی کہا کرتی تھیں کہ جب بھی کوئی مشکل ہو، مسئلہ ہو اور کسی بندے سے کام لینا ہو تو حاجت کے دو نقل پڑھ کر سورۃ یٰسین کا وظیفہ کرو اور دعا مانگو..... اللہ تعالیٰ ضرور مدد کرتا ہے۔“ شینہ کے منہ سے مرحومہ ماں کا ذکر سن کر نجمہ کی آنکھیں جل جل ہو گئی ہیں۔

”ہاں، اماں کہتی تھیں، اماں نے مجھے روزانہ سورۃ

یٰسین اور سورۃ مزمل پڑھنے کی تلقین بھی کی تھی مگر میں دنیا کے دھندوں میں الجھ کر بھول ہی گئی۔ نماز بھی پڑھنے کا وقت نہیں ملتا، اللہ مجھے معاف کرے، شاید اس لیے آزماتیں ختم نہیں ہو رہی.....“ نجمہ کے اندر جیسے بارش روشن ہوئی تھی، اپنی کوتاہی پر شدید ندامت محسوس ہو رہی تھی، اپنے دکھ، اپنا غم، اپنی تکلیف سب یاد تھا، سورۃ خدا بھولا ہوا تھا۔ گلے شکوے ہر دم زبان کی گلائی جا رہی تھے مگر ایک جگہ مشکل بلکہ مشکل ترین لگتا تھا۔

”آؤ شینہ..... آؤ..... آج ہم دونوں مل کر ان کے حضور جھک کر دعا مانگیں۔“ ماں کی بات سن کر شینہ فوراً کھڑی ہوئی تھی۔ جب وہ وضو کر کے جانماز بچھا رہی تھی تو ماما نے امی کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اسی وقت تک شینہ کو دیکھا۔

”ارے کہاں مگر مٹی ہے نجمہ، باہر نکل، کیا سوچ رہے؟“

”آف خدایا..... یہ عورت سانس بھی نہیں لیتی۔“ نجمہ نے بے بسی سے بیٹی کو دیکھا۔

”ارے ایک کپ چائے بنا دو مجھے کوئی..... درو سے پھنسا جا رہا ہے اس گھر میں پورا انجیل پورہ بیباک ہے، حرام خور، مفت خور، کسی کا احساس نہیں اس گھر میں رہنے والوں کو..... کہاں مگر گئے سارے۔“ ماما کی دہاڑتی آواز اور لٹن طعن بخوبی کمرے میں آ رہی تھی نجمہ کے چہرے کا رنگ خوف سے تبدیل ہو گیا تھا، نجمہ نے سوالیہ نظروں سے شینہ کو دیکھا۔

”امی آپ جانماز پڑھ کر مٹی میں شروع کریں۔“ اس نے نیت باندھنے کی غرض سے اپنے ہاتھ کندھوں تک اٹھائے تو نجمہ نے ایک بل کو سوجھا اور کھڑی ہو گئیں۔

”نجمہ..... ایسی دہلا دینے والی دہاڑتی کہ کئی بے چاری یکدم خوف زدہ ہو کر باہر کی جانب ہٹیں۔ زمین کے اوپر رہنے والوں کا اتنا خوف زمین آسمان کے مالک سے بھی زیادہ..... ایک دم زمین ٹانگیں لرزے لگی تھیں۔ اسے لگا اس کی جان نکلنے کی ہے، وہ گھٹنوں کے بل جھکی اور پھر اوندھے منہ جھک

میں جا گری۔

”مجھے معاف کر دے، مجھے معاف کر دے.....“ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بند تھیں اور جانماز پر سر تھراتے ہوئے وہ ایک ہی بات دہراتے ہوئے زار و تار زار رہی تھی، اسے اس وقت بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

پس وہ روئے جا رہی تھی اس کا علم محدود تھا، اس کی عمر پانچ تھی، سوچنا پختہ تھی۔ وہ اپنے اس فعل کو کوئی ہم نہیں دے سکتی تھی، نہ ہی اسے اپنے رونے سے معافی مل جانے کی توقع تھی۔ وہ تو بس رو رہی تھی کہ دل اس حرکت پر بری طرح تڑپا تھا، بدن پر لرزہ طاری کر دینے والی اس انوکھی کیفیت کو وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔

”آئی..... آئی.....“ نورین کمرے میں آئی تو اسے یوں بلک بلک کر روتے دیکھ حیران رہ گئی پھر یکدم اسے سمجھوتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔

”کیا ہے نورین..... بس بھی کرو.....“ لگا تار جھکوں پر اس نے اپنا سر اٹھا کر اسے ڈانٹا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ اس کی بے تحاشا روٹی آنکھیں، سرخ چہرہ اور سوجے ہوئے پونٹے دیکھ کر وہ بے حد تشویش میں مبتلا ہوئی تھی۔

”کچھ نہیں..... مغرب کی اذان ہو گئی ہے؟“ اب کے وہ بولی تو لہجہ بے حد ہموار تھا۔

”ہاں.....“

”چلو پھر میں نماز پڑھ کر آتی ہوں۔“ اس کے انداز میں بلا کا ٹھہراؤ..... اور سکون تھا اس کی ابتر حالت کے برعکس اس کی آواز اور انداز بہت ہی نارمل اور پُر سکون تھے، نورین نے اچھنبے سے اسے گھورا تھا۔ وہ بہت سکون سے آنکھیں موندے نماز پڑھنے میں مصروف تھی، کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ باہر نکل گئی، شینہ نے مغرب کی نماز پڑھی، دو نقل صلوٰۃ الحاجت پڑھے، دعا مانگی اور باہر آ گئی۔ اس کی ماں بچن میں تھی، وہ فرہاد کے لیے بیٹھا پراٹھا بنا رہی تھیں جب کہ ماما بڑے کمرے میں خاصی اونچی آواز میں ڈراما دیکھ رہی تھیں اور صائمہ، نرمابھی وہاں ہی تھیں کیونکہ ان

ایشل آؤ

گلکش

اپنی فائل مکمل کیجیے

صرف 100 روپے میں

اپنی پسند اور ضرورت کے پچھلے 5 شمارے رجسٹرڈ ڈاک سے گھر بیٹھے حاصل کریں

دکشا

کا اجرا اپریل 2006ء سے ہوا۔ اگر آپ پچھلے شمارے حاصل کرنا چاہیں تو اپنی پسند کے کوئی بھی 5 شمارے (دستیابی سے مشروط)

صرف 100 روپے کا ڈرافٹ یا منی آرڈر ادارے کے نام اور پتے پر بھیج کر رجسٹرڈ ڈاک سے اپنے دروازے پر وصول کریں۔

یہ رعایتی اسکیم محدود مدت کے لیے ہے۔

اس سے آج ہی فائدہ اٹھائیں۔

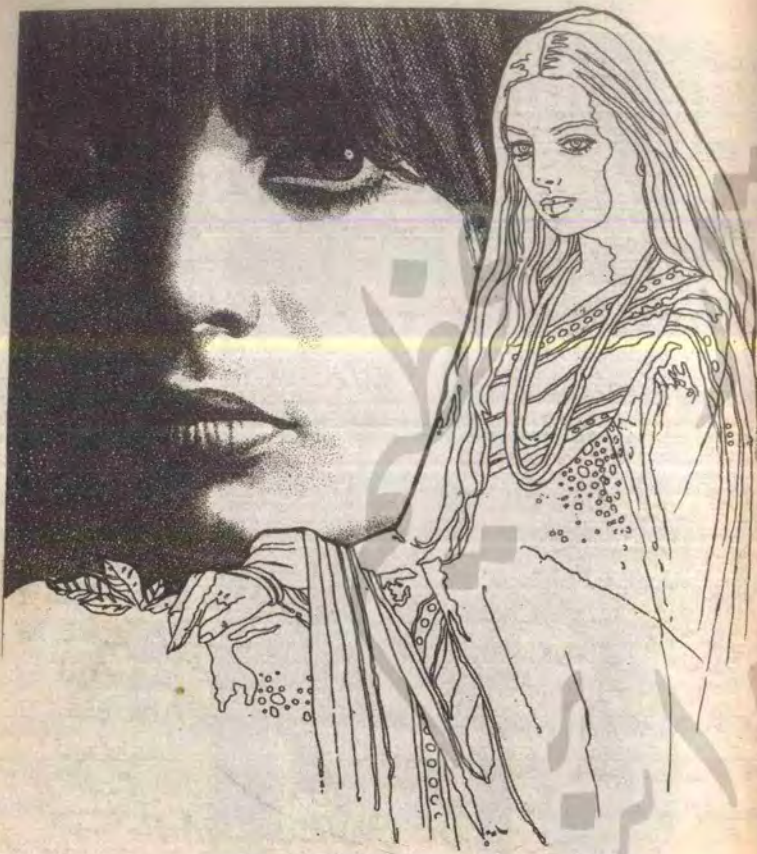
ڈرافٹ / منی آرڈر اس پتے پر بھیجیں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63 سی فیئر III سیکشن، مین کوئٹہ روڈ، فیض ہاؤس، قادیان کراچی

مزید معلومات کیلئے: فون: 5802552





## جنگلوں سی محبت

عالیہ حرا

میں کالاں ماری جا..... ساڈی فرمائش تے  
آج کالا جوڑا..... ساڈی فرمائش تے  
وہ اپنی دھن میں لمبے سے ڈنڈے پر برش لگا کر  
چھتوں کے چالے اتار رہا تھا اور ساتھ ساتھ ریاض بھی  
کر رہا تھا۔ سر پر کپڑا بندھا تھا۔  
شامک نے اندر جھانکا، وہ اب کھڑا ہوا تھیدی  
جائزہ لے رہا تھا کہیں کوئی جالا، کوئی گرد، دھول تو نہیں  
لگی چھت یاد دیوار پر، ساتھ ہی ریکارڈ کی سائیڈ تبدیل

کے پسندیدہ ڈرامے میں کوئی مرتا یا کسی کو گھر سے  
جاتا، کسی کی لڑائی ہوتی تو بے اختیار آنسو ان کی آنکھوں  
سے بہہ نکلتے تھے۔ اگلی قسط آنے تک آپس بھری  
تھیں، دشمنوں کو بددعا میں دی جاتی تھیں اور  
ٹیورٹ اداکاروں کے لیے دعا میں کی جاتی تھیں۔  
ان کی اس دوغلی شخصیت پر کسی بھی آئی ٹی اور اسوی بھی  
ہوتا تھا۔ اپنوں پر اس قدر ظلم، غیروں پر رحم..... یا شاہ  
ان کا ان کے ساتھ رشتہ ہی ایسا تھا، دنیا کا سب سے  
نازک اور خطرناک، زہریلا رشتہ بند بھوج کا تھا۔  
”مامی کی بھولی..... وہ ساہیوال والی، جنہیں  
ہفتہ بھر پہلے فوج ہوا تھا، ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی  
اطلاع آئی ہے۔“ نورین نے آکر اطلاع دی تو وہ چند  
لمحوں کو تو حیرت زدہ ہی رہ گئی تھیں۔  
”ماموں ابھی آئے ہیں، مامی تو ابھی جانے کا  
کہہ رہی تھی مگر ماموں کہنے لگے کہ ابھی رات میں کوئی  
سواری نہیں ملے گی۔ رات بھر خوار ہونے سے بہتر ہے  
صبح، صبح اذان کے ساتھ نکل پڑیں گے۔“  
”کتنے دن لگیں گے انہیں؟“ شمیم نے پرسوج انداز  
میں اسے دیکھ رہی تھی۔  
”قل کے بعد ہی آئیں گے۔“ نورین نے بے  
پردائی سے جواب دے کر ثانیہ کی پچی ہوئی روٹی اٹھا کر  
کھانا شروع کر دیا تھی۔  
”اوہ..... تو اس کا مطلب ہے، مجھے دو تین دن  
کی مزید مہلت مل گئی ہے۔ ہوسکتا ہے اس دوران کوئی  
بہتر حل نکل آئے۔“ یکدم اس کے ذہن پر چھائی وحشت  
چھٹی تھی اور وہ بہت ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔ اسے مامی کی  
بھولی کا مرنا اور پھر مامی کا یہاں سے جانا ٹی بی امداد لگ  
رہی تھی۔ ”نی الحال اتنی مہلت ہی کافی ہے۔ یقیناً بعد  
میں کچھ نہ کچھ بہتر ہو جائے گا۔“ وہ یہ سب سوچتے ہوئے  
خاصی پرامیدی میں مگر وہ جو کہتے ہیں کہ سب کچھ ہماری  
مرضی اور ارادوں کے مطابق ہونے لگے تو پھر نقد پر اور  
نقد پر بنانے والی ہستی پر کسی کا ابقان قائم نہ رہے۔  
بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

کے رواں تبصروں کی آواز بھی آ رہی تھی۔  
”باجی روئی.....“ ثانیہ اسے دیکھ کر اس کے پاس  
آگئی تھی۔ اس نے اسے گود میں اٹھایا اور بچن میں  
آگئی، تو بے پروائی ڈالتے ہوئے نجمہ نے یکدم اسے  
دیکھا تھا اور بے اختیار ہی سر جھکا لیا تھا۔  
”امی ثانیہ کے لیے روئی دے دیں.....“ اس  
نے یوں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، ماں کی مجبوری وہ جانتی  
تھی پھر انہیں کیا الزام دیتی، خدا تو قیامت کے دن ہی  
پکڑ کرے گا مگر بندہ مجھ کی تاخیر کیے بغیر پکڑ کرتا ہے،  
یہ بات اسے اچھی طرح سمجھ آگئی تھی۔  
”یہ لو.....“ امی نے چتیرے سوکھی روٹی اٹھا کر  
اس پر آکر رکھا اور اسے پکڑا دیا، شمیم کی نظر بھی سے ترہتر  
پراٹھے پراٹھے تھی اور نامرید پٹ آئی تھی ان کے لیے نہ تو  
یہ پراٹھا تھا اور نہ ہی اس قسم کی عیاشی کی اجازت تھی،  
ثانیہ بہت کمزور تھی، چوٹ کے بعد تو مزید کمزور ہو گئی  
تھی، اسے اچھی خوراک کی ضرورت تھی۔ دودھ، پھل،  
گوشت جب کہ یہاں دو وقت کی سوکھی روٹی بھی ملنا  
محال تھی۔ دودھ، پھل تو عرصہ ہوا انہوں نے چکھا نہ تھا،  
وہ چپ چاپ باہر نکل گئی اور نجمہ کے ہاتھ میں مل جیسے  
سیال لاوا بن گیا تھا۔ اچھی اور بہتر چیزیں کھانے خود  
بنانے کے باوجود انہیں اپنے بچوں کو یہ سب دینے کی  
اجازت نہ تھی، وہ ماں تھیں مگر سے ترپاٹے خود پکا کر  
اپنے بچوں کو سوکھی روٹی دیتے وقت دل کی کیا حالت  
ہوتی تھی، یہ وہی جانتی تھیں مگر وہ مجبور تھیں۔ وہ معصوم  
تھیں، بہت بھولی تھیں، چالاکی نہیں آتی تھی، چوری نہیں  
کر سکتی تھیں وہ..... ورنہ ہیرا پھیری کے سوطریتے  
ہوتے ہیں مگر وہ ایسی چلتی رہیں تو شاید اب تک حالات  
کو بہتر بھی بنا چکی ہوتیں۔  
وہ ثانیہ کو روٹی کھلا رہی تھیں، جب یکدم شادو مامی  
کے زور زور سے رونے کی آواز آئی۔  
”نورین جانا باہر زردا دیکھنا، یہ بھابی کو کیا ہوا.....  
کوئی ڈرامے میں ان کا پسندیدہ ہیرو تو نہیں مر گیا۔“  
نجمہ نے نورین سے کہا تو وہ ہنستی ہوئی اٹھ کر باہر نکل گئی۔  
شادو مامی بہت رحمدل تھیں، بہت چھوٹا دل تھا ان کا۔ ان



کی۔

اسلام آباد میں آیا ہی ٹیکس  
سوئیاں دے آتے ہوں لگا کرے گا ٹیکس  
”لاحول ولا قوۃ“..... ٹائلڈ سے سر جھٹکا۔ ”اسلام  
آباد والے اتنے فارغ بیٹھے ہیں نا انہیں ہی ٹیکس  
کریں۔“ قدرے طنز یہ نگاہوں سے سلمان کو دیکھا اور  
کھٹکھٹا کر اندر جھانکا۔ وہ چونک کر مڑا۔  
”آہم.....“ بڑی شریر سی مسکراہٹ تھی۔ ”زہے  
نصیب!“

”ممائی کہاں ہیں؟“ نظریں ملاتے بغیر کہا۔  
”ڈاکٹر ربانی کے کلینک گئی ہیں تمہارے  
ماموں کے ساتھ۔“ اسی کے انداز میں کہا۔  
”ٹھیک ہے انہیں بتا دیجیے گا کہ ٹائلڈ آئی تھی۔“  
قدم واپس پلٹے۔

”ٹھیک ہے بتا دوں گا کہ ٹائلڈ صدیقی آئی تھی شہر  
غیر سے۔“ مڑ کر اسے دیکھا۔ برش کو کھڑکی سے باہر  
جھارتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔  
نی پروین، اتوں تو نہیں اے  
تے وچوں بڑی شوقین اے  
نی پروین اے

”اونہ۔“ وہ پلٹ کر پاؤں پختی باہر نکل گئی۔  
اس کے آنے اور پھر جانے کا اس نے کوئی نوٹس  
نہیں لیا تھا، بے حس بے مروت۔ تیز قدموں سے وہ  
پہلے لان میں اترتی اور پھر روش سے گزرتی ہوئی سیاہ  
گیٹ کے داخلی دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس نے  
در پیچے سے جھانک کر جاتی ہوئی ٹائلڈ کو دیکھا۔  
”کس بات کا زعم ہے محترمہ کو! ناک پر کبھی نہیں  
بیٹھنے دیتیں۔“ شانے اچکا کر کوریڈور میں نکل آیا۔

اے رنگ کدی نہیں پائے..... یا  
ساڈی فرمائش تے  
اے رنگ تیرے تے نہیں جدوا  
اے رنگ کدی نہیں پائے..... یا  
ساڈی فرمائش تے

اب وہ کوریڈور کے جالے اتار رہا تھا۔ سنڈے کا

دن تھا جو اس طرح کے کاموں میں گزرتا تھا۔ سبھی اسے  
خیال آیا چھت پر مشین میں کپڑے ڈال کر آیا تھا۔  
”اف!“..... ڈنڈا سائیڈ پر کھڑا کر کے چھت  
جانب بھاگا۔ وہ اپنے کپڑے اتار کر خود ہی دھو رہا تھا۔  
عذر باتول نے اپنے تینوں بیٹوں کو اپنی مدد  
کے اصول کے تحت پروان چڑھایا تھا۔ اب انہیں پتہ  
ہونے کا دکھ نہیں ہوتا تھا۔ بیٹوں نے سکھ سے رکھا ہوا  
اور پچھلے دو ڈھائی سال سے سلمان نے جیسے گھر سنبھال  
ہوا تھا وہی کر سکتا تھا۔ دونوں ماسیوں کے سر پر کھڑے  
ہو کر کام کروا رہا تھا۔ سالن اکثر خود ہی بیٹا لیتا تھا۔  
روٹیاں بنواتے وقت سر پر کھڑا ہوتا یا پھر عذر باتول  
کھڑا ہوتا رہتا۔

”امی دھیان رکھا کریں ان کا، انہیں کہاں صفائی  
ستھرائی کا پتا۔ جن ہاتھوں سے سر کھجائیں گی انہی ہاتھوں  
سے روٹی نیکیں گی اور دھیان رکھا کریں اپنے دوپٹے  
چادر سے یہ کوئی چیز صاف نہ کریں۔ انہی سے اپنے  
بچوں کی ناک کان صاف کرتی ہوں گی۔“ زیتون اور  
زینب کا سلیکشن اس نے خود اپنی نگرانی میں کیا تھا۔ برا  
نقل قسم کا انٹرویو لیا تھا اور اکثر و بیشتر انہیں نکال دینے  
کی دھمکی بھی یہی دیتا تھا۔ اسے صاف ستھرا کام چاہیے  
تھا۔ سب سے برا ڈیشیان احمد تھا۔ اس کے بعد سلمان  
احمد اور آخر میں شیراز احمد۔

ڈیشیان احمد پرائیوٹ فرم میں منیجر تھا۔ اس کی  
جواب بہت اچھی تھی وہ اسی میں مصروف رہتا تھا۔ شہر دوں  
شہروں پوسٹنگ ہوتی رہتی تھی اس کی۔ سلمان احمد نے  
ایم کام کر لیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے گورنمنٹ جواب گھر  
بیٹھے ہی مل گئی تھی۔ سب سے چھوٹا شیراز احمد ابھی پڑھ  
رہا تھا۔ اس کا ارادہ سی ایس ایس کرنے کا تھا۔ احمد  
صاحب ریٹائرڈ آفیسر تھے۔ آج کل گھر میں ہوتے تھے  
تاہم انہوں نے ایک ادارہ جوائن کر لیا تھا اس کے علاوہ  
پرائیوٹ کالج میں چند کلاسز بھی لیتے تھے۔

عذر باتول کو پچھلے دو سال سے گھٹیا کا مرض تھا۔  
جوڑوں کے درد میں مبتلا رہتی تھیں۔ پاؤں میں سوجن  
الگ رہتی، چلنے پھرنے یا کھڑے ہونے کے سارے



”تم مت سدھرتا“ اسے گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

”اور کتنا سدھروں، سلیقہ مند، نیک پروین اور سکھ تو ہوں۔“ منہ میں انگلی رکھ کر شرارتی ہوا۔

”بیگم اس کی شادی کر دیتے ہیں اب!“ اندر آتے احمد صاحب یہ منظر دیکھ کر رہے۔ وہ جھینپ گیا۔

”ای کیا ہتایا ڈاکڑ نے؟“

”وہی جو ہمیشہ کہتا ہے۔ آرام، دھیان، پرہیز اور دوا۔“ انہوں نے اپنے پاؤں اٹھا کر صوفے پر رکھ لیے۔ سلمان دھیرے دھیرے انہیں دبانے لگا۔

”کھانا تیار ہے پر خوردار.....“ احمد صاحب نے پانی پیتے ہوئے کہا۔

”جی ابو، گواؤں۔“

”بالکل، بالکل، تم نے کھالیا؟“

”نہیں.....!“

”اور شیراز.....؟“

”شیراز لائبریری گیا ہے اس نے ابھی ناشتا کیا تھا۔“ جاتے جاتے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔



”تم سے اپنے گھر میں نہیں بیٹھا جاتا۔ آجاتی ہو سن گن لینے“ شائلہ کو دیکھتے ہی سلمان کی زبان میں مٹھلی ہونے لگی۔ وہ وہیں کوریڈور میں رک کر اسے گھورنے لگی۔

”تم میرے راستے میں کیوں آجاتے ہو میرے ماموں کا گھر ہے۔“

”اچھا!“ وہ شرارت سے ہنسا۔ ”ان کے بیٹوں کا بھی گھر ہے سو بیٹوں..... کدی ساڑے نال بھی ملن آجایا کرو۔“ کالر جھاڑ کر ذمہ داری انداز میں جھکا۔ وہ پاؤں فرش پر مار کر اندر بڑھ گئی۔

”میلے اپنے اندر ملا جیتیں تو پیدا کرو کہ کوئی لڑکی تمہیں دیکھ کر گرے۔“ وہ ہلکھلا کر ہنسا۔

”ہم مرد ہیں اور مرد کی مردانگی اور شرافت دیکھی جاتی ہے۔“

”ہاں! اوروازے میں رکی اور مڑ کر اسے دیکھا۔

کام ان سے نہیں ہوتے تھے۔ اب وہ امور خانہ کی نگران ہو کر رہ گئی تھیں۔ ذیشان آفس میں مصروف رہتا، شیراز بڑھائی میں، لے دے کر سلمان کی ذات نیچی وہ اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا جاب اسے اچھی مل گئی تھی۔ آفس سے جلدی آ جاتا تھا۔ اکثر چھٹی کر لیتا تھا یا ہاف ڈے میں آ جاتا تھا۔ اس لیے ماں کی بیماری کی وجہ سے اکثر و بیشتر اسے گھر دیکھنا پڑ جاتا تھا۔ کچھ گھر کے کاموں میں دلچسپی بھی لیتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس پر ڈتے داریاں پڑتی گئیں اور وہ گھریلو امور میں مشاق ہوتا چلا گیا۔ وہ بہترین لک بن گیا تھا بوقت ضرورت اچھا نگران بھی بن جاتا تھا۔

بتول اور احمد رضا صاحب کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ وہ بیک وقت دو کردار نبھا رہا تھا۔ بیٹا بھی تھا اور بیٹی بھی، جالانکہ ان کے برابر کا گھر بھائی کا تھا اور ان کی دو بیٹیاں تھیں کاشفہ اور شائلہ۔ دائیں جانب ننکا گھر تھا۔ ان کی بھی تین بیٹیاں تھیں۔ نوشاہہ، ربیعہ اور نعمانہ۔ دو بیٹے تھے حسام اور ابرار مگر عذرا بتول نے ان سے کام نہیں کروایا تھا۔



”ای آپ کے بھائی کی بیٹی آئی تھی بڑوس سے۔“ کچن کا آخری چکر لگا کر بتول کی آواز پر کیٹ کھولا تھا اور انہیں ساتھ لے کر اندر آیا۔ احمد صاحب گاڑی پارک کرنے لگے تھے۔

”کوئی بدتمیزی تو نہیں کی تھی اس کے ساتھ۔“ سرزنش بھرے انداز میں دیکھا۔

”لاحول ولا قوۃ.....“ اس نے سر جھٹکا۔ ”اتنا گلیا گزرا ہوں کہ کسی بدتمیزی کے ساتھ بدتمیزی کروں گا۔“

انہیں پانی کا گلاس دیا۔

”کیوں آئی تھی؟“

”میں نے پوچھا نہیں۔ بتایا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔“

”تو تم بھی تو اس کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہو۔“

”اپنی بھانجی کو بھی سمجھایا کریں کہ بدتمیزی مت کیا کرے۔“



”جن مردوں کے زنا نہ اوصاف ہوں..... وہ..... انہیں کون دیکھتا ہے۔“ طنز بھرے انداز میں دیکھا۔  
 ”ہوں!“ سر کھچا کر ہنکارا بھرا۔ وہ اندر قدم بڑھانے لگی۔ ”سنو! سنو!“ ادھر رکھنے کا وہ قائل ہی نہیں تھا۔ اس بے ساختگی پر گھوم کر اسے دیکھا۔  
 ”جن عورتوں کے مردانہ اوصاف ہوں انہیں کون دیکھتا ہے۔ مس شانہ صدیقی؟“ اس کے تاثرات دیکھنے کے لیے رکائیں اور پلٹ گیا۔ شانہ کا فشار خون بڑھ گیا۔  
 ”ایڈیٹ..... نان سنس! سمجھتا کیا ہے خود کو“ ایک تو عورت دوسرا مردانہ۔ ان دونوں لفظوں نے کھولا دیا۔

”کیا ہوا شانہ! اتنے غصے میں کیوں ہو؟“  
 ”ممانی.....“ اندر جا کر دم سے عذرا بتول کے سامنے گری۔ ”سنبھال کر رکھیں اس سلمان کو نہیں تو میں آنا چھوڑ دوں گی۔“ وہ دھیمے سے انداز میں مسکرا دیں۔  
 ”ایسے ہی بولتا رہتا ہے۔ تم اس کی باتوں کو مانیں مت کیا کرو اور سنو خبردار جو ادھر آنا چھوڑا..... تمہارا گھر ہے یہ۔“ اس کا ہاتھ تھام لیا اور ان کے لفظوں کو دل سے معنی پہناتی شانہ بلس ہو گئی۔ عذرا بتول نے پیار سے اس کا رخسار چھویا۔ مزید خواب شانہ کی آنکھوں میں آن لے۔  
 ”ذیشان کے حوالے سے۔ خوبصورت، ویل ڈریس، مردانہ وجاہت کا شاہکار۔ ایک مکمل شخص! خوابوں میں جذبات کی پچھلی سی بج گئی۔

آج ویک اینڈ تھا، سب بڑی فرصت سے بیٹھے تھے۔ درمیان میں ڈرائی فروٹ کا تھال رکھا ہوا تھا۔ سلمان دو دفعہ چائے بنا کر لے آیا تھا۔ اب شیراز سے کہہ رہا تھا کافی لے آئے۔ ذیشان ٹیلی ویژن پر ڈاکو میٹری دیکھ رہا تھا۔ ناگوں پر گرم چادر ڈالے عذرا بتول توجہ سے بیٹوں کی باتیں سن رہی تھیں جب شیراز نے کہا۔

”امی..... میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ ایک سائنس سیمینار ہے اس میں شرکت کرنا ہے۔ سونے کو واپسی ہے۔“ چلخوڑے منہ میں ڈالے۔

”امی میری ایک بیٹے کی ڈیوٹی اسلام آباد آ رہی ہے میں لگی ہے میں جا رہا ہوں برسوں“ ذیشان نے گہم میں امی، ابو کو دیکھا۔ سلمان نے گھوم کر بھائیوں کو دیکھا۔  
 ”مڑے سے ٹائیکس پھیلا لیں۔“  
 ”امی میں بھی غیر معینہ مدت کے لیے چھٹی رہا ہوں۔“  
 ”کہاں؟“ بتول نے پوچھا۔  
 ”بھوٹان.....“ بے ساختہ کہا۔  
 ”کیوں.....؟“ سب نے بے ساختہ اسے دیکھا۔

”بھوٹیوں بجانے.....!“ منہ بسورا۔  
 سب مسکرا دیے۔  
 ”حد ہوتی ہے ہر بات کی، ہر کام میں کرنا ہر چیز میں دیکھوں، امی انصاف ہونا چاہیے میرے ساتھ..... یہ آپ کے لاڈلے نہیں ہیں میں اکیلا کہ سنبھالوں اور یہ باہر گھومیں۔“ دل جلی بیٹوں کی طرف کہا اور ایک بار پھر سب مسکرا دیے۔  
 ”اس کا کوئی حل ہونا چاہیے۔“  
 ”اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟“

”یہ کہ ذیشان بھائی کی شادی کر دیں، گھر میں خاتون خاندان آئیں گی تو میری ذمے داریوں میں کمی آئے گی۔“  
 ”جی نہیں، میں فارغ نہیں ہوں دو سال تک اپنے پیروں پر تو کھڑا ہو جاؤں۔“ ذیشان ان کی طرف گھوما۔

”تو یہ آٹھ میٹر کے پاؤں آپ نے مستعار لیے ہوئے ہیں کیسی؟“ سلمان نے طس کر کہا۔  
 ”شادی.....!“ شیراز نے ذمہ انداز میں کہا۔  
 ”اف.....!“  
 ”تم کرلو۔“ شیراز کی دلچسپی پر سلمان نے بے ساختہ کہا۔ شیراز مسکرا دیا۔ احمد صاحب نے اس کے کان پر لپکے۔  
 ”برخوردار پہلے مکمل پڑھائی، پھر نوکری پر شادی۔“

”ابو میں تو امی کی سہولت کے خیال سے کہہ رہا تھا۔“ شرارت سے کان کھچایا۔  
 ”سہولت کے لیے گھر میں دو، دو نوکرانیاں ہیں پھر سو بھگیاں سلمان احمد صاحب ہیں۔“  
 ”ہاں سارے بھگیاں میں ہی بھگتوں۔“  
 ”ویسے سلمان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ذیشان کی شادی کر دینا چاہیے۔“ بتول کے مطلب کی بات ہوئی تھی۔  
 ”نئی اچال تو امی آپ سوچیں بھی نہیں! ابھی تو میں فیصل آباد جا رہا ہوں، اس کے بعد ایک کورس کے سلسلے میں ہرمنی جانا ہے اور میرا دوسرا سالہ منصوبہ پکا ہے۔“  
 ذیشان نے صاف ہری جھنڈی دکھا دی۔

”میرے خیال میں سلمان کی کر دیں، یہ فارغ بھی ہے آج کل۔“  
 ”آ..... ہم..... آچھو.....“ سلمان کو پسند اگ گیا۔ شیراز اسے بے چارگی سے دیکھنے لگا۔  
 ”آ..... آپ کو میں فارغ نظر آتا ہوں“  
 ”مج آفس، دوپہر سے رات تک گھر کے کام اور میں فارغ ہوں۔ حد ہوتی ہے زیادتی کی۔“ سلمان جل بھیں گیا۔

”میں تو تمہارا ہاتھ پٹانے کے لیے کہہ رہا تھا۔“  
 ذیشان شرارت سے ہنسا۔  
 ”جی شکر یہ، نوازش کرم۔“

”ویسے امی اس آئیڈیے پر سوچا جا سکتا ہے، گھر کی ضرورت بھی ہے اور ہر مسئلے کا حل بھی۔“ شیراز اپنی رائے لگانے لگا۔

”تو قلم کرنے کے لیے اپنا سر پیش کر دو نا۔“  
 سلمان اٹھا اور باہر نکل گیا۔  
 ”مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ میں سوئے جا رہا ہوں۔“ احمد صاحب نے بھی اس بات کو سرسری لیا۔  
 ”ویسے امی.....!“ شیراز ماں کے قریب ٹھک آیا۔ ذیشان اس کے سر پر اخبار کا رول مارتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ویسے امی اس کی بات پر غور کرے گا۔“ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا کہ اس کی جان بچی۔ شرارت

سے شیراز ان کے اور قریب ٹھک آیا۔  
 ”امی اس آفر پر غور کرنا چاہیے۔ گھر میں کوئی بالکل کوئی چہل پہل ہونا چاہیے، کچھ چوڑیوں کی چھن چھن، پائل کی کھن کھن، کسی نئے فرد کا اضافہ ہو، کوئی ہلا گلا ہو۔“ ماں کے پاؤں دبائے لگا۔

”تو پھر..... ذیشان کو مینا لو نا۔“ اس کے انداز نوٹ کر رہی تھیں آخر اس کی ماں تھیں۔  
 ”امی چھوڑیں نا ذیشان بھائی کو، ان کا تو شوق اور ولولہ ہی امریکا نوکری کے پیچھے..... میں ہوں نا آپ کا خزانہ بردار اور نیک بچہ۔“ ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر جھکایا۔

”تو پھر چائے فرمانبردار..... برخوردار.....“  
 ”کچن میں چائے کے برتن آپ کے منتظر ہیں انہیں دھو کر رکھیں۔“ سلمان دروازے میں کھڑا تھا۔ ”ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹائیے۔“

”تم ضرور کباب میں ہڈی بننا۔“  
 ”نہیں..... ہڈا.....“ اندر آ گیا۔  
 ”امی اس کی سن لیں اور کر دیں اور میرا نام ناممکنات..... میں شامل کر لیا جائے۔“

بتول کے پاس آیا، ان کے قریب سے جھک کر ٹاول اٹھایا اور پلٹ کر باہر نکل گیا۔  
 ”امی یہ تو جھکی بڑھیا بن گیا ہے۔“ عذرا بتول دونوں کو دیکھ کر مسکراتی رہیں۔



”کہہ تو نیچے ٹھیک رہے ہیں ذیشان کی شادی کر دیتے ہیں۔ گھر میں رونق آئے گی اور گھر کی دیکھ بھال کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“ صبح ناشتے کی ٹیبل پر عذرا، احمد صاحب سے کہنے لگیں۔

”لگ گئی بیٹے کا سہرا سر پر بھانجی کی۔“ مبہم سے انداز میں مسکرائے۔  
 ”کیسی لڑکی ٹھیک رہے گی۔“ ان کے اندر خواب جگمانے لگے۔

”جو تم کو ہو پسند وہی بات کریں گے۔“ احمد صاحب گنگنائے۔



”میرے خیال میں بہو خاندان سے ہی لیتی چاہیے۔“  
 ”یا..... ہوا“ احمد صاحب گڑبڑائے۔ وہ ہنس دیا۔  
 ”اب بہو لانے کے دن ہیں خواب دیکھنے کے نہیں۔“ جواب میں وہ مسکراتے ہوئے چائے بنانے لگے۔  
 ”تو ذیشان سے پوچھو۔“

”ہمارا مشورہ ہوگا تو ذیشان سے پوچھوں گی نا۔“  
 ”اس کی کوئی پسند بھی ہو سکتی ہے جوان اولاد ہے اور میرے خیال سے ان کی مرضی اور ان کی پسند سے ہی سب ہونا چاہیے۔ زندگی انہوں نے گزارنا ہے۔“  
 ”اور اگر اس نے آفس کی کسی لڑکی کو پسند کر رکھا ہو۔ یا کسی باہر کی لڑکی کا نام لے لے تو.....!“  
 ”تو کیا ہوا، زندگی آخر انہوں نے ہی گزارنا ہے، پسند ان کی ہی۔“

”جی نہیں.....!“ عذرا بتول نے سنجیدگی سے جگ سائیڈ پر کر دیا۔ زینون آکر ناشتے کے برتن اٹھا کر نیکل صاف کرنے لگی۔  
 ”میں کوئی ایسا رسک نہیں لیتا چاہتی، مجھے گھر کی دیکھ بھال کے لیے گھر داری کے لیے بہو چاہیے تاکہ نوکری کے لیے۔“

”تو اس لیے تو کہا ہے کہ ذیشان سے بات کرو۔“  
 ”کرو لوں گی ذیشان سے بات، پہلے لڑکی دیکھ لوں پھر اسے بتاؤں گی کہ یہ میں نے تمہارے لیے پسند کی ہے..... مگر ابھی تو اس کی مرضی نہیں ہے شادی کی۔“  
 بولتے بولتے انہیں رات کی بات یاد آئی۔

”ہو جائے گی پسند تو کریں۔“ احمد صاحب نے حوصلہ دیا۔

”تو جس کی مرضی ہے ماما اس کی کر دیں۔“ ماں کا آخری جملہ سنا مسلمان باہر آ گیا۔

”تمہاری ہے؟“  
 ”لا حول ولا قوۃ!“

”پھر شیراز تم سے چھوٹا ہے اس کی کیسے کر دیں۔“

”جس کا نمبر ہے اسی سے بات کریں۔“  
 زینون اس کے لیے جگ میں چائے لے کر تہی دروازہ کھول کر شاملہ اور ریحانہ بھی آ گئیں۔  
 ”السلام علیکم ماموں!“  
 ”السلام علیکم چاچو!“  
 ”علیکم السلام، وعلیکم السلام..... کیسے ہوئے؟“  
 ”بالکل ٹھیک۔“

”پچھو ماما بازار جا رہی تھیں آج اگر آپ کو کچھ منگوانا ہو تو بتا دیں۔“  
 ”تم لوگوں کو سوائے بازاروں کے چکر لگانے کے کوئی اور کام نہیں۔“  
 ”مسلمان بھائی آپ کی کوئی بہن ہوتی تو معلوم ہوتا۔“  
 ”اس سے کیا ہوتا؟“

”اس سے یہ ہوتا کہ جو کچھ آپ اپنی بیگمات کے لیے جوڑ توڑ کر رہے ہیں وہ لٹ چکا ہوتا۔“ ریحانہ ہنسی۔  
 ”میری بہن میری طرح کھڑے ہوتی۔“  
 ”مجھے تو یہ بھی ذیشان اور شیراز کی بہن لگتا ہے۔“ دونوں شرارت سے ہنسیں۔ احمد صاحب ان کے ساتھ ہنسے مگر عذرا بتول نے محبت سے اسے دیکھا۔

”اور کیا پھوپھو..... جس گھر جائے گا راج کرے گا۔“  
 ”لوں گی۔“ شاملہ اسے چیخنے سے باز نہیں رہ سکتی تھی۔

”وہ گھر تمہارا نہیں ہوگا۔“  
 ”دیکھ رہی ہیں ممانی کتنا تیز ہے یہ۔“  
 ”امی کیا بدیہی کی ہے میں نے آپ کی بھانجی صاحبہ سے۔“

”پھوپھو..... یہ دونوں لڑے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے دونوں کو دیکھا۔

”جو لوگ لڑتے ہیں ان لوگوں میں محبت بھی بہت ہوتی ہے۔“ مسلمان نے اک نگاہ تیز شاملہ پر ڈالی۔ اس کے خواب اس کے خیالوں سے یکسر مختلف بلکہ الٹ۔

”اونہ..... محبت!“  
 وہ اٹھا اور ڈانٹنگ نیکل سے کپ اٹھا کر لڑے

میں کرے اور کچن کی جانب بڑھ گیا۔  
 ”امی! آلو گوشت کے ساتھ میرے لیے چاول ضرور پکوا دیجئے گا۔ میں شیراز کے لیے روٹیاں لیتا آؤں گا۔ اسے خور کی روٹی پسند ہے۔“ یکن سے مسلمان کی آواز آ رہی تھی۔ شاملہ اور ریحانہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیا۔

”زینون میرے کمرے میں صرف پونچھا لگا دینا۔ اور سنو آج ٹیرس اور سیڑھیاں ضرور دھو دینا۔“  
 پچھلے ہفتے بھی تم ڈھڑی مار گئی تھیں۔ ذیشان بھائی کا ہاتھ روم ضرور صاف کر لیتا۔ وہ جاتے جاتے ہدایات بھی لٹک کر رہا تھا ماسی کے لیے ”اور سنو پھر پلٹا.....“ ڈسٹنگ ذرا ڈھنگ سے کیا کرو۔ مار دھاڑ کر کے جاتی ہو، چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھا کرو۔“ اس کا لہجہ سخت تھا زینون باادب کھڑی تھی۔

”اور سنو آج جاتے جاتے پودوں کو پانی دے دینا۔“  
 اسی اسے کچھ پیسے دے دیجئے گا میں آفس کے کام سے جا رہا ہوں۔“ کہتے ہوئے وہ نکل گیا۔

”اللہ ممانی! تو پورا لڑکی بن گیا ہے بلکہ.....“  
 ریحانہ بھی ہنسی۔ ”ڈتے دار قسم کی آپا جان.....“  
 بتول دھڑے سے مسکرائیں۔ مسلمان نے جاتے جاتے یہ طنز سننا اور سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

”پچھو آپ اتنی سخت قسم کی ساس ثابت نہیں ہوں گی جتنا یہ سخت قسم کی نند ثابت ہوگا۔“ شاملہ ہونٹ کیلے بغیر وہی نہیں سکتی تھی۔

”مسلمان بہت اچھا ہے، جس طرح میری ڈتے داری کو سننا لگا ہے، گھر، جاب، مہمان داری..... اس کا حوصلہ ہے یہ۔“ ذیشان اور شیراز تو بس باہر کے کام کر سکتے ہیں۔“ جواب میں شاملہ نے منہ بنایا اور ریحانہ ذمعی انداز میں ہنسنے لگی۔

”پچھو اب آپ ذیشان بھائی کی شادی کر دیں۔“  
 سب ٹھیک ہو جائے گا۔

”ہاں، آج کل ہم لوگ اسی موضوع پر بات کر رہے ہیں دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ تمہاری نظر میں کوئی لڑکی

ہو تو ممانا۔“

”اوہو“ بڑے ذمعی انداز میں شاملہ کو دیکھا اور اس کے گال دھکنے لگے۔ اس گھر میں آنا اس کا خواب تھا۔ خوبصورت، وجہہ ذیشان احمد اتنا پیارا سر سبز و شاداب گھر، گھر کا ماحول، بس اک ماموں اور ممانی کی ذات..... لڑکے تو ہوتے ہی من موہی اور اپنے آپ میں گن رہنے والے۔ شاملہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”کیا خیال ہے پھوپھو تمہارا رشتہ مانگ سکتی ہیں۔“ باہر آ کر شاملہ کے گلاب ایسے چہرے کو دیکھتے ہوئے ریحانہ نے تبصرہ کیا۔

”کیوں میرے اندر کس بات کی کمی ہے۔“ فخر سے گروں اٹھا کر فخری کار بھاڑے۔

”خوبصورت، اسمارٹ! میرے خیال میں ہر لڑکا یہی دیکھتا ہے اور میرے خیال میں ذیشان بھی چاہتا ہے، اچھی طرح سے بولتے ہیں میرے ساتھ۔“

”بھی اکتھار نہیں کیا۔“  
 ”اس کی نوبت نہیں آئی۔ ان کا آفس، ان کی پوسٹنگ، ان کی مصروفیات۔“ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باتیں بھی کر رہی تھیں۔



”امی آپ مسلمان کی کر دیں اس لحاظ سے وہ فارغ ہے۔“ عذرا بتول نے ذیشان سے شادی کی بات کی تو سننے ہی اس نے کہا۔

”یہ بات میں آپ کو پہلے ہی سمجھا چکا ہوں۔ دو سال تک میں شادی نہیں کر سکتا۔“

”اور یہی بات مسلمان بھی کہہ دے تو۔“  
 ”تو پھر جیسے چل رہا ہے ویسے ہی چلے دیں۔“

”تم جانتے ہو اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے میرے علاوہ۔“

”امی!“ وہ زچ ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔  
 ”یہ عمر تمہاری شادی کی ہے۔“

”ایک دو سال سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“  
 اطمینان دلایا۔



”اچھا لڑکی تو ڈھونڈ لوں تمہارے لیے؟“

”جب ارادہ ہوگا مل جائے گی۔“

”خاندان میں کرتا ہے یا باہر۔“ ذیشان ان کی شکل دیکھنے لگا۔ بھی سوپ کے پیالے کے کرسمان اندر آ گیا۔

”آئیے گرم گرم سوپ پیئیں اور مزہ لیں۔“

”شاملہ کیسی ہے؟“

”سلمان کے لیے ٹھیک رہے گی۔“ برجستہ کہا اور شرارت سے سلمان کو دیکھنے لگا۔

”آہ..... ہم.....“ اسے سوپ کا پھندا لگنے لگا۔

”میں نے کون سا جرم کیا ہے جس کی اتنی بھیا تک سزا۔“

”ارے اتنی اچھی تو ہے سلم، اسارٹ پھر تمہاری گاڑھی بھی چھتی ہے یعنی ایک پتھہ دو کاج۔“

”لا حول ولا قوۃ! آپ وہ آپ کے لیے..... بھرتی ہے۔ آتی جاتی آپ کے لیے تو میں کس کمیت کی مولی ہوں۔ ویسے سلسلہ آپ کے لیے چل رہا ہے پھر میں کیوں؟“

”میں فارغ نہیں ہوں۔“

”یعنی کہ میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے.....“

سجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔ ”آپس میں چوچیں لڑانے لگے۔“

”تو یہ اپنی بلا میرے سر کیوں منڈھ رہے ہیں۔“

”اتنی اچھی گھر بیولو کی ہے۔ شاملہ، ریحانہ، گل،

نعمانہ ان میں سے کوئی تم دونوں پسند کرلو۔ سلیقہ مند،

خاندانی اور سلجھی ہوئی لڑکیاں ہیں۔“

ذیشان بوکھلا گیا۔ سلمان مسکرانے لگا۔

”ان میں سے کوئی بھی میرے لیے نہیں ہے کیوں کہ میں دین کو حدیث کی روشنی میں پڑھ رہا ہوں۔ مجھے خوبصورت نہیں بلکہ خوب سیرت، صوم صلوة کی پابند

باجیا لڑکی چاہیے۔“

ذیشان، سلمان کو دیکھ کر ذمہ معنی انداز میں مسکرایا۔

”جی جناب! باجیا، برقع پوش خواتین نے ہی

بہادری کے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں آج کل۔“

”پھر..... پھر!“ انہوں نے سوپ ختم کر کے پیالہ اسے تھما دیا۔ ”میری سسٹنا.....! باتیں تم لوگ کر رہے ہو تو اس لحاظ سے دیکھی بھائی خاندانی لڑکیاں ٹھیک نہیں..... اور چاب کرنے والی مجھے چاہیے۔“

”مجھے تو اپنی فی الحال اعتراض ہے۔“ ذیشان نے ہری جھنڈی دکھادی۔

”اور اگر میری شادی کا خیال دل میں آیا ہے تو ان میں سے کوئی نہیں۔“ بول انہیں گھورنے لگیں۔

سلمان کے جواب نے سونے پر سہا گیا۔

”کیا خرابی ہے ان میں۔“ اسی وقت ذیشان کے فون کی بپ ہونے لگی وہ اس جانب متوجہ ہوا۔

سلمان ابھی آیا کہہ کر برتن اٹھا کر چلا گیا۔ وہ دونوں کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ دل میں خیال آ گیا تھا شادی کا۔

اب انہوں نے اس کام کو مکمل کرنا تھا مگر یہ لڑکے انہیں سننے سے غصہ آنے لگا۔

سلمان شاملہ اور ریحانہ کو دیکھ کر ہنسا۔

آج ساڑھے نال کل کی اورنی

سانوں پتا تیرے دل وچ چورنی

دونوں ہی چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ واضح اشارہ ان کی طرف تھا۔ وہ اس وقت تایا کہ لان میں بیٹھا واضح کو میٹھ سمجھا رہا تھا۔ وہ کسی کام سے اندر گیا۔

ریحانہ اور شاملہ باتیں کرتی باہر سے اندر آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر زبان پہ پھلجی ہونے لگی۔

”یہ لگ گیا کون سی ترکیب پوچھنے آئے ہیں۔“ واضح چوٹ کی۔

”ہا..... ہا..... ہا.....“ بڑا لطیف سا طنز ہے۔

”تم کچن کے علاوہ کہیں نظر آؤ تو بڑی جرات ہوتی ہے۔“

”اچھا.....!.....“ شریہ سے تھڑک رہا ہوا۔

”تم ہانڈی میں چھچھ چلاتے اور جالے اتارنے ہی بھلے لگتے ہو، جانے کیوں تم مرد بنتے ہو۔“

”اچھا تو لگتا ہوں نا.....“ سینے پر ہاتھ باندھے۔

اونہ۔ اوہ جاتے جاتے پٹی۔ ”اور یہ تم مجھے دیکھ کر

الٹے سیدھے گانے کیوں گاتے ہو؟“ کمر پر ہاتھ رکھا۔

”اچھا تو گانا ہے یہ الٹا سیدھا کیا ہوتا ہے تم جانو..... یا گانے والے سمجھیں۔“ اس نے لب پہنچ کر اسے سورا اور پاؤں پر کراندر چلی گئی۔

سلمان کا دل چاہا اٹھے اور ایک منٹ میں اس کا

ظننے، طرہ اور کدو فر نکال دے۔ ساری لگی لپٹی نکل

جائے گی۔ آج ہی ان دونوں کو اس نے نیشنل پارک میں دیکھا تھا دو لڑکوں کے ساتھ مگرمروت، لحاظ، خیال،

گھر کی بات، روز کا آنا جانا۔ ملنا ملانا، کچھ عزت اور شاملہ تو بھی بھی منہ پھٹت اور بد لحاظ مکر جانی..... اپنی بلا

تو لیے کے سر ڈال دیتی تو.....! اس سے امید بھی جی

جی۔

”شاملہ تم باہر لان میں سلمان کے ساتھ بدھیزی

کیوں کر رہی تھیں میں نے کچن کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔“ اندر عابدہ خاتون نے اسے روک لیا۔

”امی!“ غصے سے انہیں دیکھا۔ ”وہ گھر بیولو خاتون اس لائق ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

”شاملہ.....“ انہیں غصہ آ گیا۔ ”میں تمہارا رشتہ

یہاں کرنا چاہتی ہوں بھائی جان کے ہاں..... خاندان میں۔ کافہ کی شادی غیروں میں کی ہے اس کا انجام

دیکھو ہی ہو تم، بالکل بھی خوش نہیں ہے وہ۔“

”تو!“ وہ گستاخی سے پٹی۔ ”تو آپ چاہتی ہیں

میں خاندان کے چکر میں سلمان سے شادی کر لوں۔“

”بے وقوف لڑکی سلمان نہیں تو ذیشان تو ہے تا کیا

کی ہے اس میں۔ برا سلمان بھی نہیں ہے مگر تیری عقل

بڑھ چڑھ گئے ہیں۔“

”اونہ.....!“

”جہاں رشتہ کرنا ہوتا ہے وہاں ایک فرد سے نہیں

بلکہ سب سے تعلق قائم کرنا پڑتا ہے اچھا تاثر دینا پڑتا

ہے مگر تم.....! اک نگاہ ان پر ڈال کر خاموشی سے اندر

کی جانب بڑھ گئی۔

”جانے کب اس لڑکی کو عقل آئے گی.....“

بڑا ہوتے ہوئے باہر جانے لگیں..... اور شاید ان جیسی

ناعاقبت اندیش لڑکیوں کو بھی عقل نہیں آتی جو ہمیشہ

خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہیں۔ وہ ذیشان کی بھی منتظر تھی اور خولہ کے بھائی سے بھی چکر چل رہا تھا جو

کرڈا کٹر تھا گویا تو نہ کئی اور تھی..... اور نہ کئی تو تھی۔

\*\*\*

”میرے خیال میں احمد صاحب..... ذیشان کے لیے شاملہ ٹھیک رہے گی اور سلمان کے لیے نعمانہ.....“

”اپنے خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اظہار خیال کر دیا عذرا بولنے۔“

”ہوں..... دونوں ہی اچھی بچیاں ہیں۔“

”ہاں، نہ میرے بھائی کو اعتراض نہ آپ کے بھائی کو اعتراض..... پھر گھر کے رشتے ہیں، خاندانی.....“

خاندان کی لڑکیوں کا پہلا حق ہوتا ہے۔“

”ہوں.....!“ یعنی انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

”میرے خیال سے ان دونوں سے بھی پوچھ لو.....“ احمد صاحب نے اپنی رائے دی۔

”ان کی کیا مرضی.....!“ دونوں کا چونچیں لڑانا یاد آ گیا۔

”بڑے شریف ہیں میرے بچے، میری مرضی میں ہی خوش ہو جائیں گے۔“ انہوں نے اخبار کا کونا ہٹا کر انہیں دیکھا اور مسکرا دیے۔

”شریف ماں، باپ کی اولاد شریف ہی ہوتی ہے۔“ وہ بس انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔ ان کی شرافت پر کیا شک تھا۔

مگر..... سلمان اور ذیشان نے ان کی شرافت کے سارے فتوے باطل کر دیے۔

”ایم پاسمیل..... شاملہ تو بالکل نہیں، ہاں نعمانہ کے لیے سوچا جاسکتا ہے۔“

”کیوں، اس میں کیا اعتراض ہے؟“

”مجھے تو اعتراضات ہیں۔ ہاں..... بھائی کی مرضی معلوم کر لیں۔“ اچانک ہی پیٹیر ابدلا۔

”میرا..... تو دو سالہ منصوبہ مضبوط ہے۔“



”امی! شیراز نے ہاتھ اٹھایا، ”اگر آپ کہیں تو میں سر قلم کر دوں آپ کے آگے۔ یہ ناہنجار آپ کی نا فرمان اولاد.....“ جواب میں بتول اسے گھور کر دیکھنے لگیں۔ وہ اپنی جگہ مسکین سے انداز میں بیٹھ گیا۔

”سارے بخولے یہاں جمع ہو گئے ہیں۔“

”امی سڈے ہے آج.....“ سلمان نے یاد دلایا۔

”تو تم لوگوں کو نامنظور ہے۔“ انہوں نے حتی انداز میں دونوں کو دیکھا۔ مجبور یاں ان کے ساتھ بھی تھیں۔ بلڈ پریشر، وزن کی زیادتی، جوتوں کا درد اور پیروں کی سوچن دن گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔ سلمان مرد تھا کب تک گھر دیکھ سکتا تھا۔ اس گھر کو ان کے علاوہ بھی ایک عورت کی ضرورت تھی اور یہ بچے اپنی پتی مانی کرنے پر تہمتے ہوئے تھے۔

”جی! اچانک ہی دونوں نے باجماعت کہا۔

”تو میرے مرنے کے بعد کرو گے کیا؟“ جذباتی بلیک میلنگ کی۔

”خدا نہ کرے امی، کیسی باتیں کرتی ہیں۔“

دونوں نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔

”ابھی مجھے ضرورت ہے اس گھر کو ضرورت ہے ایک ”ہاں“ کی، ایک گھر گریستی والی عورت کی اور تم لوگ نہ کہہ رہے ہو، جب تم لوگوں کو ضرورت ہوگی تو میں بیٹھوں گی بھی نہیں۔ مزید کوپا ہوئیں۔

”لاحول ولا قوۃ! امی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ کر لیں نا بھائی آپ..... آپ کی عمر بھی ہے اس گھر کی ضرورت بھی۔“ امی کا ہاتھ تھام کر نا صحا نہ انداز میں ذیشان کو دیکھا۔

”تو تم یہ نیکی کمالو۔“

”بھائی!“ ٹھنڈی آہ بھری۔ ”میری تو ابھی عمر ہے نہ تجربہ۔“ بقول شخصے ابھی تو گھر داری سیکھ رہا ہوں۔“

”پھر بیکواس شروع کر دی.....“ عذرا بتول نے دونوں کو گھر کا۔

”بیگم..... بیگم! احمد صاحب باہر کہیں کھڑے تھے۔

ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ بڑی بے ساختگی سے آئے۔

”تمہارا مسئلہ میں حل کر دیتا ہوں۔“

پتھری رنگ بھی چھوٹا آئے گا۔ گھر کو عورت کی بجائے گی۔ دھیان خیال والی اور تنخواہ کی تلاش سے بے چاری۔ ”ذرا فاصلے پر بیٹھ کر کشن کو دیکھ رہا۔

”کون ہے وہ؟“

”دوسری بیوی جو تمہاری مرضی اور پسند سے آگے گی۔“

”لاحول ولا قوۃ!“

”استغفر اللہ!“

”دامغ خراب ہو گیا ہے آپ کا بچوں کے سامنے۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”تمہارا مسئلہ میں نہیں حل کروں گا تو پھر کون کرے گا۔“ مسکین سی صورت بنائی۔

”کیوں بچو!“ جواب میں بچوں نے دلی دلی زور مسکراہٹ کے ساتھ منہ پھیر لیا۔

”ٹھیک ہے نہیں تو ناہنجاری۔“ مجھے بھی پروا نہیں ہے۔

گھر ماسیوں پر چل رہا ہے چلنے دو۔ کوئی شکایت کرے..... سب مل کر گھر چلاؤ اور میری مجبوریوں سے فائدہ اٹھاؤ۔“ ناراضی سے، کچھ ٹھکی سے کہتے ہوئے انہیں اور باہر نکلنے لگیں۔

”بیگم!“ احمد صاحب نے پیچھے سے ددنی دی۔

”میں ہوں نا۔“

”امی میں بھی..... ہوں نا۔“ شیراز کیوں بیٹھے رہتا۔

”آئیں امی میں کرے میں چھوڑ دوں۔“

سلمان ہمدردی سے ان کی طرف بڑھا۔ ٹھکی سے ہاتھ جھٹکتی وہ اندر بڑھ گئیں۔ اور تینوں باپ بیٹا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”بیٹا ماں ہے تمہاری ماں لو اس کی بات سنو۔“

ابھی بھی کرتا ہے اور کچھ عرصے بعد بھی تو پھر ابھی نہیں۔“ کچھ دیر بعد احمد صاحب بچوں کو سمجھا رہے تھے۔

”ابو.....!“ وہ دونوں سر کھجانے لگے۔

”ابو میں تو راضی ہوں مگر آپ لوگ میرے لیے سنجیدہ کیوں نہیں ہوتے۔“ شیراز نے پھر مسکین سی صورت بنائی۔ سلمان نے ابو کی نظر بچا کر زور سے کشن ماریا۔ وہ ہلکا کر رہ گیا۔

”کوئی پسند ہے تو بتا دو ورنہ ماں کی بات مان لو۔“ تینوں سر جھٹکا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

\*\*\*

”وہیے اصولاً آپ کو امی کی بات مان لینا چاہیے ان کی تمام تر توقعات آپ سے وابستہ ہیں۔“

سلمان، ذیشان کے کمرے میں بیٹھا درپردہ انہیں فورس کر رہا تھا کہ انہیں شادی کر لینی چاہیے۔

”یہ سارا کھڑاگ آپ کا ہی پھیلایا ہوا ہے۔“

بڑی عزت سے اسے دیکھا۔ ”نہ آپ کو گھر داری کا غم ہوتا نہ امی کے دل میں بات ڈالتے نہ وہ اتنا ضدی ہوئیں۔“

”کرنا تو ہے نا۔“

”دو سال سے پہلے نہیں۔“ کمپیوٹر پر مصروف سے انداز میں کہا۔

”کیوں، کیا موصوفہ گریجویشن کر رہی ہیں۔“

سامنے آکر کھڑا ہوا۔

”ایسی کوئی بات نہیں بھائی۔ اسے تم لوگ ہی پسند کرنا۔“

”تو معنی تو کرو لیں ایکس والی زید سے پھر دو سال تک قسطیں سمیٹتے رہیے گا عید تہوار پر۔“

”تو یہ کام تم کر لو۔“ ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

”ہر کام میں ہی کیوں کروں۔“ وہ جھٹلا گیا۔

”قرائیاں چھوٹے ہی دیا کرتے ہیں۔“ ذیشان آرام سے مکرایا۔

”بس تو پھر میں امی سے کہتا ہوں کہ کسی بھی امی کے لبا کی کواد کے کر لیتے ہیں مفتی کر دیتے ہیں..... فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ارے..... ارے..... ارے.....“ سلمان کا ٹھہر دیکھ کر جلدی سے اٹھا۔

”نہیں تو چھوٹو کی کر دیتے ہیں ویسے بھی اسے بڑا اشتیاق ہو رہا ہے شادی کا۔“ ٹھکی سے اسے دیکھا۔

”تو تم ہی کر لو نا۔“ پیار سے سلمان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”میں.....!“ جل کر اسے دیکھا۔ ”ہر کام میں ہی کروں پہلے گھر داری مجھے شادی کے بعد کرنا ہے بیوی بچوں کے آرام کے لیے مگر آپ لوگوں کا آرام دیکھ رہا ہوں۔ اب آپ اپنی ذمے داری سنبھالیں، میں.....“

بولتے بولتے ذیشان کو دیکھ کر شرارت سے ہنسا۔

”میں ٹھنڈا جا رہا ہوں دو سال کے ویزے پر۔“

”ہیں.....!“ حیر سے دیکھا اور اس کا شرارتی انداز دیکھ کر ہنس دیا۔

”پھر واوے.....!“ باہر نکلنے لگا۔

”اوکے“ خودی کہہ کر باہر نکل گیا۔ ذیشان دھم سے کمری پر گر گیا۔

”وہیے.....!“ اس نے پھر دروازے سے منہ نکالا۔ ”یہ دو اور چار سال کا منصوبہ تو شادی کے بعد ہوتا ہے۔ منصوبہ بندی کے لیے اور آپ ابھی سے۔“ ناہنجاری سے اسے دیکھا اور پھر کچھ آنے پر سلمان کے پیچھے بھاگا۔ وہ ہنستا ہوا نو دو گیارہ ہو گیا۔

\*\*\*

اگلے دن لاؤنج میں شام کی چائے پیتے ہوئے سلمان بتول کو مناتے ہوئے ذیشان کی ہاں کی خوشخبری سنا رہا تھا۔

”جج..... ذیشان مان گیا۔“

”جج امی! بس جلدی سے ان کی مفتی کر دیں۔“

”بالکل، بالکل..... لڑکیاں تو میں نے سوچ کر رکھی ہیں ذیشان کے لیے شانلدا اور تمہارے لیے نغانہ۔“

”جج.....“ سلمان کے جوش کو بریک لگ گئے اور اپنے نام پر شانلدا کے قدم ٹھک گئے۔

”ہاں بس آج ہی تمہارے ابو سے بات کر کے کل چلیں گے بھائی صاحب کے گھر۔“ ان کا پُر جوش چہرہ دکھ رہا تھا۔ ”نئی پیاری ہے شانلدا۔“

”امی.....!“ سلمان سنجیدہ تھا۔



”شائلہ نہیں.....! شائلہ کے بجائے آپ نعمان کو ذیشان کے لیے لے لیں اور میرے لیے چھوٹے ماموں کی مدد کر لیں۔“

”اب تمہیں شائلہ پر اعتراض ہے، کیا حرج ہے اس میں۔“

”امی!“ دھیرے سے اٹھ کر ماں کے پاس قدموں میں بیٹھ گیا، ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے والے انداز میں کہنا شروع کیا اور باہر کھڑی شائلہ کے قدموں سے زمین کھینکے گی۔

”امی اس گھر کو، آپ کو ایک گھریلو اور خوب سیرت لڑکی کی ضرورت ہے کسی ڈیکوریشن بیس کی نہیں۔ جو آپ کو دیکھے، ہم لوگوں کو دیکھے، اس گھر کی ضرورت کو محسوس کرے۔ کیا شائلہ ایسی ہے؟ کیا ہے صرف چہرہ خوبصورت ہے۔ ارے انسان کا دل خوبصورت ہونا چاہیے۔ ہاتھوں کو متحرک ہونا چاہیے۔ اسے صرف ذیشان سے غرض ہے، اسے لے کر دفن ہو جائے گی۔ وہ ہے بھی اسی بیچری۔“

”سلمان.....!“ بول اس کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔

”بڑی بھالی کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی عزت اس سے محبت کرنے کو دل چاہے۔ اس کے کردار میں جھول نہ ہو، وقت کی ضرورت کو سمجھے۔ ضدی، جھگڑالو اور خود پسند نہ ہو۔ دوسروں کی عزت کرنا جانتی ہو..... ذرا غورو خوض کریں کیا ہے اس میں..... لہجہ تک تو محبت آمیز نہیں۔“ شائلہ کھڑے قد سے نیچے کرنے لگی۔

”ہمیں خوبصورت نہیں، خوب سیرت بہو چاہیے۔“ شائلہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

”دوسری بہو آپ چھوٹے ماموں کی مدد پر کوئی منتخب کر لیں۔ ان کی غربت کی وجہ سے آپ نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ ماموں کے بعد وہ کیسے گھر چلا رہی ہے محنت اور جانفشانی سے۔ وہ مستحق ہے۔ ماموں کی چار بیٹیاں ہیں جنہر کے نام پر بیٹی رہ جائیں گی۔ خاندان کے لوگوں کے متعلق خاندان کے افراد ہی سوچتے ہیں امی۔“ دھیرے سے ان کے گھٹنوں کو دبایا۔

”یہ نیکی بھی ہے۔ زادراہ بھی اور اس گھر کی ضرورت بھی۔“ غدار بول اسے دیکھ گئیں۔ کتنا بھرا اور غمگین تھا ان کا بیٹا۔

”باقی آپ کو اختیار ہے۔“ ان کے گھٹنوں پر رکھا۔ حسد اور رقابت کی آگ نے اسے خاکستر کر دیا۔ بجائے پشیمان ہونے کے اس کے وجود میں ہوا غم بھرا دل چاہا کہ اندر جائے اور سلمان کا منہ نوچ لے۔ اگر یہ درمیان میں نہ ہوتا تو اسے دنیا کی کوئی چیز اس کی بہو بننے سے نہیں روک سکتی تھی۔ سر اٹھا کر اطراف میں نگاہ کی۔

یہ گھر، یہ پیارا گھر، ذیشان جیسا شخص۔ ڈاکو اختیار جیسے لوگ کھنڈ وقت گزاری کے لیے ہوتے ہیں مگر..... اس وقت گزاری نے اس کی جانی تسکین لے اسے کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔ لائے قدموں بھاگی اور وہاں سے نکل آئی۔

فردا کسی سنیا سی باوا کا ذکر کر رہی تھی۔ ان کے ایک عمل سے محبوب قدموں میں، من چاہی مراد پوری ہو گئی۔ بور کے سہانے لٹو جھولی میں۔ سرعت سے سوچتی وہ فردا کے گھر کا نمبر ڈائل کر رہی تھی پھر اس کے ساتھ سنیا سی باوا کی درگاہ پر پہنچی۔ انہوں نے ایک خلیہ رقم لے کر سات تعویذ دیئے۔

”انشاء اللہ جو چاہو گی ملے گا۔“ اس نے ساتویں دن ساتواں تعویذ عقیدت کے گھر کے تار میں ڈوب کر جلایا تو امی اس کے کمرے میں آ گئیں۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور انھیں ہنسنا۔

”امی.....!“

”شائلہ آج ذیشان کی منگنی ہے نعمان کے ساتھ۔ تیار ہو جاؤ ابھی ابھی بھائی کا فون آیا ہے۔“ شائلہ دم بخود رہ گئی۔ ابھی تو اس نے امید کا آخری تعویذ جلایا تھا کہ امید برآئے گی۔ یہ امی کیا کہہ رہی ہیں۔

”اسی لیے..... اسی لیے میں تجھے سمجھاتی تھی۔ میں اعتماد اور روے میں توازن پیدا کر اچھیں۔ جو مرضی کر لیتی۔ سسرال تو اچھا ملتا۔ مگر تو..... مگر تو..... انہوں نے ششگاہیں نگاہوں سے دم سادے بیٹی شائلہ کو

دیکھا اور دھاڑ سے دروازہ بند کرتی باہر نکل گئیں۔ اس کے ہاتھ سنیا سی باوا کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔ اس بار انہوں نے بڑا سخت تعویذ دیا تھا۔ اس پر چار بیسیوں کا ورد کرنا اور تیسرے دن اسے زمین بوس مٹی میں دبا دینا۔ اس نے احمد والا کے گیٹ کے سامنے یہ کارنامہ انجام دے دیا۔

”میں خوش نہیں تو کوئی بھی خوش نہیں۔ سلمان میں تم سے تمہارا نہیں چھین لوں گی۔ تم نے..... تم نے.....“ حسد اور رقابت کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس دنیا کو پس نہیں کر دے۔ آگ لگا دے مگر پاگل لڑکی یہ نہیں جانتی تھی کہ کاغذ پر چند لکیروں والے رقعے جلانے اور دبانے، دفنانے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک خدانہ چاہے۔

احمد والا کے لوگ چوتھے دن بڑی دھوم دھام سے ناغم آباد میں واقع ماموں کے گھر جا رہے تھے، کسی غریب، صابر، سختی اور حیا دار لڑکی کی قسمت جگمگانے، مدیکو کو ہوبنانے۔ اسی زمین پر قدم رکھتے سب گزرے جہاں شائلہ نے من کی آشا پوری کرنے کے لیے تعویذ دفنایا تھا۔ وہاں پھول ہی پھول بکھرے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی جلد بازی نے کسی ہاتھ کی بازی نکال دی تھی۔ بے وقوف کا خبر نہیں تھی کہ نیک نیکی ہو یا دلوں میں نور..... خدا بہتر قتل عموذ برب الناس ہے۔ وہ نیک لوگوں کو بد فطرت لوگوں سے بچا لیتا ہے۔ دلوں میں چھپے شوروں کو بچان لیتا ہے اور اپنے نیک بندوں کو شر سے محفوظ رکھنے کے گڑ جانتا ہے۔

\*\*\*

”سنو!“ بڑے شرارتی انداز میں سلمان اپنے پہلو میں سٹری کٹنی بیٹھی مدیکو کو دیکھ کر ہنسا اور اس کی جانب جھکا۔

”میں آسمان سے تارے توڑنے کا وعدہ تو نہیں کرتا لیکن اگر تم اپنی محنت..... محبت، وفا اور حیا سے میرے گھر کو جنت سے جنت کدہ بنا دینے کا وعدہ کرو۔ تو میں تمہیں دنیا کی خوش قسمت لڑکی بنانے کا وعدہ کرتا ہوں۔“ مدیکو نے ایک شرمیلی نگاہ اٹھائی۔

## غزل

خواب تم، خواب کی تعبیر ہو تم  
میری ہر پور پہ خرید ہو تم  
کاش کہہ دے مرا راجھا اک دن  
کہ میں راجھا ہوں، مری ہیر ہو تم  
میں جسے توڑنا چاہوں نہ بھی  
ایسا اک حلقہ زنجیر ہو تم  
میں نہیں جانتی، یوں ہے کہ نہیں  
چاہتی ہوں، مری تقدیر ہو تم  
دیکھتی رہتی ہوں ہر دم جس کو  
دل کے اہم کی وہ تصویر ہو تم  
اور کیا تم سے کہوں، تم کیا ہو!  
دل کی تاریکی میں تنویر ہو تم!  
اس نے کچھ کہہ دیا تم سے لالی  
کیوں پریشاں ہو، دلگیر ہو تم؟  
شاعرہ: قدسیہ ندیم لالہ،  
سعودی عرب

”میں وعدہ نہیں کرتی وعدے کا کیا بھروسا، وعدہ تو ٹوٹ جاتا ہے۔ عمل سے شکایت ہو تو بتائیے گا۔“ اس نقلی فلسفے پر سلمان کان کھانے لگا۔

”اور مجھے ٹوٹے ہوئے تارے لینے کا کوئی شوق نہیں۔“ مزید کہا۔ سلمان نے حیرانی سے اپنی ہتھیلیوں سے کھینک کر دیکھا۔ جس کے ہاتھوں پر اس کے نام کی مہندی تھی اور بڑا جاندار قہمہ لگا ہوا۔

”واہ! خوب گزرے گی جوں بیٹھیں گے دیوانے۔“

جگنوؤں جی میٹوں نے کسی کی آنکھوں میں مرجیں سی بھر دیں اور کسی کی آنکھوں میں تو س قزح کے رنگوں کی آمیزش کر دی۔



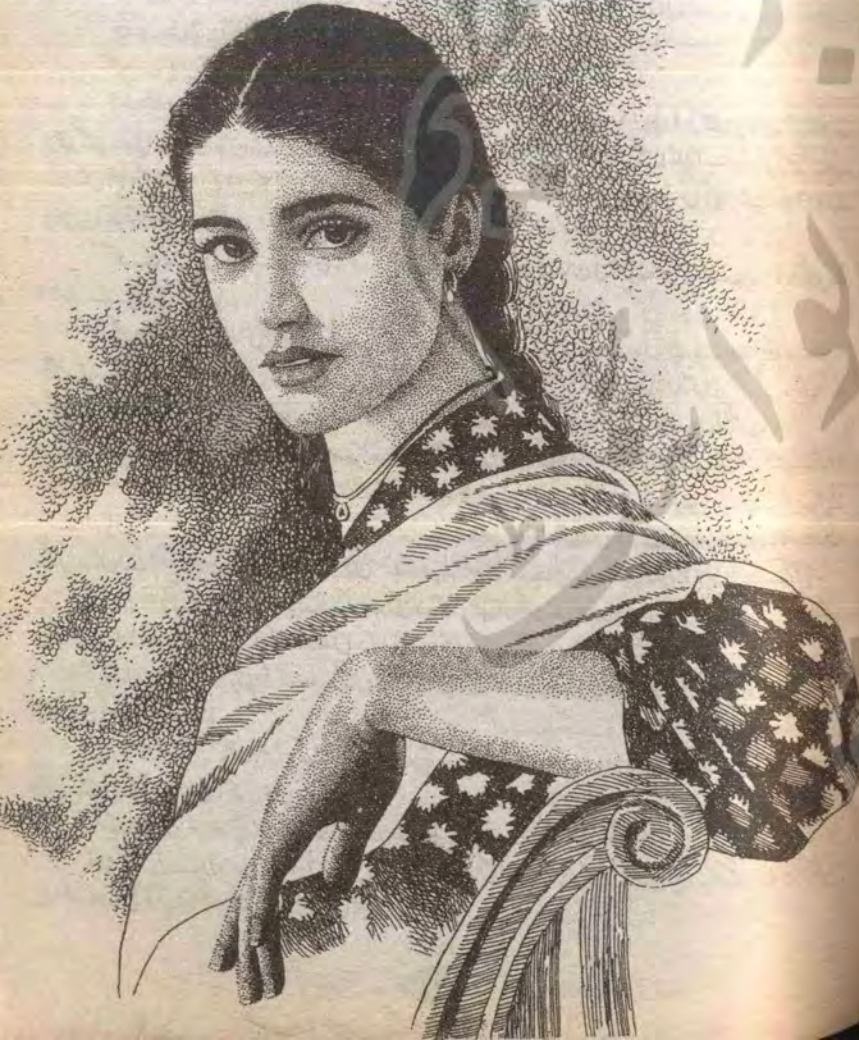


# امریکل

شیریں حیدر

عورت بظاہر کمزور ہے اور ہمارے معاشرے میں اسے ترنوالہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ ایک ایسی عورت کی داستان جس پر زندگی کی خوشیوں کا آغاز ہوتا ہے غم کا کوہ گراں آت گراٹھا مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا مگر خود جینا اور دوسروں کو بھی زندگی کی طرف لوٹانا بہت کٹھن کام ہے مگر یہ عورت ہی ہے جو سب کٹھنایاب خود پر جھیل کر بھی زندگی کا سفر جاری و ساری رکھتی ہے۔ اس کی راہ کے کائنات اور پتھر اور کوئی نہیں ہٹاتا، صرف قدرت ہی اس کی مدد کر ہوتی ہے۔ دشوار گزار راستوں میں آپ خود کو اس کا ہم سفر محسوس کریں گے،

ایک نئی روداد حیات شیریں حیدر کے حواس قلم سے.....





”کیا کر رہی ہیں آپ امی جان؟“ میں نے یکدم درمیان میں آ کر امی جان کا تیزی سے چلتا ہوا ہاتھ روک دیا۔ نادانستی میں، میں منظر کے بالکل قریب کھڑی تھی۔

”جواب نہیں دیا آپ نے میری بات کا؟“ اس نے نظریں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے کمرے میں بھلا کیوں جاتی؟ کس نے کہا تم سے کہ میں تمہارے کمرے میں گئی ہوں؟“ میں نے کہا۔

”میرے کمرے کے اندر آپ کی مخصوص خوشبو نے.....“ اس کی بات نے مجھے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔

”تمہارے کمرے کا دروازہ کھلتا تھا، صرف میں نے اسے بند کر دیا کہ کہیں ملازمہ میری لاعلمی میں اندر نہ چل جائے اور تمہاری کوئی شے غائب نہ ہو جائے، کوئی رقم یا کوئی اور قیمتی چیز۔“ میں نے صفائی دی۔

”سچ کہہ رہی ہیں؟“ اس کی آنکھوں میں بے یقینی کا پیرا تھا۔

”میرے پاس جھوٹ بولنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“ میں نے قدرے خشکی سے کہا۔

”آئی ایم سوری بھابی!“ اس نے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے اور اس کی آنکھیں پانیوں میں ڈوب رہی تھیں۔ بچی کی دفعہ امی جان نے میرے سامنے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ شاید بھی بہت بچپن میں اسے مارا گیا ہو مگر جب سے میں آئی گئی میں نے اس کا بہت معصوم روپ دیکھا تھا۔ مجھے ابھی بھی اس پر بہت ترس آیا، میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”مجھ سے نہیں امی جان سے معافی مانگو۔“ میری بات سن کر وہ امی جان کی طرف مڑا۔ انہوں نے ناراضی کے اظہار کے لیے رخ پھیر لیا۔

”مجھے معاف کر دیں امی! میری پہلی بدتمیزی سمجھ کر مجھے معاف کر دیں۔ میری ماں، میری جنت! مجھ سے منہ نہ پھیریں۔“ وہ بلب بلب کر بچوں کی طرح رورہا تھا۔ میرا دل بھی پکٹنے لگا کمرامی جان کی ناراضی بدستور تھی۔ میں نے بھی ان سے سفارش کی کہ بچہ ہے اسے معاف کر دیں۔ اس پر انہوں نے اسے ساتھ لگایا اور رونے لگیں۔

”تمہارے باپ کے مرنے کے بعد غالب نے کبھی تمہیں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور جب سے وہ ہمیں چھوڑ کر گیا ہے اس دن سے ماہانے نہ صرف حالات کا مقابلہ مردانہ دار کیا ہے بلکہ ایک باپ ہی کی طرح اپنی ذمے داریاں بھی سنبھالی ہیں۔ ارے کم بختو! تم تو اس کے احسانوں کا بدلہ بھی نہیں چکا سکتے.....“ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ میں نے منظر کو ان سے علیحدہ کیا اور انہیں سنبھالا دیا۔ منظر ان کے لیے ایک گلاس میں جوس ڈال کر لے آیا۔

”میں تو سوچتی تھی کہ میرے مرنے کے بعد بھی ماہا کا مرتبہ اس گھر میں سربراہ کا رہے گا مگر مجھے اپنی زندگی میں ہی یہ دن دیکھنا تھا کہ تم اتنی گستاخی کرو گے اس کے ساتھ۔“ امی جان نے روتے ہوئے کہا۔

”کہاناں معاف کر دیں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا!“ اس نے ٹھٹھوں کے بل بیٹھ کمرامی جان کے ہاتھ تھام لیے اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

”چلو اٹھو منظر! منہ ہاتھ دھو، کھانا تیار ہو گیا ہوگا۔ اپنا کمرہ اگر صاف کروانا ہے تو ملازمہ سے کہہ دو کر دے گی۔“ میں نے بات بدلی تاکہ ماحول بدلے۔

”ٹھیک ہی ہے کمرہ بھابی! ضرورت نہیں ہے صفائی کی۔“ منظر نے مختصر کہا۔

کھانا کھانے کے دوران بھی ماحول بوجھل سا ہی تھا۔ میں بھی اس میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہ لاسکی۔ بظاہر تو میں نے منظر کا دفاع کر لیا تھا لیکن اندر سے میرا دل بہت خوفزدہ تھا۔

کھانا کھا کر منظر ٹی وی پر اسپورٹس کا کوئی چینل لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور اپنے کمرے میں لے آئی، چائے پی کر نماز پڑھی اور پھر صبح لے کر لیٹ گئی۔ صبح تو خیر کیا پڑھتی ذہن کی روٹھک کراس طرف چلی گئی اس گھر میں منظر سے کہہ دیتی کہ میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی تو وہ جانے سے میرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ عجیب تصورات اور خوف سے مجھے پھریری آ گئی۔ میں نے یہی سوچا کہ اب کے تیور آنے کا تو میں اسے صورت حال سے آگاہ کر دیتی۔ رات نیند بھی ڈسٹرب رہی اور عجیب و غریب خوابوں نے رہی ابھی کسر بھی پوری کر دی۔

”تو یہ کی میری وقعت اور اوقات؟“ صبح ہاتھ روم میں آنے کے سامنے اپنی سوچی ہوئی آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ دیکھ کر میں نے خود سے سوال کیا۔ میں جو ابھی بائیس برس کی بچی نہ ہوئی تھی، کیوں میں نے خود پر بے بسی کا یہ خول چڑھا لیا تھا اور کیوں میں نے زندگی کی سب خوشیاں خود پر حرام کر لی تھیں۔ اس لیے نا کہ غالب نے اتنے کم عرصے میں مجھے وہ مان اور پڑا دیا تھا کہ میں اس گھر کے ساتھ ایک خوبصورت رشتے کی زنجیر میں بندھ گئی۔ ایک کے بعد ایک دستک ہوتی رہی اور میں نے ان دستکوں کے جواب میں دل کے دروازوں پر انکار کے قفل لگا رکھے تھے اور کیا یہ صلہ تھا کہ اب مجھے یہاں زندگی خوف کے سامنے میں گزارنا ہوگی۔

”لیکن میں یہاں رہنے کی پابند تو تھی۔“ ناشتا زہر مار کرتے ہوئے میں نے سوچا۔ ”کون سا مجھے کوئی مجبوری ہے کہ یہیں رہوں..... میں چاہوں تو والدہ کے گھر جا سکتی ہوں..... میرا خیال ہے کہ یہی بہتر ہوگا۔“ میں گویا دل ہی دل میں کسی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

”کیا بات ہے ماہا! تم کچھ پریشان ہو؟“ امی جان ناشتے کی میز پر میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”نہیں تو!“ میں یکدم ٹپٹا گئی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

”مجھے معلوم ہے بیٹا! تم منظر کے روتے سے پریشان ہو گئی۔ تم نے خود ہی اس کو سر چڑھا رکھا ہے۔ میں تو اس کے کمرے گستاخی کا بھوت اتار دیتی اگر تم درمیان میں نہ آ جاؤ تو۔“ انہوں نے شرمندگی سے کہا۔

”ارے نہیں امی جان! میں اس کے روتے سے پریشان تو نہیں لیکن اس کی بابت سوچتی ضرور رہی کیونکہ اس نے کبھی گستاخی کی نہیں پھر جوان اولاد پر ہاتھ اٹھانا بھی تو مسئلہ کا حل نہیں..... آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ بعد میں کیسے شرمندہ تھا اگر آپ اس کو مزید مارتیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ باغی ہو جاتا..... کہیں غصے میں آ کر گھر ہی چھوڑ جاتا تو۔“ میں نے نمکدہ صورت حال کا نقشہ امی جان کے سامنے پیش کیا۔

”اگر وہ گھر چھوڑ جاتا ہے اس بات پر تو مجھے دکھ نہیں ہوگا۔ ماں ہوں، کئی تو ہو گئی لیکن اگر وہ تمہارے ساتھ گستاخی کرے اور تمہارے سارے احسانات بھول جائے تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔“ امی جان نے کہا تو میری آنکھیں چٹھک آئیں۔

”اللہ نہ کرے امی جان کہ وہ کبھی بھی گھر چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچے۔“ میں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”اب ہم کسی کے جانے کا دکھ برداشت نہ کر پائیں گے۔“

”میں تو داد دیتی ہوں بیٹی تمہارے حوصلے کی اور آخر میں ہے تمہاری ماں کی تربیت پر کہ جس نے ایسی تربیت بیٹی کی، کی ہے۔ ایسا تدبیر بظہر او، برداشت اور فہم تو بسا اوقات میری عمر کی عورتوں میں بھی نہیں ہوتا۔ تمہارے لیے دعا مانگتے وقت بھی میرے ذہن میں تمہارا تصور بہو کی حیثیت سے نہیں آتا۔“ امی جان نے کہا۔

”اس لیے امی جان کہ میں آپ کی بیٹی ہوں، بہو نہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اللہ تمہاری آزمائش ختم کرے اور تمہارے لیے آسانیاں فرمائے، آمین!“ امی جان نے کہا۔



منظہر کے کالج کی جفتے میں دو خطبات ہوتی تھیں۔ اتوار کو تو ہمارا دفتر بھی بند ہوتا تھا البتہ میں نے اسے کہا تھا وہ جفتے کے روز میرے ساتھ دفتر جایا کرے اور پھر آہستہ آہستہ وہ جفتے کے روز آیا ہی دفتر جایا کرے گا۔ اس نے پیش کی کہ جفتے کے روز پڑھائی کی مصروفیات ہوتی ہیں، دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھائی ہوتی ہے لیکن میں نے اسے کیا تو وہ مان گیا۔ میں نوٹ کر رہی تھی کہ جفتے کے دن وہ ناشتا کر کے غائب ہوتا تھا اور رات دیر سے کھانا کھا بسا اوقات تو ہمیں علم ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ رات کو لوٹا یا صبح کو۔ امی جان تو نیند کی دوا لے کر سوتی تھیں اس لیے اسے اسے بھی کبھی ایسی گہری نیند میں ہوتی تھی کہ اس کے آنے کا علم ہی نہ ہوتا تھا۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے یہ باتیں ناچنے نے خود ہی سوچا اور خود ہی میں نے امی جان کے سامنے بات چھیڑی۔ ان کا وہ بھی میرے حق میں تھا اس لیے اسے ہتھیار ڈالنے ہی بن پڑی۔

میرے ساتھ وہ پہلے دن جب دفتر گیا تو دو پہر کے بعد بوریت سے جہانیاں لینے لگا۔  
”آپ ویسے کیا چاہتے ہیں بھائی! آج آپ تو بور بھی نہیں ہوتیں۔ پتا نہیں کس مٹی سے بنی ہیں آپ؟“ منظہر نے برملا اپنی بوریت کا اظہار کیا۔

”تم ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ کہہ رہے ہو کہ میں ڈھپٹ مٹی کی بنی ہوئی ہوں۔“ میں نے مصنوعی خشکی سے کہا۔  
”اللہ نہ کرے کہ میں آپ سے ایسی گستاخی کروں!“ وہ یکدم بولا۔  
”جیسے اس سے قبل تو تم نے کبھی مجھ سے گستاخی کی ہی نہ ہو۔“ میں نے نظریں پھیریں۔  
”اس کا مطلب ہے کہ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا؟“ اس نے شکوہ کنٹاں نظروں سے دیکھا۔  
”نہیں، معاف تو کر دیا تھا، یونہی بات منہ سے پھسل گئی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔  
”سچ کہہ رہی ہیں؟“ اس کے سوال میں بے یقینی تھی۔

بالکل سچ کہہ رہی ہوں“ میں نے کہا۔ ”بھی جھوٹ بولا ہے میں نے تم سے؟“  
”شاید!!“ اس نے شاید سادگی سے یہ لفظ کہا مگر میرے من کا چور ہو گیا مجھ سے ہی کچھ پوچھنے لگا۔ میں نے بڑی ہمت کر کے ہنسنے کی کوشش کی اور وہ بھی ہنس پڑا۔ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے اجازت دی تو نوید صاحب داخل ہوئے۔

”مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔  
”ارے نہیں سراسر ایسی کوئی بات نہیں۔“ منظہر نے کہا۔ ”بھائی کے لینے پر ہنس رہا تھا۔“  
”آپ پلیز مجھے سہہ نہ کہیں، سہر تو مجھے آپ کو کہنا چاہیے۔“ نوید صاحب نے منظہر سے کہا۔  
”ویسے تو میں آپ کو بھائی جان کا دوست ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ بھائی جان ہی کہتا رہا ہوں اور دفتر سے باہر اب بھی کہتا رہوں گا مگر دفتر کی آداب کے مطابق آپ سینئر ہیں اس لیے مجھے آپ کو سہہ نہ ہوگا۔“ منظہر نے ریکارڈ درست کیا۔

”آپ اس کاروبار کے مالک ہیں اور میں تنخواہ دار ملازم۔“ نوید صاحب نے کہا۔  
”کاروبار کی مالک بھائی ہیں، انہیں آپ میڈم کہتے ہیں، وہ ٹھیک ہے۔ البتہ مجھے آپ سر کہہ کر شرمندہ مت کریں۔“ منظہر نے کہا۔

”میں کاروبار کی مالک نہیں ہوں منظہر!“ میں نے مداخلت کی۔ ”اس کاروبار کے مالک تو اوریور ہو، میں اس کی عارضی مقرر ہوں اور میرے پاس یہ کاروبار ایک امانت ہے۔ نوید صاحب جانتے ہیں کہ کس طرح میں نے حساب کتاب کو سپردِ حوالہ اور شفاف رکھا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”چلیں جب آپ کہیں جائیں گی تو تب دیکھا جائے گا۔ جب تک آپ ہماری بھائی کی حیثیت سے کاروبار

سنبھال رہی ہیں، آپ اس کی اسی طرح مالک ہیں جیسے میں اوریور بھائی۔“ منظہر نے زور دے کر کہا۔  
”میں چلتا ہوں!“ نوید صاحب نے اجازت چاہی۔

”سوری، میں تو پوچھنا بھول گئی۔ آپ کیوں آئے تھے؟“ میں نے شرمندگی سے کہا۔

”آپ سے کچھ کام تھا بعد میں بات کر لوں گا۔“ نوید صاحب نے کہا۔

”ارے نہیں کل پھر اتوار ہے۔“ اوریور بھی ابھی تھوری دیر میں، میں اٹھ کر گھر جانے ہی والی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ بات کریں۔“

”اصل میں مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنا تھی۔“ نوید صاحب نے جھجک کر کہا اور اس بات پر منظہر نے چونک کر مجھے دیکھا، میں نے اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں یکدم مجھے غصے کا رنگ نظر آیا۔

”ایسی کون سی بات ہے جو منظہر کے سامنے نہیں ہو سکتی ہے؟“ میں نے نوید صاحب سے پوچھا۔

”میرے کسی ذاتی معاملے پر بات ہے۔“ نوید صاحب نے مختصر کہا۔

”میں باہر چلا جاتا ہوں!“ منظہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے چہرے پر لہراتے ہوئے سائے کچھ خوش آئند نہ لگ رہے تھے۔ میں دل میں خوفزدہ ہو گئی کہ جانے اس بات کو کیا رنگ دے بیٹھے۔

”نوید صاحب آپ کے رشتے والے معاملے کی بات ہے تو میرا خیال ہے کہ منظہر کے سامنے کرنے میں کوئی حرج نہیں!“ میں نے بات سمجھ کر کہا۔

”بات تو وہی ہے۔“ نوید صاحب نے کہا۔ ”میری بڑی بہن ہما آپ سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہ رہی تھیں اگر آپ اجازت دیں تو آپ کا نمبر دے دوں؟“

”ہاں ہاں! کیوں نہیں، لگتا ہے کہ وہ لاکی دیکھ آئی ہیں چاکر؟“ میں نے جان بوجھ کر بات اس طرح کی کہ منظہر کو کچھ جائے۔

”جی ہاں! میری بہنیں گئی تھیں۔ وہ لوگ..... مجھے لگتا ہے کہ مطمئن نہیں ہوئیں۔“ نوید صاحب نے کہا۔  
”چلیں آپ انہیں بتا دیں کہ وہ مجھ سے بات کر لیں۔“ میں نے کہا تو نوید صاحب شکر یہ ادا کرتے ہوئے چلے گئے۔

”یہ آپ نے رشتے کروانے کا کام کب سے شروع کر دیا ہے بھائی؟“ منظہر نے طنز سے پوچھا۔  
میں نے جواب میں خاموشی رکھی۔ واپسی پر گاڑی منظہر چلا رہا تھا اور دیر سے خاموشی تھی۔

”کہاں کروا رہی ہیں آپ نوید صاحب کا رشتہ؟“ منظہر نے پوچھا۔  
”ہمارے ایک جاننے والے ہیں.....“ میں نے مختصر کہا۔ ”بلکہ میری دوست ہی سمجھ لو۔“

”کون لوگ ہیں یہی تو پوچھ رہا ہوں؟“ اس نے پھر اصرار کیا۔  
”تم تو یوں جرح کر رہے ہو جیسے تم میری سب دوستوں اور کلاس فیلوز کو جانتے ہو.....“ میں نے چڑ کر کہا۔

”سوری! آپ کو برا لگا..... اصل میں مجھے آپ کی بات پر لگا کہ نوید بھائی کو آپ سے کچھ اور بات کرنا تھی لیکن میری موجودگی کی وجہ سے آپ بات بدل گئیں“ اس نے کہا تو مجھے بہت عجیب لگا۔

”منظہر تمہیں مجھ پر کچھ زیادہ ہی شک نہیں ہو رہا؟ ہر بات کو تم جھوٹ سمجھتے ہو۔ جانے ایسا کیا کر دیا ہے میں نے کہ تم مجھ سے بدگمان سے رہتے ہو۔ لگتا ہے اب تم بہت بڑے اور بھدرا ہو گئے ہو اور ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ میں اب تک جو کرنی آتی ہوں اور کتنی رہی ہوں وہ سب غلط تھا۔“ میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

”بخدا ایسی کوئی بات نہیں.....“ اس نے شرمندگی سے کہا۔ ”اصل میں یونیٹی مجھے لگا کہ نوید بھائی آپ سے اپنے اور آپ کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہ رہے تھے، کیونکہ وہ بھی تو کوئی سلسلہ چل رہا تھا۔“ منظہر نے جملہ مکمل کیا تو



میں اس کی معلومات پر حیران رہ گئی۔

”تمہیں غالباً اس سلسلے کا تو علم ہوا ہو گا مگر یہ علم نہیں ہوا ہو گا کہ وہ سلسلہ اپنے انجام تک پہنچ چکا ہے اور میں اس تجویز کو رد کر دیتا تھا۔“ میں نے ہنسی بھرے لہجے میں اسے جواب دیا اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے لب بھج لے۔  
”پھر ایسی کیا وجہ ہے کہ جو چیز یا شخص آپ کو اپنے لیے پسند نہیں آیا وہ اپنی دوست کے لیے تجویز کر دیا؟“  
مظہر نے چبھتا ہوا سوال کیا۔ ”حدیث شریف میں بھی ہے کہ دوسروں کے لیے وہی پسند کر دو جو تمہیں اپنے لیے پسند ہو۔“

”نوید صاحب میں ایسی کوئی خرابی نہیں جو کہ میرے انکار کا باعث بنی ہو۔ بس میرا دل ہی نہیں مانا ورنہ نوید صاحب بہت اچھے انسان ہیں اسی لیے میں نے اپنی دوست کے لیے ان کا سوچا۔“ میں نے کہا۔  
”ویسے آپ نے اچھا کیا جو آپ نے نوید صاحب سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ کو گھر چھوڑ کر جانا پڑتا۔“ مظہر نے کہا۔ ”لیکن بہتر ہوتا اگر آپ تیمور بھائی کے لیے ہاں کر دیتیں۔“  
”تم خاموشی سے گاڑی چلاؤ مظہر۔“ میں نے بات ختم کی۔



شام کو نوید صاحب کی بہن ہما کی کال آئی، میں ٹی وی روم میں ہی بیٹھی تھی، امی جان بھی پاس ہی تھیں۔ میں نے ہی فون اٹھایا تھا، سلام دعا کے تبادلے کے بعد انہوں نے پوچھا۔ ”آپ سے کچھ پوچھنا تھا اگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو پوچھوں؟“

”جی کیوں نہیں فرمائیے!“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”اما! آپ جانتی ہیں ہمارے بھائی نے ساری زندگی مصائب کا سامنا کرتے اور اپنے فرائض سے عہدہ بردار ہونے میں گزاردی۔ اب ہمارے اصرار پر وہ بمشکل شادی کے لیے مانے اور آپ کے ساتھ کی خواہش کی۔“ وہ سانس لینے کو کھیں، میں ہمدرد گوش تھی۔ ”جب آپ کی شادی غالب سے ہوئی تھی تب سے آپ نوید بھائی کو پسند آئی تھیں اور انہوں نے ہم سے ہمیشہ آپ کی بہت تعریف کی۔“

”لیکن مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں بھی ان سے ملی بھی ہوں گی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”غالب بھائی کی زبانی آپ کی تعریفیں سن سن کر ان کے ذہن میں ایک اچھی بیوی کا تصور بن گیا تھا اور پھر جس طریقے سے غالب بھائی کی وفات کے بعد آپ نے ان کے گھر کو سنبھالا دیا، جس ذمے داری سے کاروبار سنبھالا ہے وہ سب کے سامنے ہے اور نوید بھائی کو آپ کا یہی احساس ذمے داری اچھا لگتا ہے۔ اتنی کم عمری میں اتنی بالغ نظری آج کل ناپید ہے۔“ انہوں نے تفصیل بیان کی۔

”آپ نے مجھ سے زارا کے سلسلے میں بات کرنا تھی۔“ میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے بات کا رخ بدلا۔

”میں اسی بات کی طرف آ رہی ہوں، آپ بات کا رخ بدل رہی ہیں۔“ انہوں نے پھر بات شروع کی۔ ”آپ کے تجویز کردہ رشتے کو ہم دیکھنے گئے تھے اما! مجھے تو حیرت ہے کہ آپ نے ہمیں کیا سوچ کر وہاں بھیج دیا؟“ میں ان کی اس بات پر بہت حیران ہوئی مگر امی جان کی موجودگی کی وجہ سے کھل کر بات نہ کر سکتی تھی۔  
”کیوں، کیا ہوا؟“ میں نے صرف اتنا کہا۔

”اس غریب بستی میں دو کمروں کے اس مکان میں آپ نے ہمیں بھیج کر ہمیں کیا جتلیا ہے، کیا ہمارے بھائی کی یہی اوقات رہ گئی ہے۔ ہم کوئی اتنے گرے پڑے تو نہیں ہیں اما اور آپ چلی ہیں ٹاٹ کا پوند لگانے۔ ٹھیک ہے آپ کو ہمارا بھائی ناپسند کسی لیکن اس کو زارا سے شادی پر مجبور کر کے آپ کس چیز کا انتقام لینا چاہتی ہیں۔ آپ نے نوید



بھائی کو دکھ کر دیا ہے، کیا یہ کافی نہیں ہے.....؟“ وہ کافی چراغ پا لگ رہی تھیں۔ میں کھل کر بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔  
 ”دیکھیے ہاباجی! میں پھر کسی وقت آپ کو کال کر لوں گی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں نے انہیں خدا کرنے کی کوشش کی۔“

”ماہا! میں نے زندگی کو آپ سے زیادہ دیکھا اور برتا ہے اور جانتی ہوں کہ غریب گھرانوں کی لڑکیاں یہ خوشحال گھرانوں میں بیانی جاتی ہیں تو ان کے اندر کی بھوک جاگ اٹھتی ہے۔ ان میں قناعت ختم ہو جاتی ہے۔ ماحول سے وہ آتی ہیں وہ ماحول نا دیدہ و جمیز کی طرح ان کے ساتھ آتا ہے۔ وہ شاید ہمارے بھائی کو وہ خوشیار اور سکے جو اس کا حق ہیں، انہوں نے خدشہ ظاہر کیا۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ امی جان غالباً سمجھ گئی تھیں کہ میں ان کی موجودگی کے باعث کھل کر بات نہیں کر پا رہی ہوں، اس لیے انہوں نے آرام کرنے کا بہانہ کیا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔  
 ”ہاباجی! وہ بہت اچھی، سمجھدار اور سچی ہوئی لڑکیاں ہیں۔“ میں نے رساں سے سمجھایا۔  
 ”لیکن زار اطلاق شدہ ہے.....“ انہوں نے ہچکچا کر کہا۔  
 ”پھر تو میں بھی بیوہ ہوں!“ یکدم میرے منہ سے پھل گیا۔

”بیوہ ہونے میں عورت کا اپنا کوئی قصور نہیں ہوتا، جب کہ طلاق کی صورت میں یہ خیال تو بہر حال ذہن میں رہتا ہے کہ اس میں عورت کا کوئی قصور ہوگا۔ اب بغیر غرضت کے طلاق کوئی بلا وجہ تو نہیں ہو جاتی تاں، کوئی تو وجہ ہی ہوگی؟“ ہاباجی نے اپنے خدشے کو زبان دے دی۔

”درست کہہ رہی ہیں آپ، وجہ تو ہے اور میں وہ وجہ جانتی بھی ہوں۔“ میں نے کہا۔  
 ”اچھا کیا وجہ ہے؟“ انہوں نے تجسس سے پوچھا۔  
 ”سوئے اتفاق اس کی طلاق کی وجہ اور آپ کے اس رشتے کو ناپسندیدگی کی وجہ ایک ہی ہے یعنی غربت۔“ میں نے دکھ سے کہا۔ ”ہمارے ہاں المیہ تو یہ ہے کہ عورت ہی عورت کے لیے گڑھے کھودتی ہے، وہی اس کو قابلِ توجہ بناتی ہے اور وہی قابلِ توجہ.....“

”جذبائی باتیں کرنے کے بجائے آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ اپنے بھائی کی برات اس گھر میں لے کر جائیں گی، جہاں آپ ہمیں اپنے بھائی کی برات لے جانے کا کہہ رہی ہیں؟“ ہاباجی نے پوچھا۔  
 ”بے شک! کیوں نہیں، ہاباجی آپ کو غالباً نوید صاحب نے پوری بات بتائی نہیں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا ہے کہ وہ دوسرے نمبر والی ٹائی کے لیے علی بھائی کا رشتہ بھیجیں۔“ میں نے وضاحت کی۔  
 ”خود آپ نے زار کا رشتہ کیوں نہیں مانگ لیا؟ کیونکہ آپ کی والدہ کو کیا آپ کے بھائی کو وہ طلاق شدہ لڑکی پسند نہیں آتی؟“ انہوں نے طنز سے مجھ سے پوچھا۔

”سیدھی سی بات ہے ہاباجی! نوید صاحب بڑے ہیں عمر میں علی بھائی سے، صرف یہ سوچ کر میں نے یہ بات کہی تھی ورنہ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ میں مجبور تو کر ہی نہیں رہی نہ آپ کو نہ نوید صاحب کو۔“ میں نے ان کو وضاحت کی۔

”ہمارے بھائی کے لیے آپ کی بات کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو جانا چاہیے کہ انہوں نے خود ساتھ جانے کی ہامی بھری اور نہ ہی لڑکی کی تصویر دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کہتے ہیں جو آپ ان کے لیے مناسب سمجھ رہی ہیں، وہ ضرور مناسب ہوگا۔“ ہاباجی کے لہجے میں غالباً حد تھا۔

”یہ نوید صاحب کا بڑا پین ہے کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔ یقین کریں میں نے بھی خلوص نیت سے ان کے لیے وہی بہتر سمجھا جو میں اپنے بھائی کے لیے سمجھ رہی ہوں اور اگر آپ زیادہ ملیں جلیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ زار

بالکل ویسی ہی لڑکی ہے جیسی لڑکی کی نوید صاحب کو ضرورت ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔  
 ”خدا کرے کہ آپ کا اندازہ صحیح ہو مگر میرا تجربہ بھی بالکل غلط نہیں ہو سکتا۔ ایسی لڑکیاں جب پر پڑے نکالتی ہیں تو پھر ہم جیسے بناہ ماگتے رہ جاتے ہیں۔ ویسے آپ کو ان لڑکیوں سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟“ ہاباجی نے پوچھا۔  
 ”مجھے اچھی لگیں وہ بچیاں، ان کا سلیقہ اور شرافت اور اس گھرانے کی مشکلات کی وجہ سے سوچا کہ شاید مجھے اللہ نے ان کے لیے بہتری کا وسیلہ بنایا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”کون کون کیا تھا؟“

”میں سچی، فوزی، میری بہن اور ہماری بڑی چھوٹو۔“ انہوں نے بتایا۔  
 ”آپ نے زار کی والدہ سے اس سلسلے میں کوئی بات کی؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”میں ہم اچانک ہی گئے تھے۔ انہیں غالباً ہمارے یوں جانے سے شک تو پڑا ہوگا مگر چھوٹو کا کہنا تھا کہ کوئی بات نہ کی جائے۔ البتہ ہم چائے وغیرہ پی کر تھوڑی دیر بیٹھ کر آ گئے۔“ انہوں نے بتایا۔

”تو اس کا مطلب ہے آپ کو زار اپنہ نہیں آتی؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”بچیاں اچھی ہیں، والدہ بھی اچھی ہیں اور گھر بھی صاف ستھرا تھا، جس طرح ہم اچانک اٹھ کر چلے گئے تھے، بغیر بتائے۔ زار اخبار پڑھ رہی تھی، ٹائیٹل میں پر کوئی کام کر رہی تھی، شام چھن چکی تھی اور ان کی والدہ چائے بنا رہی تھیں۔“ انہوں نے سب کی حالت کا بتایا تو میری آنکھوں کے سامنے گھر کا نقشہ سا سج گیا۔

”مظہر علی سے ملاقات نہیں ہوئی آپ کی؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”وہ گھر پر نہیں تھا، البتہ ہماری چائے کے دوران وہ بھی آ گیا تھا۔“ انہوں نے بتایا۔ ”چھوٹو کو البتہ ایک بات اچھی لگی کہ ہمیں چائے دی گئی تو ویسی ہی چائے باہر ڈرا نیور کو بھی بھجوائی اور زار کی والدہ نے یہ بھی محضرت کی کہ ان کے گھر میں ڈرا نیور کو بٹھانے کی جگہ نہیں تھی۔“

”پلیس آپ کی چھوٹو کو کچھ تو پسند آنا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آپ پلیز میری طرف سے خود کو مجبور نہ سمجھیں اور نہ ہی نوید صاحب، خود ہی دیکھ بھال کر اور آپس میں مشورہ کر کے جو مناسب سمجھیں وہ فیصلہ کریں۔ ہو سکے تو استخارہ کر لیں۔ میری والدہ صاحبہ تو ہمیشہ ایسے مواقع پر استخارہ کرتی ہیں۔“  
 ”بہت شکریہ ہم ایسا ہی کریں گے۔“ ہاباجی نے کہا۔ ”ویسے ماہا کوئی گنجائش نہیں آپ کے دل میں ہمارے بھائی کے لیے؟ آپ ہماری عرضی پر غور تو کریں۔“

”پلیز ہاباجی! یہ باب بند ہو چکا ہے، اسے بند ہی رہنے دیں۔“ میں نے التجائی انداز میں کہا۔  
 ”نوں کال ختم ہوئی تو میں امی جان کے کمرے میں گئی، وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں پڑھ رہی تھیں۔ میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ اسی لیے اٹھ کر آئی تھیں کہ میں کھل کر فون پر بات کر لوں۔ جانے وہ کیا سوچیں یا کیا سمجھیں یہی سوچ کر میں ان کے پاس آئی اور انہیں ساری بات کھل کر بتا دی۔“ صفدر علی، مظہر علی سے لے کر جو میں نے نوید صاحب کو رشتہ تجویز کیا تھا اور اپنی والدہ صاحبہ کو بھی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ میں نے زار، ٹائی اور نٹا کے سلیقے کی بھی بہت تعریف کی۔ امی جان نے میری سوچ کو بہت سراہا اور دعا کی کہ اللہ ان بچیوں کے نصیب اچھے کرے۔

”اور امی جان!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”شاید بھی بہت پیاری بچی ہے، اسے ہم اپنے چھوٹو کے لیے لے لیں گے۔“ اور اس بات پر ہم دونوں خوب کھل کر ہنسے۔

☆☆☆

میں دفتر کے کام میں مصروف تھی کہ چراسی نے صدف باجی کے آنے کی اطلاع دی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ کبھی اس سے قبل وہ اس طرح دفتر میں نہیں آئی تھیں۔ میں نے انہیں اندر بلوا لیا، ان کے ہمراہ کوئی اور آدمی بھی تھا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور چوس منگوایا۔



ماہنامہ پاکیزہ 148 جنوری 2008ء

\_\_\_\_\_



سے کہا۔

”ایک ہی تو دن ہوتا ہے جتنے میں اس کی چھٹی کا۔ خیر ہے اگر دیر سے جاگتا ہے تو۔“ میں نے صفائی دہرائی میرے لیے تو مظہر بچہ ہی تھا اور میری اس کے ساتھ دوستی بھی تھی اور یوں بھی یہ کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی۔

”امید ہے کہ تم نے تیور کی عادتیں اس طرح بگاڑی ہوئی نہیں ہیں؟“ ماہ رخ نے مسکرا کر پوچھا۔

”اس کی عادتیں بگاڑنے اور سنوارنے کا تو مجھے موقع ہی نہیں ملا، میرے آنے کے بعد جلد ہی وہ اکیٹھی جا گیا تھا۔ اس کی عادتوں کے بگاڑ اور سنوار کے لیے تمہیں بھرپور موقع فراہم ہوں گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس کی اچھی بری عادتیں تو اب تک پختہ ہو چکی ہوں گی!“ ماہ رخ نے ہنس کر کہا۔

”خبردار جو تم نے میرے بھائی کی عادتوں کو برا کہا تو.....“ میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

کھانا بھی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا پھر ماہ رخ نے ہم سب کو تحائف دیے۔ مظہر کے لیے وہ ایک خوبصورت جیکٹ لائی تھی، میرے لیے ہینڈ بیگ اور امی جان کے لیے پرفیوم۔ ہم سب نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”تیور بھائی کے لیے کیا گفٹ لائی ہیں آپ؟“ مظہر نے مصیبت سے پوچھا تو وہ شرمائی۔

”تمہیں کیوں تجسس ہے تیور کے گفٹ کا؟“ وہ خود آئے گا تو اسے مل جائے گا۔“ میں نے مظہر سے کہا۔

”تم دونوں مت لڑو، میں کچھ بھی نہیں لائی۔“ ماہ رخ نے کہا۔

”کیوں بھائی! یقین آ گیا آپ کو کہ تیور بھائی کے لیے کوئی گفٹ نہیں آیا ہوگا؟“ مظہر نے سوال کیا۔

”نہیں چھوٹو مجھے یقین نہیں آیا!“ میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

”بھابی آپ نے مجھے پھر چھوٹو کہا۔“ مظہر نے ناراضی کی ایکٹنگ کی۔

☆☆☆

لچ بریک میں، میں بیٹھی اپنا کوئی کام کر رہی تھی کہ نوید صاحب نے ملنے کی اجازت مانگی اور چلے آئے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میڈم! میں نے ہمارا دورنویہ کو سمجھایا ہے اور وہ لگتا ہے کہ کچھ قائل ہو گئی ہیں، صرف چند ایک اعتراضات تھے۔“ نوید صاحب نے کہا۔

”چند ایک اعتراضات؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یقین کریں کہ ان میں سے کوئی بھی اعتراض میری طرف سے نہیں ہے، بس عورتوں کی باتیں ہوتی ہی کچھ ایسی ہیں۔“ وہ بات کرتے ہوئے ہنچکا رہا تھا۔

”آپ وضاحت کریں کہ کیا اعتراضات ہیں تو ہی میں سمجھ سکوں گی۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”اصل میں میری بہنوں کو اور اس سے زیادہ میری بڑی پھوپھی کو ان کے علاقے پر اعتراض ہے، اگر وہ کہیں اور گھر وغیرہ کرائے پر لے لیں یا خرید لیں تو.....“ وہ ادھوری بات کر کے خاموش ہو گئے۔

”میں سمجھتی تھی کہ آپ کی شادی کے معاملے میں زیادہ وقعت آپ کی بات کی ہوگی مگر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے گھر کے معاملات میں بڑی پھوپھی کے فیصلوں کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور جو بات وہ سوچتی ہیں اور جس طریقے سے سوچتی ہیں، ظاہر ہے کہ اسے ہم تبدیل نہیں کر سکتے۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”پھوپھی کی اہمیت ہمارے گھر میں واقعی زیادہ ہے کیونکہ والدین کے بعد انہوں نے ہمارے سر پر دست شفقت رکھا، میری ایک بہن کو اپنی بہو بنایا اور میری بہنوں کی شادیوں کے تمام معاملات انہوں نے ہی طے کیے.....“ نوید صاحب نے وضاحت کی۔

”سوری! آپ کو برا لگا، میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔ میرا مطلب تھا کہ پرانی اور نئی نسل کی سوچ میں فرق ہوتا



چاہیے ناں۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا۔

”میں نے اسی نظریے کے تحت انہیں قاتل کیا ہے، لیکن ان کا یہ اعتراض بے جا نہیں کہ وہ لوگ اگر کسی علاقے میں.....“ نوید صاحب کی بات میں نے کاٹ دی۔

”نوید صاحب آپ بھی جانتے ہیں کہ ان کے گھر میں ذریعہ آمدنی کیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا۔ میں پانچ دفعہ ان کے ہاں گئی ہوں مگر مجھے کبھی وہاں جا کر شرمندگی نہیں ہوئی۔“ میں نے ذرا خشکی سے کہا۔

”دوستی اور رشتے داری کے معاملات مختلف ہوتے ہیں، آپ دیکھ لیجئے گا کہ اگر آپ اپنی والدہ کو وہاں جا میں گی تو ممکن ہے کہ وہ بھی اسی بات پر اعتراض کریں۔“ انہوں نے شرمندگی سے کہا۔

”میں اپنی والدہ کو ابھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم آپ جیسے کہہ رہے ہیں میں ان سے موقع مناسب دیکھ کر بات کروں گی لیکن اس بات کا مجھے علم ہے کہ ان کے وسائل اس بات کے تحمل نہیں ہو سکیں گے۔“ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

اس سلسلے میں، میں ان کی مدد کر سکتا ہوں۔“ انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”میرا اندازہ ہے کہ وہ غید پوش اور خوددار لوگ ہیں، کسی تیسرے شخص سے اس طرح امداد کبھی قبول نہیں کریں گے۔“ میں نے وثوق سے کہا۔

”اگر ہم مستقبل میں اس مضبوط تعلق کی ڈور میں بندھنے والے ہیں تو میں ان کے لیے دوسرا یا تیسرا شخص نہیں رہوں گا۔“ انہوں نے دلیل دی۔

”یہ بات آپ اپنے مستقبل کی حیثیت میں زیادہ بہتر طرح سے کر سکیں گے، ابھی اس وقت یہ بات نہ چھیڑیں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے نہ آج ان کی رہائش پر اعتراض ہے نہ بعد میں ہوگا۔ سارا مسئلہ یہی ہے ہمارے ہاں کی عورتوں کا کہ منگی یا شادی پر عریزاد قارب باتیں کریں گے۔“ نوید صاحب نے کہا۔

”منگی یا شادی تو شادی ہال یا کسی ہوٹل وغیرہ میں بھی ہو سکتی ہے، تاہم میں پھر بھی دیکھتی ہوں کہ اس معاملے کو کس طرح ڈھلایا جاسکتا ہے۔“ میں نے گویا بات ختم کی۔

”یقین کریں کہ مجھے آپ سے یہ بات کرتے ہوئے بہت شرمندگی ہو رہی ہے کہ جانے آپ میری بابت کیا رائے قائم کریں گی حالانکہ مجھے نہ شادی سے قبل لڑکی دیکھنے سے دلچسپی ہے نہ اس کا گھر۔“ نوید صاحب نے کہا۔

”خود کو اس معاملے سے لافظ ثابت کر کے آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں اور میرے ضمیر پر بوجھ بڑھا رہے ہیں۔“ میں واقعی شرمندہ ہو رہی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ عمر میں مجھ سے ممکن ہے کہ بہت چھوٹی ہوں لیکن میں نے ہمیشہ آپ کی عزت اور احترام کیا ہے اور آپ کا یہ خیال اور سوچ بھی میرے لیے محترم ہے۔ اسے آپ میری لافظی نہ سمجھیں بلکہ یہ آپ پر میرے اعتماد کا اظہار ہے۔“ نوید صاحب یہ کہہ کر دفتر سے چلے گئے اور میں دیر تک جانے کس سمت کی کیفیت میں رہی۔ ایسا نہ ہو کہ زارا کے بارے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہو اور نوید صاحب کی زندگی میرا کہنا مان کر اجڑن ہو جائے۔

☞☞☞

بہادر پور کچھ ایسا دور تھا کہ تیور مینے میں ایک بار بھی نہ آ سکا مگر جب سے اس نے یونٹ میں رپورٹ کی تھی تب سے یونٹ آگے بارڈر پر متعین تھی۔ حالات کافی خراب تھے اس لیے اسے چھٹی نہیں مل پاتی تھی۔ جی جی اس فون آتا تو بھی اتنی ہلکی اور کمزور آواز ہوتی تھی کہ آدھے الفاظ کی سمجھ آتی تھی اور آدھے ہم اندازے سے ہی سمجھتے تھے

اور یہی کیفیت غالباً تیور کی تھی۔ دو تین دفعہ ماہ رخ نے مجھے کال کر کے پوچھا تھا کہ کیا تیور کو اس کے آنے کی خبر نہ ہوئی تھی۔ میں نے خود تیور کو ماہ رخ کی آمد کا بتایا تھا مگر یہ سوچ کر کہ اس کے کال نہ کرنے کو یہ کیا سمجھے، میں نے خود ہی تیور کا دفاع کیا۔

”اصل میں جب سے تم آئی ہو ہمیں بھی اس کی کوئی کال نہیں آئی..... اور یوں بھی جہاں پردہ ہے وہاں پر ہماری طرف سے بھی رابطہ بہت مشکل ہوتا ہے۔“ میں نے وضاحت کر کے فون بند کیا ہی تھا کہ امی جان نے فون پر کہا۔

”مجھے اس لڑکی کی آواز خیالی کوئی زیادہ پسند نہیں ہے اور مفتی کا رشتہ کیا ہوتا ہے کہ یہ تیور سے بات کرنے کو تڑپ رہی ہے۔ ایسی کون سی باتیں ہیں جو اسے تیور سے کرنا ہیں۔“

”کوئی بات نہیں امی جان! آج کل کے زمانے میں یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”تمہاری بھی مفتی ہوئی تھی، میرا خیال ہے کہ شادی سے پہلے بھی باتیں نہیں ہوئی ہوگی۔“ انہوں نے خشکی سے کہا۔

”وہ زمانہ اور تھا امی اور یہ زمانہ اور ہے۔“

”کوئی ایسی پرانی بات بھی نہیں ہے، نہ ہی تم لوگ ایسے بوڑھے تھے۔“ وہ بدستور برہم تھیں۔

”امی جان ہمارے حالات اور تھے اور پھر آپ کو میں نے بتایا تھا کہ تیور اور ماہ رخ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور مفتی سے پہلے بھی وہ ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔“ میں نے انہیں رسان سے سمجھایا۔

”مجھے تو ایسی لڑکیاں بہت خط ناک لگی ہیں جو گھر والوں سے بالائی بالائی لڑکوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہیں اور یہ لڑکی تو مجھے ہمیشہ سے ہی پسند تھی۔ میں تو اس کے حق میں نہ تھی۔ مناسب وقت پر لڑکیوں کی شادیاں ہو جائیں تو وہ مسرال کے ماحول میں رچ بس جاتی ہیں جب کہ ایسی لڑکیاں! امی جان نے ماہ رخ کی ٹیپ چڑھا رکھی تھی۔ میں انہیں غصہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”جتنے کا دن تھا، منظر دفتر گیا ہوا تھا، اب ایک ہفتے کے روز میں اس کے ساتھ جاتی تھی اور اس سے اگلے ہفتے کو میں اسے اکیلے دفتر بھیجتی تھی۔ اگرچہ وہ دن میں ہر بات کے لیے مجھے پچاسوں یا نوں کرتا تھا۔ ہم دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ منظر کی کال آگئی اور میں اس سے بات کرنے میں مصروف ہو گئی۔

اطلاعی کھنی کی آواز آئی، ملازمہ چھٹی پر تھی اس لیے امی جان اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئیں۔ میں فون پر بات کر رہی تھی کہ آنے والے تیور کو دیکھ کر حیرت سے میری چیخ نکلی گئی اور فون بند ہو گیا۔ جلی ہوئی رنگت، گالوں اور ٹھوڑی کی نمایاں ہڈیاں..... کتنا کمزور لگ رہا تھا وہ۔ امی جان بار بار اس کا منہ، سر چوم رہی تھیں۔ اب کے تو وہ تقریباً ساڑھے تین ماہ کے بعد آیا تھا۔ میں نے اسے تازہ جوس بنا کر دیا۔ منظر کا دوبارہ فون آیا، میں نے ہی اٹینڈ کیا، وہ بہت پریشان تھا کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے تیور کی آمد کا بتایا تو وہ بھی خوشی سے تقریباً چیخ اٹھا۔ فون بند ہوا تو مجھے اندازہ تھا کہ وہ انشا اللہ اگلے آدھے گھنٹے میں گھر ہوگا۔

”تم اٹھ کر فریش اپ ہو جاؤ، منظر بھی آنے والا ہوگا، میں کھانا بنالوں۔“ میں نے ہدایات جاری کیں۔

”بھائی! میں گھر آیا ہوں، پلےز مجھے ایسے ہی رہنے دیں۔ فریش اپ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ منظر کون سا کوئی لڑکی ہے؟“ اس نے سستی سے کہا۔

”اوہ ہاں یاد آتا ہے۔ ماہ رخ کو کال نہیں کی؟“ میں نے سوال کیا۔ اچانک نظر اٹھی تو مجھے امی جان کے چہرے پر ہلکی سی آنکھیں نظر آئیں۔

”اچھا! پس آگئی ہے وہ؟“ تیور نے لہجے کو سرسری رکھنے کی ایکٹنگ کی۔

”بیٹا! تو تھا تمہیں میں نے فون پر.....“ میں نے حیرت سے پوچھا۔



”اس فون پر تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا، نہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بول رہی ہیں نہ امی جان کی اور نہ آوازوں میں فرق لگتا ہے۔“

”اب ایسی بھی نہیں ہونے کی۔“ اس کی بات پر میری ہنسی نکل گئی۔

”کتنی چھٹی آئے ہو میرے بیٹے؟“ امی جان نے کہا۔

آئندہ اتوار کو واپسی ہے۔“ مختصر اس نے کہا۔

”کیا حالت ہوگئی ہے تمہاری؟ کب تک یونٹ باہر رہے گا؟“ امی جان پریشان تھیں اور اس کے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

ماں بھی کیا رشتہ ہے  
عمر بھر اس کی اولاد اس کے وجود کا  
وہی ایک شہدہ بکلا ہی رہتی ہے  
اپنے وجود کو قسیم کر کے  
جن اولادوں کو ختم دیتی ہے  
وہ دنیا میں بکھر جاتی ہے، اپنے مقاصد کی تلاش میں  
اور ماں بن جاتی ہے  
ایک ناممل وجود

JIGSAW پزل کی طرح  
جس کے کچھ ٹکڑے ملے جھدے ہو گئے ہیں اس سے  
انہی کی تلاش میں وہ عمر بھر  
سرگرداں رہتی ہے  
یہ ٹکڑے اسے مل کر بھی نہیں پاتے  
کہ یہ ٹکڑے دوبارہ اس کے وجود سے  
کبھی منسلک نہیں ہو پاتے

ماں!

کہ لپٹا دھاؤں کا دامن  
اور آچل کی چھایا  
اپنے وجود کے ٹکڑوں پر تان کر  
زندگی بھر پاپہ سفر رہتی ہے  
تیور کیا کھاؤ گے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کر لے گوشت اگر یک سکیں تو؟“ اس نے فرمائش کی۔  
”ان کا تو موسم ہی ختم ہو گیا ہے۔“ امی جان نے کہا۔  
”تو پھر کچھ بھی بنالیں، آپ جو بھی بنائیں گی اچھا ہی ہوگا۔“ تیور نے کہا۔

منظر آیا تو دونوں بھائی بڑے جوش و خروش سے ملے، کتنے عرصے کے بعد دونوں ملے تھے۔ میں نے منظر کو دیکھا  
میں بلایا اور اسے دوڑایا کہ کہیں سے بھی کر لے ڈھونڈ کر لائے۔ خود میں نے اتنی دیر میں فریزر سے شامی کباب نکال  
دیے۔ مرغی بھی نکال دیکھ کر اگر کر لے نہ لے تو مرغی جلدی سے بن جائے گی۔ بخنی دیر میں، میں نے سلا دینا دیا۔

موندھا اور چنتی تیار کی مظہر کر لیے لے کر آ گیا۔

”بس بھائی! بھٹک اٹھے ہی ملے ہیں، دس دکانوں کی خاک چھان کر۔“ اس کی شکل سے ہی اس کی کوشش کا  
اندازہ ہو رہا تھا۔ کر لیے تھے بھی اٹھنے خاص نہیں تاہم میں نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔  
”بہت اچھے ہیں، اور مجھے پتا تھا کہ تم جہاں سے بھی ہو سکا ڈھونڈ کر لاؤ گے۔“ میں نے اسے تھپکی دی۔ رات  
کھانے کی میری تیوری خوشی کر لیے گوشت دیکھ کر دینے لگی تھی۔ اس نے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔  
”آج کے کر لیے گوشت کا سارا کر لےٹ تو مظہر کو جاتا ہے، کیونکہ اگر وہ کر لیے نہ لاتا تو تمہاری فرمائش پوری  
ہونا نامکن نہ ہوتا۔“ میں نے پھر مظہر کی تعریف کی۔  
”امی مجھے تھوڑی دیر تک علی بھائی لینے آ رہے ہیں۔“ میں نے میز پر بیٹھے ہی انکشاف کیا۔

”کیوں بیٹا، خیریت تو ہے؟“ امی جان تشویش سے بولیں۔  
”بالکل خیریت ہے، اصل میں، میں آپ کو بتانے ہی والی تھی کہ تیور آ گیا اور بات ذہن سے نکل گئی۔ اصل  
میں کل مجھے والدہ کے ساتھ علی بھائی کے لیے رشتہ دیکھنے جانا تھا جو آپ کو بتایا تھا۔“ میں نے وضاحت کی۔  
”یاد ہے بیٹا، ٹھیک ہے چلی جانا پرکب واپسی ہوگی؟“ امی جان نے پوچھا۔  
”پہلے تو رکنے کا ارادہ تھا مگر اب تیور آیا ہے تو کل شام کو ہی آ جاؤں گی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور ہاں تیور  
تم کل ماہ رخ کی طرف سے ہوا نا۔“

”تم واپس آؤ گی تو اکٹھے ہی جا کر ہوا نا..... ابھی تو بچہ تھکا ہوا آیا ہے، آرام کرے گا۔“ امی جان فوراً بولیں۔  
”جی بھائی! آپ کل آئیں گی تو کل شام کو ہی چلے جائیں گے یا پرسوں۔“ تیور نے سرسری انداز میں کہا۔  
اسے معلوم تھا کہ رشتہ طے بھی ہو گیا تھا مگر امی جان کو ماہ رخ کے انداز پسند نہ تھے۔ اسی لیے تیور بھی ان کے سامنے ماہ  
رخ سے کیے دے رہا تھا۔

☆☆☆

جونہی میں نے گاڑی نالے کے کنارے بنی ہوئی پلپٹا سے گزار کر گلی میں بائیں جانب نالے کے کنارے کھڑی  
کی اور والدہ کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا تو وہ حیرت سے بولیں۔  
”کیا ہوا؟ گاڑی خراب ہوگئی ہے کیا؟“  
”والدہ باہر نکلیں، ہماری منزل مقصود آگئی ہے۔“ میں نے دروازہ کھولا۔  
”دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ مجھے تو یہاں دور دور تک کوئی گھر نظر نہیں آ رہا ایسا جو ہماری منزل مقصود ہو۔“ انہوں  
نے سر جھکا کر چاروں طرف دیکھا۔

”آپ سب طرف نہ دیکھیں، ادھر باہر نکلیں اور میرے ساتھ آئیں۔“ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گاڑی  
سے باہر نکالا۔ باہر نکلتے ہی ان کا پاؤں نیچے پھڑ میں جا پڑا جو وہ اچانک دیکھ نہ سکیں اور ان کی سفید صاف ستھری شلوار  
پنچر کے سیاہ دھبوں سے داغدار ہوگئی۔ والدہ کو تو کپڑوں اور جوتوں کی صفائی کا خطبہ تھا۔ شلوار پر پڑے ہوئے نشانات  
ان کے لیے ناقابل برداشت تھے۔

”ماہا! ایک منٹ، یہ سامنے والے کوارٹر سے ذرا تھوڑا مانی لے کر میں اپنے جوتے اور شلوار کو صاف نہ کر لوں،  
اس طرح سے تو مجھے جانا ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ انہوں نے اسی گھر کی طرف اشارہ کیا جس میں دراصل ہمیں جانا بھی  
تھا۔

میں نے زارا کو مظہر علی کے ہاتھ لکھ کر پیغام بھجوایا تھا کہ میں اتوار کے روز اپنی والدہ کے ہمراہ ان کے گھر آؤں  
گی۔ اس لیے انہیں ہمارے آنے کی خبر تھی۔ البتہ مجھے یہ صورت حال خاصی دلچسپ لگی کہ والدہ جس گھر میں یہ سمجھ کر جا



رہی تھیں کہ جو تے اور شلوار کے پانچ صاف کر لیں وہی دراصل منزل تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹا کر منظر علی کی والدہ نے دروازہ کھولا۔

”السلام علیکم آئی!“ میں آگے بڑھ کر ان سے ملی اور گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ میں تو اس گھر میں پہلے دفعہ آ چکی تھی، البتہ والدہ کو میرے انداز سے علم ہو گیا تھا کہ میں ٹھیک اسی گھر میں آئی تھی جہاں میں نے انہیں دیکھا تھا، ان کے چہرے پر مجھے تعجب اور تفاخر کا رنگ نظر آیا تھا۔

زارانے آ کر سلام کیا اور ایک ہوائی چٹل لا کر والدہ کے سامنے رکھی کہ اسے پہن کر پاؤں اور شلوار کے دھولیں۔ والدہ نے اس چٹل کو دیکھ کر انکار کر دیا۔ میں حیرت سے زیادہ شرمندگی سے سر جھکا کر رہ گئی۔

”میں غسل خانے میں جا کر ہی پاؤں بھی دھولیتی ہوں، چٹل بھی اور پانچے بھی۔“

”میں یہیں پانی لا دیتی ہوں۔“ ہم برآمدے میں بیٹھ گئی تھیں۔ زارا لوتے میں نیم گرم پانی لائی اور اس سے پاؤں دھو کر والدہ کے پاؤں پاؤں پاؤں جوتے دھواتی میں نے اس سے لوتے لیا، حالانکہ وہ یہ سب کیا چلو سی سے نہیں کر رہی تھی مگر مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے والدہ کے پاؤں صحن کی طرف کر کے دھلائے، اپنے پرس سے ٹشو پیپر لے کر انہیں پاؤں صاف کیے۔ میں نے اپنے جوتے انہیں پہننے کو دیے اور خود زارا کی لائی ہوئی چٹل پہن لی اور والدہ کے جوتے اٹھا کر صحن میں لگے لے کر جا کر ٹشو پاؤں بہا کر دھوئے۔ اگرچہ جوتے ایسے تھے کہ دھوئے جاتے مگر جوتے ہی طرح جوتے خراب ہوئے تھے انہیں دھونا لازمی تھا۔

گھر میں منظر علی اور ثناء موجود نہیں تھے۔ زارا نے بتایا کہ کسی کام سے گئے ہیں۔ یقیناً ہماری تواضع کے لیے کچھ لینے گئے ہوں گے مجھے بہت شرمندگی ہوئی تھی۔ میں جب بھی اکیلی آئی تھی انہیں اس طرح کے تر تو دے منع کر دیتی تھی۔ اصل میں چپ سے مجھے ثانے کے سلائی کرنے کا علم ہوا تھا، میں اپنے اور امی جان کے کپڑے سلائی کے لیے آئی تھی دے کر جاتی تھی۔ ہم دونوں ہی کو اس کے سلسلے ہوئے کپڑے پسند آ جاتے تھے۔ کیونکہ ہم سادہ سالیاں پہنتے تھے، یہ اور بات ہے کہ ثانے کے ہاتھ میں اب صفائی آتی جا رہی تھی۔ منظر علی اور ثناء بھی جلد ہی آ گئے۔ گھر کی بی بی بوٹی نے چائے، چائے، باز اراک پینز اور سادہ کیک..... لیکن والدہ نے کچھ نہیں کھایا۔ بلڈ پریشر کا بہانہ کر کے ٹھوڑی سے پنے کی چائے ڈالی اور وہ بھی نہیں کھائی۔ مجھے تو ان کے رویے کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ میری والدہ سادہ عورت ہیں اور ان کی نظر میں لڑکیوں کے سلیقے اور شرافت کی بہت اہمیت ہے۔ بھی ایسی بات انہوں نے نہیں کی کہ انہیں علی بھائی کو کسی امیر گھرانے میں بیاہنا ہے لیکن اس وقت ان کا ناقابل فہم رویہ مجھ پر سوچوں کے بہت سے دروازے کھٹکھٹا۔

ہم سب ہمیں اچھے بڑے گھرانوں میں بیابھی گئی تھیں پھر بھلا وہ بنے کو کسی غریب گھرانے میں کیوں کر جایا کرتی تھیں جب کہ اس میں کوئی ذہنی وجہ تھی، قصہ تھا، نہ اس کے لیے رشتوں کی کمی۔ اور مجھے خود بھی علم تھا کہ بہت سے گھرانوں سے لڑکیوں والوں کی طرف سے اس طرح پیش رفت ہوئی تھی۔ لوگ اپنی خوبصورت بڑھی کسی بیٹیوں ان سے بیاہنے کے خواہش مند تھے۔ ایسے میں بھلا اگر ایسی جگہ رشتہ کیا جاتا تو لوگ ہم سے پوچھتے کہ کیا یہ وہ گھر تھا جس کی خاطر آپ نے ہماری بیٹی کو یا ہمارے گھر انے کو مسترد کیا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے اپنا وجود خالی لگنے لگا اور میں اس ماحول سے کٹ کر فضا میں محسوس ہو گئی۔ کسی بے وقوفی کی محسوس میں نے۔ واقعی نوید صاحب کی پچھو بھی ٹھیک سوچ رہی تھیں اور والدہ بھی حق بجانب تھیں۔ نوید صاحب ٹھیک کہتے تھے کہ دوستی اور رشتے داری کے لیے معیار کے بنانے مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے جانے کب خود کو اتنا غلط سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ خود کو ان لڑکیوں کا نجات دہندہ سمجھ کر خود سے نوید صاحب اور علی بھائی کی قسمتوں کے فیصلے کرنا شروع کر دیے تھے۔ میں شرمندگی کی انتہا تک پہنچ گئی تھی کہ میں نے آئی سے ایک دفعہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ مجھے ثانے اور زارا بہت اچھی لگتی ہیں۔

بہنوں کی ماں تھیں ضرور والدہ کی آمد کا مقصد بھی سمجھ گئی ہوں گی۔

چلتی ویر میں چائے پی گئی والدہ مارے باندھے بیٹھی رہیں اور اٹھتے ہوئے پرس کھول کر اس میں سے پانچ سوکا ٹوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ میں ان کے اس طرز عمل پر بہت شرمندہ ہوئی اور نوٹ اٹھا کر شا کی طرف بڑھایا۔

شا، اصل میں ہم خالی ہاتھ آئے ہیں، والدہ ہمیں دے رہی ہیں رکھ لو۔“ آئی نے شا کے ہاتھ میں سے نوٹ ایک لیا۔ پہلے ہی اس نے ہٹل تھا تھا اور نوٹ انہوں نے زبردستی میرے بیگ میں ٹھونس دیا۔ میں نے ناراضی کا اظہار کیا مگر انہوں نے ایک نہ مانی۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے سب سے ملنا حسب عادت ضروری سمجھا جب کہ والدہ خدا حافظ لہے گھر سے باہر نکل کر کھڑی تھیں۔

”چلتی ہوں آئی پھر آؤں گی۔“ میں نے ان سے اجازت چاہی۔

”جب تمہارا جی چاہے بیٹا، تمہارا اپنا گھر ہے۔“ انہوں نے خلوص سے کہا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے منہ پھلا لیا، والدہ نے میرے رویے کو محسوس کیا لیکن خاموش رہیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بات چیتیں تو میں ان سے ان کے اس ناروا رویے کی وجہ پوچھوں لیکن وہ بھی میری والدہ تھیں اور اصرار کیا باتیں کر رہی ہیں۔ گھر پہنچ کر میں نے ان سے واپسی کی اجازت چاہی۔

”ارے! تم نے تو کہا تھا کہ چند دن روکو گی؟“ والدہ نے حیرت سے کہا۔

”چلتی ہوں والدہ! تیمور بھی آیا ہوا ہے اور ملازم بھی پچھٹی پر ہے اور کل مجھے دفتر بھی جانا ہے۔“ میں نے اپنی مصروفیات کی وضاحت کی۔

”تو تم اس گھر کی ملازمہ تو نہیں ہو بیٹا۔“ والدہ غصے میں آ گئیں۔

”والدہ ناراض کیوں ہوتی ہیں؟ میں پھر آ جاؤں گی۔“ میں نے انہیں کندھوں سے تھاما۔

”مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا تھیں۔“ انہوں نے ہتھار ڈالے۔

”مجھے بھی آپ سے بہت ساری ضروری باتیں کرنا تھیں لیکن پھر آ جاؤں گی۔ تیمور آئندہ اتوار کو واپس چلا جائے گا تو پھر ایک پورا ہفتہ آپ کے پاس رہنے کے لیے آؤں گی۔“ میں نے ان کے ہاتھ تھام کر وعدہ کیا۔

”بس سب کے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے۔“ یہیں اندازہ نہیں کہ میں کتنے دنوں سے انتظار کر رہی تھی کہ تم آؤ گی اور رہو گی۔“ والدہ ملول ہو رہی تھیں۔

”والدہ! حقیقت بتا رہی ہوں کہ تیمور اچانک آیا ہے، پہلے سے اطلاع ہوتی تو میں نوں کر کے آپ کو مطلع کر دیتی۔ بس اب آپ بہو لے آئیں تاکہ آپ کی تنہائی بھی دور ہو۔“ میں نے لاڈ سے کہا۔

”ہاں جیسے ساری بہوئیں ساسوں کی تنہائی دور کرنے کے لیے ہی تو آتی ہیں۔“ طنز سے انہوں نے کہا۔

”مگر میں بہو آتی ہے تو رونق آ جاتی ہے، سب کی تنہائی اور اکیلا پن ختم ہو جاتا ہے۔ بہو اور بیٹے کے تعلق، ماس بہو کے جھگڑے، سر بہو کے لاڈ، بچوں کی چپکاریں..... کتنا کچھ ہو گا ناں“ میں نے ایسا خوبصورت نقشہ کھینچا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔

”آپ کو ثانے پسند نہیں آئی ناں؟“ میں نے اچانک سوال کیا۔

”یہ میں نے کب کہا؟“ حیرت سے وہ بولیں۔

”کچھ باتیں کہے بنا سمجھ لی جاتی ہیں والدہ!“ میں نے کہا۔

”بڑی غلط فہمی ہو تم۔“ وہ مسکرائیں۔

”آج آپ نے یقین دلادیا ہے کہ دنیا میں مجھ سے بڑھ کر بے وقوف کوئی نہیں ہے۔ میں تو آپ کو دنیا بھر کی عورتوں سے مختلف سمجھتی تھی والدہ لیکن آپ نے جو رویہ وہاں روا رکھا، اس نے مجھے میری نظر میں بہت گرا دیا۔ کسی



انسان کے پاس صرف عزت نفس کی دولت ہوتی ہے اور آپ نے ان کے اس مان کو بھی مٹی میں ملا دیا۔“ میں نے  
بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا، کیا ہے میں نے جو تم اتنی جذباتی ہو رہی ہو؟“ وہ بولیں۔ ”میں تو اپنا پاؤں کچھڑ میں جا پڑنے پر تھملا ہوا  
کاٹکار ہو گئی تھی۔“

”پاؤں تو آپ کا دھل بھی گیا تھا مگر آپ کے ماتھے کی تورییاں پھر بھی قائم رہیں آپ نے انہیں مسٹر کر کے  
بعد میں گھرا کر پیغام بھیج دیتیں، کم از کم وہاں اس طرح۔“ جانے کیا ہوا کہ میں چمکوں پہنکوں رو نے گی۔  
”تم خود ہی اندازے لگا رہی ہو میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے ان کی تحقیر ہوئی ہو، میں تو تمام وقت  
خاموش ہی بیٹھی رہی۔“ والدہ بولیں۔

”اس سے بڑھ کر ان کی اور تحقیر کیا ہوگی؟“ اور اس سے پہلے کہ ابو یا علی بھائی میں سے کوئی باہر آ کر جاری ہو  
گفت و شنید سنتا میں انہیں خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔



گھر کی طرف واپسی کا سفر مانو کتنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ واپسی پر سارا راستہ عجیب و غریب خیالات نے ذہن  
پر قبضہ جمائے رکھا تھا۔ پوری کوشش کر رہی تھی کہ کسی خیال کو ذہن پر حاوی نہ ہونے دوں۔ کیونکہ گاڑی چلاتے ہوئے  
خیالات کی رو بھٹک جانے کا نتیجہ میں ایک بار پہلے بہت اچھے طریقے سے بھگت چکی تھی۔ ابھی تک میری ٹانگ میں  
چلتے ہوئے درد ہوتا تھا اور جڑوں پر ٹانگوں کے نشانات اگر کافی حد تک مندل ہو چکے تھے مگر جلد پر ہلکا سا کھینچاؤ مجھے  
اچھی تک محسوس ہوتا تھا۔ ابھی تک میں ان داغوں کو مندل کرنے والی کریمیں اور لوشن استعمال کر رہی تھی۔

کبھی یہ خیال آ رہا تھا کہ مجھے والدہ سے اتنی گستاخی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن یہ سب کچھ غیر ارادی طور  
پر ہوا تھا۔ مجھے بھلا اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت تھی یہ تو سب مقدر کی باتیں ہیں اور بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ  
لڑکیاں بالیاں بیری کے درخت ہوتی ہیں۔، پیر پکنے پر پتھر آنا کوئی ایسا بعید از قیاس نہیں اور پھر ہمارے ہاں تو عام  
گھرانوں میں یہی سلسلہ ہوتا ہے، لڑکیوں کے رشتے دیکھنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک بڑھیا طریقہ رائج ہے،  
لڑکیوں کی شناختی پریڈ ہوتی ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے آنے والی خواتین گھروں سے نکلتی تو اپنے بھائی یا بیٹے کے  
لیے شریک حیات کے انتخاب کے لیے ہیں لیکن ان کی نظریں بیک وقت جوہری اور قصاب کی نظریں ہوتی ہیں اور  
لڑکیوں کو یوں دیکھا جاتا ہے جیسے قربانی کے لیے بکرے کو۔ بڑی بہنوں کی نسبت کیسے طے ہوئیں مجھے ابتدائی مراحل  
کا علم نہیں تاہم مجھے ان مراحل سے بالکل بھی نہیں گزرنا پڑا کیونکہ بزرگوں ہی کے مابین بات طے پائی اور کسی تقریب  
میں غالب نے مجھے دیکھ بھی لیا جب کہ میں نے غالب کو فکٹنی کے وقت پہلی دفعہ دیکھا تھا، اس سے قبل صرف تصویر ہی  
دیکھی تھی۔

شاید معاشرے کے مختلف طبقوں میں لڑکیوں کے رشتوں کے مراحل مختلف طریقوں سے طے ہوتے ہیں۔  
والدین کا صاحب حیثیت اور خوشحال ہونا شاید اسی لیے لڑکیوں کے حق میں بہتر ہوتا ہے کہ یہ خوبیاں بہت سی ایسی  
خامیوں پر پردہ تان لیتی ہیں جو ایک غریب گھر کی بیٹی کے لیے جرم قرار پاتی ہیں۔ اللہ سب بچیوں کی نعمتیں اچھی  
کرے۔ مجھے اپنی قسمت پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ بی اے کے امتحانات سے فارغ ہوتے ہی جٹ مفتی اور پٹ جٹ  
والا معاملہ ہوا پھر غالب کا ساتھ چھوٹا تو ایک کے بعد دوسرا رشتہ کچھ عرصے کے بعد آ رہا تھا اور اگر میں کسی غریب گھر  
میں پیدا ہوئی ہوتی تو..... ثانیہ جو قدر بیا میری ہم عمر تھی اور زارا مجھ سے بڑی..... کیا میں بھی ان کی طرح رشتوں کی  
آس میں بیٹھی ہوتی۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آیا۔ واقعی میرے رب نے مجھے کتنی نعمتیں عطا کر رکھی تھیں اور میں ان  
نعمتوں کو بھٹلا رہی تھی؟



”کیا میں اپنے رب کی نعمتوں کو جھٹلا رہی ہوں؟“ خود سے میں نے سوال کیا۔ مجھے کوئی حق نہیں کفرانِ نعمت کرنے کا۔ جانے کہاں سے بھولا بھٹکا خیال میرے ذہن میں نویدِ صاحب کا آیا اور میں نے سوچا کہ اگر نویدِ صاحب کا اور زارا کا رشتہ نہ ہو سکا تو دل مانے یا نہ مانے میں نویدِ صاحب کے لیے ہاں کر دوں گی۔ میں بھلا کیوں اتنی بے یقیناں کرتی رہی ہوں۔ نویدِ صاحب کو اس لیے مستزاد کرویا کہ لوگ کیا کہیں گے، تیمور کو اس لیے کہ وہ میرے بھائیوں کیسے اور اب ایک نیا کردار ڈاکٹرِ عظیم کا سامنے آ رہا تھا۔

مگر بچی تو سب لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر گپ شپ ہوئی۔ تیمور نے بتایا کہ وہ دن بھر کابلی سے بستہ براور پھرٹی وی روم میں صوفے پر پڑا رہا ہے۔ میری دن کی روداد پوچھی گئی تو میں نے مختصر اُبتایا کہ سب ٹھیک رہا۔ باقی فیصلہ بعد میں ہوگا۔ تیمور تفصیل جانے کو نے چین تھا اور میں نے نماز پڑھ کر سونے کا عذر پیش کر کے معذرت کر لی۔ کمرے میں آ کر نماز پڑھی اور سونے کے لیے لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن کے پردوں پر ایک ایک کر کے ماضی کے منظر آنے لگے اور ان مناظر میں یادیں غالب کی۔

جو خود تو سکوں میں ہے مجھے بے سکوں کر کے

مجھے بسا طرِ زیست ہے

اک پنا ہوا میرہ بنا کے

جس کے دم سے قائم تھی بہارِ زندگی

وہ نہیں تو ختم کیا ہے

وجودِ یہ موسمِ خزاں

بہار آتی ہے اور دیتی ہے دستکیں

مگر میری مجلسیں ہیں ویراں

اور منتقل ہیں دروازے شہرِ دل کے

منتظر ہے میرے بدن کی ریاست

کوئی تو دے دستک درِ دل پہ

یہ نہیں کہ اب غالب کی یادیں آتی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے دل کے بند دروازے اب کسی دستک پروا کرنا ہی ہوں گے۔ زندگی یوں بھی پتانا مشکل ہو رہی ہے اور پھر گزرتا ہوا وقت آنے والے وقت کی تبدیلیوں کے آغاز کو ظاہر کر رہا تھا۔ نیند کسی محبوب کی طرح روٹھی ہوئی تھی، اسے کافی دیر تک کروٹیں بدل بدل کر مرنے کی کوشش کی۔ مجبوراً اٹھ کر نیند کی ایک گولی لی اور تھوڑی دیر میں ہی نیند کی مہربان آغوش میں جا گئی۔



جانے کیا وقت تھا اور کیا پہر تھا انتہائی گہری نیند سے اچانک بیدار ہوئی تو دل کی دھڑکنیں اٹھل پھل ہو رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ میری نیند ڈسٹرب ہوئی تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں تو نیند کی گولی لے کر سوئی تھی پھر دستک کی آواز آئی، میں نے وہیں لیٹے لیٹے کان لگائے۔ دستک دروازے پر نہ تھی لیکن پھر بھی کافی واضح تھی۔ غور کیا تو سمجھ کر سے کی کھڑکی کے شیشے پر دستک ہو رہی تھی۔ کھڑکی میرے بیڈ کے بہت قریب تھی، پھر مجھے تیمور کی آواز بھی ملنی دی۔ میں نے پردہ ہٹایا تو تیمور کھڑکی کے باہر کھڑا تھا۔ رات ان دنوں ملکی سی تنگی ہو جاتی تھی اور وہ عام سے چھوٹا رقص میں باہر کھڑا ٹھہر رہا تھا۔ لیکن یہ اس وقت باہر کیوں کھڑا ہے؟ میں نے کھڑکی پر وقت دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے۔



”کھڑکی کھولیں۔“ اس نے باہر سے آواز دی جو کہ بندیشوں کی وجہ سے مجھے بہت ہلکی آئی۔ میں نے زور سے کھڑکی کھولی اور اس سے کہا کہ وہ اندر آئے۔ مجھے مناسب نہ لگا کہ میں یہاں سے اس سے گفتگو کروں۔ اس نے اڑوس پڑوس والا دیکھے تو جانے کیا سمجھے اوہ بار بار کھڑکی کھولنے پر اصرار کر رہا تھا میں نے اسے اشارہ کیا کہ سیدھے راستے سے اندر آ کر بات کرے۔ اپنا بستر اٹھ کر ٹھیک کیا اور بال سمیٹ کر دوپٹا اوڑھ کر میں نے کمر دروازہ کھولا تو وہ باہر کھڑا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تیمور! اس وقت کیوں آدھی رات کو باہر کھڑے بیٹھے تھے۔“ میں نے قہر سے غصے سے ”موری بھائی! میں کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہا مگر آپ دروازہ نہیں کھول رہی تھیں، مجبوراً مجھے کھڑکی کے راستے دستک دینا پڑی۔“ اس نے معذرتی انداز میں کہا۔

”ایسی کیا ایرجی پڑ گئی تھی؟“ میں نے اسی غصے سے لہجے میں کہا۔ جواب میں وہ خاموش رہا، اس کی خاموشی سے مجھے وحشت ہونے لگی اور ساتھ ہی یکدم دل میں عجیب سا خیال یہ آیا کہ اگر امی جان یا مظہر میں سے کوئی جاگ جائے اور تیمور کو رات کے اس پہر میرے کمرے میں دیکھ لے تو..... اس خیال نے اتنی شدت سے میرے ذہن پر قبضہ کر لیا کہ میں نے اٹھ کر فوراً دروازہ کھول دیا اور جانے میرے ذہن سے ٹپکی پٹیچی کی کیسی لہریں نکلیں کہ تیمور خاموشی سے باہر نکل گیا اور ٹی وی روم میں جا کھڑا ہوا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔

”اب کھڑکی کھولو؟“ میں نے سوال کیا۔

”بھابی اعلیٰ بھائی کا فون آیا تھا..... اتنی کی طبیعت۔“ اس کا جملہ نامکمل ہی تھا کہ میں چیخ پڑی۔

”کیا ہوا والدہ کو؟“

”بھابی! انہیں ہلکا سا ہارٹ ایک ہوا ہے، اسپتال لے گئے ہیں اور میں پچھلے ایک گھنٹے سے آپ کو جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ امی جان بھی نیند کی دوا لے کر سوئی ہوئی ہیں اور نہ آپ کے کمرے سے کوئی جواب آ رہا تھا، نہ مظہر کے پھر مجبوراً مجھے آپ کی کھڑکی کی طرف سے کھٹکھٹانا پڑا۔“ وہ وضاحت کر رہا تھا اور میرا جسم لرز رہا تھا۔ میں صوفے کی بیک کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ میں ابھی گر پڑوں گی۔ تیمور نے مجھے سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا، کچن سے پانی لا کر دیا اور مجھے کپڑے تبدیل کرنے کو کہا اور خود بھی کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ میں نے کمرے میں آ کر جلدی سے کپڑے تبدیل کیے، بالوں میں برش پھیر کر بال سمیٹے۔

امی جان کے کمرے پر دستک دے کر انہیں جگایا اور ساری صورت حال سمجھائی۔ تیمور گاڑی کی چابی لیے کھڑا تھا، میں نے مظہر کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا تا کہ وہ جاگ کر کم از کم گیٹ اور بیرونی دروازہ بند کرے مگر جواب نہ آیا۔ مجبوراً امی جان نے رات کے اس پہر آ کر گیٹ بند کیا۔ راستے میں تیمور نے مجھے بتایا کہ جب وہ باہر پہنچا کھڑکی کی طرف آ رہا تھا تو مظہر کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے کھڑکی کھول کر جھانک کر اندر دیکھا تو وہ کمرے میں نہیں تھا..... کافی دیر میں اس انتظار میں رہا کہ شاید غسل خانے میں ہو مگر میرا خیال ہے کہ وہ گھر میں ہی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم سب کے سو جانے کے بعد وہ سے باہر گیا ہے کہیں؟“ تیمور کے لیے تو بلاشبہ یہ ایک انکشاف تھا۔ یہی ایک بات جو کافی عرصے سے میں اس کے ساتھ کرنا چاہ رہی تھی، اس کا انکشاف تیمور پر ہوا بھی تو ایسے وقت میں کہ میرے حواس والدہ کی خرابی صحت کا سن کر ہورہے تھے۔

”وہ اکثر پہلے بھی گھر دیر سے آتا ہے اور بسا اوقات تو اتنا دیر سے کہ ہمیں علم ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ رات کی صبح.....“ میں نے اس پر ایک اور انکشاف کیا۔



”خوفزدہ! وہ کس بات سے؟ چھوٹا ہے وہ آپ سے، اس سے کیوں خوفزدہ ہیں آپ؟“ اس نے تیز چلتے ہوئے آگے آکر سوال کر دیا۔

”خوفزدہ؟ اس کے پاس ریوالور ہے اصلی والا۔ میں نے وہ دیکھ لیا تھا۔“ لفٹ میں، میں نے اسے یہ بات دہراتے دیکھے تھائی۔ ”مگر ابھی تم اسے مت جتلاتا، میں بعد میں تمہیں ساری تفصیل بتاؤں گی پھر ہم دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔“ میری اس بات نے اس پر یوں اثر کیا جیسے میں نے اس پر ریوالور تان لیا ہو۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ ایک لمحے کی حالت میں وہ مجھے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے والدہ کے کمرے کے پاس پہنچ گئے۔ جہاں صدف باجی، خرم بھائی، علی بھائی، ابو کے علاوہ ڈاکٹر معتمد بھی موجود تھے۔ یہ سب لوگ کمرے کے باہر کچے پتوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

”کیا ہوا والدہ کو؟“ میں نے ابو کے گلے لگتے ہوئے پوچھا۔ ”مج تو بالکل ٹھیک تھیں بلکہ شام تک بالکل ٹھیک تھیں۔“ میں سننے لگی۔

”صدا کرو بیٹا! وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کی طبیعت کافی دنوں سے خراب تھی۔ معتمد بیٹا تو کافی دفعہ کہہ چکا ہے کہ ان کو انجیو پلاسٹی کروالینے چاہیے۔“ ابو نے میری کمر سہلائی۔ میں باقی سب لوگوں سے باری باری ملی اور خواہش ظاہر کی کہ مجھے والدہ سے ملنا ہے، جب کہ صدف باجی کا کہنا تھا کہ وہ آرام کر رہی ہیں اس لیے انہیں دور سے ہی دیکھ لیا جائے مگر میں مصر رہی کہ مجھے ان کو چھو کر دیکھنا تھا۔

”بچی نہ بنو ماہا! والدہ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ تم انہیں جا کر چھوؤ اور اگر وہ جاگ گئیں تو پھر ڈسٹرب ہو جائیں گی۔“ صدف باجی نے ڈانٹا۔

”پلیز میں انہیں چھوؤں گی نہیں، صرف دیکھوں گی۔“ پلیز باجی! میں نے التجا کی۔ میں والدہ کی اس حالت

”تو آپ نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ کیوں چھپائے رکھا مجھ سے یہ سب؟ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اس تمام صورت حال کو اکیلے ہینڈل کر لیں گی؟ مجھے تو اس کے اطوار پہلے ہی کچھ بدلے بدلے سے نظر آتے تھے۔“ تیمور جذباتی ہو رہا تھا۔

”میں نے بار بار کوشش کی کہ تم سے اس سلسلے میں بات کروں، اگر تمہیں یاد ہو تو گزشتہ چار ماہ قبل جب تمہیں تو میں نے تم سے اس معاملے پر بات کرنے کے لیے تمہیں باہر چلنے کو کہا تھا، تب تم نے ماہِ ربیع الاول میں میری بات کرنے سے انکار کیا۔“

”اس کے بعد بھی مجھے آپ اس بارے میں بتا سکتی تھیں۔“ تیمور شکوہ کناس تھا۔

”کبھی موقع ہی نہیں ملا، میں تو خود اس معاملے میں بہت پریشان تھی، کچھ مجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح ہینڈل کیا جائے۔ امی جان تو بات، بات پر اس کے ساتھ غصے میں آ جاتی ہیں۔“ میں نے سہمے کی زبان کی۔

”مجھے امی جان نے بتایا تھا کہ کس طرح اس نے آپ کے ساتھ شدید بدتمیزی کی تھی اور آپ نے اس پر برداشت بھی کر لیا تھا۔ آخر کیا وجہ ہے، کیوں آپ اس کی اس طرح کی غلطیوں پر پردے ڈال دیتی ہیں؟“

”میں اس لیے برداشت کرتی ہوں کہ میں اس کی بڑی ہوں، مجھے اس کی غلطیوں پر اس کی اصلاح کرنا ہے۔“

اسے سمجھانا ہے، ہاتھ اس لیے نہیں اٹھا سکتی کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں اور اسے برا بھلا اس لیے نہیں کہتی کہ خون ہے، کسی بات پر برا مان کر گھر سے ہی چلا جائے تو ہم کیا کریں گے۔“ میں بات کرتے کرتے سسک اٹھی۔

میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

”لیکن آپ کیا سمجھتی ہیں کہ کیا وجہ ہوئی ہے؟ وہ ایسا کیوں ہو گیا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ مجھ میں نہیں آتا سوائے اس کے کہ اس کا کوئی استاد یا کوئی دوست ایسا ہے جو خود کسی مذہبی تنظیم سے وابستہ ہے اور اسی نے اس سے اثر لیا ہے۔“ میں نے مختصر آتیایا۔

”یہ اندازہ آپ نے کس وجہ سے لگایا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”اس کے کمرے میں موجود مذہبی موضوعات پر بہت ساری کتابوں کی وجہ سے۔“

”لیکن اس کا کراؤ امی جان بتا رہی تھیں کہ بندر پتا ہے اور اس نے اسی بات پر آپ سے بدتمیزی کی تھی۔“

اسے شک ہوا کہ آپ اس کے کمرے میں گئی تھیں؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں اس نے مجھ سے اس بات پر بدتمیزی کی تھی، جس پر امی جان نے اس کی بہت پٹائی کی تھی۔“

”لیکن جب آپ اس کے کمرے گئی ہی نہیں تو اس کو شک کیوں ہوا؟“ اس نے حیرت سے پھر سوال کیا۔

”اس لیے کہ میں اس کے کمرے میں گئی تھی۔“ میں نے انکشاف کیا۔ ”غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی، اس کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر میں مارے جھجس کے اندر چلی گئی اور پھر لوٹ آئی۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”اور اگر آپ اس کے کمرے میں چلی ہی گئی تھیں تو اس کے سامنے یہ کہنے میں کیا حرج تھا۔“ تیمور گاڑی کو پارک کرتے ہوئے کہا۔ اسپتال آ گیا تھا، میں نے گاڑی رکتے ہی استقبالیہ کی طرف دوڑ لگا دی۔ میرے پیچھے لپک کر آیا۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میرے ساتھ چلتے چلتے اس نے سوال کیا۔

”میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔“ میں نے تجلّت میں جواب دیا۔

## زندگی بدلنے والی ورزش کی مشینیں

**KOREAN ELECTRIC TREADMILL**  
The King of All Exercise Machines

LCD-TV  
کے ساتھ بھی دستیاب

LG ملٹر و انورٹری  
طاقت اور انتہائی مضبوط  
جاپانیز ہیلٹ کے ساتھ

بعد از فروخت سروس اور  
پارٹس کی فراہمی کی ضمانت



**EXERCISE BIKE**

اپنے کمرے میں میلوں چلتے اور  
سائیکلنگ کا لطف اٹھائیے۔  
کسی بھی عمر میں اسارٹ اور توانائی سے  
بھرپور رہنے کے لئے صرف 5 منٹ  
روزانہ کسی بھی وقت استعمال کیجئے۔  
بے شمار ماڈلز آپ کے انتخاب کے لئے  
آپ کے بجٹ کے عین مطابق۔



یاد رکھیے! ادائیگی صحت برقرار رکھنے کے لئے چند منٹ کی گھریلو ورزش کا کوئی نعم البدل نہیں، ورزش کے کوئی منفی اثرات نہیں

**BILAL BROTHERS**  
Mustafa Arcade, SMCHS, Karachi. Tel: 4531961-62

**LAHORE NABI BUX & SONS** Tel: 7354004  
**FAISALABAD ELECTROLUXE** Tel: 8541004-8543436  
**PESHAWAR RASHID SONS** Tel: 5272823-5274931  
**QUETTA S. K. BUSINESS MART** Tel: 2825564-2839082

BB-2007/13



”صفیہ! مجھ پر بھی ہے تم کو.....“ شمیمہ بیگم نے کی کمائی کی عادت پڑ گئی۔“ شمیمہ بیگم نے حسب عادت تیز لہجے میں کہا۔  
”کیوں، کیا ہوا آپ؟“ صفیہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔  
”تو یہ، تو بد آ پاکسی باتیں کر رہی ہو؟“ صفیہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کاؤسے دار خود کو سمجھ رہی تھی، مجھے لگ رہا تھا کہ والدہ نے میری کی ہوئی کسی بات کی ٹینشن لی تھی، میں نے شاید انہیں زیادہ ہی گستاخی دکھائی تھی۔ میں دل سے شرمندہ تھی۔

”نہ انہیں صدف آئی، بچاری پریشان ہے۔ آنٹی کی چھوٹی اور لاڈلی بھی ہے..... آؤ ماہ میں خود نہیں چلوں آنٹی کے پاس!،“ معظم نے آگے بڑھ کر یوں استحقاق سے میرا ہاتھ تھام لیا جیسے ارد گرد کوئی نہ ہو۔ میں بھی اس وقت وقتی طور پر اپنی منتشر تھی کہ اس بات کا احساس ہی نہ کر سکی اور اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے ایک معمول کی طرح اس کے ساتھ اندر کو چلی۔ خاموشی سے والدہ کے بیڈ کی پالٹنی کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ ہوش و حواس کی دنیا میں غائب رہے ہوش میں یا پھر گہری نیند میں۔

”ڈاکٹر معظم! والدہ نے کوئی ٹینشن لی ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔  
”نہیں، کوئی ایسی خاص ٹینشن کیا ہو سکتی ہے، ویسے ان کے دل کی حالت ایسی تھی کہ انہیں پلائی ہوئے کی ضرورت تھی۔ بونہی کوئی چھوٹی سی بات بہانہ بن جاتی ہے بسا اوقات۔ ہو سکتا ہے کہ دوا کے استعمال میں بے قاعدگی ہو۔“ اس نے وضاحت کی۔

”دوا تو وہ ہمیشہ باقاعدگی سے اور بروقت کھاتی ہیں، ضرور کوئی ایسی بات ہی ہوگی۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔  
ڈاکٹر معظم مشین کے پاس کھڑا ان کا ریکارڈ چیک کر رہا تھا کہ میں نے دونوں ہاتھوں سے والدہ کے دونوں پاؤں چھوئے جو برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ میری رنگوں میں ایک خوف سا سرایت کر گیا۔ میں نے زیر لب بڑبڑا کر ان سے اپنی گستاخیوں کی معافی مانگی۔ کہیں والدہ..... یکدم مجھے خیال آیا اور میں نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر معظم نے مجھے کندھوں سے تھاما اور تقریباً دھکیلتے ہوئے باہر لے آیا، یہی نہیں بلکہ اپنی جیب سے نشوونما نکال کر دیا۔ میں نے باہر آ کر ابو کے گلے لگ کر رونا شروع کر دیا۔ دل میں یہی خدشہ تھا کہ والدہ کو کچھ ہو نہ جائے۔

کتنی نہیں کر رہی تھیں شام کو کورک جاؤ مگر میں اس وقت جانے کس موڑ میں تھی۔ غصے میں تھی شاید؟

”یا اللہ والدہ کو صحت دے! میں ایک بار ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لوں۔ مجھے تو ان سے بہت سی بات کرنا ہیں۔ میرے لیے تو وہ دنیا میں ایک مضبوط اخلاقی سہارا ہیں۔“ میں دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی۔  
تب معظم نے اصرار کیا کہ سب لوگ گھر چلے جائیں اور دن کو دس بجے واپس آ جائیں جب تک ڈاکٹر وہی راؤنڈ کر کے چلے جائیں گے۔ میرا تو بالکل جی نہ چاہ رہا تھا کہ وہاں سے جاؤں مگر سب لوگوں نے یہی کہا کہ اسپتال کے پیچوں پر بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، سو بے دلی سے میں نے بھی سب کا ساتھ دیا۔

”پریشان نہ ہو لگد لگ! اس وقت گھر جاؤ، صبح دس بجے آ جانا، پھر میں تمہیں آنٹی سے ملوادوں گا لگے ہو سکتا ہے کہ تم ان سے بات بھی کر سکو۔“ ڈاکٹر معظم نے مجھے بچوں کی طرح پککارا۔

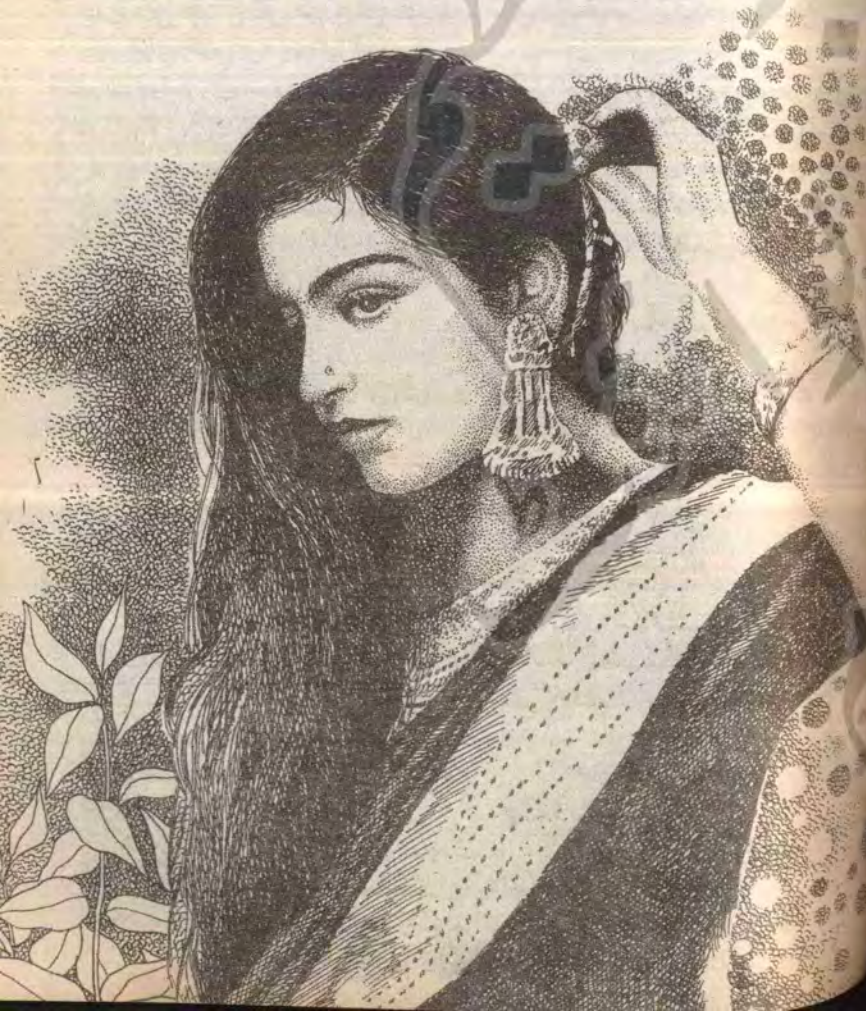
”یہ ڈاکٹر معظم کون ہے؟“ تیمور نے گاڑی اسپتال کے احاطے سے نکلنے ہی سوال کیا۔

”صدف باجی کے جیٹھ کا بیٹا ہے اور کالج میں صدف باجی کا جونیئر بھی تھا۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”اسی لیے انہیں چچی کے بجائے صدف آئی کہتا ہے۔“

”پہلے بھی نظر نہیں آیا؟“ تیمور کے لہجے میں کوئی عجیب سی چیز تھی۔  
”یہاں نہیں ہوتا، یو کے سے آیا ہے.....“ میں نے مختصر آکھا۔

”آپ سے کچھ زیادہ فریک نہیں ہے؟“ تیمور کی بات پر میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

بقیہ اگلے ادوار





”تینوں بیٹیوں کو بیاہ دیا۔۔۔۔۔ سب سے بڑی کو ابھی تک بٹھائے رکھا ہے۔ اٹھائیس سال کی ہوگئی ہے منہجا۔ اس کی عمری لڑکیاں تو اب دو، دو، تین، تین بچوں کی مائیں بن گئی ہیں۔“ صفیہ بیگم نے گویا دل پر ہی ٹھونس مار دیا۔

”بس کریں آما۔۔۔۔۔ سب کچھ آپ ہی کے سامنے ہے۔ کتنی تک دو دو ملگئی ہوئی ہوں میں! اب خاندان میں تو منہجا کے جوڑ کا کوئی رشتہ ہے نہیں۔۔۔۔۔ تو بتائیں اس میں میرا کیا تصور ہے۔ اوپر سے اور بہنوں کے مقابلے میں منہجا کی شکل صورت بھی بدلتی ہوئی ہے۔ کتنے ہی رشتوں میں ایسا ہوا کہ دیکھتے منہجا کو آئے اور پسند چھوٹی کر گئے۔۔۔۔۔ اب میں بوہ چار بیٹیوں کی ماں، میرا تو پل پل بھاری تھا میں نے اسی کو قسمت جانا کہ ایک نہیں تو دوسری کا بوجھ ہی سر سے اتار دوں اور یوں تینوں کی ہوگئی۔۔۔۔۔ بے شک میری بچی شکل صورت میں کم ہے لیکن میری بچی میں وہ خوبیاں ہیں جو آج کل ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔“ صفیہ بیگم نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔

”وہیے میں نے رشتے والی خالہ سے کہا ہے۔۔۔۔۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ نظر آیا میں بات کروں گی۔“

منہجا دوسرے کمرے میں بیٹھی اپنی خالہ اور ماں کی تمام گفتگو سن رہی تھی۔ آج پھر اسے احساس دلایا گیا کہ وہ واجبی شکل صورت کی لڑکی ہے۔ قدم قدم پر اسے یہی الفاظ سننے کو ملتے تھے۔

بکھی اس کی کزن نازہ نے قہقہے میں اس کے سانولے رنگ کا مذاق اڑایا تو بکھی کسی کلاس فیلو نے اس کے ہلکے سے اٹھے ہوئے دہانے کو نشانہ بنایا اور تو اور رشتے داروں نے بھی یہ کہہ کر دل توڑا۔ ”چھوٹی بہنیں تو اتنی خوبصورت ہیں یہ کس پر چلی گئی۔ صرف نام خوبصورت ہے شکل تو۔۔۔۔۔“

”یا اللہ کیا میری ساری زندگی ایسے ہی گزر جائے گی۔۔۔۔۔ میں کسی کا برا نہیں سوچتی لیکن لوگ۔۔۔۔۔ میں اپنی ماں کو اس طرح لکھ لکھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ یا اللہ

اس دنیا میں میرا جوڑ ہے بھی یا نہیں۔“ منہجا نے کمرے میں لیٹی دیر تک آنسو بہاتی رہی جانے کب اس کا گھر لگ گئی۔

\*\*\*

”ای میں نے ایک بڑا عجیب خواب دیکھا۔۔۔۔۔ منہجانے کھانا کھاتے وقت اپنی ماں کو مخاطب کیا۔ ”بیٹا خواب کو کبھی عجیب نہیں کہتے۔“ صفیہ بیگم نے اسے ٹوکا۔

”وہ، سوری۔۔۔۔۔ لیکن سیں تو۔۔۔۔۔“ ایک ماں تھی جن کو منہجا تھوڑے بہت خمرے دکھا دیتی تھی۔ ”اب سننا ہی دو۔“

”ای، پرسوں میں نے آپ کی اور خالہ کی قوم باتیں سن لی تھیں۔۔۔۔۔ میں عجیب کشمکش میں تھی کہ میرا آنکھ لگ گئی۔ میں نے دیکھا کہ میں کی خوبصورت ہرے بھرے جنگل میں کھڑی ہوں اچانک ہی میری کمرے جانوروں پر پڑی۔“ منہجانے پانی کا گھونٹ پلٹے سے اتارا۔

”میں نے دیکھا ہاتھی، بھینس کے ساتھ کھڑا ہے۔ گھوڑا، گھوڑی کے ساتھ، شیر، شیرنی کے ساتھ۔۔۔۔۔ تک کہ جیونے کو چوہیوں کے ساتھ دیکھا۔“ منہجا نے کمرے میں آیا۔۔۔۔۔ کہ اس خواب کا مطلب کیا ہے؟“ منہجا کی بات ادھوری رہ گئی۔ صفیہ بیگم نے مسکرا کر اطمینان کا سانس لیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اس دنیا میں اللہ نے آپ کے لیے بے جوڑ نہیں بنائی۔۔۔۔۔ کہیں نہ کہیں تمہارا جوڑ بھی موجود ہے بس اللہ کی طرف سے دیر ہے۔“

”یعنی اللہ نے مجھے میرے سوال کا جواب دے دیا۔“ منہجانے دل میں سوچا۔

\*\*\*

”منہجا بیٹا مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ صفیہ بیگم نے چائے کا کپ اُسے پکڑ لیا۔

”ماں بولیں۔۔۔۔۔“ منہجانے اپنے بال سینے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”بیٹا تم جاب چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ صفیہ بیگم نے

آج اظہار کر ہی دیا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ تمہاری جاب ہی تمہاری شادی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔“

”اوہ ای جی، کم سے کم آپ تو ایسی باتیں نہ کیا کریں۔۔۔۔۔ آپ نے اور پاپا نے ہمیں ہمیشہ یہی سبق دیا ہے کہ نسیب کے آگے کوئی نہیں جیت سکتا اور کوئی بھی چیز کسی کام میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ بشرطیکہ آپ کی نیت صاف ہو اور میری پیاری امی جب سب کی شادیاں ہو گئیں تو میری بھی ہو ہی جائے گی اور اگر نہیں بھی ہوئی تو مجھے کوئی غلش نہیں ہوگی۔ کیونکہ جس کے پاس اتنی پیاری ماں ہو اسے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

منہجانے اپنی ماں کی گردن میں ہاتھیں ڈال کر کہا۔

”لیکن بیٹا میں کوئی ہمیشہ زندہ۔۔۔۔۔“ منہجانے ان کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”ای جی سب باتیں چھوڑیں۔۔۔۔۔ ابھی رہیجہ اور سعد آنے والے ہیں ان کے لیے کچھ پکانا بھی ہے یا نہیں۔“ منہجانے اپنی بہن اور بہنوئی کی آمد کی یاد دہانی کر لی۔

”لاحول ولا قوۃ۔۔۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔“ صفیہ بیگم نے مسکرا کر اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

\*\*\*

”آئیے، آئیے۔۔۔۔۔ اتنی دیر میں آئے ہو، ذرا جلدی ہی آ جاتے۔“ منہجانے رہیجہ اور سعد کے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا۔

”آئی میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ آپ تو ہمیں ہوا جاتے ہیں ہمارے گھر نہیں آتیں۔“ رہیجہ نے بھی نہیں چھوڑا۔

”ماں ڈیر! تم کو تو پتا ہے میری جاب کا۔۔۔۔۔ وہ ایک فارما سٹیکل پینٹی ہے۔۔۔۔۔ چھٹی کا تو سوال ہی نہیں ہوتا پھر کھر آ کر بہت تھکن ہو جاتی ہے۔“ منہجانے تفصیل بیان کی۔

”ارے بھئی، امی نظر نہیں آ رہیں۔۔۔۔۔“ سعد نے دونوں کو چپ کر لیا۔

”میں آگئی بچوں۔۔۔۔۔“ صفیہ بیگم فارغ ہو کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ دونوں نے سلام کیا اور ادھر

ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ تاہم کافی ہو گیا تھا منہجانے جلدی جلدی ڈانٹنگ ٹھیل لگائی سب نے کھانا کھایا۔

”ای مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی تھی۔“ سعد نے آرام سے کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ رہیجہ بھی وہیں بیٹھ گئی۔

”وہ دراصل میری بھوپنی زبیدہ کو تو آپ جانتی ہیں نا۔۔۔۔۔“ سعد نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

”ہاں، ہاں وہ تو بہت اچھی خاتون ہیں انہیں کیسے بھول سکتی ہوں! خیر تو ہے بیٹا۔“ وہ اس طرح اچانک سوال پر چونک گئیں۔

”دراصل ان کے چار بیٹے ہیں اور ماشا اللہ سبھی شادی شدہ ہیں اور ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ البتہ ان کے بڑے بیٹے شاہ عالم بھائی امریکا میں رہتے ہیں۔ وہ وہاں کیمیکل انجینئر ہیں۔ بہت ہی ٹاکس آڈی ہیں نمازی اور پرہیزگار۔ دراصل ان کی پہلی بیوی کو انہوں نے طلاق دے دی تھی تقریباً دس سال پہلے۔

بھوپنی جان تو کب سے ان کے پیچھے بڑی ہیں کہ وہ شادی کر لیں لیکن وہ مانتے ہی نہیں تھے لیکن اب بھوپنی بہت بیمار ہیں ان کے بہت اصرار پر اب کہیں جا کر وہ مانے ہیں۔ انہوں نے کسی تقریب میں منہجا کو دیکھا تھا تو اسی سلسلے میں انہوں نے مجھے آپ سے بات کرنے کو کہا ہے۔“ گویا سعد نے تمام تفصیل ان کے گوش گزار کر دی۔

”ای جی، رشتہ بہت اچھا ہے۔ بھوپنی جان بہت اچھی عورت ہیں اور شاہ عالم بھائی کو بھی میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ رہیجہ نے بھی سلی دی۔

”بیٹا میں نے تو اس لڑکے کو نہیں دیکھا ویسے پھر بھی کیا عمر ہوگی؟“ صفیہ بیگم نے اپنے چشمے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”یہی کوئی پچاس یا باون“ سعد نے گویا ان پر بم گرا دیا۔

”پچاس یا باون۔“ صفیہ بیگم نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر کنٹرول کیا۔ ”رہیجہ آخر میری بچی کی کون سی ایسی عمر ہوگئی ہے کہ میں بڑی عمر کے شخص۔۔۔۔۔ کو اپنی بیٹی

کرے میں داخل ہوئیں۔ دونوں نے سلام کیا اور ادھر

دونوں کو چپ کر لیا۔

”میں آگئی بچوں۔۔۔۔۔“ صفیہ بیگم فارغ ہو کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ دونوں نے سلام کیا اور ادھر

دونوں کو چپ کر لیا۔

”میں آگئی بچوں۔۔۔۔۔“ صفیہ بیگم فارغ ہو کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ دونوں نے سلام کیا اور ادھر

دونوں کو چپ کر لیا۔



وان کردوں۔“ صنفیہ بیگم نے ربیعہ پر افسوس کیا۔

”دیکھیں امی، اب اگر آپ یہ سوچتی ہیں کہ منجھا آئی کے لیے کوئی راجکار آئے گا تو یہ تو ہونیس سکتا۔ شاہ عالم بھائی سے شادی کے بعد عیش کریں گی آپ۔ شکر کریں کہ انہوں نے آپ کو رنجش تک نہیں کیا۔ وہ بڑے لکھے آدمی ہیں انہیں لڑکی بھی لگتی ہوئی اور پڑھی لکھی چاہیے۔“ ربیعہ نے مزاجاً تنک کر کہا۔

”نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی میری بچی لاکھوں میں ایک ہے؟“ صنفیہ بیگم نے تقریباً انکار کر دیا۔

”آپ اچھی طرح سوچ لیں امی۔“ سعد نے پھر زور دیا۔ منجھا چائے لے آئی تھی..... وہ سب کچھ سن چکی تھی پھر بھی کمرے میں اسے دیکھ کر خاموشی چھا گئی۔

\*\*\*

صنفیہ بیگم اپنے کمرے میں سوچتی تھیں..... لیکن منجھا کی نیند جیسے اس سے روٹھ گئی تھی..... رات کی اس گہری سیاہی میں وہ شاید اپنی قسمت کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ جھٹ کی سڑکیوں پر بیٹھ گئی اور آسمان پر دور تک پھیلے تاروں کو دیکھتی رہی اور کچھ سوچتی رہی..... اب وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وقت کی گزرتی ہوئی تیزی اسے کسی طوفان کا سندیسہ دے رہی تھی..... اس نے اب فیصلہ کر لیا تھا کہ شاہ عالم والے رشتے کو انکار نہیں کرے گی..... اپنی ماں کی خاطر یہ قربانی دے دے گی..... کر لے گی اپنی زندگی سے سمجھوتا.....

”لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ لوگ مجھ پر نہیں گے کہ معمولی شکل صورت ہونے کی وجہ سے ایک ایچڈ آدمی سے شادی ہو گئی لیکن میں صبر کروں گی کسی سے شکایت نہیں کروں گی۔“

\*\*\*

”شاہ عالم بھائی آج امریکا سے آرہے ہیں۔“ ربیعہ نے فون پر صنفیہ بیگم کو اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے، میں کل ہی بھائی ایاز کو بلاتی ہوں ان کے گھر والوں سے بات کرنے کے لیے“ صنفیہ بیگم اپنے تمام مشورے اپنے بڑے بھائی ایاز الدین سے ہی کرتی تھیں..... باپ کے نہ ہوتے انہوں نے تینوں

بیٹیوں کی شادی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

\*\*\*

آج گھر میں بہت گہما گہما تھی۔ ربیعہ فائزہ بھی گھر میں موجود تھے لیکن منجھا کا دل بندھ اداس تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائے وہ کسی پر یہ غام نہیں ہونے دے رہی تھی کہ وہ اندر سے ناخوش ہے۔ صرف اور صرف اپنی ماں کی خاطر اپنے آپ کو قربان کر رہی ہے۔

آج اس کی سسرال والوں نے آتا تھا ساتھ شاہ عالم بھی آئے تھے..... لیکن فی الحال منجھا ان کے سامنے نہیں آئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کے دل کے حال کو سمجھ سکے لہذا شاہ عالم کے چاہنے کے باوجود بھی وہ ان سے نہیں ملی البتہ گھر کی عورتوں نے انہیں دیکھا اور بڑے پیار سے شادی کی تاریخ رکھ دی۔

وہ دن بھی آ گیا جب منجھا، شاہ عالم کی دلہن بن گئی۔ یاد دہانی کے نکاح ہوا اور ہر کام انتہائی خوشی اور خیر و خوبی ہو گیا..... لیکن منجھا کے دل کی چین نہ بدل سکی۔ ”میری بیٹی بہت اچھی ہے اس کا خیال رکھنا بیٹا..... سات سمندر پار میں اللہ کے سپرد کر رہی ہوں اسے۔“ صنفیہ بیگم نے رخصتی کے وقت شاہ عالم سے منجھا کو خوش رکھنے کی گزارش کی۔

”آپ بے فکر رہیں میں ہر طرح ان کو خوش رکھوں گا۔“ شاہ عالم نے مختصر جواب دیا۔

رخصتی کے بعد منجھا، شاہ عالم کی وسیع و عریض کوٹلی میں آ گئی..... کمرے میں ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے تھے۔

”انتی حسین بیج تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔“ منجھا نے ایک نظر ہال نما کمرے پر ڈالی جو کسی افسانوی ماحول کی عکاسی کر رہا تھا۔ اچانک ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی..... منجھا سمٹ کر بیٹھ گئی۔ شاہ عالم نے داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اپنا کوٹ اتار کر بیٹھ کر کیا۔ اس دوران منجھا کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا شاہ عالم ریلیکس ہو کر اس کے قریب آ گئے۔

”کیا آپ سر نہیں اٹھائیں گی؟“ شاہ عالم نے



اس کے انتہائی جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”جی!۔“ منجھا نے چونک کر دیکھا۔ دراز قد  
 پری پری آنکھیں جن کے گرد جھریاں صاف نظر آ رہی  
 تھیں۔ چوڑا ماتھا، سر پر کہیں کہیں سفید بال لیکن کنپشیاں  
 مکمل سفید تھیں۔ بھاری آواز لیکن پرسنائی بہت کریمیں  
 قل البتہ عمر صاف جھلک رہی تھی۔ اس کے دل پر ایک  
 دم گھونسا بڑ گیا۔

”کیا ہوا؟ آپ چونک کیوں گئیں؟“ پشاشا عالم  
 نے اسے کھوئے ہوئے انداز میں دیکھ کر پوچھا۔  
 ”جی۔۔۔۔۔ جی کچھ نہیں۔“ منجھا کے ہونٹ سل گئے  
 تھے۔

”ہوں۔۔۔۔۔ میں چاہتا تھا کہ آپ مجھ سے پہلے  
 لیں، مجھے دیکھ لیں تب شادی کے لیے ہاں کریں۔  
 لیکن آپ نے انکار کر دیا۔۔۔۔۔ ورنہ میں شاید آپ کو پہلے  
 ہی اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیتا۔“ شاہ عالم نے  
 اپنے ہاتھ کی کھڑی اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

”اچھا، میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنے بارے  
 میں بتاؤں۔“ منجھا اس بات پر آگ بولہ ہو گئی۔ ”کی  
 نہ بڑی عمر کے لوگوں والی بات۔۔۔۔۔ اس نے دل میں  
 سوچا۔

”میں شادی کے حق میں نہیں تھا لیکن ماں اور  
 بہنوں کے اصرار نے مجھے مجبور کر دیا۔ ان کی خوشی کا  
 اندازہ آپ اس کرے کی بناوٹ اور سجاوٹ سے لگا  
 سکتے ہیں۔۔۔۔۔ میرا اس کرے کو بچانے میں کوئی دخل نہیں  
 تھا، یہ ان کی ہی ضد تھی۔“ منجھا ایک بار پھر کھول گئی۔  
 ”یعنی میرے جذبات اور ارمان کچھ نہیں ہیں۔“ منجھا نے  
 اپنی مٹھیاں بچھنے لیں۔

”میری تو اپنی چھوٹی سی زندگی ہے۔“ شاہ عالم  
 بدستور بول رہے تھے۔ ”میں صبح تہجد کے لیے اٹھتا  
 ہوں۔ قرآن پاک کی فجر تک تلاوت کرتا ہوں پھر نو  
 بجے آفس چلا جاتا ہوں پھر وہاں سے چار بجے آنا۔  
 کھانا کھا کر آرام کرنا پھر اپنے ضروری کام نمٹانا اور عشا  
 کی نماز پڑھ کر سو جانا۔۔۔۔۔ یہی میری لائف ہے۔ لیکن  
 اب آپ میری زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ میں چاہتا

ہوں آپ میرا ساتھ دیں۔“ شاہ عالم بولتے ہوئے  
 رہے تھے اور منجھا کرب کے عالم میں ان کی ہنسنے  
 رہی تھی۔

☆☆☆

”آؤ بیٹی آؤ۔۔۔۔۔ شاہ عالم کی ماں نے اپنے  
 خوشدلی سے صبح اس کا استقبال کیا۔۔۔۔۔“ منجھا  
 کے تو بھاگ کھل گئے نہیں پا کر۔ ”انہوں نے اسے  
 کہا۔

”ای ویسے بھاگ تو منجھا کے بھی کھل گئے۔“ منجھا  
 جی کی بہن فریجہ نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔ منجھا  
 مصنوعی مسکراہٹ سے بت بیٹی ہو گئی۔

”بیٹی تم خوش تو ہونہ۔۔۔۔۔ منجھا کو ان کے سوال  
 نے چونکا دیا۔

”خوش؟“ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔  
 ”میری تو ساری خوشیاں ہی ختم ہو گئیں۔“  
 ”کیا بات ہے بیٹا۔۔۔۔۔ ماں جی نے اس کی  
 خاموشی کو توڑا۔

”جی کچھ نہیں۔۔۔۔۔ میں خوش ہوں۔ آپ کو جانے  
 لا دوں۔“ منجھا نے وہاں سے جانے کی کوشش کی۔  
 ”اللہ تمہیں خوش رکھے۔۔۔۔۔ ابھی تو آئی ہو ابھی

سے کاموں میں لگا دوں۔۔۔۔۔ تم تو مہمان ہو کچھ دن عرصہ  
 امریکا چلی جاؤ گی پھر کب آنا ہو؟ بیٹا۔۔۔۔۔ میرا شاہ عالم  
 بہت ٹیک ہے لیکن اس کی قسمت خراب تھی کہ اس کا کمر  
 نہیں بسا۔۔۔۔۔ سوہا سے اس نے پسند کی شادی کی تھی۔  
 لیکن اس نے گھر بسنے کی کوشش نہیں کی تم شاہ عالم کو  
 بر تو کی اتنا اچھا پاؤ گی۔۔۔۔۔ میرے شاہ عالم کو گھر کا  
 ضرور دینا۔۔۔۔۔ ماں جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔  
 ”میں پوری کوشش کروں گی۔“ منجھا نے ہنسنے

کہا۔  
 کچھ دنوں بعد وہ تھوڑی سیٹ ہوئی۔ بھابی  
 بھابھیاں، نندیں اور ماں جی تو بہت ہی شفیق عورت تھیں۔  
 پہلی بار کسی جگہ اسے یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ معمولی  
 اہم ہے۔۔۔۔۔ بس ابھی تک وہ شاہ عالم کے قریب تھا  
 ہو پائی تھی۔۔۔۔۔ شاید وہ ابھی تک اپنے خوابوں کے غل

\*\*\*

”تم بہت چپ چاپ رہتی ہو؟“ شاہ عالم نے  
 اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ہمیں امریکا آئے دو  
 مہینے ہوئے لیکن تم۔۔۔۔۔“

”کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟“ منجھا  
 نے گہرا کر پوچھا۔

”ارے نہیں، نہیں۔۔۔۔۔ تم تو کسی ریلوے سے  
 زیادہ تیز ہو۔ ہر کام اس طرح وقت پر کر دیتی ہو  
 جیسے۔۔۔۔۔ خیر میں تو حیران ہوں کہ میری ہر بات پر ہاں  
 اور جی کے علاوہ کوئی بات ہی نہیں کرتیں۔۔۔۔۔ سوہا  
 تو۔۔۔۔۔ منجھا نے آج پہلی بار ان کے منہ سے سوہا کا نام  
 سن کر انہیں چونک کر دیکھا۔

”خیر چھوڑو۔۔۔۔۔ ادھر آؤ۔“ شاہ عالم نے اس کا  
 ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر اپنے قریب بٹھالیا۔  
 ”دیکھو، میں جانتا ہوں کہ تم ایک بیک لڑکی ہو  
 تمہارے بہت سے ارمان ہیں لیکن میں اس دورے

بہت آگے آ چکا ہوں۔۔۔۔۔ میں عمر کے اس حصے میں تم کو  
 ”جان من“ کہہ کر نہیں بلا سکتا۔ آگے لویو، مس یو جیسے  
 الفاظ اب مجھے اور رکتے ہیں۔۔۔۔۔ ریسب میں سوہا کے  
 ساتھ کر چکا ہوں۔“ اس نے ایک لمبی سانس لی۔

”لیکن اس نے مجھے صرف دکھ ہی دکھ دیے میں  
 نے تم سے شادی کی رات ہی کہا تھا کہ تم کو میرا ساتھ دینا  
 ہو گا میں نہیں چاہتا کہ میں تمہیں چھوٹی سی بھی تکلیف

دوں۔“ شاہ عالم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔  
 ”تم خوش رہا کر دو تم کو تو میں تمہارا یہاں کسی  
 یونیورسٹی میں داخلہ کروا دوں تم نے ماسٹر کیا ہوا ہے  
 کیوں تم آگے پڑھو۔“ شاہ عالم نے اسے ایک نئی  
 راہ دکھائی۔

”میں سوچوں گی۔“ منجھا نے مختصر جواب دیا۔

\*\*\*

”السلام علیکم۔۔۔۔۔“ اس مغربی ملک میں اپنی  
 زبان سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

”پاکستانی ہو؟“ ایک یونٹھی عورت مسکراتی ہوئی

اس کی بلیک پریٹھ گئیں۔  
 ”جی آپ۔۔۔۔۔؟“ منجھا نے غور سے انہیں دیکھ  
 رہی تھی آج یہاں پہلی بار کسی نے اپنی زبان میں بات  
 کی تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

”میں نہیں رہتی ہوں، میں تمہیں روز اپنے  
 اپارٹمنٹ کی گیلری سے دیکھتی ہوں۔ کیا روز اسی ٹائم  
 اس پارک میں آتی ہو؟“ اس عورت نے شفیق لہجے میں  
 اس سے سوال کیا۔

”جی ہاں، دراصل؟“ ابھی اس کی بات ادھوری  
 ہی تھی۔

”اچھا، اچھا تو اپنے سر کے ساتھ آتی ہو۔۔۔۔۔“  
 اس عورت نے قریب آتے شاہ عالم کو دیکھا۔۔۔۔۔ منجھا پر  
 جیسے کئی بجلیاں ایک ساتھ گر گئیں۔

”تم سوچو گی کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ یہ تمہارے سر  
 ہیں۔“ منجھا ابھی تک شائد تھی۔۔۔۔۔ ”کیونکہ تم نے ناک  
 میں لونگ ڈالی ہوئی ہے۔ یہ تو ہے ہماری مشرٹی لڑکیوں  
 کی شادی کی نشانی۔۔۔۔۔ سو میں مجھ گئی تم شادی شدہ  
 ہو۔۔۔۔۔ اور انہیں دیکھ کر۔۔۔۔۔ شاہ عالم بالکل قریب  
 آ چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ شاہ عالم میں وہ جلدی  
 سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئی یہ میرے شوہر ہیں میں ان کے ساتھ روز  
 واک کرنے آئی ہوں۔“ منجھا نے جلدی سے انہیں اپنی  
 اصل بات کہہ ڈالی۔

”شوہر۔۔۔۔۔؟“ وہ شرمندہ ہو گئیں۔  
 ”اچھا آئی، میں اب چلتی ہوں۔ انشا اللہ پھر  
 ملاقات ہوگی۔“ وہ تیز قدم اٹھاتی شاہ عالم کے ساتھ  
 آ گئی۔

یہ باتیں تو اب روز کا معمول بن گئی تھیں لیکن شاہ  
 عالم بالکل بے خبر اور اپنی زندگی میں خوش تھے۔ جب  
 کہ منجھا اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی کہ شاہ عالم اپنے سفید  
 ہوتے بالوں کو کالا کیوں نہیں کر لیتے تاکہ کچھ تو عمر سے کم  
 لگیں۔ لیکن شاید شاہ عالم ان باتوں سے انجان تھے یا  
 بن رہے تھے۔

\*\*\*



”منہا.....“ شاہ عالم نے مزید ارکانی کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اسے پکارا۔  
”جی آئی.....“ اس نے نیچے سے ہی آواز لگائی۔  
”اوہو بھئی..... جی، ہاں، اچھا، ارے بابا اس کے علاوہ بھی اس دنیا میں الفاظ ہیں۔“ شاہ عالم نے زوردار تہقید لگایا۔

”چلو آج میں تم کو ایک ایسی جگہ لے کر چلتا ہوں جہاں تم بہت خوش ہوگی..... یہاں لاکھ لاکھ میں ہمارے گھر سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر اسلامک سینٹر ہے۔ وہاں تمام پاکستانی اور مسلمان لوگ آتے ہیں۔ رمضان المبارک میں افطار پارٹیز ہوتی ہیں، عید پر سب وہیں نماز پڑھتے ہیں..... دراصل آج میرے دوست احسان اللہ کے بیچ کی آئین ہے۔ اس نے مجھے اور تمہیں انوائٹ کیا ہے۔ آئی ہو پ کے تم وہاں جا کر خوش ہوگی۔ میرے کئی دوست اپنی بیویوں کے ساتھ آئیں گے تم ان سے ملنا۔“ شاہ عالم اخبار اور کافی کا مزہ لیتے ہوئے بول رہے تھے۔

”لیکن آپ نے مجھے پہلے تو نہیں بتایا،“ منہا کا پیشہ شاہ عالم اینڈ وقت پر جانے کا بتاتے تھے۔  
”ارے بابا..... پہلے سے انہیں بتایا جاتا ہے جن لوگوں میں کچھ کمی ہو..... تم تو اتنی خوبصورت ہو کہ انہی کپڑوں میں چلی چلو گی تو تم جیسا کوئی نہیں ہوگا۔“ شاہ عالم نے مسکرا کر جواب دیا۔  
”خوبصورت اور میں..... آج تک تو کسی نے کہا

نہیں۔“ اس نے دل میں سوچا۔  
منہا آج واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی لائٹ پیئرٹ گرین کلر پر بلو کمر سے انبر انڈری والی شرٹ اور کنٹراس بلو کلر کی شلوار اور دوپٹا اس پر کافی کھل رہا تھا۔

”منہا ان سے ملو.....“ شاہ عالم نے ایک کپل کی طرف متوجہ کیا۔  
”یہ ہیں فراز اور یہ ان کی وائف ندا۔“ ان دونوں نے بڑے تپاک سے منہا سے ہاتھ ملایا۔  
”شاہ عالم بھائی آپ کی وائف تو بہت پیاری

ہیں.....“ ندانے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی اس تعریف پر بہت حیرت ہوئی..... وہ جب سے یہاں آئی تھی اسے کسی نے کم صورت نہیں کہا تھا حتیٰ کہ شاہ عالم نے بھی کبھی نہیں کہا..... ”کیا یہ لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں یا واقعی یہ سب بہت اچھے ہیں۔“  
”آپ آج کل کیا کر رہی ہیں.....؟“ فراز نے اسے خیالوں کی دنیا سے کھینچا۔  
”جی، میں..... ابھی تو گھر پر ہی مصروف ہوں لیکن اب آگے بڑھنے کا سوچ رہی ہوں۔“  
”اوہ..... گریٹ“ فراز نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔  
”کتنا خوبصورت کپل ہے ان کا۔“ اسے اپنے دل میں چھین سی محسوس ہوئی۔  
”وہاں سبھی ایک دوسرے کے ساتھ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ ثنا اور عادل، شاہنواز اور صبا کی تو بہت ہی خوبصورت جوڑی تھی..... ایک، ہم ہی بے جوڑ.....“ وہ نہ جانے کیوں سب کی نظروں میں عجیب سا طنز محسوس کر رہی تھی..... جب کہ وہاں سب اس سے بہت تپاک سے ملے تھے۔

”شاہ عالم بھائی اب تو ہمارے گھر آنے میں آپ کو کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ اب تو آپ بھی گھر والے ہو گئے ہیں۔“ صبا ہمیشہ ہی بڑے پُر صراف انداز میں بات کرتی تھی۔ ”بس مجھے نہیں پتا، اب آپ بھائی کو لے کر ہمارے گھر آ رہے ہیں۔ ورنہ آپ بھائی کو ڈرائیونگ سکھا دیں تاکہ وہ آپ کی محتاج نہ رہیں..... ورنہ آپ کے صوفیانہ ماحول میں رہ کر تو یہی پانگل ہو جائیں گی۔“ گویا صبا نے ہتے ہتے اس پر ہمراہ دیا۔ شاہ عالم نے ایک زوردار تہقید لگایا۔

”ہاں بھئی، اب تو میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ ان کو ڈرائیونگ سکھا دوں تاکہ آدھے کام تو یہ خود ہی کریں۔“ منہا نے صرف مسکراہٹ سے ہی کام لیا۔  
وہ اس رات سو ہی نہیں سکی۔ آج اس کا رونے کا جی چاہ رہا تھا ہر چیز بے رنگ لگ رہی تھی۔ ”شاہ عالم میری کوئی فکر نہیں ہے..... وہ سارا دن مصروف رہے تو ہی زندگی سمجھتے ہیں۔ شاید میں انہیں پسند نہیں ہوں۔“ او

رات بھر یہی باتیں سوچتی رہی اور آنسو بہاتی رہی.....  
جب کہ شاہ عالم کمری نیند سو رہے تھے۔

”سوبا.....“ شاہ عالم کے منہ سے آج اچانک اس کا نام نکل گیا۔  
”اوہ..... آئی میں منہا آج کھانے میں کیا بنایا ہے۔“ شاہ عالم نے سوبا کے نام کو بے پروائی سے جھٹکا لیکن آج منہا پر واقعی کچل کر گئی۔  
”سوبا.....؟ آخر کب تک یہ نام میری زندگی سے چڑا رہے گا۔“ منہا آج پہلی بار ان کے روبرو کھڑی تھی۔  
”کہا..... نہ س..... س..... سوری۔“ شاہ عالم نے بات ختم کی۔

”میں نے آپ سے جواب مانگا ہے۔“ وہ جذباتی ہونے لگی۔ ”آخر کب تک میرے ارمان، میرے جذبات، میرے احساسات کو آپ روندتے رہیں گے..... میں تھک گئی ہوں ان باتوں سے، لوگوں کی نظروں سے..... اپنے آپ سے..... آخر میرا قصور کیا ہے کہ سوبا کو سب کچھ ملا اور مجھے کچھ بھی نہیں۔ آپ نے اسے ہر طرح کا عیش دیا، سکون دیا، محبت دی یہاں تک کہ اسے دلڈنڈور پر بھی لے کر گئے۔“  
”یہ بات تم سے کس نے کہی؟“ شاہ عالم نے چونک کر پوچھا۔

”ندانے بتایا ہے مجھے کہ آپ اس کے ساتھ جی مون منانے والے ڈنڈور پر گئے تھے..... آپ بے حس ہو چکے ہیں اور مجھے بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے آپ میں تن رہتے ہیں میرا کوئی احساس نہیں ہے آپ کو۔“ شاہ عالم اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر رونے لگی۔ اس کا پورا جسم پانی طرح کانپ رہا تھا..... آج گویا وہ پھٹ پڑی تھی..... شاہ عالم اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن وہ اب خاموش نہیں رہنا چاہتے تھے۔

”ہاں، میں جانتا ہوں اسے سب کچھ ملا..... کیونکہ وہ میری زندگی کا پہلا ماہ تھا..... لیکن تم یہ تو جان

تھیں کہ میں نے اسے پوری دنیا گھمائی لیکن تم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میری زندگی اس کے ساتھ کیسی گزری ہے۔ ہم مہینوں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ ہفتوں ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھتے تھے۔ الگ الگ کمروں میں سوتے تھے جو سکون مجھے ان چار مہینوں میں تم نے دیا ہے وہ چار سالوں میں نہیں دے سکتی تھی۔“ شاہ عالم نے ایک گہری سانس لی۔  
”اس نے ہمیشہ اپنی انا کی دیوار کھڑی رکھی.....

اسے صرف دنیا اور دنیا داری سے محبت تھی۔ میں ایک بے قیمت چیز تھا اس کے لیے۔“ شاہ عالم پھر کچھ دیر کے لیے رکے۔ ”اور ہاں! ایک اور بات..... تم کہتی ہو اسے سب کچھ ملا..... ہاں اسے واقعی سب کچھ ملا لیکن تمہیں..... تمہیں میں ملا ہوں منہا میں ”شاہ عالم“ سوبا میرے دل میں بھی گھر نہیں کر سکی اور تم نے مجھے دونوں ہاتھوں سے جیت لیا ہے۔“ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور منہا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔

”میں آج صبا کے گھر جاؤں گی۔“ وہ سر جھکائے ناشتے کی ٹیبل لگاتے ہوئے بولی۔ کل رات کی بات سے وہ شرمندہ ہی تھی لیکن شاہ عالم کا سلوک پہلے جیسے ہی تھا۔

”اوہ گڈ..... چلو ڈرائیونگ سیکھنے کا فائدہ تو ہوا اب تم خود جاسکتی ہو.....“ وہ اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے لیکن اس نے سر جھکا لیا۔

”ارے آج صبا کے فلیٹ کا دروازہ کھلا ہے۔“ وہ حیرت سے دل میں سوچنے لگی۔ پہلے وہ شاہ عالم کے ساتھ بھی آچکی تھی لیکن ابھی..... وہ انہی سوچوں میں اندر داخل ہو گئی۔

”کیا بکواس کر رہی ہے تو..... میں نے تجھ سے کہا تھا نہ کہ اس بار بھی ساری خواہ مجھے دینا۔“ شاہنواز کی زوردار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ وہیں رک گئی۔



”کیوں، آخر کیوں؟ جب سے میں یہاں آئی ہوں تم نے مجھے غلام بنادیا ہے..... اور رعب بھی جاتے ہو۔ بچے نہ ہونے کی دوائیاں کھلا کھلا کرتے مجھے مرلیں بنادیا اور اب چاہتے ہو کہ میں ہی سب کچھ کروں۔ آخر تم کب تک پیسہ جوئے میں ہارے رہو گے۔“ صبا زور زور سے رونے لگی.....

”کم ظرف، زبان چلاتی ہے طلاق دے دوں گا تجھے.....“ شاہنواز نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔

”آف میرے خدا.....“ منہا گرتے گرتے پئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گاڑی میں بیٹھی تو اسے کچھ نہ آیا کیا کرے۔ وہ خوبصورت کپل جس کو دیکھ کر اسے شاہ عالم برے لگ رہے تھے وہ اندر سے ایسے نکلے..... سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اسی سوچ میں اس نے گاڑی نڈا کے گھر کی طرف دوڑادی۔ ڈور بیل دی تو ندانے ہی دروازہ کھولا۔

”ارے منہا بھابی.....!“ کہنے کو منہا ان ہی لوگوں کی عمر کی تھی لیکن شاہ عالم کی پوزیشن کے رعب میں سب ہی اسے بھابی کہتے تھے۔ ”کیا بات ہے؟ کچھ پریشان ہو؟“ ندانے اس کی اڑی رنگت دیکھ کر تشویش ظاہر کی۔ منہا صوفے پر دراز ہو گئی۔

”ندانم سے ایک بات پوچھوں.....؟“ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر لی۔

”ہاں پوچھو.....“ ندانے بیمار بچے کو جو چار سال کا ہوتے ہوئے ڈھائی سال کا لگتا ہے دوا پلاتے ہوئے بولی۔

”کیا صبا اور شاہنواز ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں؟“ بس وہ اتنا ہی کہہ گئی۔

”یہاں کون، کس کے ساتھ خوش ہے.....؟“ ندا نے ایک سرد آہ بھری۔

”یہ پردیس امریکا، لاس ویگاس جہاں کے لوگ خواب دیکھتے ہیں کہ ان کی بیٹیاں یہاں بیٹیاں جائیں وہ شاید یہ نہیں جانتے کہ یہ پردیس ان کی بیٹیوں کے لیے کتنا بڑا ناگ ہے جو انہیں پل پل ڈس رہا ہے۔ اپنا وطن

اپنا ہی ہوتا ہے۔ کچھ دکھ میں کم سے کم ہم انہوں سے قریب تو ہوتے ہیں۔ کسی سے کچھ کہہ تو سکتے ہیں یہاں.....!“ اس نے توقف کیا۔ ”یہاں ہم اسکے بیکل اکیلے..... پاکستان جا کر لڑائیاں اتر اتر کر رہے ہیں۔“ آف یہاں ڈسٹ بہت ہے، اندر بہت گرم ہے۔“ وہ یہاں پھر ادانوں سے بدتر حالت میں رہ رہی ہیں۔ آگ میں جل رہی ہیں..... مجھے یہ دیکھو دن بھر اپنے بیمار بچے کی بیمار داری کرتی ہوں کیونکہ جب یہ پیدا ہونے والا تھا تو میں ایک چڑا بنانے کے کارخانے میں کام کرتی تھی دن بھر وہاں کی خوشبو نے میرے بچے کو پیدا کئی بیمار کر دیا۔ اسے اگر یہی ہے کہ شدید سردی میں بھی اسے گرمی لگتی ہے۔“ ندانے اپنے آنسو پونچھے۔

”اور فراز..... وہ ایک ظالم شخص ہے..... بلکہ یہاں ہر مرد اور عورت ایک کمبخت والی زندگی گزار رہے ہیں۔ آدھا خرچہ شوہر اٹھاتا ہے اور آدھا بیوی لیں یونٹی گاڑی چلتی ہے۔“

”اور تمہارے ماں باپ.....“ منہا کی بات ادھوری رہ گئی۔

”ماں باپ مجبور نہ ہوں تو ہمیں اتنی مصیبت ہی نہ اٹھانی پڑے وہ تو یہی کہتے ہیں زندہ گئی ہوسر کے جی شوہر کے گھر سے نکلتا۔“

”آف میرے خدا.....“ منہا کا ضمیر اسے ڈسنے لگا۔

”شنا کا تو ہم سے برا حال ہے۔“ ندانے اس کو مزید جھنجھوڑا۔ ”اس کا شوہر ایک نمبر کا فلرٹ ہے۔ شنا پر شک کرنا، لڑائیاں گھمانا اور ان کے ساتھ عیاشیاں کرنے اس کا اولین شوق ہے۔ آہ..... ہم پردیسوں کی قسمت۔“ ندانے صوفے سے ٹپک لگائی۔

”منہا آپ سب سے زیادہ خوش نصیب ہو.....“ ندانے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ”بلکہ دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہو کہ آپ کو شاہ عالم بھائی جیسا شریک حیات ملا۔ ہم ان کو برسوں سے جانتے ہیں۔ انہوں نے ہر قدم پر ہماری مدد کی ہے۔ دس سال ہوئے ان کا گھر خراب ہوئے..... بڑی سے بڑی حسین

لوگیاں ان کے پیچھے پڑیں لیکن انہوں نے آج تک کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔“ ندانے رک کر سانس لی۔ اور خیالوں میں کھوتے ہوئے بولی۔

”جس دن وہ حج پر جا رہے تھے ہم سب ان سے ملنے گئے تھے ان کو مبارک باد دینے..... تب ہم سب نے ہی زور دیا تھا کہ اس بار پاکستان جائیں تو اپنی شریک حیات کو ساتھ لے کر آئیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے انہوں نے مسکرا کر کہا تھا کہ اس بار ضرور خانہ کعبہ کی چادر پکڑ کر اللہ سے گھر کا سکھ مانگوں گا اگر اللہ نے سن لی تو ضرور اپنی شریک حیات کو ساتھ لاؤں گا اور واقعی آپ ایسی ہی ہو کہ آپ کو خانہ خدا کی چادر پکڑ کر مانگا جائے۔“ ندانے بولی جاری تھی اور منہا کی آنکھوں سے درد کا سیلاب بہتا جا رہا تھا۔

”بہن! ندائیں کرو میں اس لائق نہیں ہوں..... میں نے تو قدم قدم پر خدا کی ناشکری کی ہے میں تو شاہ عالم جیسے فرشتہ صفت انسان کو بھی ہی نہیں۔ آج مجھے اپنی ماں کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ وہ اکثر کہتی تھیں۔ ”بیٹا خوش نصیب لڑکی تو وہ ہوتی ہے جس کا شوہر اس کا اپنا ہو بھر جائے وہ جہاں بھی ہو وہ سکون کی نیند سوتی ہے اور یہ نیند ہر لڑکی کو نہیں ملتی۔“ وہ راستے بھر روتی رہی۔

آج اسے ایک ایک پل صدیوں کے برابر لگ رہا تھا۔ مغرب کی اذان کا وقت ہو گیا تھا..... اس نے وضو کیا اور تہجد پڑھ لی۔

”اے اللہ تو مجھے معاف کر دے، میں نے اپنے فرشتہ صفت شوہر کو کھنص اس کی عمر کی وجہ سے دکھ دیے انہیں اپنے خاموش سلوک سے اذیت دی اور وہ پھر بھی میری قدر کرتے رہے۔ میں تو معافی کے بھی لائق نہیں ہوں۔“ وہ جھنجکیوں سے رو رہی تھی۔ اچانک ہی اسے اپنے کندھوں پر مضبوط ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا اس نے بچے مڑ کر دیکھا تو شاہ عالم مسکرا رہے تھے۔ اس کی ٹھیکڑ زمین میں گڑ گئیں، آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں سراسر ہے تھے۔ شاہ عالم اس کے قریب بیٹھ گئے۔ اس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ لے لیا۔

”مجھے معاف.....“ منہا کی بات پوری ہوئے

## سالیِ نومیں

شاہد اب کے سال نو میں ہو پوری آرزو اداس دل کی رفاقتوں کا کوئی پھول بھل ہی جائے کا نسا بھر کا نکل ہی جائے نئے سال میں غم جدائی کا داغ خوشی کے اشکوں سے وصل ہی جائے ہاں شاہد اب کے سال نو میں کوئی معجزہ ہو ہی جائے پیچھا ہے جو وہل ہی جائے

مرسلہ: نصیرہ آصف خان، ملتان

”اپنے انہوں نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ مت کہو، میں جانتا تھا کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ تم کیوں پریشان رہتی ہو..... اس لیے میں نے تمہیں آزاد چھوڑ دیا تا کہ تم خود اپنی آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھو اور سمجھو اس کے بعد میرے قریب آؤ..... جانتی ہو جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو مجھے سوا سے شدید نفرت ہو چکی ہے۔ میں اسے بھول چکا ہوں، میں تو سوچتا ہوں کہ کاش دس سال پہلے تم مجھے مل جاتیں تو میری زندگی کتنی پرسکون گزرتی..... مجھے صرف تم سے محبت ہے۔“ منہا نے شاہ عالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور شاہ عالم نے اس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

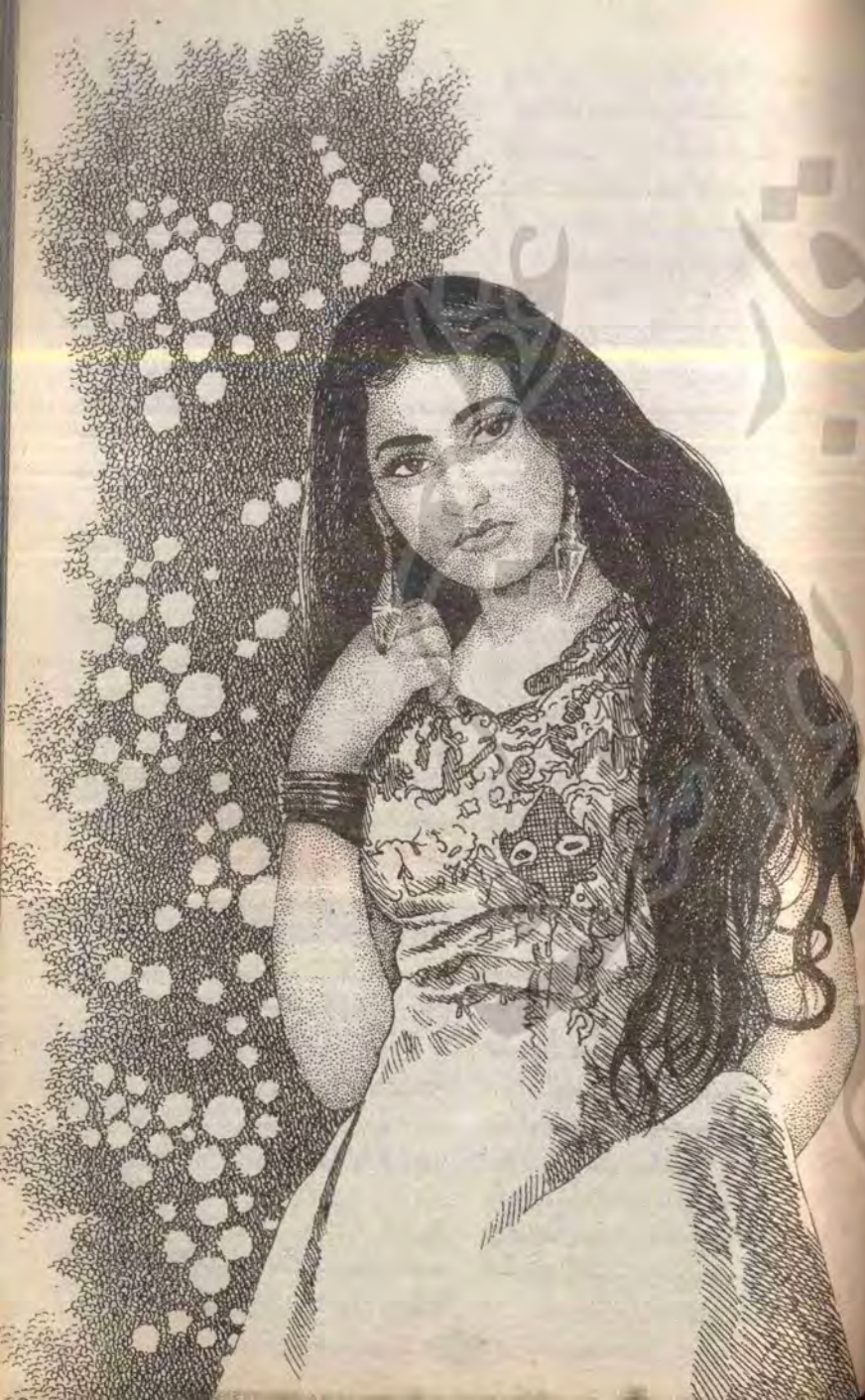


گرگہوا

عالیہ بخاری

گارمنٹ فیکٹری کی ملازمت ان تینوں کے درمیان دوستی کی بنیاد بنی تھی۔ ایچ سیون کی بس میں، شہر کے تین مختلف حصوں سے چڑھنا اترنا، ان تینوں ہی کا روز کا معمول تھا مگر ”بنتی روشنی“ اسکول والے اسٹاپ ڈال کر وہ تینوں آپس میں بیٹا کچھ کہہ اپنا اپنی منزل کی سوئے اتفاق ان تینوں کے علاوہ اس اسٹاپ پر کوئی اور مسافر اس وقت نہیں تھا۔ ایک دوسرے پر چبکاتی سی نگاہیں ڈال کر وہ تینوں آپس میں بیٹا کچھ کہہ اپنا اپنی منزل کی

ناولٹ





طرف روانہ ہو سکتی تھیں چند منٹ میں ہی اندازہ ہو گیا کہ منزل مقصود غالباً ایک ہی ہے۔

”ستار بھائی کی گارمنٹ فیکٹری میں جا رہی ہیں؟“ گنبد کا اتنا پوچھ لیتا ہی ابتدائی تعارف کا بہانہ بن گیا۔ ان دونوں کے ہاتھ میں تھامے ہوئے اپنے جیسے سستے پرس اور پلاسٹک کی ٹبلی میں رکھا بیج باکس دیکھ کر اس نے جو اندازہ لگا یا تھا وہ بالکل درست تھا۔

ستار بھائی کی فیکٹری میں یہ ان تینوں کا پہلا دن تھا۔ نیا اسکول، نیا محکمہ، نئی نوکری اور نئی رشتے داری کا آغاز کرتے ہوئے جو فطری سی گھبراہٹ دل پر طاری ہوتی ہے، وہی ان تینوں کو ایک دم قریب لانے میں مددگار ثابت ہوئی تھی۔

”سنا ہے ستار بھائی، کام کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ درکار کو سارا دن، ذرا سا بھی ریست نہیں لینے دیتے؟“ بھیلہ نے ستار بھائی سے جڑی سب سے معروف ”خوبی“ پریشان کن سے لہجے میں بیان کی۔

”ارے کچھ نہیں ہوتا، دو چار دن لگتے ہیں سیٹ ہونے میں، میں پہلے بھی کام کر چکی ہوں، ہر وقت مالک تھوڑی سر پریشیے رہتے ہیں، چار فیکٹریاں ہیں ان کی، میں پہلے دوسری فیکٹری میں کام کرتی تھی ان کی، سارا سسٹم اچھی طرح سمجھتی ہوں!“ اپنا تکی جگہ والا خوف خونی سے چھپا کر گنبد نے اپنی دونوں ساتھیوں کی طرف ذرا آخریہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ دونوں پہلی بار، بغرض ملازمت لگتی تھیں، گنبد کی اس سیناریو سے بے حد متاثر ہوئیں۔

”پھر وہ نوکری تم نے کیوں چھوڑ دی؟“ شالی نے فوراً ہی پوچھا۔

”لو چھوڑ دی کہاں، وہ تو فیکٹری ہی دوسری جگہ شفٹ ہو گئی۔ بہت دور پڑتی تھی ورنہ انچارج تو بہت خوشامد کر رہی تھی کہ میں ان کے ہاں کام نہ چھوڑوں، میرے جیسی ورکر.....!“

اسناپ سے فیکٹری تک کے فاصلے کو طے کرتے ہوئے وہ تینوں اپنا درمیانی فاصلہ ختم کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہی تھیں۔ فیکٹری میں ان کی شناخت کا

سبب یہی دوسری ٹھہری جو محض اتفاقی وجود میں آ گئی تھی۔ مزاجاً بے حد مختلف ہونے کے باوجود بھی ایک جڑ جوتیوں میں مشترک تھی، وہ تھیں ان کے حالات زندگی بد حالی اور ذلت داریوں کا بوجھ، ان تینوں کو یہی یکسانیت، بہت تیزی سے قریب لائی تھی۔ یکساں امارت فاصلے پر بڑھائی ہے مگر ایک سی تنگ حالی بڑی جلدی سارے تکلف اور فاصلے ختم کر دیتی ہے۔ نہ ہی گنبد کو ان دونوں سے آئے دن بس کا کرایہ مانگنے میں جھجک رہی، نہ ہی بھیلہ کو گنتی کے چار جوڑوں کو بار بار پہن کر آنے میں کوئی شرمندگی ہوتی اور نہ ہی شالی کو اپنے بیج باکس میں پرانے کے ساتھ صرف اچار رکھ کر لانا ہی برا لگتا۔

سارا دن مشینوں کی گھر گھر، میں گھرے رہ کر بھی وہ لوگ اتنی ڈھیر ساری باتیں کرنے کے لیے وقت نکالے ہی رکھتی تھیں۔ انچارج سیکرٹ آپا نے پہلے پہل تو ان تینوں کو بڑے سارے ہال کے تین مختلف کونوں میں بٹھایا، ان کی تجربہ کار آنکھوں نے پہلے ہی دن ان لوگوں کی آپس کی ٹیکسٹری کو بھانپ لیا تھا۔ اس طرح کی دوستیاں، کام میں رخنہ کا سبب بنتی ہیں اور کسی پرائیویٹ سیکٹر میں یہی بات سب سے زیادہ ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ یہاں روزگار ٹارگٹ سامنے ہوتا جسے پورا کر کے مالکوں کو دنیا ہی پڑتا، بعض اوقات تو اوور ٹائم بھی کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔

”دیکھ لیتا، ان سیکرٹ آپا کو تو میں کیسے خشتے میں اتارتی ہوں، مگر ہی مت کرو!“ گنبد نے اپنا دھوکا کر دکھایا اور مہینہ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ وہ لوگ بالکل ہی قریب قریب کی سیٹوں پر بیٹھنے لگیں۔

”لوگ کیاں سختی ہیں اور خوش اخلاق بھی، ورکر اپنا کام لگن اور ایمانداری سے کرے تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر اس کا پیچھا پڑے رہیں۔“ سیکرٹ آپا نے کام کرنے والی دوسری عورتوں کے سامنے ان تینوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ اب گنبد اور بھیلہ بالکل آگے پیچھے بیٹھنے لگی تھیں اور شالی ان کے دائیں ہاتھ پر۔ ”میں نے کیا کہا تھا، سیکرٹ آپا کو ٹبلی میں لیتا ہوا

کا ہے۔ تم دونوں بے وقوف تو بے کار میں ہی گھبرا رہے ہو۔“ گنبد کی ”سیناریو“ واقعی بڑے کام آئی تھی۔ شالی اور بھیلہ نے اس کی بالادستی، دل و جان کے ساتھ قبول کی تھی۔ گنبد بولتی بھی بہت تھی اور عاداتاً شوخ بھی تھی۔ بہت دیر تک ایک جگہ بیٹھے رہنا بھی اس کے لیے مشکل کام تھا۔ اپنی پیاری دوستوں کو چھوڑ کر، موقع ملے ہی وہ ادھر ادھر چکر لگاتی اور چند منٹوں میں ہی ڈھیر ساری خبریں جمع کر لاتی۔



”بائیں ہاتھ والی لائن کے بالکل آخر میں بیٹھنے والی سلی کے میاں نے آج پھر اسے پیٹا ہے۔ آنکھ کے قریب تیل پڑا ہوا ہے۔ بہت زور رہی ہے غریب!“ اس روز کی تازہ خبر تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے اس کے میاں کا، بے چاری اتنی شریف اور سیدھی سادی ہے، سارا دن سر جھکائے کام میں لگی رہتی ہے!“ بھیلہ کو کن کر بڑی ہی ناؤ آیا۔ سلی واقعی بڑی شریف عورت تھی محض اپنے کام سے کام رکھنے والی مگر قسمت میں لکھا کھ، محض خویوں کا مردانہ منت کب ہوتا ہے؟ تو کوئی اور ہی سلسلہ ہے۔ ”اس کا میاں کہتا ہے کہ تین سال میں ایک بچہ بھی پیدا نہیں کر سکی ایسی عورت کس کام کی، کسی وقت بھی ٹال باہر کروں گا!“ بے نیازی سے سر جھٹک کر گنبد نے سلی سے سنا فخر و من و عن توہرایا۔

”کینہ کہیں کا!“ پاس بیٹھی شالی کے کان بھی ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ ”بے چاری سلی کا کیا قصور، ایک تو اس کٹھن، آوارہ آدمی کو کما کر کھلا رہی ہے پھر بھی کٹھن نہیں لینے دیتا۔ میں تو کہتی ہوں اس سے پہلے وہ کما لے، سلی کو خود دیکھ گی کا فیصلہ کر لینا چاہیے!“ شالی نے شادی کے محض تین ماہ اور سترہ دن بعد شوہر نے اسے بار کر گھر سے باہر کر دیا تھا۔ سواب وہ اپنی زحی انا کی عمر بٹی کے لیے زمانے بھر کی عورتوں کو ایسے ہی محنت سے دیا کرتی تھی۔ اپنی ستم نظریاتی کا قصہ مختصر الفاظ میں تو اس نے پہلے ہی دن، ان دونوں کو سنا دیا تھا مگر تعلیمات تقریباً روزانہ ہی دہرائی جاتی تھیں۔

”مرد اگر فطرتاً گھٹیا ہے تو وہ ہمیشہ گھٹیا ہی رہے گا۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں تاکہ ممبر کرو، وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ محض طفل کشی والی بات ہے۔ میں نے ویسے کے اگلے دن ہی بڑی بہن سے کہہ دیا تھا کہ اشرف کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی مرضی کہیں اور تھی محض خالہ خالو نے زبردستی شادی کی ہے مجھ سے!“ گردن موڑ کر پیچھے بیٹھی، آنسو صاف کرنی سلی کو دیکھ کر، شالی کو پھر سے چھپتاوے گھیرنے لگے۔

”مگر میری آپا! لگی ہاتھ پاؤں جوڑنے کے بس اب کسی اور کے سامنے کوئی لفظ منہ سے نہ نکالو، سب ٹھیک ہو جائے گا آہستہ آہستہ، مرے ہوئے باپ کی عزت کا واسطہ دینے لگی پھر جب تین ماہ بعد اس اشرف نے دھکا مارا کر دروازے سے باہر کیا۔ اس وقت سر پر نہ برقع نہ چادر، کلی میں جھڑول لگانی بختو نے اپنی چادر میرے سر پر ڈالی۔ اس وقت ابا کی عزت کو بہت چار چاند لگے!“ شالی کی آواز رنڈھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہوا بھی بہت برا تھا۔

”دفع کرو اس قصے کو، کیوں بار بار یاد کر کے خود کو دکھی کرتی ہو۔ وہ تو آرام سے رہ رہا ہوگا۔ اپنے کیے پر ذرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر تم یوں ہی آدھا وقت جل کر اور باقی آدھا وقت رو کر اپنی جان گھلائے دے رہی ہو!“ بھیلہ نے اس کے شانے کو زری سے تھپتھپایا۔

”سنا ہے، پھر سے اسی عورت کے ہاں آنا جانا بڑھ گیا ہے اس کا، گھر سے بھی بھاگا رہتا ہے اور نوکری سے بھی، کیا خبر نکاح بھی پڑھوایا ہو!“ نظریں پٹی کیے، وہ ہلکے سے بولی تو گنبد ایک دم ہی ہنس پڑی۔

”تم اس کے بارے میں خبریں ساری رکھتی ہو۔ آخر ضرورت کیا ہے؟“

”خبر کیا رکھتی ہے، خاندان ایک ہے۔ رشتے دار آتے ہیں تو خود ہی پتا جاتے ہیں!“ ایک شندھی سانس لے کر شالی سامنے رکھی مشین کی طرف پھر سے متوجہ ہو گئی۔

”اچھا اب سیشن ختم، ابھی تم لوگوں کو چکن پیٹیز کھلوانی ہوں لی بریک میں، سامنے والی بیکری میں



بڑے زبردست بنتے ہیں۔“ نگینہ نے کہا۔

”تم نے کب کھائے؟“ بجیلہ نے مشکوک سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کھالیے ہیں، کسی کی مہربانی سے!“ وہ جواباً پھر سے ہنس پڑی اور پھر ”ابھی آئی“ کہہ کر باہر کی طرف چلی گئی۔

شالی اور بجیلہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے، دوبارہ اپنے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ نگینہ، واقعی دومنٹ میں ہی واپس آ گئی تھی۔ سیکنڈ آپا، بی بریک سے ذرا پہلے راؤنڈ لیتی تھیں چند منٹ میں ہی ان کا راؤنڈ شروع ہوا، وہ دہائیوں بڑے انتہاک سے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

”شباباش، اسی طرح محنت سے کام کرتی رہو، جلد ہی تمہارے پیسے بھی بڑھو ادوں گی اور چاہو گی تو ادور ٹائم بھی دلا دوں گی۔“

”ہمارے لیے تو یہی انعام ہے کہ آپ ہم تینوں سے خوش ہیں ورنہ ادھر ستار بھائی کی دوسری فیکٹری کی انچارج صفراں آپا! آف تو یہ!“ چالیس سی مسکراہٹ کے ساتھ نگینہ نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایمان سے سیکنڈ آپا، اتنی بدتمیز عورت شاید آپ نے بھی دیکھی بھی نہ ہو۔“

”ارے دیکھ رکھی ہے میرے پاس ہی تو کام کر کے گئی ہے۔ معلوم نہیں کیسے انچارج بن گئی وہاں میں نے تو اسے بھی منہ نہیں لگایا تھا۔“ سیکنڈ آپا کی وہی روایتی سی ”پرفیشنل جیلسی“ تھی۔ جذباتی ہو کر، چند منٹ اسی میں الجھی رہیں۔ وقت کا یہ چھوٹا سا وقفہ، وہیں کھڑے کھڑے تمام ہو گیا۔ جہاں تک وہ نہیں جاپاتی تھیں وہاں بیٹھی ساری ورکرز نے بھی سکون کا سانس لیا۔

”نگینہ، بی بریک کے بعد تم سارے میں ایک چکر لگا کر مجھے رپورٹ دینا، آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ذرا۔“ ہدایت دے کر، وہ واپس مڑ چکی تھیں۔ ایک طرف پارٹیشن کر کے ان کا چھوٹا سا آفس قائم تھا۔ چکن پیٹیز واقعی چائے کے ساتھ موجود تھے اور دو نہ چار

پورے درجن بھر!

”اتنے سارے ہم کیسے کھائیں گے؟“ بجیلہ سنا کچھ الجھ کر، ان مہک اڑاتے، گرما گرم پیٹیز کی طرف دیکھا۔

”کچھ ہم کھائیں گے اور کچھ دوسروں کو کھلا دیں گے۔ سسلی بے چاری آج بہت رو دھو کر بیٹھی ہوئی ہے اسے دے کر آئی ہوں اور دو پیٹیز جا کر سیکنڈ آپا کو کھلا دیں ہوں۔ دیکھنا کیسی خوش ہوئی ہیں!“ وہ مزے سے مسکراتی ہوئی چل دی۔

معلوم نہیں اتنے سارے پیسے اس کے پاس آئے کہاں سے تھے۔ ورنہ آئے دن تو اس کا لبر کا کرایہ بھی ان ہی دونوں میں سے کوئی ایک بھر اکتا رہتا۔ نگینہ واپس آئی، تو بجیلہ نے سب سے پہلے یہی سوال کیا۔

”میرے پاس کب تھے پیسے۔ کسی سے فرمائش کی تھی۔ بے چارہ سر کے بل دوڑا گیا پوری کرنے کے لیے!“ نگینہ کے چہرے پر بڑی فحش سی مسکراہٹ تھی۔ ”بہت بری بات ہے نگینہ!“ بجیلہ کے حلق میں وہ خوش ذائقہ پیٹیز چھٹنے لگا۔ ”بیچ خراب ہوتا ہے ایسی باتوں سے۔ ہم یہاں کام کرنے آرہے ہیں۔ ایسی ویسی باتیں نہیں بنی چاہئیں۔“

”ارے سب چلتا ہے۔“ نگینہ نے ہاتھ ہلار چیسے کھینچی اڑائی۔ ”کام تو کر ہی رہے ہیں۔ تھوڑی سی دل لگی بھی ساتھ چلے تو کیا حرج ہے!“ بجیلہ کو پتا تھا کہ کوئی ایسا ہی جواب سننے کو ملے گا۔

نگینہ اور مزاج کی لڑکی تھی۔ شوخ، زندہ دل اور انتہائی غیر محتاط۔ اس کی محلے کے کتنے ہی چھوٹے موٹے عشق بھگت چکی تھی، اپنے دوا انتہائی بد مزاج بھائیوں کی خاطر میں لائے بغیر۔ میٹرک میں تین سال مستقل دل ہونے کے بعد اس کا خالی گھر میں جیسا اور بھی خراب لگنے لگا تھا بھائیوں کو۔ سو وہ اس... تاکا بھائی سے بچانے کے لیے نوکری کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

”اچھا ہے صبح سے شام تک وہیں رہے گی پابندی

پھر عورتوں میں ہی سارا کام ہے!“ ایک بھائی نے ستار بھائی کی چاروں فیکٹریوں کا دورہ کر کے یہ بیان منہ پر رپورٹ مرتب کی تھی مگر نگینہ کے لیے ”دو ماہ“ کا گزیر تھا۔

”جی بات ہے زندگی میں کوئی چاہنے والا نہ ہو تو زندگی بالکل بے کار ہے۔ کوئی میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے پیچھے پھرے تو دماغ خود بخود وسا تو اس آسمان پر جا پہنچتا ہے۔ مجھ سے تو ایسی روکھی جھپکی زندگی نہیں گزارا جاسکتی۔ معاف کرو!“ لڑکیوں کے اخلاق و کردار کی اہمیت پر ایک چھوٹی سی تقریر جو بجیلہ نے اس کے سدھارنے کی غرض سے کی تھی اس کے جواب میں نگینہ نے ہاتھ جوڑے۔

”تو پھر سیدھے سیدھے شادی کرلو، کرتی رہنا مارے ارمان پورے۔ مگر یہ سب تو ٹھیک نہیں ہے!“ بجیلہ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ ایک ہی سانس میں چٹ چٹ چٹ گئی۔

”شادی بھی ہو جائے گی۔ ابھی تو زندگی کو انجوائے کریں اور کوئی برائی بھی تو ہو۔ بس یوں ہی تھوڑا سا دل خوش کر لیتے ہیں اور کیا.....!“ نگینہ کو سمجھانا آسان نہیں تھا۔ بجیلہ کو اس کے مزاج پر حیرت ہوئی تھی اسے یہ ذہن بھی نہیں لگتا تھا کہ کل کو اس کے شوہر کو ان باتوں کا ذرا سا سبھی علم ہوا تو کتنا برا ہو گا۔ خود اس کا تو دور دور ہی کوئی ایسا سلسلہ نہیں تھا۔ پھر بھی احمر کی جواب طلبی کا خوف ہر وقت ہی سر پر سوار رہتا تھا۔ اسے وہیں بیٹھے بیٹھے احمر یا تو دل بڑی زور سے دھڑک اٹھا۔

”معلوم نہیں، اس کے آج کے انٹرویو کا کیا بنا گا؟ اس بار تو بات بن ہی جائے خدا کرے۔“ کتنے ہی سارے نفل اس نے احمر کی کامیابی کے لیے مان گئے تھے۔ جانے کیا مسئلہ تھا جو صل ہونے کا نایام نہیں سمجھتا تھا۔ اختفاری طوالت جب اسے تھکانے لگتی ہے تو سب چارے احمر کی ٹینشن کی وجہ تو سمجھ ہی آتی ہے۔ احمر کے نام کے ساتھ سوچ کا لائق اتنا ہی سلسلہ جڑا ہوا تھا اس کا دل پھر کسی بات میں سارا دن لگ ہی نہیں سکا۔ شالی اور نگینہ نے ایک آدھ بار، اس کی غائب دماغی کو نوٹ

کر کے پوچھا بھی مگر وہ نال گئی۔

چھٹی کے وقت وہ تینوں ایک ساتھ ہی بڑے ہال سے باہر آئیں۔ باہر کچھریل کے چھجے والا لہسا سیدھا آج تھا جس پر گہرے پیلے رنگ کے پھولوں والی تیل بنا روک ٹوک کے پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ لڑکیاں اس برآمدے میں رک کر اپنی صحن کو دور کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔

چادریں، اسکارف سنبھالتے ہوئے، وہ باتیں بھی کرتی جاتی تھیں جو سارا دن میں نہیں ہو پاتی تھیں۔ بجیلہ، نگینہ اور شالی ایک ساتھ ہی فیکٹری سے نکلا کرتی تھیں۔ مگر اس وقت نگینہ نظر نہیں آ رہی تھی شالی، کیاؤنڈ طے کر کے اس کے آگے گٹ تک دیکھ کر بھی آئی مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”نگینہ.....! اسے تو میں نے اس طرف جاتے دیکھا تھا۔“ ایک ساتھی لڑکی نے بجیلہ کے استفسار پر برآمدے کے دوسرے سرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ اس طرف فیکٹری کا آفس تھا جہاں فیکٹری کے حسابات چیک کرنے کے لیے دو کلرک بیٹھا کرتے تھے۔ لڑکیاں عموماً اس طرف نہیں جایا کرتی تھیں۔ ان کا تمام تر ساتھ سیکنڈ آپا کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ نگینہ کو وہاں سے ایسا کون سا کام پڑ گیا تھا؟ شالی اور بجیلہ دونوں ہی کو کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چند منٹ بعد نگینہ خود ہی آ گئی۔

”کچھ نہیں، بس معلوم کر رہی تھی کہ اگر مفتے میں چادر دن اور ٹائم کریں تو مفتے میں کتنے پیسے بن جاتے ہیں!“ بے پروائی سے کہتے ہوئے وہ اپنی چیزیں اٹھانے لگی۔

”یہ بات تو تم سیکنڈ آپا سے بھی پوچھ سکتی تھیں۔“ شالی اعتراض کے بغیر نہیں رہ سکی۔

”وہ صحیح تھوڑی بتاتیں، بڑی صفائی سے یہ انچارج لوگ کوئی کر سکتی ہیں۔“ نگینہ نے کہا۔

”اچھا!“ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی، وہ دونوں اس سے متفق ہو گئیں۔



بجیلہ گھر پہنچی تو حسب معمول سناٹا تھا۔ دروازہ



”پتا نہیں، میں نے تو پوچھا نہیں، شاید اماں کو معلوم ہو۔ میں تو کھانا پکا رہی تھی۔“ صدف نے سہ پروائی سے جواب دیا۔

”کیا پکایا تھا؟“ جیلہ نے پوچھا۔  
”آلو پالک اور مونگ کی دال!“ صدف نے بتایا۔

”امی سے کہہ کر قید ہی منگوا لیتیں!“ جیلہ کو افسوس سا ہوا، آج احمر نے کتنے ہی دن بعد یہاں کھانا کھایا تھا۔

”مہینہ ختم ہو رہا ہے آپنی اور ابھی پہلی آنے میں تین دن باقی ہیں۔“ صدف کے جواب کے بعد بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ اما کی پشن اور اوپر بنے ایک کمرے، کچن، واش روم کا مختصر سا کرایہ، گھر کی گزر بسر کچھ تنان کر ہی محدود رقم میں ہو رہی تھی۔ کئی سال سے اس نے گھر پر ٹیوشن کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا مگر آس پاس بسنے والوں کے حالات بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ کوئی بھی سودو سو سے زیادہ دینے کو تیار نہیں ہوتا تھا اور اس پر بھی ایک بڑے بچے کے ساتھ کسی چھوٹے کو منسلک کر دیا جاتا۔ ”اسے بھی بٹھالو، کچھ تھوڑا بہت بتا دیا کرو اسے بھی!“ وہ مارے مروت کے منے میاں کے ساتھ بھی دماغ سوزی کیے جاتی۔

ظہر سے کھلا کتب، عشا تک چلتا ہی رہتا اور مہینے کے آخر میں ہاتھ آتے محض پانچ سو روپے کٹک آ کر اسے سوشل ورک کا یہ سلسلہ بند ہی کرنا پڑ گیا۔

اب یہاں ستار بھائی کی گارمنٹ فیکٹری میں اگر وقت کا دورانیہ لمبا تھا تو کم از کم پیسے بھی اتنے تو مل ہی رہے تھے کہ فراغت کا احساس ہونے لگتا تھا۔ مہینے کے ابتدائی ہفتے میں ہی سہی۔ پچھلے مہینے اس نے اپنے امی اور صدف کے لیے کاشن کے سوٹ خریدے، پانچ سو روپے احمر نے ادھا کر لیے۔ اس سے پچھلے مہینے میں احمر کی ساگرہ تھی۔ پچھو کنی دن پہلے سے یاد دلانا شروع کر دیتی تھیں۔ انہیں بڑا ارمان ہوتا تھا کہ احمر کے لیے عیدی، بقر عید کے علاوہ ساگرہ اور نئے سال پر بھی ہونے والی سسرال سے ”گفت“ آئیں۔ جیلہ کو امی کا

صدف نے کھولا تھا۔ ”اسی برابر والی خالہ کے گھر گئی ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے!“ اس نے جیلہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اطلاع دی۔

”اچھا!“ وہ کچھ چپ سی ہو گئی۔ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ امی کا یہ وقت اکثر ہی اس طرح کے خیر گالی دوروں میں گزرتا تھا اور اب عصر کی نماز کے لیے نکلنے تو عشا پڑھ کر ہی گھر آتے۔ پہلے تو بھی ایسا محسوس نہیں ہوا تھا مگر آج ایک دم ہی اس کو صدف کا اتنی دیر گھر پر اکیلے رہنا کھلا تھا۔ وہ کم عمر تھی۔ انٹر کا پرائیویٹ امتحان دے رہی تھی۔ پڑھنے کی کوئی خاص شوقین بھی نہیں تھی۔ فرصت اور تنہائی دونوں ہی اس عمر میں غلطی کا کوئی امکان پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

”کوئی آیا تو نہیں تھا؟“ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے، جیلہ نے کچھ اندازہ لگانا چاہا۔

”احمر بھائی آئے تھے، کافی دیر بیٹھے رہے۔ تمہارا پوچھ رہے تھے!“ صدف نے کہا۔

”کب آئے تھے۔ کیا ابھی.....؟“ بہت مشکوک سا ہو کر اس نے پوچھا۔

”ابھی کہاں، وہ تو دوپہر کو آئے تھے۔ بہت دیر امی کے پاس بیٹھے رہے، دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا، میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں!“ وہ بے پروائی سے کہتی ہوئی کچن کی طرف مڑ گئی جیلہ کو اطمینان بھی ہوا اور شرمندگی بھی۔

”خدا نہ کرے، ہر ایک خراب ہی تھوڑی ہوتا ہے اور احمر تو بالکل بھی نہیں، بے حد محبت کرتا ہے مجھ سے بچپن کی مٹکئی ہے کوئی مذاق تھوڑی ہے۔“ خود کو باور کراتے ہوئے اسے سارا تصور رنگینہ کا نظر آنے لگا۔

”گنہگار کی دوستی، دماغ میں ایسے الٹے سیدھے خیال بھر رہی ہے کہ ہر ایک بات پر شک سا ہونے لگا ہے۔ پھر بھی صدف کا اتنی دیر تک گھر پر تنہا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بات امی کے ضروری گوش گزار کرنی ہے۔“

”احمر کا انٹرویو کیا ہوا.....؟“ صدف چائے لے کر آئی تو اس نے بڑی امید سے پوچھا۔



ٹینشن دور کرنے کے لیے کئی ماہ پہلے ہی سے بچت شروع کرنی پڑی تھی۔ اس بار ذرا آسانی رہی تھی۔

احمر کے لیے تحائف تو ایسے چلے گئے تھے جیسے پر بانی مبینہ ہاتھ ذرا کھینچ کر رکھنا پڑا تھا۔ اب اس مبینے کے لیے بھی اس کے ذہن میں کئی پروگرام تھے۔ ابا کے لیے دو نئے سوٹ، ذرا اچھے پیڑے کے، ان کے سارے ہی جوڑے دھل دھل کر اپنا رنگ کھو بیٹھے تھے۔ بجیلہ کو پتا تھا کہ وہ نہ تو کبھی کسی کی کا اٹھارہ کریں گے اور نہ ہی خود سے اپنے لیے کچھ خرید کر لائیں گے، یہ کام اسے ہی کرنا تھا۔

”اور کیا خبر، احمر بھی پانچ سو واپس کر دے تو پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہے۔“ اس نے دل ہی دل میں کچھ اور جمع جوڑی۔

احمر اس بار اتوار کو آیا۔ بجیلہ گھر رہی تھی۔ صدف صفائی کر رہی تھی اور وہ خود جلدی جلدی کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ کام سے فارغ ہو کر بازار جانے کا پروگرام تھا۔ احمر دروازے سے سیدھا پچن میں چلا آیا۔ ”شکر ہے، تم گھر پر ملیں تو سبھی بہت دل لگتا ہے تمہارا اپنی ٹیکسری میں!“ اس کا لہجہ جیستا ہوا تھا مگر آج وہ اسے دن بعد دکھائی دیا تھا کہ وہ اس خوشی میں بہ آسانی اس کے طنز کو نظر انداز کر گئی۔

”کیسے ہو، پچھو کو بھی لے کر آتا تھا، کتنے دن ہو گئے ان سے ملے ہوئے!“ گوان کے ہاں کوئی پابندی نہیں تھی اور پچن کی اس مفتی کو بڑے سرسری سے انداز میں لیا جاتا تھا مگر وہ خود ہی شروع سے ان کے ہاں جانے میں بڑی محتاط رہا کرتی تھی۔ پچھو، ان کی بیٹیوں اور خود احمر کو اس بات کا گلارہ ہوتا تھا۔

”اگر وہ نہیں آئیں تو تم کون سا انہیں پوچھنے کے لیے چلی گئیں۔ انہیں تو دیسے بھی گھر سے نکلنے کی عادت نہیں ہے!“ بجیلہ مسکراتے ہوئے اس سے چائے کا پوچھنے لگی۔

”چائے تو پیوں گا مگر کھانا بھی کھاؤں گا، آج مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں!“ باہر برآمدے میں سے امی، احمر کو آواز دے رہی تھیں۔ ابا گھر پر ہی

تھے اور انہیں یہی خدشہ ہو رہا تھا کہ احمر کو ہاں بجیلہ کے سر پر کھڑا دیکھ کر وہ حسب عادت اعتراض کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

احمر ان کے پاس چلا گیا تو بجیلہ نے آج کے ”مینو“ پر نظر ثانی کی۔ فقط آلو، پیٹنگن اور روٹی، کچھل بار بھی جب وہ اس کی غیر موجودگی میں آیا تھا تب بھی، دال پاک کھا کر گیا تھا۔ آج تو کچھ عطا کرنا لازمی تھا۔ ”اب یہ آکر بیٹھے گئے ہیں، بازار جانا تو کیا ہماڑ میں!“ صدف بے زاری ہوئی پچن میں آئی تو وہ پرس میں سے نکال کر لائے پیسے پکڑے کھڑی تھی۔

”برابر میں خالہ سے کہنا کہ کسی کو بیچ کر ایک کو چاول اور ایک ہی کلو پچن منکوادیں اور ساتھ میں.....!“ ایک چھوٹی موٹی سی لسٹ، اس ہنگامی دعوت کے سلسلے میں تیار ہوئی تھی۔

”بہت پیسے خرچ ہو جائیں گے آپا، احمر بھائی کوئی مہمان تھوڑی ہیں اور ان کے اپنے گھر میں ایسا کیا کیا ہے۔ کچھل بار جب میں اور امی گئے تھے تو پچھو نے بغیر گھما کر ہی ہوئی دال سامنے رکھ دی تھی، نہ چاول نہ کوئی سلا اور چٹنی، بس روٹی کے ساتھ دال کھا کر تم واپس اپنے گھر آ گئے تھے۔ پچھو کے ہاں کی مدارات صدف کے دل کو بڑی لگی تھیں۔ آئے وقت اسی کا قصہ پچھلے رکتی چھوٹے سے محسن کے اس طرف برآمدہ تھا۔ یہاں سے وہاں آواز جانے میں کون سی دیر لگتی۔ بجیلہ کو اس کو خاموش رکھنے کے لیے ہاتھ تک جوڑنے پڑے۔

”بہت اچھی بہن ہے میری، شاباش خالہ کے ہاں چلی جا بھاگ کر!“ صدف منہ بنائی ہوئی پانچ سو کے نوٹ کو ہاتھ میں تھام کر گئی تو اسے تھوڑا اطمینان ہوا۔

صدف کو بازار نہ جانے کا بڑا ہی رنج تھا۔ اس غریب کے پاس آنے جانے کے چند گئے چنے یا ”آپٹن“ ہوتے تھے وہ سب سے زیادہ جوش و خروش اسے بازار کے نام پر ہی محسوس ہوتا تھا۔ نت نئے سامان سے نئی دکانیں، آرٹیفیشل جیوری کے اشال، چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے بھاؤ تاؤ کرنے میں اسے بڑا مزہ آتا اور اپنے لیے کی ہوئی شاپنگ، خواہ وہ کتنی ہی تھوڑی

کیوں نہ ہو اسے بہت ساری خوشی فراہم کرتی تھی۔ آج کا پروگرام بری طرح خراب ہوا تھا۔ ”کھانے کے بعد چلے چلیں گے۔ پوری شام وہی ہے ابھی تو!“ پچن بریانی پکاتے ہوئے، بجیلہ اسے دلاسا دینے لگی۔ مگر اس کا موڈ ٹھیک ہونا تھا نہ ہوا۔ ”ابھی کھانا کھاتے کھاتے تین بج چکے ہیں اور پھر احمر بھائی کا چائے کو دل چاہ جائے گا۔ دو تین بار برا کر بیٹیں گے۔ پھر کہیں عصر کے بعد وہ یہاں سے اٹھیں گے، دیکھ لیتا۔“ سابقہ تجربات کی روشنی میں اس نے پوری قطعیت کے ساتھ پیش گوئی کی۔ اس بار بجیلہ جوا خاموش رہی تھی۔

ابا کو کوئی بلانے آ گیا تھا۔ اب ان کی واپسی ظہر کی نماز پڑھ کر ہی ہوتی تھی۔ کھانا اس کے بعد ہی کھایا جاتا تھا۔ ابھی تھوڑا سا وقت باقی تھا۔ بجیلہ کام سے فارغ ہو کر خود بھی برآمدے میں آ بیٹھی سردیوں کی نرم دھوپ برآمدے کو گھیرے ہوئے تھی اور اندر کمرے میں صدف بڑے اشتہاک سے ٹی وی کے آگے بیٹھی کوئی کھانا پکانے کی ترکیب نوٹ کر رہی تھی۔ بجیلہ تخت کے ایک کونے پر ٹپک گئی۔

”تمہارے انڈو یو کا کیا بنا احمر؟“ امی وضو کے لیے اٹھیں تو اس نے بڑی نرمی سے ہی پوچھا تھا۔ مگر وہ پھر بھی جھنجھکیا گیا۔

”کیا بنا تھا۔ سارے فیصل پہلے ہی کر لیے جاتے ہیں۔ بے کاری فارمیٹی ہوئی ہے۔ یہ اشتہار اور انڈو یو میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ اس طرح کے اشتہارات دیکھ کر درخواست ہی نہیں دوں گا!“ بہت عرصے سے یہ موضوع اس کی دکھتی رگ بن چکا تھا۔

”اس طرح مسئلہ تو حل نہیں ہوگا، تم اتنا مٹنی کیوں نہ گئے ہو؟ خرا“ بجیلہ نے سمجھانا چاہا۔

”جب میں پیسے ہوں تو سب مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔“ وہ بڑی بے نیازی سے سر جھٹک کر بولا۔

”اور یہ پیسے کہاں سے آئیں گے، جب تک کوئی کام نہیں کرے گا؟“ بجیلہ نے بشکل ہی خود کو یہ کہنے سے انکار کر دیا۔ تاؤ میں آ کر ابھی فوراً ہی اٹھ کر چلا جاتا

اور اسے جتن کر کے پکائی گئی بریانی یوں ہی جاتی۔ ”تمہارا کام کیسا چل رہا ہے۔ ماحول تو ٹھیک ہے نا وہاں کا؟“ بجیلہ کی خاموشی موضوع بدلنے کا سبب بن گئی۔

”ہاں، ٹھیک ہی ہے۔ وہاں تو ساری عورتیں ہی ہوتی ہیں اور پھر کام بھی اتنا ہوتا ہے کہ سر اٹھانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔“

یوں ہی موبوم سی امی تھی کہ شاید وہ ہمدردی میں اتنا ہی کہہ دے کہ اتنا کام کرنے کی ضرورت نہیں، خود کو مت تھکایا کرو مگر اس نے ایک اور ہی نکتہ اعتراض ڈھونڈا۔

”عورتیں بھی ساری ٹھیک نہیں ہوتیں، زیادہ مراسم بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے کسی سے بس اپنے کام سے کام رکھا کرو۔“ بجیلہ نے نابعداری سے ہلکے سے اثبات میں سر ہلادیا۔

”احمر، اب سنجیدگی سے کسی بھی کام کو سٹ کرو۔ پلیز بے شک تھوڑی خواہ ہو شروع میں، آہستہ آہستہ بڑھ ہی جاتی ہے!“ وہ پھر سے اصل بات پر آئی۔

”تم کیا سمجھتی ہو، میں جان بوجھ کر نوکری نہیں کرتا۔ ملے تو سبھی، جتنی ٹینشن خود مجھے ہے، اس کا تو کسی کو بھی اندازہ نہیں ہے۔“ تمام تر کوشش کے باوجود بھی، آخر کار اس کا موڈ خراب ہو ہی گیا۔

”ساری کوشش اکیلا خود ہی کر رہا ہوں ساتھ دینے والا کون ہے میرا، ہر ایک کو بس یہی فکر ہے کہ کسی کی طرح کمائی کر کے پیسے سب کے ہاتھ پر رکھے لگوں۔“ بجیلہ کے دل پر ٹھک سے کوئی چیز لگی۔ اتنے عرصے سے جو کچھ بھی وہ اس کے لیے کر رہی تھی خواہ وہ کتنا ہی کم تھا مگر اس کے دل میں ذرا بھی قدر نہیں تھی کسی بات کی بھی۔

”اور تمہیں جلدی کس بات کی ہے۔ آرام سے نوکری کر رہی ہو۔ تمہارے گھر میں تو کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے ہمارے گھر کی طرح، ماموں کی پنشن، گھر کا کرایہ تمہاری تنخواہ، گھر میں ہر طرح کی خوشحالی ہے۔“ ابا کی معمولی سی پنشن، اوپر کے حصے کا فلت پندرہ سو



کراہیہ اور اس کی یہ گارمنٹ فیکٹری کی نوکری..... اگر احمر کو خوشحالی کی نوید سنا رہے تھے تو تردید کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ایک ٹھنڈی سانس، اس نے اپنے اندر ہی اتار لی۔

”اصل میں خالہ، اب جلدی کر رہی ہیں صدف کی شادی کے لیے اگلے سال وہ اور خالوج پر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ابا کی مرضی ہے کہ دونوں.....!“ وہ کچھ جھجک کر خاموش ہوئی۔

صدف کی چھوٹی خالہ کے ہاں بات طے تھی۔ اسی ابا یہاں اپنے طور پر یہی فرض کیے بیٹھے تھے کہ دونوں کی شادیوں سے بیک وقت ہی منٹ لیا جائے گا۔

”تو کیا پرائلم ہے، صدف کی شادی اگر پہلے ہو جائے اور اماں تو ویسے بھی دو شادیوں کے بیک وقت ہونے کی مخالف ہیں۔ کہتی ہیں کہ ضرور ہی کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔“

بڑی بے پروائی سے کہتے ہوئے اس نے اعتراض کی وجہ تسمیہ بھی بتا دی۔ اماں نماز ختم کر کے آچکی تھیں سو بات خود بخود ہی ختم ہو گئی۔ صدف اندر کمرے میں دسترخوان بچھا رہی تھی۔ ابا عموں تھوڑی دیر کر کے ہی گھر آتے تھے۔ محلہ میٹھی کے رکن تھے۔ اسی حساب سے ان کی اپنی مصروفیت ریتی تھی پر اس وقت وہ خارج ہوتے ہی فوراً گھر آ گئے۔

”میں نے سوچا احمر میاں کو گھر جانا ہوگا۔ جلدی سے کھانے سے فارغ ہو جائیں پہلے!“ وہ برآمدے میں کھڑے کہہ رہے تھے۔ گھر میں سب ہی کو اندازہ تھا کہ ابا کو احمر کا یہاں زیادہ آنا چاہنا پسند نہیں ہے۔ اور شاید احمر کو بھی ان کے لہجے کی رکھائی کو محسوس کر کے جیلہ کوا لیے ہی وہم سنا تے تھے۔

کھانا مزیدار تھا۔ خود احمر نے بھی بہت تعریف کی۔ امی اسے متوقع داماد کا پورا پورا نوکول دیا کرتی تھیں کتنی ہی بار انہوں نے اس کی پلیٹ میں چن چن کرا چھٹی بوٹیاں ڈالیں۔

”جتنی ضرورت ہوئی خود لے، لے گا۔ تم کیوں زبردستی کر رہی ہو۔ پیار ڈالنے کا ارادہ ہے کیا اس کو!“

ابا کو ان کا التفات، جھنجھلاہٹ میں جتا کر رہا تھا سو ایک دو بار انہوں نے ٹوک بھی دیا۔

جیلہ خاموشی سے پلیٹ میں تھوڑے سے چاول نکالے بیٹھی رہی۔ چنی بات تو یہ کہ اتنا کچھ کر کے بھی اس کا دل بری طرح دکھتا تھا۔ احمر کی حد سے بڑھی ہوئی بے حسی، ابا کی بے اعتنائی.....! معلوم نہیں آگے قسمت کیا رنگ دکھانے والی ہے.....!

”ساڑھے تین بج رہے ہیں، دو بیس بدل کر تم گھر پہنچو گے۔ اچھا خاصا وقت درکار ہے۔ اب نکلو گے تو پچھتے پچھتے مغرب ہو جائے گی۔“ جب وہ اور صدف برتن اٹھا رہی تھیں تو ابا کو اس نے کہتے ہوئے سنا۔

”ابا اپنے بھانجے کی عزت افزائی خوب ہی فرماتے ہیں۔“ صدف چٹن میں آکر خوب ہی ہنسی۔

جیلہ خاموشی سے چائے کا پانی رکھنے لگی اسے ابا کا اس طرح سے کہنا بھی اچھا نہیں لگا تھا کون سا وہ روز روز آیا کرتا تھا۔ پھر بھی وہ ایسا برا تاڈ کرتے تھے مگر امی..... بہر حال تلافی کرتی تھیں۔ چائے کے بہانے بھی انہوں نے بڑے اصرار کے ساتھ احمر کو گھنٹا بھر اور بٹھائے رکھا ابا مایوس ہو کر عصر کی نماز کو مسجد روانہ ہوئے، تب وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”دو منٹ رک جاؤ، امی نماز پڑھ لیں!“ جیلہ نے کہا، تو وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا تھوڑا سا قریب آ گیا۔

”تھوڑے پیسے ہوں گے تمہارے پاس، بہت سخت ضرورت ہے۔ اسی لیے آیا بھی تھا۔ تمہارے علاوہ اور ہے بھی کون۔ جس سے میں مدد کے لیے کہوں!“ وہ اتنی بے چارگی سے کہہ رہا تھا کہ جیلہ کو اپنا دل کھلتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔

”ٹھہرو، میں ابھی لاتی ہوں!“ وہ کہتی ہوئی حیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ پرس میں چند دن پہلے چلی آوا ابھی باقی تھی۔

”میتے بھر آنے جانے کا کراہیہ، ابا کے لیے خریدے جانے والے سوٹ اور ضرورت کی چند چھوٹی موٹی چیزیں!“ اپنی ساری ہی ترجیحات، اس کا ہاتھ روکنے کے لیے تیار تھیں۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ مجھے



میں ہی رہی۔

”معلوم نہیں اسے کتنے پیسوں کی ضرورت ہے، اگر سو دو سو میں ہی کام چلائے تو کتنا اچھا ہو پھر لینا چاہیے تھا کہ کتنے پیسے اسے چاہئیں!“ بھیلہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر بابا کیا، کیا جاسکتا تھا۔

”کیا خبر سو دو سو دیکھ کر وہ ناراض ہی ہو جاتا اگر ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہے تو کھانے پر پیسے خرچ کرنے کے بجائے، یہی اسے دے دیجی!“ بے حد کلن کے ساتھ لپکا ہوئی بریانی اسے دوسری غلطی محسوس ہو رہی تھی۔ اچھے اچھے سے انداز میں پانچ سو کا ایک نوٹ لے کر وہ واپس برآمدے میں آگئی تو وہ وہیں کھڑا تھا۔

”بس اتنے ہی، میں تو سمجھا تھا کہ ابھی تمہیں تنخواہ ملی ہے تو شاید.....!“ احمر کے لہجے میں بڑی مایوسی تھی۔

”اصل میں ابھی سارے خرچے بھی باقی ہیں احمر!“ وہ شرمندہ سی ہو کر صفائی پیش کرنے لگی۔

”کچھ دن میں کسی دوست سے لے کر تمہیں واپس کر دوں گا!“ احمر کا اصرار بڑھنے لگا تو وہ انکار بھی نہ کر سکی۔

”بہت شکریہ بھیلہ، تم نے اس وقت میری بڑی پریشانی دور کی، خدا نہ کرے اگر میری زندگی میں تم نہ ہوئیں تو شاید میں بالکل ہی حوصلہ کھو بیٹھتا۔“ مزید پانچ سو لے کر اسے بڑی تسلی ہوئی، وہ محبت سے بھیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہی ایک نظر تھی جو ساری کوفت، ساری ٹینشن بھلا دیتی تھی۔ آج کی پریشانی کل کی خوشیوں کی نوید سنائی محسوس ہوتی تھی۔

ای نماز پڑھ کر فارغ ہوئیں تو احمر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا صدف البتہ اتنی ناراض تھی کہ بی بی کے سامنے سے اٹھ کر اسے رخصت کرنے تک کے لیے نہیں آئی۔

”تم نے پرس سے نکال کر اتنے سارے پیسے احمر بھائی کو پکڑا دیے۔ آخر کس خوشی میں!“ وہ بھیلہ کو پرس میں سے پیسے نکالتے ہوئے دیکھ چکی تھی اور اب بذاتِ خود اس کے پرس کو چیک کر کے جواب طلبی پر اترتی ہوئی تھی۔

”احمر پریشان تھا کچھ دنوں میں واپس کر دے گا۔“ وہ بڑی نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شکر تھا کہ صدف کو پچھلے ماہ کے پانچ سو کا مل کر ہوسکا تھا۔

”کبھی بھی نہیں دیں گے وہ، پہلے بھی جب ٹیوشن پڑھا یا کرتی تھیں جب بھی وہ سو پچاس لے ہی جاتا کرتے تھے۔ کبھی واپس کیے، وہ بدستور تھا حتیٰ اور پورے یقین کے ساتھ جو پیش گوئی وہ کر رہی تھی وہ بھی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

احمر نے باقی پورے ماہ مشکل تک نہیں دکھائی۔ اوپر سے ستم یہ ہوا کہ اوپر کے کمرے والے کرائے دار پر پچھلے مہینے کے آخری ہفتے میں محض دس دن کے لیے پنجاب گئے تھے انہوں نے اپنے قیام کی مدت بڑھا دی تھی۔ سو اس ماہ اوپر کا کرایہ بھی وصول نہ ہوا۔ اتھ ایک دم ہی تنگ ہو گیا۔ بہت سے ضروری اخراجات کیا کٹوتی کرنی پڑی۔ ناشتے میں سے انڈا ایکسپریس ختم کر دیا گیا اور گوشت جو ہفتے میں ایک بار پٹاؤ، ڈیزہ باڈا لاکر پکایا جاتا تھا۔ اس ماہ وہ سلسلہ بھی منقطع رہا۔ کوئی ٹی بھرا نہیں جاسکا اور کچھ نہیں مگر جس دن ابا اپنے بی بی دھلے دھلائے اڑی ہوئی رنگت والے سوٹ میں، اپنے دوست کی بیٹی کی تقریب نکاح میں شریک ہونے کے لیے گئے اس دن بھیلہ کے دل میں احمر کی طرف سے کو جڑ پکڑنے لگا۔

”کیا تھا اگر وہ سارے نہیں تو آدھے ہی بچے واپس کر جاتا۔ کسی سے لے کر ہی سہی۔ آخر ان کے گھرانے کے باقی سارے خرچ بھی تو چل ہی رہے ہوں گے!“ وہ سوچ سوچ کر رنجیدہ ہوتی رہی۔



فیکٹری میں شالی اور گھنیز بھی اس کے چپ چپ رہنے کو نوٹ کر رہی تھیں۔ کئی بار اصرار کر کے پوچھا مگر اصل بات بتانے میں اسے خود اپنی توہین محسوس ہو رہی تھی۔

مہینہ ختم ہونے میں ابھی چھ دن باقی تھے اس روز وہ اور دونوں سے زیادہ خاموش تھی۔ ذہن بار بار پرتا

میں چڑے فقط چوبیس روپے کی طرف جا رہا تھا اللہ ہی جانے اب باقی دس کن طرح کتنے تھے۔

چائے کے وقفے میں وہ شالی کی باتوں کے جواب میں یوں ہی ہوں ہاں کیے جا رہی تھی۔ گھنیز حسبِ رواج ”ابھی آئی“ کہہ کر جو غائب ہوئی تو آدھا گھٹنا ترزنے کو تھا اب تک واپس نہیں آئی تھی۔ اس کی بہن راز گندگی اب ”پڑا سرا“ نہیں رہی تھی۔ کچیریل والے برآمدے کے آخری سرے پر بنے چھوٹے سے آئینے میں کام کرنے والے فجر سے اس کی بڑے غضب کی ”پڑا سٹینڈنگ“ ہو چکی تھی۔

”ج کبھی ہوں، فخر ہی وہ انسان ہے جس کے بیٹے ساتھ کی میرے دل نے خواہش کی ہے۔“ گھنیز جیسی بیٹ کی ہلکی لڑکی، زیادہ دن یہ راز چھپا ہی نہیں سکی تھی۔ مگر اب جس تیزی سے وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہوئی جا رہی تھی وہ شالی اور گھنیز دونوں کو حیران بھی کر رہا تھا اور پریشان بھی۔ سو اس وقت بھی یہ طے شدہ بات تھی کہ وہ آپا سیکنے کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہیں آئیں میں گری پریشانی، فخر کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گئی۔

”کم از کم مجھے تو بتاؤ کیا پریشانی ہے۔ میں تو اپنا مارا دکھ دو تو نہیں سناتی ہوں مگر تم شاید مجھے غیبر ہی سمجھتی ہو!“ شالی کے لہجے میں خلوص بھی تھا اور دردمندی بھی۔

بھیلہ ساکت سی نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ شالی کی گہری سانولی رنگت اور معمولی نقوش کے پیچھے ایک بڑا ہی خوبصورت دل تھا۔ بھیلہ کو اسے بتانا ہی پڑا۔

”بس اتنی سی بات.....!“ اس نے مڑ کر اپنی بہن کے ساتھ رکھے پرس کو اٹھایا۔

”یہ لو!“ اس نے سو پچاس کے طے طے سے چند نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمائے ”تھوڑے اور بھی ہیں گھر کے لیے، کل میں اور بھی لے آؤں گی!“ بھیلہ نے وہ نوٹ دیکھ کر چار سو روپے تھے۔

”نہیں بس بہت ہیں۔“ مجھ میں نہیں آ رہا تمہارا شکر یہ ادا کروں شالی، انشا اللہ تنخواہ ملتے ہی میں یہ پیسے لوٹا دوں گی۔“ بھیلہ ممنونیت سے کہنے

لگی تو وہ لانا تھا ہو گئی۔

”پھر وہی غیریت والی باتیں، میں تو تمہیں اپنی بہنوں سے بھی بڑھ کر سمجھتی ہوں بھیلہ، تمہاری دوستی میں اپنا دکھ بھولے رہتی ہوں اور تم ہو کہ.....!“ بھیلہ کو باقاعدہ معافی مانگنی پڑ گئی۔

”یہ گھنیز کچھ زیادہ ہی دیر کے لیے غائب نہیں ہو جاتی ہے۔ کل سیکنے آ، اسے سیٹ پر نہ دیکھ کر ناراض ہونے لگیں تو مجھے بہانہ کرنا پڑا کہ واش روم گئی ہے!“ شالی کو گھنیز کی فکر ہو رہی تھی ”اتنا سمجھاتی ہوں مگر کان ہی نہیں دھر رہی۔ اسے فخر کی محبت میں اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا ہے!“ بھیلہ جواباً خاموش ہی رہی۔ محبت میں انسان یوں ہی، اندھا، بہرا اور گونگا ہو جاتا ہے۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھی۔

”تمہیں پتا ہے!“ شالی اس کی طرف راز دارانہ انداز سے بھگی۔ ”اب تو یہ دونوں باہر بھی ملنے لگے ہیں۔ کبھی کسی پارک، کبھی ریسٹورنٹ، گھنیز کہہ رہی تھی کہ اب کسی دن فلم دیکھنے جائیں گے۔“

”یہ تو بہت ہی غلط بات ہے۔“ بھیلہ کو گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ ”تمہیں اسے سختی سے منع کرنا چاہیے تھا۔ ابھی کتنا جانتی ہے وہ اس لڑکے کو اگر وہ اتنا ہی غلط ہے تو اپنے گھر والوں کو بھیج کر رشتہ مانگ لے باقاعدہ!“

”وہ آ رہی ہے سامنے!“ شالی نے سامنے سے آتی گھنیز کو دیکھ کر کہا۔ چند لمحوں میں ہی وہ ان کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

”پتا ہے آج مجھے فخر نے کیا دیا.....؟“ اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا اور چہرہ کی اندرونی خوشی سے چمک رہا تھا۔ بھیلہ کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ گھنیز کو نصیحت کرنے کے لیے یہ بالکل بھی موزوں وقت نہیں ہے۔ آس پاس لڑکیاں اپنا کام دوبارہ شروع کر چکی تھیں سو وہ بھی اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ یہاں سیکنے آ پانے لگی جاسوس چھوڑ رکھی تھیں جو انہیں ساری خبریں دیتی تھیں گھنیز اگر ابھی تک بچی ہوئی تھی تو محض اپنی ہوشیاری اور چرب زبانی کی وجہ سے۔



”بجیلہ یہ دیکھو۔“ تھوڑا سا جھک کر اس نے چھوٹے سے شاپر سے کچھ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ ایک بریلیٹ تھا اور اس کے ساتھ ایئر رنگز، ویلے ہی جیسے عام طور پر مصنوعی زیورات کے جگہ جگہ لگے اسٹار پر ملتے ہیں۔“

”اچھا ہے نا، فخر نے دیا ہے۔ بالکل نیا ڈیزائن ہے!“ گنیز نے ڈراسی دیر میں ہی بہت ساری خوبیاں ڈھونڈ نکالی تھیں۔ بجیلہ نے یوں ہی مردانہ اثبات میں ہلادیا۔ اسے جیولری سے کوئی ایسی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ صدف کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔ شالی نے بھی نگاہوں ہی نگاہوں میں سر ہلایا مگر گنیز کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

”ابھی دو ہفتے پہلے فخر نے مجھے ایک پرفیوم بھی دیا تھا۔ جب میں اس سے ملنے، اتوار کے دن گئی تھی!“ وہ تمہیں ڈر نہیں لگتا گنیز اگر کوئی دیکھ لے، ویلے بھی تمہارے بھائی بہت سخت مزاج ہیں۔ اگر کوئی بات ان تک پہنچ گئی تو بڑے بجیلہ نے اس کے دل میں تھوڑا سا ڈر بٹھانا چاہا۔

”اب مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے، بھائیوں کو کون سی میری پروا ہے۔ اپنے بیوی بچوں میں کم ہیں، اماں بھی ان ہی کی خوشنودی میں لگی رہتی ہیں۔ میری کس کو فکر ہے وہاں، اب جو میرا دل چاہے گا، میں بھی وہی کروں گی۔“ گنیز کے لہجے میں بڑی بے خوفی تھی اور چہرے پر کچھ کرگزر جانے کی سی کیفیت۔ بجیلہ کو بڑا ڈر مانا لگنے لگا۔ سامنے سے سکیڑہ آ پاراؤنڈ پر آ رہی تھیں۔ انہیں باتیں کرنا دیکھ کر بھینا برامنا میں سو گنیز کا شاپر اسے پکڑا کر وہ خود سامنے رکھی مٹھین پر جھک گئیں مگر کسی وقت فرصت سے گنیز کو سمجھانے کا ارادہ ضرور دل میں پکا کر لیا تھا۔

مہینہ ختم ہونے پر تنخواہ ملتے ہی سب سے پہلے شالی کے پیسے واپس کیے، حالانکہ وہ منع بھی کرتی رہی، پھر بھی کسی نے کسی طرح بجیلہ نے اسے وہ رقم واپس لینے پر مجبور کر ہی دیا۔

”مجھے کرنا کیا ہے پیسوں کا، نہ بچے نہ گھر بار،

پیٹ تو بھر ہی جاتا ہے ماں باپ کے در پر، میں سن تو کر لی صرف اپنی تنہائی بانٹنے کے لیے کی ہے۔ اگر میرے پیسے اپنے پاس رکھ لیتیں تو مجھے بہت خوشی حاصل ہوتی۔ شالی پیسے ہاتھ میں لے کر آرزوہ سے لہجے میں کہنے لگی۔ اس کا ڈپریشن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ زور زور سے اپنے آپ سے بے پروا ہو رہی تھی۔ کئی کئی دن ایک ہی سوٹ پہن کر فیکٹری آتی رہتی، بے تو جہی اور مستقل مایوسی میں گھرے رہنے کی وجہ سے اس کی رنگت اور بھی زیادہ سیاہی پائل ہو رہی تھی اور چہرے کی رونق بھی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ بجیلہ اور گنیز دونوں ہی اسے جب موقع ملتا سمجھتاں مگر وہ کچھ اثر نہ لیتی۔

”مجھے پتا ہے کہ اب کچھ اچھا نہیں ہوتا، اگر میری قسمت میں خوشی ہوتی تو اشرف سے ہی مل جاتی۔“ امیر کی آخری کرن بھی وہ گنوا چکا تھی اور اب کسی خوش فہمی کے قریب پھٹکنے پر تیار نہیں تھی۔

”اس طرح خود کو مستقل اذیت میں رکھنے سے کیا حاصل ہے بھلا۔ اشرف نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا۔ اب ساری عمر لکیر سیٹھتے ہوئے تو نہیں گزارا جاسکتی!“ بجیلہ غصے میں آنے لگی۔

شالی آج پورے تین دن کی چھٹی کے بعد آئی تھی۔ اس کی بیماری کی اطلاع تو فیکٹری تک آ گئی تھی مگر اس بیماری کی اصل وجہ اس نے بذاتِ خود صوبے جب وہ تینوں بس میں اکٹھی ہوئیں تب سنا۔ اشرف کی دوسری شادی ”کنفرم“ ہو چکی تھی اور اب وہ باقاعدہ اسی عورت کے ساتھ اس کے گھر میں رہنے لگا تھا۔

شالی آس پاس مسافروں کی پروا کیے بغیر، یہ خبر سناتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی گنیز اور بجیلہ کو اسے چپ کرانا مشکل ہو گیا تھا۔ فیکٹری میں ساتھ کام کرنے والی تقریباً سب ہی لڑکیوں کو شالی کا سارا قصہ معلوم تھا باری باری سب ہی نے آ کر اظہارِ افسوس کیا شالی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ بجیلہ کو اس کی حالت دیکھ دیکھ کر اب غصہ آ رہا تھا۔

”اور اگر اب یہی رونا ساری زندگی جاری رکھتا ہے تو گزر گئی شالی بی بی۔ ارے، سیدھے طلاق لو اس



نے کرو شروع اپنی نئی زندگی، دوسروں کو تو تم بہت شور مچاتی ہو۔“ دوپہر کے کھانے کے وقفے میں نوڑی فرصت ملی تو اس نے ٹھیک ٹھاک خبر لے ڈالی۔

”تو اور کیا۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں، اس بار بہت کچھ بھال کر اپنی پسند سے شادی کرنا، دیکھنا بہت خوش ہوئی!“ آج ٹھیکہ نے بھی بڑی قربانی دی تھی جو شالی کی وجہ سے فخر سے ملاقات کے لیے آفس کا چکر نہیں لگایا تھا۔

”کون کرے گا مجھ سے شادی!“ شالی آنسو صاف کرتے ہوئے بلکہ سے بولی ”نہ رنگ روپ اور نہ ہی تعلیم، مفت کا بوجھ کون لا داتا ہے۔ شکل اچھی ہوتی تو صرف کا دل کسی اور پر آتا ہی کیوں.....؟“ اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ بچیلہ نے بے اختیار ہی انگلیوں سے نچنے کو چھوا تو وہ کچھ جھپٹ گئی۔

”اصل میں تم اور ٹھیکہ ماشاء اللہ اچھی صورت شکل کی ہواں لیے تم نہیں سمجھ سکو گی۔ تمہیں ایسا کوئی احساس کمتری نہیں ہے بچیلہ!“ وہ اپنی بات کو واضح کرنا چاہ رہی تھی مگر بچیلہ اور ٹھیکہ کے نزدیک اس کی بات میں ذرا بھی دم نہیں تھا۔

”انسان خوش رہے، اپنا خیال رکھے، مرد ہو یا لڑکتی ہو، ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔“ طبیعتوں میں ہزار اختلاف کے باوجود، دونوں میں کم از کم اس بات پر ضرور اتفاق رہتا تھا۔ شالی پتا نہیں قائل ہوئی یا نہیں مگر ان دونوں کی محبت کے آگے خاموش ضرور ہو گئی۔



اگلے ہفتے سے فیکٹری میں کام ایک دم ہی بڑھ گیا۔ بڑے آرڈرز مالکان کو مل گئے تھے۔ اور رات بھی بولی چل رہا تھا اور نئی ورکرز بھی رکھی جا رہی تھیں جو کثرت بہت طویل عرصے سے یہاں کام کر رہی تھیں، ان کی تعداد میں نئے کام والوں کی آمد یہاں پر کھل چکی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ نئے آنے والوں کی پیسے اور رات میں پرانوں کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ آئے دن کسی نہ کسی کی ٹھکر سنا دی دے جاتی تھی۔ سکینڈ آپا معاملات کو سلجھانے کی کوشش میں بلکان

ہوئی جا رہی تھیں۔ ایک دن ستار بھائی کا بڑا بیٹا بھی بطور خاص وزٹ پر آیا اور بڑی حد تک سب کو مطمئن کرنے کی کوشش کر کے گیا۔

شالی اور ٹھیکہ دونوں ہی اور رات میں لگا رہی تھیں۔ شالی کو تنہائی سے فرار کے لیے بہانہ درکار رہتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ بھابیوں کا موڈ بھی اچھا رہتا تھا کہ وہ سارا دن باہر ہے اور ان پر بوجھ بھی نہ ہے۔ ٹھیکہ پر آج کل اپنا جیز جوڑنے کی دس سوار تھی۔ اپنے مستقبل کے گھر کے لیے وہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑے ارمان کے ساتھ اکٹھی کیے جا رہی تھی۔ فخر سے اب اس نے بچیلہ کے اصرار پر بہت زور دے کر کہا تھا کہ اس بار جب وہ حیدر آباد اپنے گھر جائے تو اپنی اماں کو ساتھ لے کر آئے تاکہ وہ ان دونوں کے رشتے کی بات چلا سکیں۔ آج کل ملنے والے ان اضافی پیسوں سے وہ بڑی لگن کے ساتھ اپنے مستقبل کے خاکے میں خوبصورت رنگ بھرنے میں مصروف تھی۔

آج کل بچیلہ واپسی میں اکیلی ہی ہوتی تھی۔ اس کے ابا اور امی کی طرف سے اتنی دیر رکنے کے لیے اجازت نہیں مل سکی تھی حالانکہ اس نے بہت خوشامد کی تھی کہ زیادہ نہیں تو ہفتے میں تین دن ہی وہ بھی وہاں رک جایا کرے۔

”پیسوں کی ضرورت کسے نہیں ہوتی، یہ تو جتنے بھی ہوں کم ہی دکھائی دیتے ہیں اور اب تو تمہاری شادی بھی قریب ہے!“ رات کے کھانے کے بعد جب وہ دونوں بہنیں ذرا فرصت میں تھیں بچیلہ، صدف کو ہموار کرنے کی کوشش کیے گئی وہ پہلے تو چپ چاپ سنتی رہی پھر جب بچیلہ خاموش ہوئی تو بڑی سنجیدگی سے بولی۔

”ضرورتیں کم بھی تو کی جاسکتی ہیں آپنی، ضروری ہے کہ پیسہ کمانے کے لیے انسان اتنا بلکان کرے خود کو کہ پھر زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو انجوائے نہ کرے۔ یہ بھی محروم رہ جائے، پیسے سے آسانیاں میسر آ جاتی ہیں آپنی لیکن خوشی کا سلسلہ نہیں اور سے ہی جا کر جڑتا ہے اور میری شادی میں تو ویسے ہی ٹینشن لینے والی کوئی بات نہیں ہے۔ امی نے جو تیاری کر کے رکھی ہے وہی



بہت ہے! "بجیلہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔  
صدف ہمیشہ ہی بالکل بے وقوف اور ناسمجھ سی  
محسوس ہوتی تھی آج پہلی بار اسے لگا کہ وہ زندگی کے  
بارے میں نہ صرف بڑی واضح سوچ رکھتی ہے بلکہ یہ  
سوچ اس کے مقابلے میں بڑی سنجیدہ اور قابلِ تقلید  
ہے۔

"مجھے تو یہی سوچ کرافسوس ہو رہا ہے کہ اگر اس  
وقت احمر بھائی اور پچھو بھی تعاون کر لیتے تو امی اور ابا  
بڑی آسانی سے، ہم دونوں ہی سے فارغ ہو جاتے!"  
صدف کے لہجے میں بڑا رنج تھا۔ "بجیلہ حالانکہ قصور  
دار بھی نہیں تھی پھر بھی اس کی نگاہ جھکنے لگی احمر اور اس کے  
گھر والوں کے رویے کو چاہے کوئی بھی خوبصورت نام  
دے لیا جاتا مگر اس سے چھلکنے والی خود غرضی، صاف  
دکھائی دے رہی تھی۔ صدف کے لیے حالہ کے ہاں سے  
تختی سے جہیز کے لیے منع کروایا گیا تھا اور یہ فیصلہ خود فہد  
نے کیا تھا جو صدف کا منگیت تھا۔

"کاش ایسی ہی کوئی بات احمر بھی کہہ دیتا!" "بجیلہ  
کے دل میں کتنی ہی بار یہ بات پن کی طرح چمبی تھی۔  
پچھو نے ابا کے لاکھ زور دینے پر بھی ایک ساتھ دونوں  
شادیوں کے ہونے پر رضامندی ظاہر نہیں کی تھی۔ سارا  
الزام احمر پر رکھتی تھیں کہ وہ ابھی راضی نہیں ہے اور احمر  
سے جب ملاقات ہوتی تو وہ پچھو بھی کی مجبوریاں گنوانے  
لگتا۔ کون سچا تھا؟ یا پھر وہ دونوں ہی سچ بولنے سے  
ڈرتے تھے۔ نیت کا کھوٹ، عمل کی راہ میں سب سے  
بڑی رکاوٹ کھڑی کرتا ہے۔

"یہ تو ہم ہی بے وقوف ہیں جو ایک غیر ذمے دار  
اور جزوقتی کام کرنے والے لڑکے کو بیٹی سوچنے کے لیے  
بے قرار ہو رہے ہیں!" ابھی چند دن پہلے، ابا نے بہت  
جھجھلا کر امی سے کہا تھا۔ یہ بھی پروا نہیں لی تھی کہ "بجیلہ بھی  
وہیں بیٹھی ہے۔ فہدی اعلیٰ ظرفی کے بعد انہیں احمر اور بھی  
زیادہ کھلنے لگا تھا۔

"اور میری بات مانو تو اپنی شادی سے پہلے، یہ  
جواب چھوڑ دینا ورنہ احمر بھائی اور پچھو ساری زندگی نہیں  
پیٹتے ہی رہیں گے!" "صدف نرمی سے جو کہہ رہی تھی

وہ سراسر ایک بہن کی محبت تھی مگر بجیلہ کے دل و دماغ  
چھائے غبار جو جیسے نکاسی کا موعن ملا۔

"تم سب لوگ آج احمر کے پیچھے کیوں بڑھ گئے ہو،  
مانا فہد اس کے مقابلے میں ہر طرح سے بہتر ہے مگر اس  
کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر وقت اس کو ذلیل کیا جائے!"  
اپنی بات کہتے کہتے اس کی آواز رندھنے لگی۔ "صدف  
جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر بجیلہ کے پاس آ بیٹھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا آبی، اچھا بلیز معاف  
کر دو، میں تو صرف تمہارے خیال سے.....!" "بات  
ادھوری چھوڑ کر، وہ خود رونے لگی تو بجیلہ کو اپنی غلطی کا  
احساس ہوا۔ صدف بے چاری اب یہاں چند دن کی ہی  
مہمان تھی اور آج کل وہ خود جدائی کے جس احساس کے  
ساتھ گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ بجیلہ  
نے فوراً ہی آنسو صاف کر کے اسے گلے سے لگا لیا۔

مگر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوا تھا۔ احمر بے پروائی  
اور بے حس کو اب باقاعدہ نوٹس کیا جانے لگا تھا۔ ابا کو  
اس سے خاص طور پر چڑھ چکی تھی، کسی کسی وقت تو بجیلہ کو  
لگتا کہ بس یہ رشتہ ٹوٹا ہی تو نا مگر امی بات کو کسی نہ کسی  
طرح سنبھال لیتیں۔

بجیلہ منتظر ہی رہی کہ وہ کب اس سے لیے گئے  
پیسے واپس کرے گا مگر احمر کا کھانا کیلنڈر ہی رہا۔ وقت  
تو قتا اس سے پیسے لے لینا اب اس کی عادت بن چکی  
تھی۔ پچھو آتیں تو ان کا بھی یہی رونا ہوتا کہ حالات سچ  
نہیں ہیں۔ "بجیلہ کی مایوسی بڑھنے لگی مگر وہ خود کو پھر کسی  
کسی طرح بہلا لیتی۔



گھر میں صدف کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا تو  
بہت سارے دن اس کی نذر ہو گئے۔ گارمنٹ فیکٹری  
سے بھی اس نے پورے دس دن کی چھٹی لی تھی۔ صدف  
کی بارات بھی مختصر ہی آگئی تھی اور کھانے پر مختصر دو شہر  
رکھی گئی تھیں۔ بے جا اسراف سے بچتے ہوئے یہ شادی  
بڑے ہی ہلکے پھلکے انداز میں انجام پائی۔ ویسے تو فہد  
بھی ہوا، سب گئے انجوائے بھی کیا مگر ٹوینٹس  
بجیلہ کی فیکٹری سے عکینہ اور شالی کے علاوہ بھی

بہت سی دوسری لڑکیاں شادی میں شریک ہوئیں، خاص  
طور پر کینڈا پاپا، جن کی آمد غلطی غیر متوقع تھی۔ ان سب کا  
غلط اور اپنائیت ہی قابلِ قدر غیر دشمنی اور عکینہ نے احمر  
کو خاص طور پر دیکھا۔ صدف کی شادی والے دن، وہ  
گف بھی بہت افسار رہا تھا۔ صورتِ شکل اچھی تھی ہی،  
باقی سراسر اچھے کپڑوں نے پوری کر دی تھی۔ "بجیلہ کو اسے  
ان لوگوں سے ملواتے ہوئے بڑے فخر کا احساس ہوا  
تھا۔

شالی نے بہت کھل کر احمر کی تعریف کی تھی مگر عکینہ  
نے کسی خاص اشتیاق کا اظہار نہیں کیا۔ باوجود تمام تر  
وجہ الناسی کے بجیلہ کے دل میں یہی گھٹایا خیال آیا کہ  
وہ اس سے جل گئی ہے۔ "فخر، احمر کے مقابلے میں بے  
چارہ بالکل ہی گیا گزرا سا ہے اور اوپر سے پچھو را  
نکلتا!" "بجیلہ کو عکینہ سے سنی اس کی باتیں یاد آئیں۔

صدف کی شادی کا ہنگامہ ٹھنڈا پڑا، تو زندگی پھر  
سے معمول پر آنے لگی۔ فیکٹری میں گزشتہ مہینوں والا کام  
کارو، اب باقی نہیں رہا تھا۔ وہی روز کا کام چل رہا  
تھا۔ عارضی طور پر رکھے گئے ورکرز کی بھی بڑی تعداد  
گھنٹ اور جا چکی تھی اور اوور ٹائم کا بھی اب وہ عالم نہیں  
رہا تھا۔ ہر وقت چلتی مشینوں کے سچ پیٹھ کو بھی بجیلہ کو  
بڑے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

عکینہ کی کام کے سچ آٹھ پچوٹی والا سلسلہ ابھی بھی  
جاری تھا۔ اس کے اور فخر کے سچ جو سلسلہ جاری تھا وہ  
اب راز نہیں رہا تھا۔ ساری لڑکیوں کو خبر ہو چکی تھی۔ شالی  
سے تباہ ایک روز، عکینہ کی سب سے اہم اتحادی سیکینہ  
آپاسے بھی بہت سختی سے جبر لی ہے اس کی۔

"بہت اچھا کیا، یہاں سب کام کے لیے آتے  
ہیں۔ اس طرح کی باتوں سے ماحول خراب ہوتا ہے اور  
لڑکیوں پر بھی اثر پڑتا ہے۔" "بجیلہ نے کہا۔

"میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم دونوں کو بھی عکینہ  
سے وہی کم کر دینی چاہیے۔ یہاں پر ہمارا تاثر بھی  
آب ہو رہا ہو۔" "شالی کی بات اسے ٹھیک ہی لگی، چند  
دنوں پر سوچ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔  
کی ٹھیک آگئی، آج اس نے بہت خوبصورت کاشن کا

سوٹ پہن رکھا تھا جو دیکھنے میں خاصا مہنگا لگ رہا تھا۔  
عکینہ نے بھی شاید اس کی نگاہوں میں آئی پسندیدگی کو  
بجانب لیا تھا۔ ایک فخریہ مسکراہٹ، اس کے چہرے پر  
چلی آئی۔

"بجیلہ ماہ میری سا گرہ تھی۔ فخر نے گفٹ کیا تھا  
معلوم ہے گفٹے کا ہے؟" "عکینہ نے رعب بھانا چاہا۔

"تم اتنے مہنگے تحفے کیوں لے رہی ہو فخر سے،  
آخر کیوں وہ تم پر اتنے پیسے خرچ کر رہا ہے۔ کل کو  
تمہارے لیے کوئی پریشانی نہ کھڑی ہو جائے، اتنا تو  
سوچو۔" "عکینہ نے تھوڑی سی غلطی کے باوجود بھی، بجیلہ  
نے دوستی کا حق بھانا چاہا مگر جوا بادہ بے پروائی سے ہنس  
پڑی۔

"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ایسی ویسی نہیں، بچی  
محبت اور اسی لیے میرے لیے کچھ بھی لیتے ہوئے اسے  
پیسوں کی پروا نہیں ہوتی۔"

"پھر بھی، ابھی تو تم دونوں کے درمیان کوئی  
باقاعدہ رشتہ نہیں بنایا ہے۔ پھر بھی تم.....!" "بجیلہ نے  
کہا تو عکینہ اس کی بات کاٹنے ہوئے بولی۔

"ظاہری رشتہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا بجیلہ، ہمیں  
ایک دوسرے پر پورا بھروسہ ہے اور برا مت منانا، احمر تو  
تمہارا منگیت ہے۔ فخر بھی رشتہ دار بھی ہے مگر دل کا تنگ  
ہے ورنہ بھی تو تم بھی اس کی لائی ہوئی کوئی چیز، ہمیں  
بہت شوق سے دکھاتیں، لڑکیوں کو تو بڑا ارمان ہوتا ہے  
کہ ان کے منگیت.....!"

"ہمارے درمیان اس قسم کی باتوں کی اہمیت نہیں  
ہے۔ میں احمر کے لیے کتنی اہم ہوں اس بات کا اندازہ  
مجھے خود ہے۔" "بجیلہ کو اس کے سو فیصد درست تجربے سے  
انکار کرتے ہوئے خود اپنی آواز کھلی گئی۔

"خوش نہیں ہے تمہاری، ان مردوں کے نزدیک  
خود ان کے اپنے علاوہ کوئی بھی اہم نہیں ہوتا۔ اپنی  
اہمیت عورت کو ثابت کرنی پڑتی ہے۔ جیسے میں کر رہی  
ہوں۔ ابھی سے میری ٹٹھی میں ہے فخر، بعد میں تو.....!"  
"عکینہ کے چہرے پر بڑی پراسراری مسکراہٹ ابھرنے  
لگی۔



بجیلہ کو اس لمحے وہ کسی عام سی لڑکی کے بجائے، بڑی جہانمیدہ سی عورت محسوس ہوئی جس کا فلسفہ زندگی اس کے ذاتی تجربات کا مرکب ہونا منت تھا۔ خوبصورت لباس کے ساتھ، میک اپ سے رنگے خوبصورت چہرے سے، نہیں معلوم کیوں اسے گھن سی آنے لگی۔

”اپنا مقابلہ ہم لوگوں سے مت کرو گنیمے، یہ تو وقت بتانے کا کہ خوش فہمی میں، میں جیتا ہوں یا تم اور امر جیسا بھی ہے، کم از کم اس چھپورے آوارہ لڑکے سے ہزار درجہ بہتر ہے جس پر تم بھروسہ کیے بیٹھی ہو!“ اس کے لہجے میں اتنی نفی اور حقارت تھی کہ سچ میں بیٹھی مگر گردنوں کا منہ دہشتیں شالی کو مدخلت کرنی ہی پڑی۔

”پاگل ہو گئی ہو تم دونوں، بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہی ہو۔ چلو کھانا کھاؤ دونوں!“ اس نے تینوں کے پیچ بکس آگے کمر کائے۔

”رہنے دو شالی، جب دلوں میں اتنی تلخی بھری ہو تو یہ دکھاوے کی دوستی بالکل ہی بے معنی ہے۔“ گنیمے ایک جھٹکے سے اپنا پیچ بکس اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ شالی نے اسے روکنا بھی چاہا مگر وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ کھیریل والے برآمدے میں، اس دوستی کے تابوت میں آخری کیل ٹھک ہی گئی۔ ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں نے شروع شروع میں تو ان کے مابین چھائی سرد مہری کا بہت زیادہ نوٹس لیا۔ کرید کرید کر اصل وجہ جاننے کی کوشش کرنی چاہی مگر اس سابقہ دوستی کا اتنا لحاظ انہوں نے ضرور رکھا کہ کسی دوسرے کے سامنے ایک دوسرے کی برائی سے اجتناب ہی کرتی رہیں۔

رفتہ رفتہ سب ہی اس نئے معمول کے عادی ہو گئے۔ کھیریل والے برآمدے میں اب پیچ بکس میں شالی اور بجیلہ ساتھ کھانا کھاتی دکھائی دیتی تھیں۔ گوشالی کی براہ راست گنیمے سے کوئی ناراضگی نہیں ہوئی تھی مگر وہ خود بخود ہی بجیلہ کے ساتھ گروپ بنا چکی تھی۔ اس کی زور زنجی اور پاپوسی، بجیلہ کی حساس طبیعت کے ساتھ ہی میل کھاتی تھی۔ ویسے وہ رسماً گنیمے سے بھی دعا سلام کر لیتی اور آتے جاتے بس میں اگر جگہ کا مسئلہ ہوتا تو گنیمے کے ساتھ بیٹھ بھی جاتی۔

بجیلہ نے اس دن کے بعد بالکل ہی پروا کرنی چھوڑ دی تھی کہ وہ کیا پہن رہی ہے اور کتنی بار اپنی سیٹ سے غائب ہوتی ہے۔ اس کا دل، گنیمے کی طرف سے ہر اتنا خراب ہو گیا تھا کہ اگر شالی بھی گنیمے کے متعلق کوئی بات چھیڑتی تو وہ بات کا موضوع بدل دیتی چند دن بعد گنیمے نے جگہ بھی تبدیل کر لی تو یہ قصہ تقریباً ختم ہی ہو گیا۔

\*\*\*

بجیلہ جتنی دیر فیکٹری میں رہتی۔ وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا مگر گھر میں اب صدف کی غیر موجودگی میں وقت کا شاو دو بھر ہو رہا تھا۔ اب حسب معمول زیادہ سے زیادہ وقت باہر ہی اب اس کے خیال سے شام کو اس کے آجانے کے بعد کہیں نہیں جانی تھیں مگر جو باتیں وہ صدف سے بے ٹکان کر لیا کرتی تھی امی سے کہاں کرتی۔

البتہ کبھی کبھی جب صدف رہنے کے لیے آتی تو بس عید کا سامان ہو جاتا۔ وہ اب بجیلہ کے لیے پریشان رہا کرتی تھی۔ اس کے سامنے تو نہیں مگر غیر موجودگی میں امی پر زور دیا کرتی کہ وہ جلد از جلد بجیلہ کی شادی کرنے کی کوشش کریں۔

اس بار وہ نسبتاً جلدی آگئی، نہ کوئی فون، نہ اطلاع اور ابھی وہ لوگ حیرت بھری خوشی سے لکھنے بھی نہیں تھے کہ اس نے وہ خبر بھی سنا دی، جسے سنانے کے لیے وہ دوڑی چلی آئی تھی۔

”احمر بھائی کو تو بڑی اچھی جاب مل گئی ہے۔ ایک پرائیویٹ فرم میں، فہد کا اتفاقا جانا ہوا تو وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔“ اتوار کا دن تھا، گھر پر امی کے ساتھ بجیلہ بھی تھا، وہ دونوں ہی اس کی شکل دیکھنے لگیں۔ ایسا کہے ممکن تھا۔ بے شک احمر آج کل بہت کم آتا تھا مگر ایسی کوئی بات ہوئی تو وہ سب سے پہلے یہیں سنانے آتا۔

”ہوسکتا ہے، وہ وہاں کوئی انٹرویو دینے کے لیے ہو، فہد کو غلط فہمی ہوئی ہو۔“ بجیلہ نے ایک بوسہ ہوا زور سے تلاشا۔

”کیسی باتیں کرتی ہو آپلی!“ صدف تیزی سے

پولی، شادی کے بعد اس کی بات میں خود بخود وزن پیدا ہو گیا تھا۔

”احمر بھائی وہاں آفس میں بیٹھے باقاعدہ فائلیں چیک کر رہے تھے، فہد کو بتایا کہ ابھی آئیں وہاں جوائن کر رہے ہیں۔“

”وہ کھوتو بیلا، کسی نے تک فون کر کے نہیں بتایا، اس خوش خبری پر ہمارا حق نہیں تھا۔“ امی آزرہ ہونے لگی۔ خود بجیلہ کے بھی دل کو دھکا سا لگا۔ کیسی خوش خبری کی جودل دکھانے کا سبب بنی تھی۔

”ابھی فون کریں پچھو کہ گھر، ویسے تو آئے دن بیٹھے رہتے تھے احمر بھائی، اچھی جاب کیا ملی، دماغ پورانی ساتویں آسان پر جا پہنچا، امی مجھے تو ان لوگوں کی بات ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔“ صدف شاید اور بھی کچھ کہتی مگر بجیلہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”ابھی سے اندازے قائم مت کرو، میں خود بات کران گی اور ابھی اپنے ابا سے کچھ ذکر مت کرنا۔“ امی نے کچھ سوچتے ہوئے صدف کو ہدایت کی۔ وہ صرف اپنی اطلاع دینے کے لیے آئی تھی۔ تھوڑی دیر ہی بیٹھ کر اس پاری تھی۔ ابھی احمر کی آمد ہوئی۔

”دیکھا، آج فوراً آئے، پتا تھا کہ اب یہاں ملازمہ بیٹھنے میں دیر نہیں لگے گی!“ صدف نے دروازے سے نکلتے ہوئے سرگوشی کی تو بجیلہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

صدف اور فہد چلے گئے تو احمر نے وہ خوش خبری سنا لی، جواب تھوڑی سی پرانی ہو چکی تھی۔

”ہاں بتایا تھا صدف نے ابھی، مبارک ہوا۔“

امی کے انداز میں بڑی واضح رکھائی تھی۔ احمر نے کی طرف دیکھا تو وہ بھی بڑی سنجیدہ سی محسوس ہوئی۔

”اصل میں، ابھی تک کفر نہیں ہوں۔ اسی لیے تم پچھائیں لگا۔ میں نے سوچا پہلے پورا اطمینان بنائے۔“ پتا نہیں کیوں، بجیلہ کو ایسا لگا جیسے وہ جھوٹ کہہ رہے۔

”میں جائے بنا کر لاتی ہوں!“ وہ فضول بات کو جھٹک کر کھڑی ہوئی تو وہ بھی فوراً ہی اٹھ گیا۔

”نہیں، جائے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے چند ضروری کام ہیں، بس چلتا ہوں۔“

امی اور بجیلہ دونوں ہی حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ عام طور پر جب وہ آتا تھا تو اٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا اور دوپہر کا کھانا تو لازمی ہی تھا۔

”پھر آؤں گا فرصت سے!“ اس نے ان کی تسلی کی خاطر ہی کہا اور پھر فوراً ہی چلا گیا۔ بجیلہ بہت دیر طول سی ہوئی بیٹھی رہی۔ اگلے دن فیکٹری بھی نہیں گئی، سرور دکا بھانہ کر کے سارا دن اپنے کمرے میں ہی گزار دیا۔ اس سے اگلے روز جب وہاں پہنچی تو ایک نئی خبر وہاں بھی منتظر تھی، گواس کے لیے اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی پھر بھی.....

”فخر کا ٹرانسفر کر دیا ہے یہاں سے ستار بھائی نے، اب وہ ان کی دوسری فیکٹری میں کام کرے گا۔ چلا گیا یہاں سے کل پیچ بکس میں۔“

”اچھا!.....“ بجیلہ کو سن کر اچھا ہی لگا، خواجواہ فیکٹری کا ماحول خراب ہو رہا تھا۔

”گنیمے تو کل بہت روٹی، کہہ رہی تھی کہ سکیٹہ آپا نے جان بوجھ کر فخر کو یہاں سے بھیجا ہے۔ لڑکیاں ان سے میری شکایتیں کرنی تھیں، کہیں اس کا اشارہ ہم دونوں کی طرف تو نہیں ہے۔“ شالی کے پاس خبر کے ساتھ خدشات بھی تھے۔

”ہمیں کیا پڑی ہے۔ گنیمے کی حرکتیں چھپی ہوئی تھوڑی ہیں سب ہی کو پتا ہے کہ یہاں کیا چل رہا تھا۔“

بجیلہ نے بے پروائی سے کہتے ہوئے اس طرف دیکھا، جس طرف اب گنیمے بیٹھتی تھی۔ درمیان میں فاصلہ تو تھا، مگر اتنا بھی نہیں کہ وہ گنیمے کے چہرے کی اس قدر دگی کو نہ دیکھ پاتی۔ اب وہ سارا وقت اپنی جگہ پر ہی دکھائی دیتی۔

فخر کی جگہ نہ لڑکا آ گیا تھا ایک دو بار وہ آتا جاتا دکھائی بھی دیا تھا۔ فخر سے زیادہ خوش شکل تھا، شالی اور بجیلہ دونوں ہی کو یقین تھا کہ گنیمے کی شوخیاں پھر سے رفتار پکڑی شروع ہو جائیں گی مگر اب ایسا کچھ نہیں ہوا۔ گنیمے سارا وقت اپنی جگہ پر بیٹھی کام کرتی رہی اور چھٹی ہوتے



ہی خاموشی سے گھر کو روانہ ہو جاتی۔ ان کا روٹ ایک ہی تھا سو بس میں وہ الگ ہو کر بھی ساتھ ہی تھیں، شالی کی زبانی پتا چلا کہ وہ اب بھی فخر سے ملتی ہے۔ بجیلہ اور اس کے درمیان چھائی سردھری برقرار تھی کسی کسی وقت بجیلہ کا بڑا دل چاہتا کہ وہ اس کو احمر کی نئی نوکری کے بارے میں بتائے کہ اب وہ کتنی بہترین جگہ پر کام کر رہا ہے اور زمانے بھر کا چھپورا فخر اب بھی ستار بھائی کے کسی تنگ سے آفس میں بیٹھا گارنشن کا حساب کتاب دیکھتا ہو گا۔ دل ہی دل میں اس گھٹیا سی مقابلے بازی سے اسے بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی۔

احمر کا آنا جانا اب کم ہو گیا تھا، نیا آفس نئی ڈسٹے واریاں۔ گھر میں امی اب بجیلہ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف رہنے لگی تھیں۔ پیچھونے کہا تھا کہ اب جلد ہی وہ باقاعدہ تاریخ لینے والی ہیں۔

احمر کی بے اعتنائی کا سارا گلہ بجیلہ کے دل سے جاتا رہا تھا۔ اب تو اس نے دل میں یہ حساب جوڑنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ احمر پر اس کا کتنا قرض باقی ہے۔ اب یہ حساب کسی خوبصورت لمبے میں بے باق ہونا تھا۔ اس بار صدف والا سلسلہ نہیں تھا۔ پیچھو اور ان کے گھرانے کو جینز میں ہر شے کی توقع تھی اور یہ باتیں وہ یاد دہانی کے طور پر عرصے سے کر رہے تھے سو اس بار اچھی طرح تیاری درکار تھی۔ بجیلہ کی تنخواہ اب اسی دم میں خرچ ہو رہی تھی۔

شالی اسے خوش دیکھ کر خوش تو ہوتی مگر ساتھ میں تھوڑی سی اداسی بھی گھیرتی۔ ”میں یہاں اکیلی ہو جاؤں گی، نگینہ کے ساتھ اب وہ پہلے والی بات ہی نہیں رہی، ویسے بھی اسے تو فخر کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں ہے اب۔“ شالی جب بھی زیادہ دل گھبراتا اسی طرح کی باتیں کرتی تھی، بجیلہ اسے مایوسی سے ٹکالنے کے لیے کچھ بھی کہتی وہ بے اثر ہی جاتا۔

”خالہ خالو کہتے ہیں کہ میں آکر ان کے ساتھ رہنے لگوں مگر میں سوچتی ہوں کیا فائدہ، یہاں ہوں تو آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل والی بات ہے، وہاں رہوں گی تو اشرف اپنی بیوی کے ساتھ آتا جاتا دکھائی دے گا پھر

بڑی مشکل ہو جائے گی۔“ وہ گود میں رکھے ہاتھوں کو ہلکے ہلکے سے ملتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں جانے کی، یہاں کم از کم اپنے پیروں پر کھڑی ہو، ماں باپ کے سامنے میں رہ رہی ہو، وہاں جا کر ان لوگوں کی بے دام غلام بن کر رہ جاؤ گی اور بس.....“ بجیلہ کو یہ سوچ کر ہی برا لگ رہا تھا کہ شالی جیسی ستم رسیدہ ایک بار پھر اسی آزمائش کی بجنی میں جھوکی جائے۔ کچھریل والے برآمدے میں نرم سی دھوپ پھیل رہی تھی اور فرش پر ہوا کے سرد جھونکوں سے ٹوٹ کر گرنے والے تیز پیلے پھول اڑتے پھر رہے تھے۔

”اماں زور تو نہیں دیتیں مگر دے لفظوں میں کہتی ہیں کہ میں واپس چلی جاؤں، ان کا خیال ہے کہ اسی میں عزت ہے!“ شالی کی آواز اور دھیمی ہوئے لہجے۔

کس کی عزت، اسی کہنے اشرف کی جس نے ایک بار دھکا دے کر باہر نکالا..... واپس انہی کے دروازے پر جا کر پڑنا ضروری ہے کیا؟“ بجیلہ کو بہت زور کا غصہ آیا۔ شالی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر بھی بجیلہ کے پیچھے کچھ دیکھ کر یکدم ہی چونک اٹھی۔

”ارے، اسے کیا ہوا؟“ بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکلا۔ بجیلہ نے بوہنی بیٹھے بیٹھے مڑ کر دیکھا تھوڑے فاصلے پر نگینہ کھڑی تھی۔ منگجے سے کپڑوں میں میک اپ کے بغیر اس کا چہرہ بڑا بے رونق سا لگ رہا تھا۔ پچھلے دو تین دن سے وہ یہاں نہیں آ رہی تھی اور اب آئی تھی تو اس وقت جب لڑکیاں کھانے کے وقتے میں باہر آئی بیٹھی تھیں۔

”کوئی بات ہے ضرور، ظہر میں پوچھ کر آئی ہوں!“ شالی کہتی ہوئی اٹھی اور بجیلہ کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گئی۔ لڑکیوں کا ایک گروپ پہلے ہی نگینہ کو گھیرے کھڑا تھا۔

”صرف توجہ حاصل کرنے کے ڈرامے!“ چند لمحوں بعد جب وہ شالی کے کندھے سے لگ کر رو رہی تھی، بجیلہ نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس کی طرف سے رخ پھیرا۔

اسے تلاش کر لیا مگر کچھ فائدہ نہیں، اب کل اس کے کسی دوست نے بتایا ہے کہ اس نے وہاں حیدر آباد میں ہی نوکری کر لی ہے اور پچھلے جمعہ کو اس کا نکاح بھی ہو گیا ہے وہیں.....“

”کوئی نئی بات نہیں!“ بجیلہ کے انتہاک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ”ایسی کہانیوں کا یہی انجام ہوتا ہے، تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ فخر بہت عزت کے ساتھ نگینہ کا ہاتھ تمام لیتا، ظاہر ہے اسے یہی کرنا تھا جو اس نے کیا۔“ شالی خاموش سی ہو گئی۔ اسے امید تھی کہ پرانی دوستی کے صدف نے ہی سہی بجیلہ، نگینہ کے لیے دو لفظ تو ہمدردی کے کہہ ہی دے گی۔

”نگینہ کی حالت بہت رومی ہو رہی ہے کہتی ہے مجھے منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا ہے اس فخر نے، آج یہاں سے اس کا حیدر آباد والا پتا پوچھنے آئی ہے مگر سکیڑہ آپا نے بھی صاف انکار کر دیا ہے۔“ شالی کی آنکھوں میں سہم سا طاری ہو رہا تھا۔

”معلوم نہیں ان دونوں کی دوستی کس حد

کھانے کا وقت اب ختم ہو رہا تھا، بجیلہ لٹخ باکس بند کر کے واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھی، ساری لڑکیاں ایک ایک کر کے اندر آ رہی تھیں مگر نگینہ ان میں نہیں تھی اس کی بیٹ بدستور خالی تھی۔ بھی اسے شالی اندر آتی دکھائی دلی۔

”بے چاری نگینہ کے ساتھ بہت برا ہوا!“ وہ دونوں اب آگے پیچھے ہی بیٹھتی تھیں۔

”یہ نگینہ بے چاری کب سے ہو گئی ہے؟“ بجیلہ نے اس کی ایکسٹنٹ نوکیسر نظر انداز کیا۔

”سنو تو سہی، فخر نے بہت برا دھوکا دیا ہے اسے، بے چاری تو بہت غلطی کی اس کے ساتھ!“

”وہی روایتی کہانی!“ بجیلہ تیزی سے بغیر کرنے لگی مگر شالی اس کی بے نیازی کو خاطر میں لائے بغیر وہ سارا قصہ سنانے کے لیے بے تاب تھی جو یہاں آدھی لڑکیوں کو تو معلوم ہو ہی چکا تھا۔

”بہت دن سے فخر غائب تھا جہاں کام کرتا ہے وہاں بھی نہیں آ رہا تھا، موبائل بھی بند تھا۔ نگینہ نے ہر جگہ

## ماہنامہ کس جنوری 2008ء

== لکھنے کے علاوہ صرف عشق کیا ہے۔

== مجبوری ہے اپنے مداح قارئین سے فاصلہ رکھنا پڑتا ہے۔

== ادب کے ٹھیکے دار ڈائجسٹوں میں لکھنے والوں کو بے ادب سمجھتے ہیں۔

== 77 سال کا بوڑھا نانڈ بے میں سفر کرنا چاہتا ہے۔

یہ اور بہت سارے تھکے سوالات کے دلچسپ و ممتی خیز جوابات

لاکھوں دلوں کی دھڑکن اور دنیا کی طویل ترین کہانی و یوتا کے تخلیق کار

محی الدین نواب کا دلکش نئے تصنیف میں خصوصی اظہار خیال

نواب صاحب کی اس نئی کتاب کے لیے جنوری 2008ء کو کس جنوری میں

جاسوسی ڈائجسٹ پہلی کیشئر فون: 5895313 فیکس: 5802551



تک.....؟“ بھیلہ نے پل بھر کے لیے کام پر سے ہاتھ روک کر اس کی آنکھوں میں جسے خوف کو دیکھا اور پھر واپس مٹھیں پر دباؤ بڑھانے لگی۔ آج اسے زیادہ سے زیادہ کام ختم کر لینا تھا کیونکہ کل کی چھٹی لینی تھی۔ پھپھو نے گھر بدلنا تھا اپنا پڑا گھر کرانے پر وہ کروہ جتنا بہتر علاقے میں آئی تھیں، یہ ان سے زیادہ احمق کی خواہش تھی، اب سے نہیں کتنے ہی عرصے سے اور اب جب اسے اچھی بھاری بھر کم تنخواہ مل رہی تھی تو اس نے اپنی خواہش کو پورا کرنے میں دیر نہیں لگائی۔



پھپھو کے گھر محفل میلاد تھی، پھپھو اصرار کے ساتھ بلاوادی گئی تھیں۔ بھیلہ کو یہ محفل سعید، اپنی متوقع خوشیوں کا پیش لفظ ہی محسوس ہو رہی تھی اور وہ اس میں پوری تیاری کے ساتھ شرکت کرنا چاہ رہی تھی۔ اگلا سارا دن جیسے پر لگا کر اڑا۔ گلی میں ہی واقع بیوٹی پارلر سے آئی بروز بوائس، بال بہت اچھی طرح شیمپو کے پہلی باران میں کندہ بشر بھی لگا یا اور چہرے پر ماسک بھی، پنج ایک دن پہلے صدف آئی تھی تو کمرنگ تھی۔ سہ پہر کو جب وہ تیار ہو رہی تھی تو شخصیت میں ایک بڑا واضح گھٹا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک دم اسے نگینہ یاد آئی۔ یہی سب جو وہ آج بطور خاص کر رہی تھی، نگینہ کے معمول کا حصہ تھا۔ شاید جانے والی نظر کے آگے سراہے جانے کی خواہش بھی کی ایک جیسی ہوتی ہے۔

اسے اپنی اور نگینہ کی مماثلت عجیب سی لگی مگر آج کا دن فضول سوچوں کی نذر کرنے کے لیے نہیں تھا۔ صدف کو اپنے گھر سے ہی وہاں جانا تھا۔ یہاں سے بس وہ ادرا لے گئی تھی، اسی کا خیال تھا کہ رکشا سے چلے جائیں گے مگر بھیلہ نے نیکی پر اصرار کیا۔ ”نیکی میں زیادہ اچھا لگے گا امی، اتنی مدت بعد تو جارہے ہیں۔“ امی خاموش ہو رہی ہیں، وہ اپنا کمار ہی نہیں سوچ رہی تھی کہ کو بھی دل چاہتا تھا۔ ”تین سو سے کم نہیں لے گا کسی والا اور پر سے کیک، مٹھائی پورے ہزار روپے کا نسخہ ہے۔“ جب تک وہ لوگ گھر سے نکلیں، ابابڑ بڑا تے ہی رہے۔

پھپھو کا گھر کافی ٹھیک ٹھاک تھا۔ بتایا ہوا دن یونٹ گھر زیادہ بڑا تو نہیں تھا مگر ان لوگوں نے اس سے پہلے اتنا فشنگ والا گھر نہیں دیکھا تھا۔ ”مجھے تو کوئی گڑ بڑ لگ رہی ہے، بھلا کم سے کم بھی کیا کرایہ ہوگا اس گھر کا.....؟“ صدف نے سرگوشی کی میلاد شروع ہونے میں ابھی تھوڑا وقت باقی تھا اور پھپھو انہیں خیر انداز میں اوپر نیچے گھر دکھاتی پھر رہی تھیں۔ ”آفس کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اب وہاں اس گھر میں تو کوئی بٹھانے لائق جگہ بھی نہیں تھی، احمق کے پاس نے خود اس گھر کا انتظام کر کے دیا ہے، کرایہ تنخواہ سے کم چایا کرے گا۔“

”بھلا سمجھ میں آنے والی بات ہے آپ!“ صدف سے پھر تیز رہ گیا، بھیلہ اسے مشتعل متنبی لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔ صرف امی تھیں جو چہرہ پر دیکھ کر بہت خوشی سے ماشا اللہ کہے جا رہی تھیں۔ پل بڑا اسٹاکس تھا اور حقیقتاً جگہ گراہ تھا۔ ”اس گھر سے کم از کم ہمیں بغیر بکھاری ہوئی وال کھا کر تو واپس نہیں جانا پڑے گا!“ کسی یاد نے چلتی سی لی تو صدف اپنی بات کہتے ہوئے قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ بھیلہ نے شکر کیا کہ پھپھو، امی کو لے کر وہاں سے چاچی نہیں۔

پھپھو کی بیٹیاں تیار ہو کر اب کمرے سے برآمد ہونا شروع ہو گئی تھیں، ان دونوں کو دیکھ کر کسی سی خوشی کا اظہار کیا اور پھر مہمانوں کو ریسیو کرنے میں لگ گئیں۔ گھر کے آگے والے لان میں تقریب کا انعقاد تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ آنے والوں میں زیادہ تر نئے چہرے ہیں، خاندان میں سے صرف کتنی کی دو چار خواتین ہی آئی تھیں، وہ بھی وہ جو نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھیں۔

”مجھے تو بڑا اطمینان ہوا یہاں آ کر، اللہ نے ہماری سن ہی لی۔“ امی کے لہجے میں بڑی گہری طنز تھی۔ بھیلہ نے کن انکھیں سے پھپھو کی طرف دیکھا کہ شاید وہ اس کے حوالے سے کوئی خوش امید بات کریں مگر آج وہ بہت مصروف تھیں۔ شاید ڈھنگ سے سنا بھی

نہیں۔ خاندان کی خواتین نے البتہ امی کو خصوصی طور پر مبارکبادی احمق کی جانب کی، سب کا خیال تھا کہ بس اب قادی ہونے میں کچھ ہی دن اور لگیں گے۔ خود کو موضوع سبوتا دیکھ کر بھیلہ ہجک کر وہاں سے اٹھ گئی۔ مہمان خواتین ابھی آئی رہی تھیں۔ سامنے گیٹ سے کچھ بٹ کر احمق کچھ لڑکیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے قدم بڑے نادانستہ سے انداز میں اس کی طرف اٹھ گئے۔ وہ ساری شکلیں اس کے لیے انجان تھیں پھر بھی اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا کہ وہ لوگ احمق کی کوٹنگ ہیں۔ ”یہ میری کزن ہے بھیلہ!“ اسے قریب کھڑا دیکھ کر احمق کو سی سناخار کرانا پڑا۔

”اچھا!“ ان سب نے بڑی دلچسپی سے اس کا جائزہ لیا۔ ”کیا کر رہی ہیں ابھی، پڑھ رہی ہیں یا کہیں باب اسٹارٹ کر لی ہے؟“ وہ جو ابھی صرف ”کزن“ ہی میں چھپی غیریت کے مطلب معنی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، سوالات کی اس بوچھاڑ سے بالکل کنفیوز ہونے لگی۔

”گر گریجیشن کر لیا ہے، اب فیشن ڈیزائننگ کر رہی ہے!“ سامنے کھڑا احمق بڑے اعتماد سے ان لوگوں کو اس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ گارمنٹ ڈیزائنری میں نوکری کی بے عزتی کو بھینا اب اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی، پر یہ عزت افزائی بھی اس کے اعتماد کو بحال کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

”بہت دلچسپ سبجیکٹ ہے، مزہ تو بہت آتا ہو گا!“ احمق کے بالکل ساتھ کھڑی وہ بے معمولی شکل کی لڑکی اس سے بڑے اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ مٹھوں کی گھر گھر سے گونجا ہوا وہ بڑا سا ہال پل سے گھٹ کر رتھے میں اس کی نگاہوں میں گھوما۔

”جی بہت۔“ وہ ہلکے سے کہہ کر واپس مڑ آئی، میلاد شروع ہو گیا تھا۔ وہ سیدھی صدف کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”کہاں پھر رہی ہو تم، جب پھپھو کی بیٹیاں ہمیں ملے تھیں دے رہیں تو کیا ضروری ہے کہ ہم تنخواہ بیچ

## گھریلو ٹوٹکے

☆ کپڑے اور برتن دھوتے وقت دستا نے ہنسنے کی عادت ڈالیں، یہ ہاتھوں کی حفاظت کے لیے بہت ضروری ہے۔ چھوٹی بچیوں کو شروع سے ہی دستاؤں کی عادت ڈالیں۔

☆ آنکھوں کی سوجن دور کرنے کے لیے ان پر کٹے ہوئے آلو رکھیں۔

☆ کپڑے دھونے سے پہلے ہاتھوں پر کوئی بھی چکنی چیز مل لیا کریں تاکہ پاؤں میں پایا جانے والا کاسٹک سوڈا ہاتھوں کی ملامت پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

☆ کام کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں کو اچھی طرح خشک کر کے کوئی سی بھی کریم ضرور لگائیں۔

☆ بار بار پانی سے ہاتھ دھونا اچھا نہیں ہوتا، اس سے گریز کریں۔

☆ کھانے کے بعد کیوئیالیوں کے جھلکے سے ہاتھوں کو صاف کیا جاسکتا ہے۔ اس سے ہاتھ نرم ہوتے ہیں۔

☆ بعض اوقات گوشت ایسا آجاتا ہے جو گھٹے میں ہی نہیں آتا۔ اس کے لیے آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ خرپوزے کے جھلکے کھاکر رکھ لیں اور جب کبھی ایسی صورت حال پیش آئے تو گوشت میں ڈال کر پکا لیں گوشت گل جائے گا۔

☆ عرق لیموں میں ہم وزن گلیسرین ملا کر اس میں ایک چھوٹا چمچ بورک ایسڈ ڈال کر تینوں کو یکجا کر لیں اور شیشی میں بھر کر رکھ لیں، ہاتھ دھونے کے بعد دن میں دو تین بار استعمال کریں، یہ عمل ہاتھوں کو نرم اور چمکنا رکھتا ہے اور ہاتھوں کی رنگت نکھارنے کے لیے بے مثال ہے۔

☆ ناخن اور انکھوں کی پوروں پر کیوئیالیوں کے جھلکے ملتی رہا کریں، اس سے ناخن اور پوروں میں چمک آجاتی ہے۔

شائستہ رمضان، کراچی



# دائے زندگی کے

## تحسین اختر

”کیسے چپ کر جاؤں بچہ انہوں نے تو اپنی طرف سے بڑا چھانٹ کر لڑا چنا تھا بڑا کہتی تھیں مجھے کہ عیش کرو گی عیش.....“ شافہ کی بات کانٹے ہوئے ابا جان نے کہا۔

”لیکن بیٹا یہ تو بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے۔ اس نے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ موصوف کی اتنی ساری خوبیاں بغیر سانس لیے ہی گنوائے جا رہی ہو۔“ ابا جی عصر کی نماز

”امی دیکھ لیا آپ نے اپنے اچھے اور بہت اچھے دادا کا حال جس کی تعریفیں کرتے ہوئے آپ ہلکتی نہیں تھیں۔“ اس نے اپنے پلو سے نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے ماں سے شکوہ کیا تھا۔

”ارے آپا بس بھی کرو اب چپ ہو جاؤ امی کا پیلے ہی بلڈ بریش بہت ہائی ہے“ مدحہ نے شافہ کے کندھے تھام کر اس کے آنسو پونچھے تھے۔



ایک نظر دیکھ لینے کے خیال سے ہی چند قدم آگے بڑھائے تھے جو قدموں تلے سے زمین سر کی گئی۔ بہت دیر کروہ لٹے قدموں واپس پلٹی۔

”کوئی ہے احمر!“ ایک نسوانی آواز اسے سنائی دی۔

”ارے کوئی نہیں، تمہارا وہم ہے!“ احمر کی آواز میں بڑا خفا تھا۔

جیلہ کو پلٹ کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ اس نے دیکھا۔ سڑکیوں کو چٹنی تیزی سے وہ طے کر سکتی تھی اس نے کی پھر بھی آخری سے چند میٹر کی اوپر اس کا پاؤں بری طرح پھسلا۔ گلابوں سے بھری ٹوکری الٹ کر میڑھیوں پر اور نیچے فرش پر پھیل گئی تو وہ بے بس ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ ٹھنڈوں میں منہ چھپا کر اس نے خود کو کمپوز کرنے کی پوری ہمت کے ساتھ کوشش کی مگر آنسو بڑی روانی کے ساتھ اس کے چہرے کو تر کرتے رہے۔

چند لمحے یونہی خاموشی کے ساتھ دل پر سے ہوتے گزرے تھے اسی لگا جیسے کوئی اس کے دامن میں آگیا۔ جیلہ نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ بالکل سامنے قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا جس میں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا مگر یہاں وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ شانی اور نگینہ بھی تھیں۔ وہ چپ چاپ سامنے دکھائی دیتے اس عکس کو دیکھنے لگی جہاں وہ تینوں ایک ساتھ موجود تھیں۔ مثلث کے تین زاویوں کی طرح الگ الگ بھی اور ایک دوسرے سے جڑی ہوئی بھی۔

”کیا ہے تقدیر کا مجید بھاء؟ اس نے ایک گہری سانس کھینچی اپنے اپنے ارمانوں کی راہ پر چلی وہ تینوں لڑکیوں کی لگتی ہیں۔ جیلہ نے ایک اور حیرت بھری نگاہ سامنے والے شے پر ڈالی۔

کتنی مماثلت..... اور وہ خود کتنی بڑی احمق تھی کہ مرد کی ذات کو پہچانے بغیر اپنے آپ کو دوسروں سے ”الگ“ سمجھنے کا دم لے بیٹھی تھی۔ ایک دم ہی اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ شانی اور نگینہ کو سامنے والے شے سے نکال کر گلے سے لپٹائے۔

\*\*\*

میں گھمیں!“ صدف خفا ہوئے گی اور پھر میلاؤ کی محفل کا خیال آیا تو فوراً ہی خاموش بھی ہو گئی۔ جیلہ اس با برکت محفل سے تقریباً گم ہی رہی، بار بار درود شریف پڑھتے ہوئے وہ اس درس کی طرف پورا دھیان دینے کی کوشش کرتی جو بڑے مؤثر انداز میں دیا جا رہا تھا مگر سارا دھیان اس لڑکی کی طرف جا رہا تھا جو احمر کے ساتھ بہت قریب ہو کر کھڑی تھی اور ایک بار بھی یہاں آ کر نہیں بیٹھی تھی جب کہ اس کے ساتھ آئی دوسری لڑکیوں کو وہ یہاں مستقل موجود دیکھ رہی تھی۔ پچھو، ان کی بیٹیاں بھی جب یہاں تھے تو آخر وہ کہاں تھی۔

”کیا بات ہے؟“ صدف نے اسے بے چینی سے پہلو بدلتے دیکھ کر سرگوشی میں پوچھ لی۔

”کچھ نہیں، میں ذرا پانی پی کر آتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر شامیانے سے باہر آئے گی بھی پچھو تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔

”جیلہ، اوپر میرے کمرے میں سے گلاب کے پھولوں والا تھاں تو اٹھا لاؤ بانٹنے کے لیے، یہ لڑکیاں تو بس بیٹھ ہی گئیں تیار ہو کر بیٹھ کر!“

”جی اچھا! اس نے ایک خاموش سی نگاہ پچھو کی تینوں بیٹیوں پر ڈالی جو بطور خاص پڑھنے والیوں کے دامن میں بیٹھ چکی تھیں۔

اس نئے گھر کے تینوں بیڈ رومز اوپر تھے، سڑھیاں طے کر کے پچھو کے کمرے سے گلاب کے پھولوں سے بھری کین کی باسٹ اٹھانے میں اسے چند منٹ ہی لگے، اوپری لاؤنج میں صرف سیٹ لائٹس ہی جل رہی تھیں۔ سوتا جاگتا یہ ماحول اتنا دلکش تو ضرور تھا کہ اسے چند لمحوں کے لیے رک کر سہا لیا جاتا۔ جیلہ کے بھی قدم سڑھیوں کی طرف بڑھتے بڑھتے رکے تھے بھی اسے جیسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دھڑکنے ہوئے دل کے ساتھ اس نے اوپر اوپر دیکھا، لاؤنج حقیقتاً خالی ہی تھا پر دوسری طرف آخری دروازہ نیم وا تھا۔

”معلوم نہیں یہ کس کا کمرہ ہے۔ لڑکیوں کا یا احمر کا!“ اس نے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے محض



پڑھ کر گھر آئے تو شافہ کے گلے شکوے سن کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئے تھے۔

”کیا بتاؤں اباجی، عادل نے اس شرط پر مجھے گھر بھیجا ہے کہ جب تک میں آپ سے عیدی کے طور پر ایک ہٹا کتا کھڑا سا بکرا نہیں لاتی وہ مجھے لینے نہیں آئے گا۔ اب آپ بتائیں یہ کوئی تک ہے۔ آج کے اس مہنگائی کے دور میں بکرا خریدنا کوئی آسان تھوڑی ہے۔ دس ہزار تک کا تو مرل صا بکرا ملتا ہے پھر آپ کیسے اس کی نگلڑے سے بکرے کی فرمائش پوری کریں گے۔ لوگ ایسے موقع اور تہواروں پر روٹھے ہوؤں کو منا کر گھر واپس لاتے ہیں اور اس سختی القلب آدمی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔“ وہ پھر رونے لگی تھی۔

”عادل ایسا تو نہیں ہے، بات واقعی پریشانی والی تھی۔ مرزا صاحب کے ماتھے پر بھی پریشانی اور نظررات کی لکیریں ابھرنے لگی تھیں۔ عذرا بیگم شوہر کی پریشان صورت اور بیٹی کے آنسوئیں دیکھ سکتی تھیں وہ سخت سے اتر کر چپل گھینٹے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔“

”میں اس سے بات کرتا ہوں۔ وہ میرے لیے غیر تھوڑی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا سر ایک ایماندار فیکٹری در کر رہے اور مینے بھر کی سر توڑ محنت کے بعد جو چھ سات ہزار مجھے ملتے ہیں وہ چار بچوں کے بڑھنے اور گھر کے اخراجات پر اٹھ جاتے ہیں اگر میری اتنی استطاعت ہو تو کیا میں ہر سال قربانی سے محروم رہ جاؤں۔ میں خود قربانی نہ کروں۔“ وہ عادل سے بات کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”رہنے دیں اباجی، بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ سب باتیں میں نے اس سے کی تھیں اور پھر وہ خود بھی تو ہمارے حالات جانتا ہی ہے تا لیکن اس نے میری کوئی نہیں سنی اور مجھے یہاں بھیج دیا۔ اباجی وہ کہہ رہا تھا اس کے یار دوست اور ملنے ملانے والے کھاتے پیتے لوگ ہیں اور سب لوگ قربانی کریں گے۔ ایسے میں ہمارا بکرا نہ خریدنا بہت شرمندگی کا باعث ہے اور آپ کو تو پتا ہے کہ آپ کا داماد کتنا شاہ خرچ ہے سے شک ہم دونوں میاں بیوی آٹھ نو ہزار میں اچھی طرح گزارہ کر

سکتے ہیں بلکہ بچت بھی کر سکتے ہیں لیکن اسے کسی نے بچت کرنے کی عادت ڈالی ہو تب نا۔ جب وقت بے وقت ہوٹلوں میں کھانے کھائے جائیں گے۔ یار دوستوں کی ضیافتیں کی جائیں گی تو پھر آٹھ نو ہزار کی کیا اوقات پچاس ہزار بھی کم پڑ جاتے ہیں۔“ شافہ نے کہا۔

”لا حول ولا قوۃ کیا زمانہ آ گیا ہے، یار دوست رشوت کے مال سے پلے پلائے بکرے خرید رہے ہیں تو اسے بھی بکرا چاہیے، چاہے کسی بھی ذریعے سے۔ اس کا مطلب ہے قربانی خدا کی راہ میں دینے کی نیت سے نہیں کی جاتی بلکہ لوگوں کو دکھانے اور اپنا اسٹیٹس بڑھانے کے لیے کی جاتی ہے۔ تو یہ تو بے خدا پاک ایسے خیال اور نیت سے دور ہی رکھے۔“ وہ اس مسئلے کا حل سوچتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل پڑے تھے۔

”اباجی اب میں کیا کروں؟“ شافہ نے پیچھے سے انہیں پکارا تھا۔ اس کی شادی کو ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا تھا دو سال۔ وہ عید کا خوبصورت اور مقدس دن اپنے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ منانا چاہتی تھی۔ بے شک شوہر کیسا ہی مطلبی و خود غرض اور سنگ دل کیوں نہ ہو۔ ”کچھ کرتا ہوں۔“

وہ جھکے تھکے سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے تھے۔

\*\*\*

دسمبر کا دوسرا ہفتہ تھا، نرم نرم سی دھوپ درو دیوار کو آسودہ حرارت سے نواز رہی تھی۔ شافہ چھت پر پڑی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے گھر سے آئے ہوئے پانچ دن ہو گئے تھے۔ عادل نے ابھی تک اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا گویا وہ ابھی تک اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔ اسے شادی کے ابتدائی دن یاد آرہے تھے۔ ان دنوں کی اپنی اہمیت اور حسن ہوا کرتا ہے۔ شاید اس وقت فریقین پر ایک دوسرے کی خوبیاں ہی خوبیاں آشکار ہوتی ہیں۔ خامیوں پر دبیز پردہ پڑا ہوتا ہے جو بعد میں آہستہ آہستہ اترتا ہے۔ عادل بھی اس کے ساتھ بہت اچھا رہا تھا۔ وہ محبتوں اور رفاقتوں کا ترسا ہوا شخص تھا۔ شافہ نے اس کو پور پور آسودہ کر کے مکان کو گھر بنا دیا تھا۔ وہ بھی بہت



موج میں ہوتا تو اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر احسان مندی کے طور پر اس کا بے حد شکر گزار ہوتا کہ جس نے اس جیسے سیلابی شخص کو اپنی محبت کی زنجیروں میں باندھ دیا تھا۔ وہ دن بے حد اچھے تھے لیکن آج کل کے دن بہت بے کیف اور اداس کر دینے والے تھے۔ وہ اس کے والدین کی مالی حالت سے بخوبی آگاہ تھا پھر اس نے ایسا کیوں کیا۔ تیز دھوپ شافعی کی آنکھوں میں چھینے کی تھی لیکن اسے اس سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے اندادو پنا منہ پر ڈال لیا اور آنے والی عید کے متعلق سوچنے لگی۔ جب تک عادل اس کی زندگی میں نہیں تھا تب اور بات تھی لیکن دو تین عیدیں اس کے سنگ منالینے سے اسے لگنے لگا تھا کہ ان عیدوں کے تمام رنگ عادل کے ساتھ موجود ہیں۔

”آپا سوگئی ہو کیا؟“ مدیحہ اس سے دو سال چھوٹی تھی اور تھرڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ وہ دھلے کپڑوں کی بالٹی اٹھائے اوپر آئی تو اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”نہیں، اس وقت نیند کہاں آئے گی۔ بس دھوپ میں لینے سے سستی سی چھا گئی ہے۔ تم نے پڑے دھو کیے، مجھے بلایا ہوتا۔“ مدیحہ کی آواز پر اس نے دوپٹا منہ سے اتار لیا۔

”تم تو مہمان ہو آیا پھر میں تم سے کام کرواتی اچھی لگوں گی۔“ وہ ہنس کر کپڑے تار پر پھیلانے لگی تھی۔

”مہمان..... کیا خبر یہیں رہنا پڑ جائے۔“ وہ طنز بے انداز میں مسکرائی تھی۔

”کیوں، اللہ نہ کرے دیکھ لینا تم عید سے پہلے اپنے گھر چلی جاؤ گی۔ مایوس کیوں ہوئی ہو۔“ مدیحہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن کیسے، کیا ساتھ والے وحید صاحب کے گھر کے باہر بندھا ہوا موٹا سا کالا بکرا کھول کر لے جاؤں۔“ شافعی نے طنز کیا۔

”آپا بابا لگے تو ہیں پیسوں کا انتظام کرنے۔“ وہ کپڑے پھیلا کر اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

”پیسوں کا انتظام کرنے لیکن کہاں سے.....؟“

وہ چیخے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ”ابھی تو ان کا پچھلا قرض نہیں اترتا۔ وحید صاحب کے دس ہزار جو پچھلے مہینے قرض لیے تھے وہ تو ابھی تک نہیں لوٹا سکے ہیں۔“ شافعی نے فکر مندی سے کہا۔

”وہ ان کا مسئلہ ہے، قرض آہستہ آہستہ اتر جائے گا اب تمہیں تو کسی نہ کسی طرح گھر بھیجنا ہی ہے نا۔ ورنہ عادل بھائی کے ساتھ ساتھ لوگ بھی باتیں بنائے لگیں گے۔“ مدیحہ نے کہا۔

”مدیحہ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ زندگی کس قدر مشکل ہے۔“ شافعی نے کہا۔

”آپا زندگی مشکل نہیں ہے بس اسے ہم لوگوں نے اپنے لیے مشکل بنا لیا ہے۔“ وہ ایک گہری بات کہہ کر سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ باپ کی بے بسی پر شافعی کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنا لگی تھی۔ وہ پیچھا جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے ایک بار پھر وہیں لیٹ گئی تھی اور خیالوں میں کھو گئی۔

\*\*\*

”آپا، یہ دیکھو میں نے تمہارا دوپٹا رنگا ہے کتنا اچھا لگ رہا ہے نا۔ یہ سوکھ جائے گا تو اپنے ہاتھ سے اس پر گونا گواؤں گی۔ اچھا لگ رہا ہے نا۔“ مدیحہ سرخ دوپٹا اس کے سامنے پھیلا کر اسے دکھانے لگی تھی۔

”ہاں، اچھا ہے۔“ وہ بے دلی سے بولی تھی۔ کل عید تھی اور عید کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ ابا پیسوں کا انتظام نہیں کر سکے تھے جس کی وجہ سے وہ اب تک یہیں تھی۔ امی جان اور ابا بھی اس سے یوں آنکھیں چرائے پھر رہے تھے کہ جیسے اس کا گھر میں موجود ہونا ان کی وجہ سے ہو۔

”آپا شام کو چوڑیاں بننے چلیں گے۔“ مدیحہ دروازے تک جاتے جاتے پلٹی تھی۔ شاید اس کی عمر کا تقاضا تھا کہ وہ اتنی فکر میں نہ پڑے۔ شافعی نے اس کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

جوں جوں شام ہوتی جا رہی تھی باہر سے آتی پٹاخوں قہقروں کی آوازیں اور روڑھیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن شافعی عادل کے دل میں تاریکی رہتی جا

ہی تھی۔ خدا جی کو مجبور اور غریب بھی پیدا نہ کرے۔ کئی بار اس کے دل سے یہ شکوہ ابھرتا اور اس نے کئی بار خود ہی منہ سے معافی مانگی تھی۔

”آپا، آپا جلدی سے باہر آؤ۔ جلدی آؤ نا۔“ اس سال گڑیا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی تھی۔ اس سے چوٹا حاشر بھی پیچھے پیچھے تھا۔

”کیا ہے مدیحہ؟“ وہ دوپٹا درست کرتے ہوئے ان کے ساتھ باہر آ گئی تھی۔

”عادل! اس نے آنکھیں مل کر اسے بار بار دھکا دیا کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہے۔“ ”ہاں..... میں!“ وہ بکرے کی رسی مدیحہ کے ہاتھ میں تھا کہ اس کے قریب چلا آتا تھا۔

”لیکن..... یہ..... بکرا۔“ وہ الٹ الٹ کر بولی تھی۔

”یہ بھی میں لایا ہوں۔ ہم اس بار عید یہیں منائیں گے اور دل کر قربانی کریں گے۔“ عادل نے کہا۔

”دل..... لیکن.....“ وہ ابھی تک کچھ نہیں بھیجی تھی۔

”لیکن..... لیکن.....“ وہ آدھرا آدھرا کہہ رہی تھی۔

”تم بھی جاؤ شافعی۔“ وہ اندر چلا گیا تھا جب کہ وہ ابھی تک سکتے کی سی کیفیت میں وہیں کھڑی تھی۔ شافعی نے کن انکھوں سے ابا کی طرف دیکھا جو مدیحہ کے ہاتھ سے بکرے کی رسی تھامے اسے ایک طرف لے کر مٹے جارہے تھے۔ امی بھی پکٹ میں جا چکی تھیں۔

”ان لوگوں کے سامنے عادل کے پاس جاتے شرم آ رہی تھی۔ میدان صاف دیکھ کر وہ عادل کے پاس چلی گئی تھی۔ اسے ابھی اصل معاملہ معلوم نہ تھا۔

”یہ کیوں لائے ہو، ہماری غریبی اور بے بسی کا مذاق اڑانے کے لیے.....؟“ وہ روٹھے ہوئے انداز میں اندر جا کر بولی تھی۔

”شافعی بلیر، مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارا اور تمہارے گھر والوں کا دل دکھایا ہے۔ جب بڑی آیا کے سسرال سے بھی یہی تقاضا آیا کہ سسرال والے بکرا بھیجیں تو میری آنکھیں کھلیں کہ بری بات تو بری ہی ہوتی ہے۔“ عادل دھستے لہجے میں بولا۔

”اگر چوٹ لگ کر تمہیں عقل آگئی تھی تو مجھے بلوا لیا ہوتا۔ یہاں کیوں آگئے ہو۔“ شافعی نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ میرا گھر نہیں ہے۔ ماموں بھی تو باپ کے برابر ہوتے ہیں۔“ عادل نے بھی ہلکا سا شکوہ کیا تھا۔

”وہ تو ہیں۔“ وہ گڑبگڑائی تھی۔

”تو پھر ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔ امی اور ابو بکرا لے کر تایا کے گھر گئے ہیں تاکہ بڑی آپا خوش ہو جائیں اور میں یہاں آ گیا۔“

”عادل تم نے مجھے بہت ستایا ہے۔“ دل پر تحریر کچھ گلے کھٹوے مٹے تو اپنا خیال آیا تھا۔

”مجھے پتا ہے اسی لیے تو اب تمہیں منانے آیا ہوں بمعہ بکرا۔“ وہ شوخ ہوا تھا اور اپنی پُر شوق نظریں شافعی کے رخ چہرے پر نکا دی تھیں۔

”اب بھی نہ آتے۔“ وہ اس کی نظروں سے بچتے ہوئے منہ موڑ کر بولی تھی۔

”کیسے نہ آتا۔ لوگوں کو عید کا چاند آسمان پر دیکھنا تھا مجھے زمین پر..... وہی تو دیکھنے آیا ہوں۔“ اس نے اس کے کندھے پکڑ کر اپنی طرف گھاڑا تھا۔

”واہ جناب، بڑے عاشق بنے پھرتے ہیں۔ یہ نہیں پتا کہ اس عید کا چاند تو دس دن پہلے ہی نکل آیا ہے پھر آپ کو سنا چاند تلاش کرنے آئے ہیں۔“ اس کی فکری ہنسی نے عادل کی ساعتوں میں رس کھولا تھا۔

”مجھے تو بس ایک ہی چاند کی تلاش ہے۔“ اس نے ایک شوخ جسارت کی تھی۔

”میں اپنا بکرا دیکھنے جا رہی ہوں۔“ شافعی گھبرا کر باہر دوڑ گئی تھی۔ عادل نے صحت چھاڑتے ہوئے لگا ہوا عید ایک روز پہلے ہی اس گھر کے درو دیار کو اپنی خوشبو سے مست کرنے لگی تھی۔



# جب خوشبو نے تھا ماہاتھ

نورین ظفر خان



junaid



”آسمان جیسی گہری براؤن گول گول  
 آنکھیں.....“ شاہ میر نے آنکھیں بند کر کے ایک جذب  
 کے عالم میں کہا۔  
 ”تیرا دماغ تو ٹھیک ہے شاہ میر۔ یہ آسمان کا  
 رنگ براؤن کب سے ہو گیا؟“ شاہ میر کے منہ پر  
 کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ شاہ میر سے  
 استفسار کے ساتھ ساتھ اس نے آسمان کی طرف ایک  
 نگاہ ڈال کر اطمینان کرنا چاہا اور اسے تسلی ہوئی کہ آسمان



ہمیشہ کی طرح صاف شفاف نیلے رنگ کا تھا۔  
 ”اس کے سفید بال اتنے نرم و ملائم ہیں جیسے کوئی  
 مٹکی کبل۔“ شاہ میر، آذری حیرتوں سے بے خبر کھڑی کا  
 پٹ تھا۔ بدستور خوبانہ لہجے میں بولا تھا۔  
 ”سفید بال.....؟“ آذری نے ڈھرایا..... حیرت کا  
 شدید جھٹکا۔ ”کیا وہ کوئی ساٹھ سالہ لڑکی ہے؟“ اسے  
 شاہ میر کی بات ہضم نہیں ہوئی تھی۔ اب اتنا بڑا وقت بھی  
 نہیں آیا تھا کہ شاہ میر جیسا نوجوان بڑھا لکھا خوبصورت  
 بندہ ساٹھ سالہ بڑھیا سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس نے  
 ایک ٹھنڈی آہ بھری واقعی محبت اندھی ہوئی ہے مگر اتنی  
 اندھی.....

”کل جب وہ سڑک کر اس کر رہی تھی تو اچانک  
 ایک کار سامنے آگئی۔“ اس نے لہجے میں سہنس بھر اور  
 یوں گویا ہوا جیسے وہ منظر سامنے ہو۔

”میں گیٹ پہ کھڑا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے پاؤں دوڑ  
 پڑا اور بھاگ کر اس کے نرم دنازک وجود کو اپنی بانہوں  
 میں اٹھالیا۔“ شاہ میر بتا رہا تھا۔

”شاہ میر چپ کر جاؤ، اب میں ایک لفظ بھی  
 برداشت نہیں کروں گا تم تو بالکل ہی پاگل ہو گئے ہو یعنی  
 ایک لڑکی کو تم نے بانہوں میں اٹھالیا، آسان جیسی براؤن  
 آنکھیں، سفید بال..... یہ سب کیا بکواس کیے جا رہے  
 ہو۔ اس کو تو چھوڑو تمہارے خوابوں کی شہزادی نہیں ہے  
 جسے تم تھامے کھڑے ہو۔“ آذری نے کھڑی کے پٹ  
 سے چپکے شاہ میر کو کھینچ کر سامنے کیا۔

”کیا مصیبت ہے؟“ شاہ میر اس طرح کھینچنے پر  
 چلا یا جیسے واقعی اسے خوابوں کی شہزادی سے الگ  
 کر دیا گیا ہو۔

”رہتی کہاں ہے وہ؟“ آذری کڑے تیور لیے  
 ہوئے تھا۔

”آئی وہیہہ کے گھر۔“ وہ جھنجھلا کر صوفے پر  
 آ بیٹھا۔

”جہاں تک میری معلومات ہیں ان کے گھر میں  
 کوئی لڑکی نہیں ہے۔ اکل احمد اور آئی وہیہہ اکیلے ہی  
 رہتے ہیں۔“ آذری کا جیس کے مارے برا حال تھا۔

”لڑکی.....؟“ شاہ میر نے آذری کی ساری گفتگو  
 میں لفظ لڑکی پر حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔ ”لڑکی کا  
 ذکر کس نے کیا؟“

”دیکھو شاہ میر مجھے غصہ آرہا ہے۔ تمہارے حق  
 میں یہی بہتر ہے کہ مجھے صاف صاف سیدھے الفاظ میں  
 بتا دو۔ ورنہ..... ورنہ..... کہنے کے ساتھ اس نے ادھر  
 اُدھر نظر دوڑائی کس مناسب چیز کی تلاش میں جسے اختیار  
 کے طور پر استعمال کر کے مناسب کارروائی کر سکے۔ آخر  
 اس نے ٹیبل پر پڑا کرشل کا گلدان اٹھالیا، انداز بڑے  
 جارحانہ تھے۔ شاہ میر کو اس کے نشانی پر تو کچا بھر سا تھا  
 کہ آج تک نشانی پر نہیں لگا تھا مگر اپنی قسمت کی طرف  
 سے ہراسہ نہیں تھا کیا پتا ہی جاتا لہذا فوراً صبح جو  
 انداز اپنایا۔

”آذری میرے بھائی بقول تمہارے جس لڑکی کا  
 میں ذکر کر رہا ہوں وہ اصل میں لڑکی نہیں بلکہ آئی وہیہہ کی  
 خوبصورت سفید بلی ہے۔“ ٹھہر ٹھہر کر اصل قصہ بیان کیا  
 گیا۔ آذری کے تو پاؤں سے لگی سر پہ بھی والا کام ہوا اکل  
 اس کے کے گلدان اسے دے مارا شاہ میر ابھی آواز  
 میں چیخا۔

”دیکھو اگر یہ ٹیٹ گیا تو ما مجھے اور تمہیں اس کی  
 کرچیوں سمیت باہر پھینک دیں گی۔“ آذری غصہ  
 ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ آئی کے ڈر سے اس نے  
 گلدان نہایت شرافت سے میز پر رکھ دیا تھا مگر صوفے  
 سے سارے کشن سمیٹ لیے تھے۔ ”حق، مالائق،  
 گدھے جیسے القابات سے نوازنے کے ساتھ ساتھ وہ  
 کشن شاہ میر کو مار رہا تھا جنہیں شاہ میر نہایت آرام سے  
 کچھ کر رہا تھا کیونکہ اس کی فیلڈنگ بہر حال آذری کی  
 باؤنڈنگ سے نہیں بہتر تھی۔

☆☆☆

”خاموش ہو جاؤ، اب ایک لفظ بھی میرے نکالا تو  
 گلا دبا دوں گا۔“ آذری بھی کہ شہر کی دھاڑ دہاتی زور سے  
 بولا تھا نیلی ٹوبی دین سم کر رہ گئی۔ اس نے بھی تصویر بنی  
 نہیں کیا تھا کہ اس کا دولہا اس روپ میں سامنے آئے  
 گا۔

”لیکن آپ بھی تو.....“ اس نے کمزور لہجے میں  
 کہہ کرنا چاہا مگر اس کے الفاظ ادھورے ہی رہ گئے۔  
 ”خاموش ہو جاؤ کسی نے تمہیں شوہر کی عزت  
 کرنی نہیں سکھائی۔ آگے سے زبان چلائے جا رہی ہو۔  
 آواز سے جا کر بیٹہ پر بیٹھ جاؤ۔“ وہی غصیلہ لہجہ تھا۔  
 ٹیبل کی تیز آواز پر وہ چونکی..... پیمبر تین ٹیبل پر  
 بیٹھا اور آؤر گیٹ کی طرف کھینچا۔ دیکھنے میں اس قدر  
 شگ ہوئی کہ دروازہ بجنے کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی اور اب  
 مسلسل بجتی ٹیبل نے اسے ہوش دلایا تھا۔

”آج تو شامت آئی۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے  
 ایک کھولا اور سامنے ٹیڈی آئی کے چھوٹے بیٹے کاشی کو  
 دیکھ کر غصے سے کھول اٹھی۔

”کیا ہے؟“ اس نے کڑک کر پوچھا۔ کاشی نے  
 غصے سے لال ہوئی ندیا کو دیکھا ضرور دگر ڈرا بالکل نہیں تھا  
 کیونکہ اب تو وہ اس کے مزاج کا عادی ہو چکا تھا۔ بھی  
 اتنی نرم خود ہو جاتی کہ اس کے لیے ٹافیاں نکلاتی۔ اس  
 کے ساتھ کرکٹ بھی کھیل لیتی مگر کبھی کبھار تو اسے  
 پھانسنے سے بھی انکار کر دیتی اور ایسا تب ہوتا تھا جب  
 دادو جان سے عزت افزائی ہوتی تھی۔

”آئی، دادو جان نہیں آئیں ابھی۔“ اس کے  
 غصے سے بے پروا کاشی نے کھلے گیٹ سے اندر جھانکا۔  
 کاشی نے دادو جان کو لٹولانے کے لیے پیسے دے  
 رکھے تھے اس لیے لٹو کے حصول کے لیے وہ تیسری  
 رتبہ پتا کرنے آیا تھا۔

”نہیں آئیں ابھی، جب آئیں گی تو دیوار سے  
 اڑا دے لوں گی۔“ خبردار جواب دروازہ بجایا۔ ”کہنے  
 کے ساتھ اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور پھر لاؤنج  
 میں آگئی۔ ناول لکھنے کے دوران کاشی نے اسے تین  
 چار ڈسٹرب کیا تھا اس لیے اس کا غصہ عروج پر پہنچ چکا  
 تھا۔ دادو اماں اور آئی صبح سے بازار گئی ہوئی تھیں اور  
 دادو جان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس نے کاغذ  
 غصہ کیا تھا۔ اب ناول کا اختتام لکھ رہی تھی کہ کاشی  
 نے پھر ڈسٹرب کر دیا، لکھنے کا موڈ بالکل ختم ہو گیا تھا۔  
 اکل نے سارے کاغذ سینے اور دروازے میں ڈال

دیے۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔  
 ”دادو جان اور آئی اب آنے والی ہی ہوں گی۔“  
 اس نے خود کلامی کی مگر دادو جان کے ذکر پر دل ایک دم  
 سے دھڑکا تھا۔ دادو جان شاید کچھ کرنے کو کہہ کر گئی تھیں  
 مگر وہ ”کچھ“ کیا تھا اسے سرے سے یاد ہی نہیں تھا۔  
 ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود ناکامی ہوئی۔ اس  
 نے فوراً کچن کی راہ لی کہ شاید وہاں یاد آجائے۔

”کیا کروں؟“ بے بسی سے خود سے سوال کیا۔  
 ”دادو جان نے کیا کرنے کو کہا تھا۔“ ڈائمنڈنگ  
 ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر سردیوں ہاتھوں میں تمام کر اس  
 نے پھر سے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اصل میں جب دادو  
 جان نے کام بتائے تھے وہ اس وقت ذہن میں ناول کا  
 پلاٹ ترحیب دے رہی تھی اس لیے سن کر سمجھ ہی نہیں پائی  
 تھی۔

”آٹا گوندہ لیتی ہوں۔“ چٹکی بجاتے ہوئے اٹھ  
 کھڑی ہوئی۔ آٹا گوندہ کر فریق میں رکھنے کے لیے فریق  
 کھولا تو وہاں سفید پیلا ایلپلے سے موجود تھا۔ پلیٹ ہٹا کر  
 اس نے دیکھا تو اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔ صبح کا بیجا ہوا  
 آٹا بھی کافی سارا بڑا تھا اور اس نے بھی اب بڑے کھلے  
 دل سے گوندہ لیا تھا۔ ٹیبل کی تیز آواز پر وہ چونکی پیالے کو  
 فریق میں پٹھا اور دروازے کی طرف چل دی۔ اب کی  
 بار دادو جان اور آئی نہیں۔ متوقع بے عزتی کا خیال اسے  
 ڈرا رہا تھا۔

”اُف خدا یا بہت گرمی ہے۔“ دادو جان اندر کی  
 طرف جاتے ہوئے بولیں گیٹ بند کر کے وہ ڈھیلے  
 قدموں سے اندر آئی تھی۔ آئی چادر اتار کر دوپٹا لے چکی  
 تھیں۔ گرمی سے ان کا چہرہ دھک رہا تھا۔

”ندیا بیٹا، ذرا پیالہ تو پلانا۔“ دادو جان نے کہا۔  
 ”آئی کیا، کیا لائیں ہیں؟“ دادو جان کو گلاس  
 تھامے ہوئے وہ آئی کے پاس آ بیٹھی جو شاہ پر ز میں  
 چیزیں چیک کر رہی تھیں۔

”یہ دیکھ لو، میں ذرا کچن میں چیزیں سیٹ  
 کر لوں۔“ انہوں نے تین شاہ پر اس کے آگے کیے اور  
 باقی دو ہاتھ میں لے کر کچن کی طرف چل پڑیں جن



میں جھپٹے بھر کا سودا تھا۔ دالیں، گوشت، بیکن اور انڈے وغیرہ۔

”ندیا چنے ابال دیے ہیں؟ کچن کے دروازے پر رک کر آئی ہے پوچھا۔

”اوہ! خدایا تو چنے ابالے تھے، پیاز کا ٹٹی تھی! بس پیس کر رکھنا تھا اور کاشی سے وہی منگوانا تھی۔“

چنوں کے ساتھ ہی ساری لسٹ یاد آگئی۔ آئی کے ساتھ ساتھ دادو جان کی سوالیہ نگاہیں بھی اس پر آٹھیں۔

”جی آئی میں نے دو لفظ بڑی مشکل سے ادا کیے اور آئی کے پیچھے ہی کچن میں آگئی۔ وہ شارپ شیل پر رکھ کر چنوں کی تلاش میں نگاہ دوڑا رہی تھیں۔

”آئی۔ وہ اصل میں، میں ناول لکھ رہی تھی ناں تو مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ آج چاول پکانے ہیں۔“ ندیا

روانی سے مگر بہت آہستہ آواز میں بولی مبادادادو جان نہ سن لیں۔

”تو.....“ اس کی خاموشی پر اڑے فرخج میں رکھتے ہوئے آئی نے مڑ کر پوچھا۔

”تو یہ کہ میں نے چنے نہیں ابالے۔“ ندیا نے انگلیاں پچھائی آواز آہستہ تھی۔ اور ”پیاز بھی نہیں

کائی۔“ ایک توقف کے بعد پھر بولی۔ ”اور وہی بھی نہیں منگوا یا۔“ آخر بات پوری ہو گئی تھی۔ اس کے انداز پر آئی

بشکل اپنی ہنسی روک پائی تھیں۔

”ندیا، بہت بری بات ہے اگر دادو جان کو معلوم ہو جائے تو خوب ڈانٹ پڑے۔ پھر تم فٹ سے رونے لگ جاتی ہو۔ اب تم بچی نہیں رہی ہو۔“ انہوں نے

سنجیدہ لہجہ اپنایا۔

”سوری آئی، مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔ آپ دادو جان کو نہیں بتائیں گی نا.....!“ اس نے لاڈ سے ان کے

گلے میں بائیں ڈال دیں۔

”اچھا، اچھا اب چلو۔ پیاز کا ٹو بہت دیر ہو گئی ہے۔“ آئی بولیں۔

☆☆☆

”کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں“  
”ہزاروں ہی بے عزتیاں ہوئیں کیا کیا بتاؤں“

وہ بڑے سر میں تان سین بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک مصرعہ ہی گایا تھا کہ آڈرنے دوسرا مصرعہ بڑی روانی سے کہہ ڈالا۔ شاہ میر نے تان ٹوٹنے پر آڈر کو کھڑک دیکھا یہ اور بات ہے کہ ہمیشہ کی طرح اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”کیا آواز میں درو پایا ہے میر درد صاحب۔“ آڈرنے اس کے نام کے لاشعے سے فائدہ اٹھایا اور اس کی سر میں درد کرنے والی آواز کی تحریف کی۔

”داستانِ حیات جب غموں سے بھری پڑی ہو تو درد آئی جاتا ہے۔“ وہ یوں بولا جیسے دنیا کا دھڑی ترین شخص وہی ہو۔

”بہتر ہو گا کہ آپ اپنے درد کو اپنے تنک محدود رکھیں برائے مہربانی اسے دوسری کسانوں میں مت اٹھ لیں۔“ اب اس نے واضح تحریف کی تو شاہ

میر تڑپ کر پلٹا۔

”انتہائی بد ذوق آدمی ہو تم۔“ اسے اپنی مدد سرائی پسند نہیں آئی تھی۔

”یقیناً جس کا دوست تم جیسا ہو وہ آدمی بد ذوق ہی ہو سکتا ہے۔“ اس کا جواب شاہ میر..... کے لیے

نازیانہ ثابت ہوا۔

”کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے“ شاہ میر گنگٹایا۔

”بے عزت ہو گئے تم یہ ہمارا اندازہ ہے“ اس نے ایک بار پھر اپنی آواز کا جادو سمجھنا چاہا

مگر اب کی بار بھی آڈرنے اس کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

”یار تجھے تکلیف کیا ہے آخر یہ شاہ میر بھلا لے ہوئے بولا۔

”جس کا دوست تم جیسا ہوا۔“ کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔“ آڈرنے ایک بار مگر غصہ کیا۔

”ٹھیک ہے تو پھر میں چارہ ہوں خبردار جو مجھے روکا۔“ وہ فوراً کھڑا ہوا تھا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو

روکنا ہے تو روک لو۔

”اللہ حافظ۔“ آڈر بھی کہاں کم تھا۔ رخصتی کے

الفاظ کہہ ڈالنے میں دیر نہ کی۔

”یار شرم آئی چاہیے تجھے کتابداری لفظ، بد عقل واقع ہوا ہے تو.....“ شاہ میر پھر سے پلٹا تھا۔

”تشریف رکھیے جناب ذی وقار، عقل ناپائیدار صاحب میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں۔“ اس نے

شاہ میر کا بازو پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور خود کچن کی راہ لی۔ اب چائے ہی شاہ میر کے مڑو کو بہتر کر سکتی تھی۔

”وہ عشق جو ہم سے روٹ گیا اب اس کا حال سنائیں کیا“ آڈر چائے لے کر لاؤنج میں آیا تو اس کا ریکارڈ

پھر سے بج رہا تھا۔ فریدہ خاتون کی آواز کو پہچان کر تا ہوا وہ عشق کے دکھ سے گارہا تھا۔ اس بار آڈرنے اس کو

چیخڑنے کی غلطی نہیں کی تھی ورنہ نتیجے کے طور پر ایک چٹائی چائے اور بنائی پڑی۔ راگ کا اختتام ایک آہ پر

کر کے اس نے چائے کا گھونٹ لیا۔

”یار، یہ آج اتنی عجیب اور ٹھنڈی آہیں کیوں تمہارے دل ناداں سے نکل رہی ہیں؟“ آڈرنے اس

کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے بڑے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔ جس کا جواب بڑا مہنگا پڑا تھا۔ شاہ میر تو تھا ہی اس

بات کا منتظر کہ اسے اپنی داستانِ حیات سنائے کاموقع مل جائے، کان تو وہ ہمیشہ ہی کھاتا تھا آج تو اس نے حد

ہی کر دی۔

”دوست کیا بتاؤں۔ وہی پرانا مسئلہ ہے محبت کا۔“ کہنے کے ساتھ ایک ٹھنڈی آہ پھر سے بھری۔

”تم کتنے خوش قسمت ہو آڈر! ایک ہم ہیں۔ زمانے بھر کے طریقے آزماتے آئے مگر کوئی لہجہ دھڑکنے کوئی

مس ولڈ کوئی حسینہ شارٹ کٹ زلفوں والی یا ناگن جیسے سیاہ مٹل کھاتے بالوں والی ہم یہ مہربان نہیں ہوتی

اور یہ میر ا دل کم بخت بھی تو کسی شیار کے پراندے میں نہیں اٹھا۔“ آڈر جو کہ صوفے پر بیٹھا تھا، نیم دراز

ہو گیا۔ شاہ میر کی داستانِ غم شروع ہو چکی تھی اور آڈر جانتا تھا کہ اس کا دورانیہ پندرہ بیس منٹ سے کسی

طور کم نہ ہو گا اور اتنی دیر بیٹھ کر جمائیاں لینے سے لیٹا کھیں، بہتر تھا۔

”میں تمہیں لوری نہیں سنائے لگا ہوں۔“ اسے

لیٹنے دیکھ کر شاہ میر چڑ گیا۔

”دوست تم کسی رکھو صرف لیٹا ہوں، سوؤں گا نہیں۔ تم اپنی بات جاری رکھو میں نہایت غور سے سن رہا ہوں۔“ آڈرنے اسے تسلی دی۔

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ محبت کرنے کا ہر قسمی، ڈرامائی، کٹائی طریقہ آزمایا مگر محبت نے تو گویا نہ ہونے

کی قسم کھائی ہے مگر میں نے بھی بہت نہیں ہاری۔ پہلے دن کی طرح آج بھی اپنے قول پر قائم و دائم ہوں۔

ایک طریقہ اور ہے میرے ذہن میں۔“ شاہ میر بڑا پرجوش تھا۔ آڈر جتنے آرام سے لیٹا ہوا تھا اس سے زیادہ

جلدی اٹھ بیٹھا۔

”اور ایک اور طریقہ کیا ہے؟“ آڈر نے جلدی سے پوچھا کیوں کہ پرانے سارے طریقہ اسے ابھی

طرح یاد تھے جو شاہ میر نے آزمائے تھے۔ شروع میں تو اس نے اخلاق کا یہ معیار اپنایا تھا کہ ہر کسی کے سامنے

مسکرائیے کا اشتہار بن جاتا۔

”کوئی کام ہو تو ضرور بتائیے گا۔“ وہ مسکرا کر بڑے خوبصورت انداز میں لڑکیوں سے کہتا..... ساتھ

میں ان کی والدہ محترمہ کو بھی اپنی خدمات پیش کرتا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف شاہ میر کی پکار پڑنے لگی تھی۔ کسی لڑکی کو

رسالہ منگوانا ہوتا تو شاہ میر حاضر، کسی آئی کو کبزی منگوانی ہوتی تو شاہ میر حاضر۔ صبح شام کے چکروں میں وہ کھن

چکر بن کر رہ گیا۔ ڈانٹ الگ اور جب لڑکیوں نے اس کی آرزوؤں کے خلاف شاہ میر بھائی پکارنا

شروع کیا تو اس نے لالوں والا کہہ کر مسکراتے دانٹوں پر سختی سے خول چڑھایا اور لوگوں میں کسی حد تک مغرور

مشہور ہو گیا۔ اس کا نتیجہ بھی کچھ اچھا نہیں نکلا لڑکیاں اس سے کئی کڑا کر نکل جاتیں۔

آخر اس نے محبت کی تلاش کا ایک اور طریقہ آزمایا۔ اس کے خیال میں آدھی محبتیں شادیوں میں قائم

ہوتی ہیں لہذا اس نے شادیوں میں جانا شروع کر دیا مگر وہاں بھی کچھ خاص بات نہیں بنی۔ مہندی، بارات پر

لڑکیاں اس جج دج سے تیار ہوتیں کہ اسے ہر لڑکی اپنی محبوبہ نظر آنے لگی مگر چہرہ وحل جانے کے بعد وہ پچھان



ہی نہیں پلا کہ یہ کون ہے۔ دوسرا نقصان یہ بھی ہوا کہ شادی کے گھر میں تھتے ہی اس کی والدہ محترمہ کو اپنے بیٹے کے سر پر سہرا باندھنے کا شوق اہال کی طرح اغما اور پھر کئی روز تک وہ یہی موضوع لیے رہیں۔

”طریقہ یہ ہے کہ اس بار میں کسی تجربہ کار آدمی سے مشورہ لوں گا۔“ شاہ میر بولا۔

”تم نے محبت کرنی ہے کہ مٹھائی کی دکان کھولنی ہے۔“ آذر اس کی بے تکلیف بات پر مسکرایا۔

”وہیے یار آج تو تم مجھے بتا دو، ترس کھا لو مجھ پر اور اپنی محبت کی پرسوز داستان سنا دو شاید اس میں ہی مجھے بھی کوئی کلیو مل جائے۔“ آذر کی بات نظر انداز کر کے وہ اس کے سر ہو گیا۔

”چھوڑ دیا ر.....“ آذر کا لہجہ آزرہ سا ہو گیا۔

”چھوڑنا تو میں ہوں اور اتنی لمبی کہ سینی مشکل ہو جاتی ہے مگر آج تمہیں نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ اگر تمہیں چھوڑ دیا جائے تو میں بے محبت رہ جاؤں گا اور کبھی بڑا نہیں ہو سوں گا۔“ شاہ میر بولا۔

”یار بھی تو ٹھیک اردو بول لیا کرو۔“ آذر نے اس کے لفظ بے محبت پر ٹوکا۔

”اور وہیے میری محبت میں تمہارا بڑے ہونے کا کون سا پہلو لگتا ہے؟“ آذر نے حیرت سے پوچھا۔

”پہلو تو کیا پورا وجود لگتا ہے۔ تم مجھ سے آٹھ سال بڑے ہو، محبت کیے ہوئے تمہیں زیادہ نہیں تو چھ سال تو ہو گئے ہوں گے۔ تم وسیع تجربہ رکھتے ہو، ذرا اپنے دوست کو بھی مستفید ہونے کا موقع دو۔ پلیز یار بس تم مجھے وہ جگہ بتا دو جہاں تمہیں کسی خوبصورت لڑکی سے محبت ہوئی تھی۔“ شاہ میر منت پر اتر آیا تھا اور باقاعدہ آذر کے گھٹنے دبانے لگا۔

”بڑے مرشد مجھے اپنا مرید بنالیں ورنہ میں بے فیض و بے شرم ہی اس دایرہ فانی سے کوچ کر جاؤں گا۔ پیر مرشد میرے والد بزرگوار کی نسل پر رحم کریں۔ پیری آنے والی نسل پر ترس کھائیں اور اپنے اس حقیر پر نصیحت مرید کو اس عظیم شرمندگی سے بچالیں جو اسے اپنی اواد کے سامنے اٹھانی پڑے گی۔“ آذر کے گھٹنوں پر سر

رکھے وہ ایسے بول رہا تھا جیسے کوئی مرید اپنے پیر سے دعا کروا رہا ہے۔

”شاہ میر تم تو بالکل پاگل ہو گئے ہو۔“ آذر اس کے انداز پر بھلا گیا۔

”پاگل نہ کہو مجھے دیوانہ نہ کہو۔“ وہ لہک کر مہا شروع ہوا ہی تھا کہ فون کی تیز بیل نے اسے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ کینہ تو نظروں سے ٹپکی فون کو گھورنے لگا جب کہ آذر فون سننے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ہیلو، السلام علیکم آئی۔“ وہ آواز پہچان کر بولا۔

”جی میں بالکل خیریت سے ہوں۔ شاہ میر میرے پاس ہی ہے، جی اچھا میں اسے بھیجتا ہوں۔ جی بالکل۔ اللہ حافظ۔“

”پہنچ گیا شاہی پیغام۔“ آذر فون رکھ کر پلٹا ہی تھا کہ شاہ میر تنک کر بولا۔ ”شہزادہ عالم کی ڈھنڈی بج گئی ہوگی۔ ملکہ صاحبہ کو اپنے اکلوتے سب جیسے لعل کی یاد ستانے لگی ہوگی۔ خدام کو شہزادہ عالم کی بازیافت کے لیے دوڑا دیا گیا ہوگا۔“ وہ تن فون کرتا بول رہا تھا کہ آذر کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”ہنس لے بیٹا ہنس لے۔“ شاہ میر، آذر کی ہنسی پر مزید چڑ گیا۔ آذر کے ہال آئے ہوئے ابھی اسے آدھا کھٹکٹا ہی ہوا تھا اتنی جلدی واپس بلائے جانے پر وہ تپ گیا تھا اصل غصہ تو اسے اپنی اتنی ضروری بات کے ادھورے رہ جانے پر تھا۔

”اچھا، اب زیادہ گرم مت ہو اور گھر کی راہ لو۔“ آذر نے عینک آنکھوں پر جمائی۔

”ایسے تو میں نہیں جاؤں گا۔“ شاہ میر جو کھڑا تھا آذر کی بات سن کر دھیمے سے صوفے پر گر گیا۔

”ایسے تو تم واقعی نہیں جاؤ گے جب تک میں خود تمہیں باہر کی راہ نہ دکھا دوں۔“ آذر کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

”خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔“ شاہ میر کے ایک دم چیخنے پر وہ تنک کر کر گیا۔

”کیوں تم نے چلا کاٹ لیا ہے اپنے گرد کہ تمہیں

ہاتھ لگانے سے میں پتھر کا ہو جاؤں گا۔“ آذر اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

”چلے تو اب شروع ہوگا۔ جب تک مجھے یہ نہیں جاؤ گے کہ سینی سے کہاں ملے تھے میں نہیں جاؤں گا۔“ وہ مزید صوفے پر پھیل گیا تھا۔

”ارے یار میں کوئی بھاگا جا رہا ہوں پھر کبھی آرام سے بات کر لیں گے۔“ آذر نے ماننا چاہا۔

”تم تو بھاگے نہیں جا رہے مگر میری عمر بھاگی جا رہی ہے بقول والدہ محترمہ میری عمر کے لڑکے دو، دو بچوں کے والد محترم بن چکے ہیں۔ وہیے آذر تمہارے گھٹنے پیچے ہیں؟ تم تو مجھ سے آٹھ سال بڑے ہو۔ کم از کم آٹھ بچے تو ضرور ہونے چاہئیں اور خدا زیادہ مہربان ہوا ہو یعنی ایک سال میں ذیل گفت ملا ہو تو دس بھی ہو سکتے ہیں، ہیں ناں؟“ وہ شرارت سے بولا۔

”شاہ میر تم بہت بدتمیز ہو گئے ہو ٹھیک کہتی ہیں آئی تمہاری شادی کر دینی چاہیے۔“ آذر اس کی بات پر جھنجھکیا تھا سو اپنی جھنجھکی کو مٹانے کے لیے بولا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ جب تک بدتمیز نہ ہوں جب تک شادی نہیں ہو سکتی۔“ شاہ میر بڑی حیرت سے بولا تھا۔

”وہیے میں آج ڈیڑی سے پوچھوں گا کہ وہ کس عمر میں بدتمیز ہوئے تھے کہ واداجان کو ان کی شادی کا خیال آ گیا لیکن آذر اگر بندہ شادی کے بعد اور بدتمیز ہو جائے تو کیا اسے شادی کرتے رہنا چاہیے؟“

شاہ میر کی زبان فینچی کی طرح چل پڑی تھی وہ بڑی رازداری سے آذر سے پوچھ رہا تھا۔

”اوہ میرے خدا۔“ آذر نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

”تم انتہائی فضول شخص ہو۔“

”دیکھو مشرتم مجھے اصل مقصد سے ہٹا رہے ہو۔“

”سیدھی طرح بتا دو..... ورنہ..... ورنہ۔“ اس نے پھرے کے تاثرات کو خوف ناک بنانے کی ناکام کوشش کی۔

”ورنہ کیا.....؟“ آذر نے ڈرنے کے بجائے تنک کر پوچھا۔

”ورنہ یہ کہ میں پھر سے بیٹھ جاؤں گا۔“ دھمکی

کو بے اثر ہوتا دیکھ کر وہ نہایت معصومیت سے کہتا ہوا پھر سے بیٹھ گیا تھا۔

”نہ جاؤ تمہاری مرضی ویسے آئی بتا رہی تھیں کہ انکل بھی آپ کے ہیں۔“ اس نے بطور خاص انکل کا ذکر کیا۔

”تو پھر.....؟“ شاہ میر بھی آج ہر ڈر سے آزاد تھا۔

”بہت ڈھیٹ ہو تم.....“ آذر غصے سے بولا۔

”ڈھیٹ نہیں ابن ڈھیٹ ہوں۔“ خیال آنے پر اس نے زبان دانتوں تلے دبا لی۔ ”میرا مطلب تھا اپنی ڈھیٹ۔ دیکھو آذر کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے اگر تم خرچ سے بچنا چاہتے ہو تو منہ کھولو ورنہ نتائج کے ڈٹے دار تم خود ہو گے۔“ شاہ میر نے کہا۔

”یہ لو.....“ آذر بھی کہاں کہ تھا کہنے کے ساتھ ہی اس نے منہ کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔

”اب تم پٹو گے مجھ سے؟“ آذر کے انداز پر اس نے غصے سے کشن اٹھا لیا اس سے پہلے کہ وہ حملہ کرنا فون بج اٹھا آذر نے متنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

”دیکھو اگر عزت پیاری ہے تو فوراً انکل یہاں سے ورنہ انکل خود آ رہے ہیں۔“ فون سن کر وہ اس کی طرف پلٹا۔

”میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اگر مجھے بتا دو تو میں ابھی چلا جاتا ہوں۔“ وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

”یونیورسٹی میں.....“ آذر نے یوں کہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ سن لیا اب جاؤ دفع ہو جاؤ۔

”یونیورسٹی.....“ شاہ میر نے جوش سے دہرایا۔

”باقی کل سہی“ کہتا ہوا وہ دروازے کی طرف بڑھا اور آذر نے سکون کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

”ندیا سو جی اچھی طرح بھونٹا۔“ کچی ہوئی تو حلو صبح نہیں بنے گا۔“ دادو جان نے ندیا کو ہدایت کی جو کڑا ہی میں سو جی ڈال رہی تھی۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ اور بیزار صاف رقم تھی۔

”کشمش میں نے صاف کر دی ہے۔ تم کھوپرا،



بادام پرایک کاٹ لیتا، دادو جان نے پلیٹ اس کے پاس رکھی۔

”اچھا.....“ اس نے بڑی بے دلی سے جواب دیا۔ دراصل آج جمعرات تھی اور دادو اماں ہر جمعرات کو بیٹھاپکا کر نیاز دلاتی تھیں۔ ندیا کے انگریز سے پہلے تک یہ فریضہ آپنی اور دادول کر احیام دیتی تھیں مگر جب سے ندیا انتھانوں سے فارغ ہوئی تھی دادو جان کی نظر عنایت اس پر اکٹھری تھی۔ جتنا وہ بیٹھے سے خار کھاتی تھی اتنا ہی دادو اسے بیٹھی ڈشوں میں اکسپرٹ کرنا چاہتی تھیں۔ بقول دادو جان کے ”ضروری ہیں کہ ندیا کی طرح اس کے سرال والے بھی کیڑے کی کانوں کو پسند کرتے ہوں۔“

”مولوی خاندان سے بھی تعلق نہیں رکھتے ہوں گے۔“ جواب میں ندیا چڑ کر کہتی تھی۔ گزشتہ جمعرات دادو نے اس سے زورہ بنانے کو کہا اور جب اس نے پانی کا پوچھا کہ کتنا ڈالوں تو دادو جان نے کہا کہ اندازے سے ڈال لو۔ اب انہیں کیا پتا تھا کہ ان کی پوتی کا اندازہ اتنا وسیع اور کھلا ہوگا کہ چاول، چاول بننے کے بجائے حلوے کی شکل اختیار کر گئے تھے لہذا اب کی بار انہوں نے رسک لینا مناسب نہ سمجھا اور پانی جگ میں ڈال کر اس کے قریب لار کھا۔

”دادو آپ کے ہاتھ کا پنا حلو تو اتنا ڈال لے دار ہوتا ہے۔ چنانہیں مجھ سے کیسا بنے گا۔ پلیز آپ خود بنا لیں ناں!“ کڑاہی میں چیخ چلا تے اس نے نہایت لجاجت سے خوشامد کی تھی۔ جواب میں دادو نے اسے تنبیہی انداز میں گھورا تھا، وہ منہ سرور کر گئی۔ اسی پہل اس نے گیٹ سے روتے بسورتے کاشی کو اندر آتے دیکھا تھا۔ اس کا کل ٹیٹ تھا اور اس کی اماں اپنے دو عدد جڑواں بچوں میں لگی ہوئی تھیں اسے کیا تیاری کر داتیں۔ سو انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے ندیا کے پاس پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ اور اس نے آتے ہوئے چپکے سے بیٹ بھی بغل میں دبایا تھا کہ اگر ندیا آپنی کاموڈ اچھا ہوا تو کھیل بھی ہو جائے گا۔

برآمدے سے ہوتا ہوا آؤنج سے گزر کر وہ منہ

بنائے کچن کے دروازے میں اکٹھرا ہوا۔

”سام دادو۔“ اس نے مزید رونی صورت بنائی تھی۔

”کیا ہوا کاشی؟“ دادو کے جواب کے بعد ندیا نے کاشی سے پوچھا تھا۔ ”کیا آج پھر سے مہما سے عزت کروائی ہے؟“ اس کی رونی شکل دیکھ کر اس نے شرارت سے چڑایا اور جواب میں کاشی بچارہ کھانی سی ہنسی کر رہ گیا۔

”کیا ہوا ہے کاشی، ادھر آؤ،“ اسے بدستور دروازے میں استادہ دیکھ کر دادو نے پیار سے بلایا۔

”دادو کل میرا ٹیٹ ہے میں نے اما سے کہا تھا کہ مجھے تیاری کرادیں مگر علی بہت بدتمیز ہے۔“ وہ اندر آکر ان کے ساتھ ڈانگ ٹیبل کی کرسی بیٹھ گیا۔

”ارے علی نے کیا بدتمیزی کر دی ہے؟“ دادو نے حیرت سے پوچھا بھلا چھ ماہ کا بچہ کیا بدتمیزی کر سکتا تھا۔

ندیا بھی جواب سننے کے لیے ادھر متوجہ ہوئی۔

”مما جب بھی میرا کوئی کام کرنے لگتی ہیں یا مجھے پڑھانے لگتی ہیں علی صاحب فٹ سے شور مچا کر اپنی طرف بلا لیتے ہیں۔ عمر نے تو بھی ایسا نہیں کیا۔“ کاشی کا بوجھ شکایت سے بھرا ہوا تھا۔ حالاں کہ وہ اپنے جڑواں بھائیوں سے بہت محبت کرتا تھا۔

”ندیا آپنی مجھے تیاری کرادیں گی ناں.....؟“

اب کے اس نے ندیا کو مخاطب کیا۔ ندیا جو صوجی بھوننے کے بعد پانی اور چینی اس میں ڈال کر چیخ ہلاتی تھی نہایت بے دلی سے۔ کاشی کی آمد اسے بڑی خوشنوا لگی تھی۔ اسے گیٹ سے داخل ہوتا دیکھ کر ہی اسے حلوے سے جان چھوٹی نظر آتی تھی اور اب جو کاشی نے اس کے مطلب کی بات کی تو وہ جھٹ سے بولی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“

”لیکن آپ تو کام کر رہی ہیں۔“ کاشی ”صومیت“ سے بولا۔

”یہ.... یہ تو دادو کر لیں گی۔ کیوں دادو؟“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے دادو سے بھی پوچھا اور غلاب توئی دادو فوراً مان بھی گئیں۔

”ہاں ٹھیک ہے، تم کاشی کو پڑھا دو میں دیکھ لیتی ہوں۔“ کہنے کے ساتھ وہ چوٹھے کے پاس آکھڑی ہوئی۔

”شکر یہ دادو۔“ چیخ انہیں تھا کر خوشی سے بولی مسلسل وجہ کاشی کو پڑھانے کی اجازت ملنا نہیں بلکہ اپنی جان بخشی ہو جانا تھی۔

”آؤ کاشی۔“ دادو کے گال پر چٹ سے پیار کر کے کاشی کو بلانے کے ساتھ ہی وہ جھٹ سے بکن سے باہر میا دادو کا کارادہ بدل ہی نہ جانے۔

کاشی سرور سائیک اور بیٹ سنبھالتا اس کے پیچھے ہولیا۔ دونوں گھر کے پچھلے محن میں آگئے جو محن کم اور چھوٹا سا باغچہ زیادہ لگتا تھا۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ بڑی کھاریوں میں جاسن، آم، امرود، مالٹے کے درخت تھے۔ اس کے علاوہ لمبوں کے پودے بھی تھے۔ اس کے علاوہ آپنی کے پسندیدہ پھولوں، چنچلی، گلاب کے بے شمار پودے کھاری میں ترتیب سے لگے تھے جو ہر موسم میں اپنی بہار دکھاتے تھے اور شام کے وقت ان کی خوشبو سے سارا گھر مہک اٹھتا تھا۔ سامنے کی دیوار کے پاس جاسن کے بڑے سے درختوں کے درمیان ہارنگھار لگی تھیں جو اتنی پھیل چکی تھی کہ ایک بڑی سی چھتری کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس کی کچھ شاخیں جاسن کی شاخوں سے بھی لپٹی ہوئی تھیں اور جاسن کا دامن بھی اس کے خوب صورت پھولوں سے بھرا رہتا تھا۔ یہ ٹیل اور اس کے نیچے کی جگہ ندیا کی پسندیدہ جگہ تھی وہ اکثر و بیشتر بیٹھیں پانی جانی کہیں مٹلن کی طویل نظمیں یاد کرتی ہوئی۔ کاشی غالب اور انشا کی غزلوں میں کم اور کبھی اپنے کسی خوب صورت ناول کا اختتام لکھتی ہوئی۔

”آپنی اسلام علیکم“ کاشی بستہ وغیرہ میز پر رکھتا اسے پیاس جاکٹھرا ہوا۔ وہ اپنے دھیان میں تھیں، دیاریوں کی صفائی کرنے کے بعد اب گوڈی کر رہی تھیں اور ندیا اور کاشی کی آمد سے بے خبر تھیں۔ کاشی کی آواز پر ایک دم چونک اٹھیں۔

”وعلیک السلام کاشی صاحب، کب آئے آپ؟“ انہوں نے خوشدلی سے پوچھا۔

”ہاں ابھی آیا ہوں۔ ندیا آپنی سے کام تھا۔“ اس نے بڑے مصروف بندے کی طرح جواب دیا۔

”اچھا کیا کام تھا۔ ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے ناں!“ سعید نے اس سے تفصیل پوچھی۔

”میتھ کے ٹیٹ کی تیاری کرنی ہے۔“ ٹیٹ کے نام پر اس نے پھر منہ بنایا۔

”اچھا تو پھر وقت کیوں ضائع کر رہے ہو، چلو پڑھو۔“ وہ اس کے انداز پر مسکرائیں۔

”چلو کاشی ادھر آؤ۔“ ندیا نے اس کی کتاب نکال کر آواز دی تو وہ ادھر چل دیا پھر وہ دونوں پڑھنے لگے۔

سعید نے گوڈی کرنے کے بعد کھاریوں کو پانی لگایا اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد اندر چلی گئی تھیں۔ جہاں دادو حلوے کو دم پر رکھنے کے بعد عصر کی نماز کے لیے وضو کر رہی تھیں۔ سعید نے بھی وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

”کاشی تم آؤٹ ہو چکے ہو۔“

”نہیں ندیا آپنی آپ چیٹک کر رہی ہیں۔“

سعید اور دادو نماز پڑھ کر فارغ ہوئی ہی تھیں کہ کاشی اور ندیا کی تیز آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرانی۔

”ارے اتنی جلدی تیاری ہوگئی ٹیٹ کی؟“ دادو نے حیرت سے سنی کی طرف دیکھا۔

”دادو یہ پڑھانی کے دوران کھیل کا وقفہ ہے۔“

سعید نے مسکرا کر کہا تو دادو بھی اس کی بات پر مسکرا دیں۔

☆☆☆

”جی اتو فرمائیے شاہ میر صاحب آپ نے اس غریب کو اتوار کے دن صبح سویرے کیوں یاد فرمایا ہے؟“ آذر نے پوچھا۔

اتوار کا دن تھا اور آذر ویر تک سونے کا عادی تھا مگر شاہ میر کی ایمر جیسی کال نے اس کی نیند کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ وہ ڈھیٹ بن کر پڑا سوتا رہتا لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر چندہ منٹ میں نہیں گیا تو شاہ میر خود حاضر ہو جائے گا اور کسی طرح شام سے پہلے نہیں ملے گا اور اتنے وقت میں اس کا سارا دماغ ختم ہو جائے گا۔ شاہ



میرا اپنے گھر شاید آگنی اکل کے سامنے اپنی زبان کو کم استعمال میں لائے یہی سوچ کر وہ چلا آیا تھا۔ مگر دماغ ابھی تک سویا ہوا تھا۔

”آذر صاحب مسئلہ اہم نوعیت کا ہے جس کے لیے پرمغز ہونے کے ساتھ ساتھ پُر پیٹ ہونا نہایت ضروری ہے اس لیے آپ کے خالی پیٹ کو بھرنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔“ شاہ میر نے کہنے کے ساتھ چکن کی طرف اشارہ کیا جہاں ردا اپنا تمام تر سکھڑا آتما کر بہترین ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ شاہ میر کی بات وہ بھی نہیں مانتی اگر اسے شاہ میر سے کام نہ ہوتا۔ اسے شام کو اپنی دوست کی سالگرہ پر جانا تھا اس لیے اگر وہ شاہ میر کی بات نہیں مانتی تو وہ بھی اسے دوست کے گھر نہیں دیتے کہ کر جاتا اور امی اسے اکیلا تو بھی بھی جانے نہیں دیتیں۔ اس لحاظ سے ردا کافی مطلب پرست واقع ہوئی تھی۔

”چلو کچھ تو آپ کو اپنے خادم کی غربت کا خیال آیا۔“ ناشتے کی تیاری کامن کراڈر کے پیٹ میں دوڑتے چوہوں نے کچھ دم لیا تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے صوفے پر دراز ہو گیا۔

”دوے تم نے میرے پیٹ کے متعلق تو سوچ لیا ہے مگر اپنے خالی دماغ کے لیے بھی کوئی تدبیر کی کہ نہیں ہے آذر نے نہایت فکر مندی سے پوچھا۔

”جی ہاں، بہت سوچا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کی طرح مجس بھراؤں۔“ شاہ میر اس کی بات پر جل ہی تو گیا لہذا جواب بھی جلے کئے انداز میں دیا۔

”اچھا، میرے سر میں بھس بھرا ہے تبھی تو مجھے اپنے سامنے گدھے نظر آتے ہیں۔“ آذر نے شاہ میر پر نظریں گاڑیں۔

”بالکل بجافرایا آپ نے۔ یقیناً آپ کو گدھا اس وقت نظر آتا ہوگا جب آپ آئینہ دیکھتے ہوں گے۔“ شاہ میر نے بڑی سہولت سے اس کی بات اس کو لوٹائی۔ ”معززین محفل ناشتا تیار ہے۔“ اس سے پہلے کہ آذر کوئی جواب دیتا ردا اثرالی تھیں داخل ہوئی۔ شاہ

میر اور آذر دونوں سیدھے ہو بیٹھے۔

”شکر ہے خدا کا، آج محسوس ہوا کہ ہم ملتان میں رہتے ہیں۔“ پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہی شاہ میر بولا۔ ”کیوں بھی؟“ آذر حیران ہوا۔

”اس لیے میرے بھائی کہ ہماری ردا صاحبہ کھانے میں نمک اس فراخ دلی سے استعمال کرتی ہیں کہ لگتا ہے کہ ہم کھڑے کی کان میں رہتے ہوں۔“ اس نے وضاحت کی تو آذر قفس پڑا۔ اور ردا جو کہ تہہ پہنی الفاظ سننے کی خاطر کھی چھپکھپکھ لکھانوں کا حوالہ نہ کر سکتی تھی چلی گئی۔

ارادہ تو تھا کہ ایسا جواب دے کہ شاہ میر کو مزہ آجائے مگر دل کی خواہش کو دبا گئی کیوں کہ جانتی تھی کہ اس کا جواب اس کے ہی خلاف جائے گا۔ شاہ میر کو لڑائی کرنے کا موع مل جاتا اور نتیجتاً وہ اس سے ناراض ہو جاتا اور وہ اپنی دوست کی سالگرہ میں جانے سے محروم ہو جاتی۔

”اول درجے کے ناشکرے ہو تم۔“ آذر نے ردا کے ناراض ہو جانے پر شاہ میر کو ڈانٹا۔

”ہاں، میں بہت ذہین ہوں ہمیشہ اول آتا تھا۔“ اس نے فخر یہ کہا۔

ناشتے کے بعد شاہ میر کو برتن خود ہی سمیٹنے پڑے کیوں کہ ردا سے تو اب شام کو ہی ملاقات ہونی تھی۔

”جی! تو جناب اب وہ اہم نوعیت کا مسئلہ پیش کیا جائے۔“ تو لیے سے ہاتھ پوچھ کر آذر صوفے پر بیٹھا۔

”بزرگوار مسئلہ۔ یہ ہے کہ مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہے۔“ شاہ میر اس کے قریب بیٹھے ہوئے اطمینان سے بولا۔

”کیا.....؟“ آذر واقعی حیران ہوا تھا۔

”یونیورسٹی میں ایڈمیشن وہ کیوں بھی..... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم پچھلے سال ایم ایس سی فزکس فیضیل خدائیکٹر کر چکے ہو۔“ آذر کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

”لیکن اب میں ایم اے آرڈولٹر پچ میں کرنا چاہتا

ہوں۔“ شاہ میر اطمینان سے بولا۔

”اچھا تو اب تم مودب ہونا چاہتے ہو۔“ آذر نے مذاق کیا۔

”یاد رہے سیریس نہیں ہو سکتے؟“ شاہ میر براماتے ہوئے بولا۔

”قسم لے لو شاہ میر میں تو بہت سیریس تھا مگر نصرت نے ہی ساتھ نہیں دیا۔“ آذر نے معصومیت سے غائی پیش کی۔

”آذر.....“ شاہ میر نے اسے تنبیہی انداز میں گھورا۔ سو آذر نے سنجیدہ ہو جانے میں عافیت جانی۔

”ڈیزیر فرینڈم کہو میں ہمہ خرگوش ہوں۔“ آذر نے کہا۔

”اصل مسئلہ یہ ہے کہ صورت حال سنگین ہوتی جا رہی ہے۔ اور محبت ہے کہ ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ مگر میری شادی کے علاوہ کچھ سوچتا نہیں مگر میں نے بھی شان لی ہے کہ میں ہرگز دادا ابابور بابا کے نقش قدم پر نہیں چلوں گا۔“ شاہ میر نے کہا۔

”تو کیا تم شادی نہیں کرو گے؟“ آذر پھر شرارت سے گویا ہوا تھا۔ حالاں کہ اصل بات جانتا تھا۔

”نہیں یار، دراصل میں چاہتا ہوں کہ محبت کی شادی کروں۔“ شاہ میر نے جواب دیا۔

”دوسرے الفاظ میں مجبوں کی طرح خوار ہونا چاہتا ہوں۔“ آذر کی زبان میں پھر پھلکی ہوئی۔

”لیکن یہ تو بتاؤ محبت کی شادی کا یونیورسٹی سے کیا تعلق؟“ شاہ میر کے جارحانہ تیور دیکھ کر آذر اصل موضوع کی طرف آگیا۔

”یونیورسٹی ہی وہ جگہ ہے جہاں نوے فی صد سے زائد بھتیجی جنم پتی ہیں۔“ شاہ میر نے جھنجکی سے کہا۔

”واہ کیا مشاہدہ ہے۔ کیا گہری نظر ہے۔“ آذر نے اسے داد دی۔ ”لگتا ہے یہ مشاہدہ اب ہی زیر غور آیا ہے ورنہ میرے خیال میں تم نے یونیورسٹی میں چار سال گزارے ہیں اس بات کا پتا اگر تمہیں تب ہوتا تو تم اب

کب کی بھتیجی اور کئی شادیاں کر چکے ہوتے۔“ آذر نے نہایت معصومیت سے کہا۔

”نہیں یار، جب تو اس طرف خیال ہی نہیں کیا اور ویسے بھی بابا جان نے یونیورسٹی کے پہلے روز ہی فرمان جاری کر دیا تھا کہ برخواستہ یونیورسٹی میں پڑھائی کرنے جا رہے ہو تو پڑھائی ہی کرنا ہی ایس اور ایم ایس سی چار سال میں ہی کر لو تو بہتر ہے کہ یونیورسٹی کی مستقل آمدنی کا ذریعہ نہ بن جانا اور جیسے ہو ویسے ہی رہنا مجبوں، رانجھانے کی کوشش نہ کرنا۔“ شاہ میر نے بابا کی نقل کر کے بتایا تھا۔

”تو ڈیزیر کیا اب تمہیں یقین ہے کہ اس بار تمہارے والد محترم اس قسم کی کوئی نصیحت تمہارے پلو سے نہیں باندھیں گے۔“ آذر نے پوچھا۔

”اب تو وہ خود کسی..... پلو والی حینہ کی تلاش میں ہیں۔“ نہایت حسرت سے کہا گیا۔

”کیا.....! اکل کسی حینہ کی تلاش میں ہیں؟“ آذر کو حیرت کا شہ بدھ کھا کھا گدھ بچ بولا۔

”لا حول ولا.....“ شاہ میر اس کے فقرے پر تلملایا۔ ”میں اپنی بات کر رہا ہوں۔“

”اس کو اس کے بعد مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟“ آذر نے پوچھا۔

”تم میرے اکلوتے دوست ہو اس لیے تمہیں میری ہر طرح سے مدد کرنی ہے۔“ شاہ میر نے اطمینان سے پوچھا۔

”مثلاً.....“ آذر نے تفصیل جانتا چاہی۔

”مثلاً اخلاقی، اور مالی، شاہ میر نے جواب دیا۔ اخلاقی مدد تو میں کر سکتا ہوں مگر مالی مدد سے قاصر ہوں کیوں کہ میرا پتلا ان مالی نہ ہونے کی وجہ سے ابتری

کا شکار ہو گیا ہے۔“ آذر بڑی ادا سے بولا۔ آذر کے جواب پر شاہ میر کا خون کھول اٹھا۔ اس نے سارے کشن اسے دے مارے۔

”جس کا دوست تم جیسا ہو اس شخص کو تو شرم سے مرجانا چاہیے۔“ شاہ میر غصے سے بولا۔

”اچھا تو پھر کب اپنے قول پر عمل کرنے والے ہو۔“ آذر جی کم ڈھیٹ نہ تھا۔

”خدا کے واسطے میرے مسئلے کا حل سوچو۔“ آخر



شاہ میر نے ہتھیار ڈالے اور ہاتھ جوڑ کر عاجزانہ انداز اپنایا۔

”اچھا، اچھا بتاؤ کیا کروں؟“ آذر نے پوچھا  
”تمہیں ماما اور بابا کو ممانا ہے۔“ شاہ میر نے کہا۔

”ان میں لڑائی ہوگی ہے؟ سوئی میرا مطلب تھا کہ مالی مدد سے تمہاری کیا مراد ہے۔“ آذر نے پوچھا  
”مالی مدد سے مراد یہ ہے کہ اگر بابا راضی نہیں ہوئے تو تم مجھے ایڈمیشن فیس دو گے۔“ شاہ میر نے اپنا غصہ ظاہر کیا۔

”کیوں جناب، کیا آپ میری لے پالک اولاد ہیں؟“ آذر نے طنز یہ لہجے میں پوچھا۔  
”یونہی سمجھ لو۔“ شاہ میر اطمینان سے بولا۔  
”اچھا، جو خدا کو منظور۔“ آذر نے غصہ کی سانس بھری اور نہایت صبر و شکر کا مظاہرہ کیا۔

☆☆☆

ڈارک میر ورن اور مکمل کنٹر اسٹ سوٹ میں روا بہت پیاری لگ رہی تھی، قمیص کے گلے اور آستینوں پر ننھے ننھے شیشے جگمگا رہے تھے اور ان کی چمک سے اس کی گلابی رنگت اور بھی گہری لکھری لگ رہی تھی۔ کلائیوں میں چوڑیاں اور گجراپٹے وہ کب سے تیار ہو کر لاؤنج میں کھڑی تھی اور شاہ میر کو آواز دے جا رہی تھی۔ شاہ میر کو ایک گھٹنا ہو گیا تھا، دروازہ بند کیے تیار ہوتے۔ روانے ٹائم دیکھا ساڑھے سات بج چکے تھے جب کہ سالگرہ کا ٹائم سات بجے کا تھا۔  
”ای بلائیں ناں بھائی کو.....“ اس نے تھک ہار کر ماما سے شکایت کی۔

”شاہ میر کیا کر رہے ہو اب؟ ابھی جاؤ، بہن کو دیر ہو رہی ہے۔“ انہوں نے روا کی جھنجھلاہٹ پر مسکراتے ہوئے شاہ میر کو کتلی سے پکارا اور وہ آیا ماما جان کہتا ہوا یوتھ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا تھا۔ ماما اور روا اس کی تیاری دیکھ کر چونک اٹھیں۔

”پرنس صاحب، خیریت تو ہے ناں.....!“ دل ہی دل میں اس کی نظر اتارتے ہوئے انہوں نے اس

کے وجہ سے سراپا پر نظر ڈالی۔ ڈارک بولکر کے کان کے کلف لگے کرتے شکواریں وہ واقعی بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

”بھائی صاحب کیا دو لہا کے سلیکشن کے لیے جا رہے ہیں؟“ روانے اسے سر سے تھک دیکھا۔  
”بالکل نہیں، مابودولت دہن کی تلاش میں جا رہے ہیں۔“ شاہ میر نے جواب دیا۔

”اچھا تو ایک گھنٹا اس لیے تیاری میں لگایا ہے۔“ روانے اس کے تھرب بھیلی Havoc کی خوشبو سونگھی۔

”پرنس کو تیار ہونے میں کچھ تو وقت لگتا ہے ناں کنیز۔“ شاہ میر نے شاہانہ انداز میں کہا۔  
”ویسے ایک بات بتاؤ پرنس صاحب پرنس تو پرنس ہوتا ہے اسے تیاری کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی البتہ.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور معنی خیز انداز میں ماما کی طرف دیکھا۔

”خبردار جو ہماری شان میں گستاخی کی۔“ شاہ میر اس کی شرارت سمجھ گیا تھا۔

”ردادیر ہو رہی ہے اب بس کرو جاؤ.....“ واپس بھی آتا ہے۔“ ممانے ٹائم کی طرف توجہ دلائی جو کہ دونوں ایک دوسرے سے لوک جھوک میں بھول چکے تھے۔

”ایک منٹ میں ابھی آیا۔“ اس نے جانے کیا یاد آگیا اور واپس پلٹنے لگا مگر روانے اس کا بازو پکڑ لیا۔  
”نہیں، بس بہت ہو گیا مجھے دیر ہوئی ہے۔“ شاہ میر ایک کاٹ لے گی۔“ روانے سچپتی ہوئی پوریج تک لے آئی۔

”بے فکر رہو۔ کوئی بھی خیرجی کارروائی تمہارے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔“ اس نے گاڑی کا لاک کھولا۔  
”ڈیزر برادر سالگرہ تو میری دوست کی ہے، تمہاری اتنی تیاری کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔“ راستے میں روا نے اس سے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے تمہاری دوست تمہاری بھابی بن جائے۔“ وہ بڑی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”کیا کیا.....“ خبردار جو میری دوستوں پر نظر رکھی۔  
”مجھے بہت عزیز ہیں۔“ روا، شاہ میر کو آنکھیں دکھائی ہوئی بولی اور اسی پر اکتفا نہ کیا۔ اترتے ہوئے اس کے خوبصورت سلیقے سے بنے سنورے بالوں کو ہاتھ سے خراب کر کے فوراً ترگئی اور پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ شاہ میر نے آئینے میں اپنے نکھرے بالوں کو دیکھا جنہیں اتنی محنت سے اس نے سیٹ کیا تھا اور دل میں بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ ایک میدان میں ناکام ہونے کے بعد اس نے دوسرے کو فتح کرنے کا سوچا اور گاڑی گھر کی طرف موڑ لی تاکہ ماما سے ایڈمیشن کی بات کر سکے۔

”السلام علیکم ماما جانی۔“ سیٹی پر انگلیش گانے کی دھن بجنا تھا۔ بڑے خوشگوار موڈ میں اندر داخل ہوا۔ ماما اسے لاؤنج میں بیٹھی مل گئیں۔ یکن سے فارغ ہو کر اب وہ لاؤنج میں آ بیٹھی تھیں اور سینٹرل ٹیبل کا نقیص سا کرٹل کا گلدان صاف کر کے بھول لگا رہی تھیں۔

”علیکم السلام، بیٹا اتنی جلدی واپس آ گئے میرا خیال تھا کہ تم آذر کی طرف جاؤ گے۔“ گلدان کو ہاتھ میں کھرا کر انہوں نے پھولوں کی سیٹنگ چیک کی۔

”ماما آپ کتنا کام کرتی ہیں تھک گئی ہوں گی،“ اس میں دبا دوں۔“ ان کے ہاتھ سے گلدان لے کر میز پر رکھ کر ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے بڑی فکر اور محبت سے بولا۔

”خیریت تو ہے بیٹا جی۔“ ماما اس کے انداز پر مسکرائیں۔ ضرور کوئی کام ہوگا۔ انہوں نے شاہ کو دیکھا جو ان کے شانے پر سر ٹکائے ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے بیٹھا تھا۔

”ارے ماما آپ کو کیسے پتا چلا کہ مجھے آپ سے کوئی کام ہے۔ کتنی ذہین ہیں آپ۔“ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”اچھا اب اس خدمت کو چھوڑیں اور فرمائیں کہ کیا کام ہے؟“ انہوں نے ہاتھوں سے اس کے بال سٹوارے۔

”ماما ذرا ذہانت کا اور ثبوت دیں اور بتائیں کہ کھلا کیا کام ہو سکتا ہے؟“ وہ بڑے لاڈ سے بولا۔

”اچھا.....!“ انہوں نے کہا اور سوچنے لگیں۔  
”ایک خوبصورت، نوجوان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے کو کیا کام ہو سکتا ہے کہ وہ ماں سے لاڈ سے کہے۔“ انہوں نے سوچا اور سمجھ گئی اور بڑے اعتماد سے بولیں۔ ”صاف صاف بتاؤ کہ سلیکٹ کیا ہے؟“ وہ حیران ہو کر ان کے شانے سے ہٹا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ماما اتنی جلدی اس کی بات سمجھ لیں گی۔

”ماما تو کیا آپ مجھے دلوادیں گی۔“ اس نے بے یقینی سے پوچھا جس کام کو بہت مشکل سمجھ رہا تھا ماما اتنی آسانی سے مان جائیں گی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔  
”دلوادوں گی سے تمہاری کیا مراد ہے۔ میں اسے گھر کی رانی بنا کر لاؤں گی۔“ ان کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

”کیا.....! آپ یونیورسٹی کو گھر کی رانی بنالیں گی۔“ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”یونیورسٹی.....؟“ اب حیران ہونے کی باری ان کی تھی پھر انہوں نے سوچا کہ شاید یونیورسٹی میں پڑھتی ہوگی اس لیے پھر فوراً بولیں۔

”کیا نام ہے اس کا.....؟“ انہوں نے پوچھا۔  
”آرڈو لٹرچر۔“ وہ فوراً بولا تھا۔ اس نے سمجھا کہ ماضی میں ان کا نام پوچھ رہی ہیں۔

”دماغ تو تھوکیے تمہارا لڑکی کا نام آرڈو لٹرچر ہے کیا؟“ انہیں شاہ میر کی دماغی حالت پر شبہہ ہوا۔  
”کیسی بیکلی باتیں کر رہے ہو؟“

”لڑکی.....“ حیرت سے شاہ میر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اب سمجھا تھا کہ ممی کی ذہانت کا ثبوت ایک لڑکی تھی۔

”ماما آپ غلط سمجھ رہی ہیں، میں تو اصل میں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کی بات کر رہا تھا۔“ اس نے ایک ایک کروڑ حقائق کی۔

”کیا.....! یونیورسٹی میں ایڈمیشن.....؟“ وہ حیرانی سے بولیں۔

”جی ماما، میں آرڈو لٹرچر میں ماسٹر کرنا چاہتا ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔



”پاگل ہو گئے ہو کیا؟ میں شادی کی تیاری کر رہی ہوں تمہارے لیے لڑکی دیکھ رہی ہوں اور تم پھر سے یونیورسٹی کی زیارت کرنے چلے ہو۔“ انہیں سچ بچ ٹھنڈا کیا گیا۔

”مما شادی کے لیے تو عمر پڑی ہے۔“ اس نے انہیں سمجھانا چاہا۔

”شادی کے لیے عمر پڑی ہے اور تم لکھ لادوب تو تمہیں ماسٹر زکر کے بھی نہیں آئے گا۔“ غصے سے برا حال تھا ان کا۔

”یعنی آپ کی طرف سے اجازت ہے ایڈمیشن لے لو۔“ وہ خوشی سے چلا یا۔

”خبردار جو تم نے ایڈمیشن لیا۔۔۔ آنے دو اپنے باپ کو سیدھا کروانی ہوں تمہیں۔“ وہ غصے میں بولیں۔ ”قسم لے لیں ماما جو میں ذرا سا بھی میڑھا ہوں یا نس کی طرح سیدھا ہوں۔“ شاہ میر نے ان کا مزاج خوشگوار کرنا چاہا۔

”بس زیادہ بکواس مت کرو۔ ایم ایس سی کر کے کیا تیر مار لیا ہے جو ڈبل ایم اے کی خواہش جاگ اٹھی ہے۔ باپ روز کہتا ہے کہ ساتھ آفس چلو مگر نواب صاحب کو فرصت ہی نہیں۔“ وہ بھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شاہ میر بھی ان کے پیچھے تھا۔

”ای آپ نے پڑھا نہیں کہ ماں کی گود سے قبر تک علم حاصل کرو۔“ قائل کرنے کے لیے اس نے احادیث کا سہارا لیتا چاہا۔

”اور ماں، باپ کی اطاعت کی احادیث نہیں پڑھیں تم نے۔“ انہوں نے اسے گھورا۔

پھر شاہ میر نے علم..... ڈبل ایم اے کی اہمیت، افادیت، پیچیدہ پیچیدہ لوگوں کی مثالیں تک پیش کیں مگر ماما کی ناں ہاں میں نہیں بدلی۔ احتجاجاً شاہ میر ناراض ہو کر کمرے میں بند ہو گیا، ردا کو لینے بھی نہیں گیا۔ اس کی دوست خود چھوڑنے آئی تھی۔ رات کے کھانے نہ بھی باہر نہیں نکلا۔ اس کے متعلق وہ پریشان تو بہت ہوئیں مگر جانتی تھیں کہ اب ڈھیل دی تو وہ مزید چوڑا ہو جائے گا لیکن انہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ رات کو اس نے فریج کی

بھر پور تلاش لے لی تھی۔ ناشتے پر بھی ہڑتال جاری تھی۔ ماما اور ردا نے لاکھ دروازہ بجایا مگر اس نے جواب تک نہیں دیا تھا۔ آخر ماما نے آذر کو بلایا۔ اس کے آنے پر شاہ میر نے جھٹ سے دروازہ کھولا تھا مگر آذر کو اندر کھینچنے کے بعد فوراً بند کر لیا۔ نہ جانے ان میں کیا گفتگو ہوئی۔ آذر کچھ دیر بعد باہر آیا اور آگنی سے طویل مذاکرات کا سلسلہ چلا۔ آخر آذر ان کو منانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ورنہ دوسری صورت میں اسے شاہ میر کی مالی مدد کرنی پڑتی۔

☆☆☆

پچھلے ایک ہفتے سے ندیا کی نمازیں اور دعائیں معمول سے کچھ زیادہ طویل ہوئی تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آج شام کو اس کا رزلٹ آؤٹ ہوتا تھا۔ اب بھی ظہر کی نماز کے ساتھ نوافل پڑھنے اور دعا مانگنے کے بعد فارغ ہوئی تھی۔

”دادو جان آپ نے میرے لیے دعا نہیں کی؟“ وہ نماز پڑھ کر لاؤنج میں آئی تو دادو کو اخبار پڑھتے دیکھ کر بولی۔

”ارے بیٹا مانگی کیوں نہیں، میری ساری دعائیں تم دونوں کے لیے ہی تو ہیں۔“ انہوں نے کتاب میں لال ڈوری مطلوبہ صفحے پر ٹکا کر کتاب بند کی اور نہایت شفقت سے اپنی پونی کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ سفید دوپٹے میں اس کا روپ چاندنی کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔

”دادو جان! آپ کو بتا ہے کہ ہم تینوں دوستوں نے جرنلزم میں ماسٹر ز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کتاب مزہ آئے گا ناں جب ہم یونیورسٹی جایں گے۔ یونیورسٹی لائف کا تو اچھا ہی ایک مزہ ہوتا ہے، ہے ناں آپ۔“ پُرجوش لہجے میں بولتے ہوئے اس نے سعید سے بھی تائید چاہی۔

”ہاں واقعی۔“ چکن میں کام کرتی سعید نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور دل ہی دل میں ندیا کی کامیابی کے لیے ڈھیروں دعائیں کی۔ دادو، ندیا سے کچھ کہنے والی تھیں مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئیں وہ

اس وقت ندیا کو اداس اور ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ شام کو تو ندیا خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ سب کی دعا کیں اور اس کی اپنی محنت رنگ لائی تھی وہ نہ صرف بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تھی بلکہ اس نے اپنے کالج میں ٹاپ کیا تھا۔ اس کی دوستوں کے ساتھ ساتھ ٹیچرز کے بھی مبارکباد کے فون اور میج موصول ہو رہے تھے۔ دادو نے تو فوراً شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔

”دادو اب تو میں ناول لکھ سکتی ہوں ناں۔“ ہنسنے چہرے کے ساتھ ان کے گلے میں ہاتھیں ڈالے وہ لاڈ سے پوچھ رہی تھی۔

”پاگل، اب تم تو ہر کام کر سکتی ہو کیونکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری ندیا بہت ذہین ہے۔ بیک وقت کئی کام کر سکتی ہے اور اب تو تم مجھ سے اور سعید سے کھانا پکانا بھی سیکھ گئی، ہے ناں؟“ انہوں نے شرارتی لہجے میں اجازت دینے کے ساتھ استفسار بھی کیا۔

”دادو..... یہ چکن درمیان میں کہاں سے آ گیا۔“ مصنوعی ناراضی سے کہتی ہوئی وہ ان کے پاس سے اٹھ کر چکن میں آگئی اور پانی پینے لگی۔

”بیٹا، چکن درمیان میں نہیں ساڑ پڑا گیا ہے تمہارا بابا سے کہا بھی تھا کہ چکن لاؤنج اور کمرے کے درمیان میں بیٹونا مگر انہوں نے ساڑ پر بنوایا ہے۔ حیرت ہے تمہیں اب بھی یہ درمیان میں لگ رہا ہے۔“ دادو کا لہجہ پھر شرارت لیے ہوئے تھا۔

”دادو.....“ ندیا کا لہجہ احتجاجی تھا۔

”جیسی میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے ناول کی ہیروئن کی طرح سکھ پڑ جاؤ آخر کل تمہاری شادی بھی کرنی ہے۔“ دادو نے کہا۔

”دادو میں آپ سے نہیں بولتی۔“ وہ ناراضی سے کہتے ہوئے کمرے میں جا گئی۔

☆☆☆

”صاحبزادے کیا ارادے ہیں آپ کے؟“ اس وقت سب ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھے۔ رضا صاحب نے اخبار پڑھنے کے دوران ذرا سا اخبار ہٹا کر شاہ میر کو دیکھتے ہوئے سوال کیا اور اخبار پھر سے نظروں کے

سامنے پھیلایا لیکن وہ شاہ میر کے جواب کے منتظر تھے۔

”وہ بابا اصل میں.....“ رضا صاحب کو اسلام آباد سے واپس آئے چار روز ہو گئے تھے اور ان چار دنوں میں انہوں نے شاہ میر سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن پر نہ تو کوئی استفسار کیا تھا اور نہ ہی ڈانٹا تھا۔ اس لیے شاہ میر جو شروع میں ڈرا ہوا تھا اب بے فکر ہو چکا تھا اس کے خیال میں امی نے بابا کو راضی کر لیا ہو گا اس لیے بابا نے کوئی سوال نہیں کیا مگر آج اچانک اس حملے پر وہ گزبوا گیا اور کوئی مناسب جواب نہیں بن پڑا تھا۔

”بابا میں بتاتی ہوں۔ اصل میں بھیا کا موقف ہے محبت.....“ ردا بڑی روانی میں شروع ہوئی مگر نظر جو شاہ میر پر پڑی اس کی آنکھوں میں ”سوچ لو“ کا مفہوم واضح دیکھ کر یکدم خاموش ہو گئی۔ شاہ میر اس کے ہزاروں کام بغیر کسی رشوت کے کر دیا کرتا تھا۔ لائبریری سے کتابیں لانا۔ ٹیکس کو پڑے دے کر آنا۔ دوستوں کے گھر لے جانا اور دوستوں کی آمد پر بازار سے چیزیں لا کر دینا وغیرہ وغیرہ۔ ردا نے پل میں سوچا کہ اگر آج اس نے ڈیڑی کے سامنے شاہ میر کے موقف کا اظہار کر دیا تو پھر آئندہ ہمیشہ کے لیے اپنے ہزاروں کاموں کے لیے شاہ میر کی خدمات حاصل کرنے سے محروم ہو جائے گی جو سراسر کھائے کا سودا تھا۔ لہذا اس نے سفید دوپٹا لہرا کر اس کا اعلان کیا اور ساتھ ہی شاہ میر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں اپنا چائے کالگ سنبھالے وہاں سے کھٹک گئے۔

”بولو ردا آخر کیا موقف ہے ہمارے پروردار کا.....؟“ پُردا کے آدھے حملے کے بعد خاموشی کے وقفے پر انہوں نے اخبار سے نگاہ اٹھائی مگر ردا ہوتی تو جواب دیتی ناں۔ ساتھ ہی شاہ میر بھی غائب تھا۔ انہوں نے بیگم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جو مسکرا رہی تھیں پھر وہ بھی ان کی مسکراہٹ میں شامل ہو گئے۔

☆☆☆

یونیورسٹی کا احوال بھی نہایت دلچسپ تھا۔ ہر لڑکی کو دیکھ کر شاہ میر کو لگتا کہ یہی ہے خوابوں کی شہزادی..... مجھے وہ خوابوں کی شہزادی صرف یونیورسٹی تک رہتی گھر آ کر



”اڑا لو مذاق..... لیکن میں جانتا ہوں جس دن میں نے اپنی محبت پالی اس دن سب سے زیادہ خوش تم ہی ہو گے۔“ شاہ میر یقین سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”اے یونیورسٹی جاتے ایک ماہ ہو چلا تھا۔ روز صبح تک سب سے تیار ہو کر جاتا مگر مقصد ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ایک سے ایک حسین لڑکی تھی۔ معصومیت اور سادگی کی کچھ کمی نہیں تھی مگر محبت تھی کہ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ پری ریخ محبوبائیں میر اور غالب کی غزلوں کی طرح حمد و مدح ہو گئیں اور وہ غزلیں اشعار باد کر کر... کے تنک آ گیا تھا۔ غالب کے حالات زندگی سے زیادہ اسے اپنی زندگی قابلِ رحم لگتی تھی۔“ اگر اگلے ایک ہفتے میں محبت نہ ہوئی تو میں یونیورسٹی چھوڑ دوں گا۔“ اس نے گویا دل کو اٹائی ٹم دے دیا۔

☆☆☆

محبت کرنے کا یہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ شاہ میر نے نہایت دلبرداشتہ ہو کر یونیورسٹی کو خیر باد کہہ دیا۔ تقریباً ایک ہفتہ ہو چلا تھا اسے یونیورسٹی چھوڑے۔

”پرنس صاحب کیا حال ہے آپ کے لڑچر کا؟“ اتوار کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ رضا صاحب گھر پر تھے۔ ردا اور امی پکن میں ناشتا بنا رہی تھیں۔ وہ ابھی جاگا تھا۔ لاؤنج میں داخل ہوا تھا کہ بابا نے اس سے سوال کیا۔

”بابا میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔“ انداز ایسا تھا جیسے مجھوں نے سلی کی طلب چھوڑ دی ہو۔

”چھوڑ دی.....؟“ انہوں نے اچنبھے سے دیکھا۔ ابھی کل تک تو خوب تیار ہو کر جاتا تھا اور اب چھوڑ بھی دی ہے۔

”جی بابا.....“ جواب نہایت سعادت مندی سے دیا گیا تھا۔

”میں آپ کو بتا رہی ہوں کچھ کرنا ہے تو کر لیں یہ لڑکا نکل جائے گا ہمارے ہاتھ سے۔“ ماما بھی لاؤنج میں آ گئی تھیں۔ مزہ دانی کے بیٹے کی شادی کا کارڈ آیا ہوا تھا۔ ان کی بھی بیٹے کے سہرے کے پھولوں کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔

”کیوں جناب، کیا کہہ رہی ہیں آپ کی

اسے اس کی شکل تک یاد نہیں آتی اگلے دن پھر کسی چہرے کو اپنی محبوبہ کے تصور سے دیکھتا مگر اب تک اس میں کسی لڑکی سے دوستی کرنے میں پہل کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی ہمت شاید ہو بھی جاتی اگر دل کسی لڑکی کو پسند کر لیتا مگر دل تو نہ جانے کس ڈھٹ مٹی کا بنا تھا کہ محبت کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ کسی کی بھی تصویر دل کے خانے میں فٹ نہیں ہوتی تھی ہر شام وہ آذر کے گھر پایا جاتا اور اسے یونیورسٹی میں گزرے وقت کے ایک ایک منٹ کا احوال سناتا۔ کون سی لڑکی کس سوٹ میں اچھی لگ رہی تھی آج کتنی لڑکیوں سے گفتگو ہوئی اور کیا کیا ہوئی۔ کتنی لڑکیاں اسے دیکھ کر مسکرائیں۔ اتنی باتیں کہ آذر کا دماغ گھومنے لگتا۔ محبت کے متعلق ایسے ایسے سوال پوچھتا کہ آذر زج ہو جاتا۔

”اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ محبت کی علامات کیا ہیں؟“ شاہ میر نے آذر سے کہا۔

”محبت کا پوچھ رہے ہو یا کسی بیماری کا؟“ آذر ان اوٹ پٹانگ سوالوں سے تنک آیا ہوا تھا بھی چلا کر بولا۔ جب سے شاہ میر کو پتا چلا تھا کہ آذر کی لڑکی کو پسند کرتا ہے تب سے وہ آذر کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس سے محبت کرنے کے گرو چھتا رہا تھا۔

”یار بیماری ہی مجھو۔“ شاہ میر نے نہایت بیمار لہجہ اپنایا۔

”تیری بیماری کا ایک ہی علاج ہے۔ انکل آنتی کی پسند سے شادی کر لے۔“ آذر جلا بیٹھا تھا۔

”یہ نہیں ہو سکتا، میں نے اس رسم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ پہلے میرے والد محترم پھر دادا محترم پھر والد محترم کے دادا محترم سب نے یونہی شادی کر لی مگر میں شادی کروں گا تو محبت کی۔“ بڑے جوش میں جواب دیا گیا۔

”واہ، کیا عزائم ہیں۔ کتنا جوش و جذبہ ہے ہمارے جوانوں میں۔ تمہیں تو وزیر اعظم کا عہدہ بطور تحفہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تمہیں تو مجنوں کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا وہ یقیناً ایسے ہونہار سپوت پر فخر سے اکڑ کر چلتا۔“ آذر نے کہا۔



”کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔“ انہوں نے  
”آج دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھانی۔“  
”چکر کیسے بابا بس یونہی۔“ شاہ میر نے آہستہ  
سے جواب دیا۔

”یہ بس یونہی کیا ہوتا ہے۔ صاف صاف بات  
کر۔“ رضا صاحب نے سختی سے کہا۔  
”آج خیر نہیں۔“ شاہ میر نے دل میں کہا اور پھر  
کھٹکھٹا کر بولا۔ ”اصل میں بابا میں نے سوچا تھا کہ  
”کوئی خدمت کر لوں۔“

”تو پھر.....؟“ رضا صاحب کی نظریں شاہ میر  
کے چہرے پر گزری تھیں۔

”بابا پھر یہ کہ ادب تو بڑی مشکل چیز ہے اتنی لمبی  
نہیں، تشریح، مصنفوں، شاعروں کے حالات زندگی۔  
میں سمجھ سے نہیں ہوتا یہ سب کچھ۔“ شاہ میر نے بڑے  
جھنجھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”واقعی ادب بہت مشکل چیز ہے صرف تم جیسوں  
کے لیے۔“ رضا صاحب کا طنز سے بھرپور لہجہ سمجھ تو وہ گیا  
لی گرا۔ بات کا تقاضا تھا کہ خاموش رہا جائے۔

”آپ نے جواب نہیں دیا صاحبزادے۔“ وہ  
کی کہاں پیچھا چھوڑنے والے تھے۔

”کس بات کا بابا.....؟“ اسے واقعی یاد نہیں رہا  
پراثری اسکول کے بچے کی طرح وہ بھی بڑا مظلوم  
نظر آ رہا تھا جس کا استاد دو کا پہاڑ یاد نہ ہونے پر سزا  
دینے والا ہو۔ ردا اور ماما اس کی مظلومیت پر مسکرا رہی  
تھیں۔

”یادداشت بھی خوب پائی ہے۔ میں نے پوچھا  
تھا کہ یونیورسٹی کیوں چھوڑ دی ہے۔“ انہوں نے سخت  
لہجے میں استفسار کیا۔

”بابا میں نے بتایا ناں کہ مشکل ہے۔“ شاہ میر  
حارث اثرانی پر روہینے کو تھا۔

”اچھا.....!“ انہوں نے معنی خیز انداز میں اچھا  
وفا صاف لہجہ میں کہا۔ ”کل تک تو علم کی احادیث پر بڑا عمل  
کرتا تھا۔“

”لیکن بابا.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”بس بہت ہو گیا مذاق اگر تم نے یونیورسٹی  
چھوڑی تو پھر دیکھنا۔ مفت کا مال نہیں ہے کہ تم ایڈمیشن لو  
اور چھوڑ دو۔ اتنا فالتو پیسہ نہیں ہے میرے پاس۔ داخلہ  
لیا ہے تو پورا کرو۔ تمام لوگوں کو پتا ہے کہ ہمارا ہونہار  
سپوٹ ڈبل ایم اے کر رہا ہے۔“

”لیکن بابا۔“ اس نے پھر احتجاج کرنا چاہا۔

”لیکن کیا..... سنا نہیں تم نے کیا کہہ رہا ہوں  
میں۔ جب میں نے کہہ دیا تو اس کا مطلب ہے کہ تم ایم  
اے پورا کرو گے۔“ انہوں نے غصے میں ختمی انداز میں  
کہا اور اب کسی نہ کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ شدید رد عمل  
کے طور پر اس نے گود میں رکھا کٹن دور پھینکا اور میز کو  
ٹھوکر مارتا یا ہر نکل گیا جب کہ ردا اور ماما ”ارے ارے“  
کرتی رہ گئیں۔

☆☆☆

”بیٹا ندیا کو بھی بلا لاؤ۔“ سعید نے کھانا ٹیبل پر رکھا  
تو دادو جان نے اس سے کہا۔

”اے بھوک نہیں ہے دادو آپ شروع کریں۔“  
سعید نے پلیٹ اور چاولوں کی ڈش ان کی طرف بڑھائی  
جسے انہوں نے خاموشی سے تھام لیا مگر پھر ٹیبل پر ہی رکھ  
دیا۔ سعید نے اچھٹے سے انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں  
سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ کئی دنوں سے ندیا کی بے رخی  
برداشت کر رہی تھیں مگر آج ان کا صبر ٹوٹ گیا تھا۔

”دادو جان یہ کیا؟“ سعید بے چینی سے ان کی  
طرف بڑھی۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو صاف کیے۔  
”دادو جان آپ کیوں فکر مند ہو رہی ہیں کچھ دنوں  
میں خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔  
اسے ندیا پر بھی سخت غصہ آ رہا تھا جو اس طرح ری ایکٹ کر  
رہی تھی۔

”دادو جان میں ندیا کو بلا کر لاتی ہوں۔“ سعید نے  
آج ندیا سے سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس  
کے کمرے کی طرف چل دی۔

”اٹھو ندیا، کھانا کھاؤ۔“ سعید نے کہا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے؟“ ندیا الماری میں نہ جانے  
کیا تلاش کر رہی تھی اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔ سعید



ایک نے چند لمحے انتظار کیا مگر ندیا بدستور الماری میں چیزیں ادھر ادھر کر رہی تھی۔  
”ندیا میں نے تم سے کچھ کہا ہے۔“ سعید کے لہجے میں غصے کی آمیزش تھی۔  
”اور میں جواب دے چکی ہوں۔“ ندیا نے کھٹ سے الماری بند کی اور زور سے بولی۔ سعید اس حرکت پر بھونچ کر رہ گیا۔

”ندیا! سعید کے لہجے میں تاسف تھا۔“ تم اتنی خود غرض ہو۔ تمہیں اپنے آگے کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ شرم آتی چاہیے تمہیں۔ تمہاری وجہ سے دادو جان کتنی پریشان ہیں اگر تمہیں پونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کی اجازت نہیں دی تو اس کی کوئی وجہ ہے۔“ سعید نے اسے سمجھانا چاہا۔  
”کیا وجہ ہے؟ کیا انہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟“ ندیا نے سعید کی بات کا غلط مطلب لیا۔

”تم پر اعتبار ہے مجھے۔“ سعید کے جواب دینے سے پہلے ہی دادو جان کی آواز آئی۔ ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ دادو جان نم آنکھوں سے ندیا کو دیکھ رہی تھیں ندیا نے نگاہیں ملنے پر نظریں جھکا لیں۔  
”لیکن ندیا بیٹے مجھے زمانے پر اعتبار نہیں۔“ وہ چلتے ہوئے بیٹھ بیٹھ گئیں۔ عمر کی طویل مسافت نے انہیں تھکا دیا تھا۔

”اس زمانے نے مجھ سے میری زندگی کا سہارا چھین لیا۔“ وہ بولیں تو دنیا بھر کا کرب ان کے لہجے میں آسایا۔ ”تم سے تمہاری ماں، تمہارا باپ چھین لیا۔ رب کے نیکے کو کوئی نہیں مٹا سکتا مگر تم آنکھوں کے سامنے رہو تو دل سکون میں رہتا ہے۔ دل کو تسلی رہتی ہے۔ ذرا نظروں سے اوجھل ہو تو دل کتنی مرتبہ جیتا مرنے سے تم نہیں جانتیں۔ بیٹا اگر تمہارا باپ زندہ ہوتا تو میں تمہیں بھی متع نہ کرتی اور اگر تمہارا بھائی ہوتا تو بھی تمہیں نہیں روکتی۔ بھائی تو تمہیں رب نے دیا نہیں اور باپ اس نے واپس لے لیا تو بتاؤ میں کس کے آسمان پر تمہیں اتنی دور جانے کی اجازت دوں؟“

ندیا جواتے دنوں سے کیا کیا الٹی باتیں سوچ رہی تھی۔ دادو جان کی بات سن کر بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

اس نے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ نہ کبھی یہ بات سوچی تھی اور حقیقت دادو جان سے جان کر اسے اپنے آپ پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ اس نے دادو جان کو اتنے دن نظر انداز کیا تھا۔ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا اور اپنی جواس سے اتنا پتیار کر لی میں ان سے کبھی بدتمیزی کی تھی۔  
”دادو جان، مجھے معاف کر دیں۔“ دل غم اور شرمندگی سے بھر گیا وہ دوڑ کر دادو جان سے لپٹ گئی۔  
”میں بہت بری ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔“ شدت سے روتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔  
”دیکھا سعید میں نے کہا تھا نا کہ میری ندیا میری بات مان لے گی۔“ دادو جان نے ندیا کے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا سعید مگر ادی۔  
”میں کھانا گرم کرتی ہوں۔“ سعید نے کہا اور اگلے پندرہ منٹ میں کھانے کی ٹینل بج چکی تھی۔

”آئی آپ بھی مجھے معاف کر دیں، میں نے آپ سے بہت بدتمیزی کی ہے۔“ سعید نے چاول ڈال کر پلیٹ اس کے سامنے رکھی تو ندیا کی آنکھیں پھر سے چمک پڑیں۔ اس نے سعید کا ہاتھ تھام لیا۔  
”ندیا اب بس بھی کرو۔ سارے آنسو آج ہی بہا دیے تو اپنی شادی والے دن کیا گلگیرن استعمال کرو گی۔“ سعید نے اس کے گال تھپتھپائے۔  
”جی نہیں، میں اپنا میک اپ بالکل خراب نہیں کروں گی۔“ ندیا نے اپنی جون میں آکر جواب دیا۔ آئی سمیت دادو جان بھی اس کی بات سن کر کھل کر مسکرائیں۔

☆☆☆

دو دن پہلے اس کا آخری پیپر ہوا تھا۔ اگلا دن اس نے سو کر گزارا تھا۔ اپنا آپ یوں ہکا بھکا لگ رہا تھا کہ منوں بوجھ سے آزاد ہو گیا ہو۔ اس فراغت میں اس کا دماغ نئے نئے طریقے سوچنے میں مصروف تھا۔ ہر طرح کی پوریات ہی پوریات تھی۔ آؤر کی ممالک طبعیت اچانک خراب ہو گئی تھی اور وہ ایک ہفتے سے انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ شواہ میر تھا اور اس کی بے پناہ پوریات۔  
”اپنا مقصد کسی طرح پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ کیوں

ہاں میں نادرن ایریاز سے ہواؤں۔“ اس نے خود کو محو مشورہ دیا۔ ”اکثر فلموں میں دیکھا ہے کہ کسی فزیمورت سی وادی میں کسی چشمے کے قریب ہیرو، ہیروئن کی ملاقات ہوتی ہے اور پھر محبت ہو جاتی ہے۔ کسی پھیل کے قریب خوبصورت حین کا پاؤں پھسلتا ہے تو ہیرو آن موجود ہوتا ہے اور پھر محبت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یا پھر بھی کسی خوفناک موڑ پر کسی نازنین کی گاڑی خراب ہو جاتی ہے اور ہیرو و ملکینک بن کر پہنچ جاتا ہے۔ بعد کا قصہ ہی محبت کا پھر کسی بھار کوئی دلربا سی پری حالات سے تنگ آ کر خود کشی کرنے کے لیے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی ہوتی ہے تو ہیرو زندگی کی خوشیاں لے کر پہنچ جاتا ہے۔ قصہ مختصر بہت اور پھر شادی۔“

”شاہ میر بیٹا.....“ خود کو مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ وہ ہر کردار میں خود کو ایک خوبصورت لڑکی کے ہمراہ دیکھ رہا تھا۔ اپنے خیالوں میں غلطیاں و بچاں تھا کہ بابا کی راز پر چونکا۔

”جی بابا.....“ ان کو دیکھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔  
”کیا حال ہے بیٹا جی؟“ وہ اس کے برابر صوفے پر بیٹھی۔

”ٹھیک ہوں بابا۔“  
”پتھر کیسے ہوئے؟“ انہوں نے پوچھا۔  
”اچھے ہوئے ہیں۔“ اس نے مردہ دلی سے جواب دیا۔ ”میر کے حالات زندگی میں غالب کے حالات زندگی ملے آ رہے ہیں۔“

”ویری گڈ تمہیں فرسٹ پوزیشن ملتی ہے۔“ بابا خوش ہوئے تھے۔  
”جی انشاء اللہ لیکن شاید ٹیل ہونے والوں میں۔“

السنے دل میں خود سے کہا۔  
”آج کل کیا پروگرام ہے؟“ رضا صاحب نے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ شاہ میر کہہ کر بچھڑتا ہوا تھا۔  
”تو پھر ٹھیک ہے۔ تمہیں گاؤں جانا ہے۔ اس سال کا حساب تم لاؤ گے۔“ تمہاری آؤر تک بھی ہو جائے گا اور کچھ زمین کے بارے میں بھی جان لو گے۔ مجھے

آفس میں کام ہے فارغ ہونے میں کئی دن لگ جائیں گے۔“ وہ تو پہلے ہی طے کیے بیٹھے تھے۔ شاید اس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔  
”لیکن بابا.....“ اس کا احتجاج دو لفظوں پر ہی مشتمل ہوتا تھا۔

”بیٹا جی! اگر آپ اپنی پوری زندگی سے یہ بیچارگی بھرے دو لفظ نکال دیں تو بہت اچھی گزرے گی۔“ رضا صاحب نے کہا۔  
”لیکن بابا.....“ اعتراض آپ ہی کو ہوگا۔“ اس نے بابا پر زور دیا۔

”اچھا بس باتیں مت بناؤ۔ دو دن آرام کرو اور سو موار کو روانہ ہو جاؤ۔“ انہوں نے حکم صادر کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے، وہ بیٹھا رہ گیا۔ محبت کے حسین سفر کے شروع ہونے سے پہلے ہی بابا راہ میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ No way کے بورڈ کے مانند۔ اس کا جی چاہا کہ اپنی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو بہائے عمل ہی کرنے والا تھا کہ ردا آ بیٹھی۔

”شاہ بھائی کیا کر رہے ہیں؟“  
”جی فرمائیں، آپ بھی کوئی حکم دیجیے غلام حاضر ہے۔“ احتجاج غصے کی صورت میں نکلا تھا۔

”بھیا آج کیم ہے نا تو آپ مجھے ڈائجسٹ لا دیں۔“ ردا اس کے غصے کی کم ہی پروا کرتی تھی اب بھی اس پر شاہ میر کے غصے بھرے انداز کا خاص اثر نہیں ہوا تھا۔

”مجھے نہیں جانا۔“ روٹھے بچے کے مانند اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔  
”بھائی پلیز! آپ کتنے اچھے ہیں۔“ ردا نے مکھن لگایا۔

”نہیں ہوں میں اچھا، بس مجھے نہیں جانا۔ تم اپنے بابا جان سے منگواؤ۔“ شاہ میر نے کہا۔

”اوہ، تو آپ گاؤں جانے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ شاہ میر بھائی میرے پاس ایک ایسی خبر ہے کہ آپ سو موار چھوڑ آجی گاؤں جانے کے لیے بھاگ آئیں گے۔“ ردا نے تجسس پیدا کیا۔



”جی..... ایسی کون سی خاص بات ہے گاؤں میں۔“ وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔  
 ”ایسے نہیں پہلے ڈائجسٹ لا کر دیں پھر بتاؤں گی۔“ روانہ کیا۔  
 ”دیکھو مجھ سے دھوکا تو نہیں کرو گی؟“ شاہ میر نے تنبیہی انداز میں پوچھا۔  
 ”بالکل نہیں۔“ روانے اطمینان سے جواب دیا۔  
 ”وعدہ کرو۔“ شاہ میر نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔  
 ”وعدہ!“ روانے اس کا ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔  
 ”ٹھیک ہے، میں ابھی ڈائجسٹ لے کر آتا ہوں۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”بھائی سموسے بھی لائے گا۔“ پورچ میں اسے روا کی آواز آئی اور اس نے فوراً نکل جانے میں عافیت جانی ورنہ ردا کا فرما کر ریکارڈ بجاتا ہی رہتا۔  
 وہ واپس لوٹا تو ردا لاؤنج کے دروازے پر ہی اس کی منتظر تھی۔ ڈائجسٹ دیکھ کر وہ تیزی سے لپکی مگر شاہ میر نے ہاتھ اٹھایا کر لیا۔  
 ”بھائی دو ناں۔“ بردا نے اچک کر لینے کی کوشش کی۔  
 ”ایسے ہی دے دوں۔ پہلے تم مجھے وہ بمبائٹک نیوز سٹاؤ پھر ملے گا۔“ ردا کی سائیڈ سے نکل کر وہ اندر داخل ہو گیا اور صوفے پر بیٹھ کر ڈائجسٹ مضبوطی سے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔  
 ”پہلے دو پھر بتاتی ہوں۔“ روانے کہا۔  
 ”آں ہاں، پہلے خبر سٹاؤ۔“ شاہ میر نے اطمینان سے کہا۔  
 ”یہ دو گے تو سٹاؤں گی ناں آپ کی خبر کا تعلق بھی اس سے ہی ہے۔“  
 ”کیا.....؟“ میرا تعلق اس ڈائجسٹ سے اور وہ بھی خواتین کے۔“ وہ حیران ہوا۔  
 ”تمہارا مسئلہ خواتین ہی ہیں۔“ روانے کہا۔  
 ”خواتین نہیں، صرف خاتون۔“ اس نے سچ کی۔  
 ”ایک ہی بات ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔  
 ”ایک ہی بات نہیں ہے ڈیر سسٹر، تمہیں تو میرے

ناور خیال کا علم ہے ناں کہ جس سے محبت کروں گا اس سے شادی کروں گا۔ اگر میں نے خواتین سے محبت کر لی تو شادی بھی خواتین سے کرنی پڑے گی۔“ خواتین پر زور دیتے ہوئے اس نے بے چارگی بھرے انداز میں کہا۔  
 ”مجھے لگتا ہے آپ سننا ہی نہیں چاہتے میں چاہتی ہوں۔“ ڈائجسٹ نہ ملنے پر ردا کا کافی ناراض ہو گئی تھی مگر اس کی دھمکی کا رگڑ ثابت ہوئی۔ شاہ میر نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر سامنے ٹھہرایا۔  
 ”تم تو ناراض ہو گئیں، یہ لو ڈائجسٹ مگر اپنا وعدہ یاد رکھنا۔“ روانے بے تابی سے ڈائجسٹ کھولا اور ورق اٹھنے لگی۔  
 ”اتنی توجہ سے اگر اپنی کتابیں پڑھو تو ڈبل ایم اے کرو۔“ شاہ میر نے اس کی بے تابی پر چوٹ کی۔  
 ”ادب والوں کے لیے مشکل ہی کافی ہے۔“ وہ بھی کم نہ تھی۔  
 وہ مسکراتے لگی تھی۔ شاید اسے اپنا مطلوبہ صفحہ مل گیا تھا۔ شاہ میر نے بھی اوپر سے جھانکا آخر ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے وہ اتنی بے تاب ہو رہی تھی۔  
 ”آخر اس میں ہے کیا؟ مجھے تو لفظوں کی ریل پیل کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ شاہ میر نے پوچھا۔  
 ”ہاں تو اب سنو۔“ ردا اس کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک صفحہ بھی پلٹا۔ ”یو کیو، اس نے صفحے کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ ساتھ شاہ میر کو کچھ بتانے لگی۔ جس کو سن کر شاہ میر کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔  
 ”بہن ہو تو تم جیسی۔“ وہ خوشی سے چلایا پھر دونوں سموسوں سے انصاف کرنے لگے۔  
 ☆☆☆  
 ”پیاری مس دنیا“  
 آپ اتنی خوبصورت ہوں گی میں نے تو خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جمیل سی خوبصورت آنکھیں، ماتن جیسی سیاہ زلفیں اور سب سے بڑھ کر گلاب کی پتھریوں سے نازک لبوں کی یہ دلکش ہنسی۔ دیکھتے ہی میرے دل کی ساری گھٹنیاں بچ آئیں۔ آنکھوں میں ہزاروں محبت کے دیے روشن ہو گئے ہیں۔ میں نے تو اماں کو فوراً بتا دیا کہ اس

دلی کی آخری چوہدرانی تم ہی ہو گی۔ تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں آگ کا دریا بھی پار کر لوں گا۔ چوہدری شہناز خان ایک بار جو چڑچڑھند کر لیتا ہے اسے حاصل کر کے جاتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں روک سکتی تم کو کو میری ہی سمجھو۔ میرا ارادہ تو ڈائریکٹ ملنے کا تھا مگر ردا دوسٹ دلا اور خان کہتا ہے کہ تمہیں پہلے بتا دوں تاکہ تم میری تیاری شکاری کر لو۔ کل بننے کو تمہارے گھر ملاقات کر لی۔  
 چوہدری شہناز خان“  
 تیسری دفعہ خط کو پڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی باہر جانے کا۔ وہ تو ویسے بھی خاصی ڈر پوک اور نرم دل تھی اس نے خط نے تو اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ اسے سانس نہ رہا وہ محسوس ہو رہا تھا۔ تنقیدی اور تعریفی خط تو روز بروز موصول ہوتے تھے مگر اس قسم کا خط پہلی بار مل رہا تھا۔  
 چوہدری شہناز خان نام ہی اتنا خوفناک تھا۔ بندے کا تو نام بھی نہیں سنی تھی۔ چوہدریوں کے متعلق جو کچھ اس نے سن رکھا تھا اسے ڈرانے کے لیے وہی کافی تھا۔ جب اس نے اپنا انڈریس ڈائجسٹ میں دیا تھا تب دادو جان نے اسے منع کیا تھا مگر اس نے ان کی بات کو بے پروائی سے لیا تھا۔ اس لیے کہ کسی بھی فن تنقید اور تعریف ہی کا اثر نہیں ہے پھر اس نے سوچا تھا کہ ڈائجسٹ تو خواتین ہی کی چیز ہے۔ وہی خط لکھیں گی مگر اس خط نے تو اس کے دل میں روشن کر دیے تھے اگر وہ واقعی آ گیا تو..... اس تو اس کے سوچنے کی ہمت نہیں تھی اس میں۔ ”اور اگر دادو کو یہ پتا چل گیا تو..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی لڑکی نے دلی کی ہوئی اس نے دل کو کسلی دی سیان، یہی بات ہو کسی لڑکی نے شرارت کی ہوگی ورنہ کی چوہدری کے ساتھ وقت کہاں کہ وہ خواتین کے رسالے پڑھتے اور یہ بھی چوہدری ان پڑھ ہوتے ہیں۔“ وہ خود کو حوصلہ دیتی تھی۔  
 ”دنیا..... دنیا!“ آپ کی آواز آئی اور قدموں کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسی طرف آ رہی ہیں۔ وہ اس سے چونکی۔ خط ابھی تک ہاتھ میں تھا۔

”دنیا! کب سے بلا رہی ہوں کیا کر رہی ہو۔“  
 دروازے کا ہینڈل تھام کر انہوں نے اندر جھانکا۔ اسی پل وہ خط نکالنے کے نیچے گھسیڑ کر سیدھی ہو بیٹھی تھی۔  
 ”وہ میں..... میں.....“ ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا اس لیے بولنے کے بجائے اس نے بیڈ پر پٹھرے خطوط کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”اچھا تو خط پڑھے جارہے ہیں۔“ وہ اندر داخل ہوئیں۔ ”تمہیں اپنی تعریفیں کروانے کا کچھ زیادہ شوق نہیں ہو گیا۔“ انہوں نے ایک خط اٹھا کر پڑھتے ہوئے کہا۔  
 جس میں لکھا تھا کہ آپ کے ناول تو خوبصورت ہوتے ہی ہیں مگر آپ خود تو اتنی پیاری ہیں جیسے کوئی پری۔ اس دفعہ ڈائجسٹ میں دنیا کی تصویر شائع ہوئی تھی اس لیے بہت سے خط میں اس کی تعریف لکھی ہوئی تھی۔  
 ”سینس تو آتی.....“ خط کا کوئی ٹکڑے کے نیچے سے نظر آ رہا تھا۔ اسے کچھ سوچ نہیں رہا تھا کہ کیا جواب دے کوئی اور وقت ہوتا تو اپنی تعریف پر اتر کر کہتی کہ کیا میں اس تعریف کے قابل نہیں ہوں..... واقعی وہ بہت خوبصورت تھی۔ بڑی بڑی غرائی آنکھیں جن پر سیاہ پلپٹیں سایہ لگن تھیں۔ گلاب کی پتھریوں سے نازک گلابی ہونٹ، ستواں ناک اور سب سے بڑھ کر اس کے گالوں میں پڑتا ڈھیل۔  
 ”اوہ ہاں.....“ ایک اور خط کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ روک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں تو بھول ہی گئی۔ دادو جان چائے پر انتظار کر رہی ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ تم ان فضول کاموں میں مصروف ہو تو خوب عزت افزائی کریں۔“ سعید نے کھڑی پر نگاہ ڈالی۔ چار بجے کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ جس کا واضح مطلب چائے تھا۔  
 ”میں واقعی بھول گئی۔ آپ چلیں میں ابھی آتی۔“  
 دنیا نے خطوط دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”فورا آ جاؤ کہیں پھر نہ پڑھنے بیٹھ جانا۔“ اس نے سارے خط اکٹھے کر کے دراز میں رکھے۔ خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھا وہ خط پھاڑنے لگی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر الماری میں رکھ دیا اور مزید دھوکا بھرانا میں آ گئی۔  
 ”آئیں شریف لائیں مہارانی صاحبہ جلدی آ جایا



کریں تاکہ خدام کو انتظار کی رحمت نہ اٹھانی پڑے۔“ دادو جان اسے دیکھتے ہی اپنے خاص لہجے میں بولیں جو وہ اس وقت اپنی تھیں جب کوئی بات ناگوار لگتی تھی۔

”دادو جان میں پڑھ رہی تھی۔ پڑھنے میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔“ ندیانے فوراً صفائی پیش کی۔

”کیا پڑھ رہی تھیں آپ؟“ دادو جان نے عینک کو صبح کرتے ہوئے گھورا۔

”دادو جان انگلش کا مضمون یاد کر رہی تھی۔“ اس نے جھوٹ بولا کیونکہ اگر دادو جان کو پتا چل جاتا کہ وہ خط پڑھ رہی تھی تو خوب ڈانٹ پڑتی تھی۔

”یہ تمہارا انگلش کا مضمون ہمیشہ چائے کے وقت پر ہی کیوں ہوتا ہے۔“ اس بات کا کیا جواب دیتی بس مسکرا کر رہ گئی۔ ”اگر آئندہ یہ مضمون چائے کے وقت آیا تو پھر چائے کے بجائے اسے ہی گھول کر پینا۔“

”جی دادو جان آئندہ دیر نہیں ہوگی۔“ اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”ماشا اللہ کتنی سعادت مند بچی ہے میری۔“

”دادو جان اب بس بھی کریں۔“ آخر ندیا کو کہنا ہی پڑا کیونکہ جب دادو جان انتہائی عزت کے ساتھ بے عزتی کرتی تھیں تو اسے ہنسنے نہیں ہوتی تھی۔

”اچھا ملکہ عالیہ، ہم بس کرتے ہیں آپ چائے لیجیے۔“ دادو نے کہا۔

”دادو جان.....!“ اب کی بار وہ روہانی ہو گئی۔

”اچھا..... اچھا اب رونے مت لگ جانا، چلو چائے پیو۔ اب کے دادو نے بھر درست کیا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ابھی رونا شروع کر دے گی اور پھر کئی دن تک منہ بنائے رکھے گی جو وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جانے والی وہ بارہا دل کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ کسی لڑکی کی شرارت ہو گی مگر نہ جانے کیوں دماغ ایک ہی بات پر اٹک گیا تھا کہ ”اگر یہ سچ ہوا تو.....! اگر وہ کل پہنچ گیا تو.....؟“ اور یہ ایسے سوالیہ جملے تھے جو دل کی تسلی کا کوئی جملہ پورا نہیں ہونے دیتے تھے اگر مبینہ کی آخری تاریخ ہوتی تو وہ ایک نوٹ شائع

کر دیتی کہ اس کا ایڈریس تبدیل ہو گیا ہے اس طرح شاید جان چھوٹ جاتی مگر آج تو اس تاریخ تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ مستقبل کی یہ دس تاریخ آئندہ کے ماضی میں بدترین تاریخ ہوگی۔

”ہائے اللہ، میں نے لکھنا کیوں شروع کیا اگر لکھ ہی لیا تھا تو شائع کیوں کر دیا اگر یہ بھی ہو گیا تھا تو پھر یہ کیوں شائع کر دیا۔ کاش میں نے دادو کی بات مان لی ہوتی۔“ وہ خود کو کوس رہی تھی۔ سوچ سوچ کر دماغ پھٹ رہا تھا کہ کل کیا ہوگا۔

”اللہ میاں جی مجھے معاف کر دیں، میں نے دادو جان کی بات نہیں مانی تھی۔ اللہ میاں جی یہ کسی لڑکی کی شرارت ہو اگر واقعی کوئی چوہدری ہے بھی تو..... اس کی جیب کا مائز پتھر ہو جائے۔ اسے ملیریا ہو جائے۔ اس کی فصلوں میں امریکن سنڈیل کا حملہ ہو جائے اور وہ انہی میں مصروف ہو جائے۔ کچھ بھی ہو جائے مگر وہ کل یہاں بلکہ بھی بھی یہاں نہ آئے۔“ وہ عشاقی غماز کے بعد بڑے خشوع و خضوع سے دعائیں مانگ رہی تھی حالانکہ انہیں یہ بددعائیں لیکن اس کی طرح معصوم تھیں۔

”حیرت ہے، یہ آج اللہ میاں سے کیا مانگا جا رہا ہے؟“ آپ کی کب سے اس کے اٹھے ہاتھوں، بند آنکھوں اور ملے ہوئے نوٹوں کو دیکھ رہی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے آواز پر فٹ سے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ گود میں رکھ لیے۔

☆☆☆

ساری رات وہ صبح سے سو نہیں سکتی تھی۔ اگر ڈاڈا دیر کو آنکھ لگ جاتی تو خواب میں بے دھمکی جسامت والا چوہدری شاہنواز آ جاتا۔ بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا۔ صبح کے قریب اس کی آنکھ لگتی تھی۔ آپ نے نماز کے لیے جگایا مگر وہ ابھی نہیں تھی۔ اس پریشانی میں وہ اکیڈمی جانا بھی بھول گئی تھی۔ اس کے خیال میں سر سیر دنیا کی خوفناک ترین چیز تھے۔ کم از کم وہ تو صرف ان سے دل تھی اور ان کی وجہ سے پریشان رہتی تھی۔ پتا بھی سبق رٹ لو اگر نہیں ایک لفظ بھی اٹکے تو سادے کیے کرانے پر پانی پھر جاتا مگر چوہدری شاہنواز کے خط نے اس کے

خیال کی تردید کر دی تھی۔ جس شخص کے الفاظ سے وہ اتنی پوزہ ہو گئی تھی، اس سے ملنے پر کیا حال ہوگا۔ تقریباً دس بجے وہ بیدار ہوئی تھی۔ شب بیداری اور پریشانی کی وجہ سے دماغ سن ہو رہا تھا۔ دادو اور آپ کی باتیں میں مصروف تھیں۔ ندیانے ایک کپ چائے بنائی اور باہر برآمدے میں دادو اماں کے تخت پر بیٹھی۔ کچن سے برتنوں کے اٹھا کر آپ آوازیں آرہی تھیں مگر اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ

”برمیانی کے نیچے آجج جیسی کر دو۔ کسٹرز میں سے ڈال دو۔ کفوں میں مرچیں تیز رکھنا۔ کباب بعد میں فراں کر لیں گے۔“ دادو جان مسلسل آپ کی ہدایات سے رہی تھیں۔ ندیانے نظر میں گیٹ پر بھاری تھیں ”اگر مائز آستہ وہ آگیا تو کسی نہ کسی طرح اسے گیٹ سے ہی بھیج دیں دوں گی“ انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے

دوہات لیجئے ذہن کے ساتھ تھپتھپی تھی۔ اس بات کا نوٹس لیا نہیں لیا تھا کہ دادو جان اور آپ نے یہ انتہام کس لیے کر لی تھیں، نہ ہی وہ اٹھ کر کچن میں گئی تھی۔ حالانکہ پہلے

دادو آپ کی کچھ بنا رہی ہوتی تھیں تو وہ بہانے بہانے سے کچن کے چکر لگاتی رہتی تھی اور بہت سی چیزیں کھا جاتی تھیں

آج تو پریشانی میں کچھ سوچ ہی نہیں رہا تھا۔ کبھی اٹھ کر اندر آ کر انداز میں ٹھہرتی تھی اور کبھی پھر بیٹھ جاتی۔ دادو نے اس کے انداز پر دھیان نہیں دیا تھا مگر آپ کچن کے گلاس

مذہ سے مسلسل نوٹ کر رہی تھیں۔ کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ دادو جان نوافل پڑھنے کے لیے اپنے کمرے میں چل گئیں۔ آپ نے راستہ تیار کر رکھی تھیں جب تیل ہوئی ندیا

دیکھنے کی طرف دوڑی۔

”جی کون؟“ اس نے پوچھا۔

”شاہ!“

”دیکھیے شاہنواز صاحب آپ ابھی یہاں سے گئے ہیں۔ میں آپ سے نہیں مل سکتی۔ اوہ، میں نہیں

..... اصل میں آپ کو جن سے ملنا تھا وہ یہ گھر

..... آگے کر کہیں اور شفٹ ہو گئے ہیں۔ آپ یہاں سے فوراً

..... آگے جائیں۔“ اس نے شاہن کو بولنا شروع کر دیا تھا اور

..... آگے بول رہی تھی۔ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی تو

.....

.....

.....

باہر کھڑے شاہ میر کو کیا سمجھا آتی۔

شاہ میر نے پھر سے نیم پلیٹ کو غور سے پڑھا اور دل میں سوچا۔ ”شاید پاگل خانے آ گیا ہوں۔ حیرت ہے دو گھنٹے میں گھر چھوڑ کر چلے گئے، ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو دادو جان کو اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔“

”کون ہے ندیا؟“ آپ بھی آگے تھیں۔

”کوئی نہیں، کاشی تھا اپنی امی کا پوچھ رہا تھا۔“ اس نے جھوٹ سے جھوٹ گھڑا۔ باہر کی خاموشی سے اس نے سمجھا کہ شاید شاہنواز چوہدری چلا گیا ہے۔ ”آئیں چلتے ہیں۔“ دونوں نے قدم آگے بڑھائے مگر تیل ایک بار پھر

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....



تھا۔ جسے وہ چوہدری شاہنواز سمجھ کر اول فول بول گئی تھی وہ کوئی اور تھا شاید یہ سب اہتمام اس کے لیے ہی ہو رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اسے اپنے حلیے کا خیال آیا۔ بانی تو سب ٹھیک تھا مگر جوتے..... نظر ہیروں پر پڑی تو جوتے غائب تھے۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر کہیں سے دریافت نہ ہوئے۔ ”اوہ نوہ.....“ یاد آنے پر اس کے منہ سے نکلا۔ ایک جوتا تو وہ گیٹ کی طرف دوڑتے ہوئے پہن ہی نہیں سکتی تھی اور تخت کے پاس ہی رہ گیا تھا اور دوسرا شاید واپسی کی دوڑ میں گیٹ کے پاس رہ گیا تھا۔

”نہا.....!“ آپنی کی آواز بھر سے آئی۔  
”اب کیا کروں؟“ اس نے سوچا۔ ”چلو ایسے ہی چلتے ہیں وہ کونسا کسی ریاست کا شہزادہ ہے۔“ دل کڑا کر گئے آخر وہ باہر آ ہی گئی۔ شاہ جو سر سے پاؤں تک جائزہ لینے کا عادی تھا پہلے ہی سر چلے میں حیران ہوا اس کو تنگے پاؤں دیکھ کر حیرانی میں دوسری نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ انتہائی مصحوبیت لیے سر جھکائے کھڑی تھی۔  
”شاہ میرے تم نے کیا کہا ہے؟“ آپنی نے پوچھا۔  
”وہ آپنی اصل میں..... میں۔“ اب انہیں کیا بتانی کہ اس نے یہ سب شاہ میرے نہیں شاہنواز سے کہا تھا۔  
”سوری.....“ کوئی جواب نہ بن پڑا تو منہ بنا کر اتنا ہی کہہ ڈالا۔

”جوتے کہاں ہیں تمہارے؟“ آپنی نے بھی شاہ میر کے بعد اس جائزہ لیا۔  
”وہ رہے۔“ وہ ذرا غصے سے بولی۔ آپنی جو ایک اجنبی کے سامنے ڈانٹ رہی تھیں۔

”جوتے پہنوا اور میری بات سنو۔“ آپنی کہتی ہوئی ڈربک لینے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ ایک جوتا تو وہ پہن آئی مگر دوسرے کا مسئلہ تھا۔ یہ تو وہ دیکھ چکی تھی کہ دوسرا جوتا اس اجنبی کے دونوں پاؤں کے درمیان پڑا تھا بلکہ اس کا پاؤں اس کے اوپر ہی تھا اور وہ اجنبی نے دنیا کی موجودگی سے بے نیاز باہر لان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تخت کے قریب آئی اور بیٹھ کر ہاتھ سے جوتا پکڑنا چاہا مگر اس پر تو ابھی بندے کا بھاری بھر کم بوٹ والا پاؤں تھا۔ اس نے تھوڑا کھینچا بھی مگر جوتا پھر نہیں نکلا تھا۔

”یکسیکوزی..... میرا جوتا.....“ اس نے شاہ میر سے کہا مگر وہ بدستور باہر نکلنے کے مشغلے میں لگا ہوا تھا۔ ”جوتے چھوڑ دیں۔“ اس نے دوبارہ کہا۔  
”جی مجھ سے کچھ کہا.....؟“ اب کی بار وہ چونکا۔  
”نہیں، آپ کے سر سے۔“ اس کی بے نیازی پر نہا کا بارہ ہانی ہو گیا تھا۔ غصے میں بیڑ بستی وہ اندر چلی گئی۔  
”ایک تو میں شاہنواز کی وجہ سے پریشان تھی اور اب یہ شاہ میر صاحب اب یقیناً یہ دادو کو بتائے گا اور دادو پھر سے ادب تیز پر ایک لمبا لکچر دینے کے ساتھ ساتھ عزت افزائی بھی کریں گی۔ اس نے سوچا۔ ”بھائز میں جائیں دونوں۔ شاہنواز اور شاہ میر۔“

☆☆☆

”کب واپس آ رہے ہو؟“ وہ لان میں کھڑی تھی کرسی پر بیٹھا آذر سے موبائل پر بات کر رہا تھا لیکن اس کی تمام توجہ پودوں کو پانی دیتی نہ دیا پر مگر کرسی۔  
”یار جلدی آؤ، تمہارے لیے ایک بہت بڑی خوشخبری ہے۔“ شاہ میر نے جان بوجھ کر آواز اونچی رکھی۔  
”دوست بھی بھرے بنائے ہوئے ہیں۔“ نہا کی بڑبڑاہٹ بڑی واضح تھی جو اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔

”یار آہستہ بول، بہر انہیں ہوں میں۔“ انگلی پل آذری کی آواز اس کی مسکراہٹ کو قہقہے میں بدل گئی۔  
”خوشخبری تو سناؤ۔“ آذر کو اس کا لہجہ جس میں جھٹکا کر رہا تھا۔

”ایک لڑکی ہے۔“ شاہ میر نے معنی فیزی سے نہا کو دیکھا۔  
”کہاں.....؟“ آذر کو اس کی آدمی بات سے ہمیشہ ہی کوفت ہوتی تھی۔

”میرے سامنے۔“ شاہ میر کی مسکراہٹ بڑی گہری تھی۔ شاہ میر کی بات پر نہا کا دل بڑی زور سے دھڑکا اور اس نے پلٹ کر شاہ میر کو غصے سے دیکھا۔  
”جو مجھے بہت غصے سے دیکھ رہی ہے۔ اس لیے بعد میں بات کروں گا۔“ ایک توقف سے شاہ میر نے

بات مکمل کی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت رقصاں تھی۔ نہا نے غصے میں سارا پانی شاہ میر کی طرف اچھال دیا اور پاؤں پختی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ شاہ میر کو لگا کہ اس پانی کی بوندیں نہیں گلاب کی چٹاں نچھاور کر دی گئی ہوں۔

”یار، اس لڑکی سے مجھے محبت ہونے لگی ہے۔“ شاہ میر پھر سے آذر سے جو گفتگو تھا اور یہ اس کا پہلا جملہ تھا۔

☆☆☆

دونوں گزر چکے تھے اور چوہدری شاہنواز کا خوف کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ البتہ شاہ میر سے وہ ابھی تک فضا تھی اور اس سے اس نے کوئی بات چیت نہیں کی تھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ آج صبح وہ در سے جا گئی تھی کیونکہ پچھلے دو دن سے اکیڈمی سے چھٹی کی تھی اور بہت سا کام اٹھا ہو گیا تھا اس لیے وہ رات دیر تک پڑھتی رہی تھی۔ اب وہ لاؤنچ میں بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ دادو جان، شاہ میر اور آذری بازار گئے تھے۔ شاہ میر کی امی نے وہاں سے موٹن حلو لانے کو کہا تھا۔ دادو جان اور آذری روا کے لیے لکٹ لینے لگی تھیں۔ ناشتے کے برتن کچن میں رکھ کر جائے لکٹ لے کر وہ لاؤنچ میں آئی تھی کونوں کی کھل ہوئی اس وقت وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھی جو ادھر ادھر کا ”مہندی“ لگنا تے ہوئے اس نے ریوڑا ٹھایا۔  
”ہیلو جی، مجھے مس نہا سے بات کرنی ہے۔“  
”جی بات کر رہی ہوں۔ آپ کون؟“ بھاری بھر کم لہجہ سن کر اس کا دل دھڑکا اٹھا تھا۔

”میں چوہدری شاہنواز خان ہوں۔“ وہی خوشگوار لہجہ..... اس کے سارے خدشے درست ثابت ہوئے تھے۔  
”آپ خاموش کیوں ہو گئیں شاید ناراض ہو گئی ہیں مجھ سے..... میں وعدہ کر کے آیا ہو جی نہیں۔ وہ بڑی بے ہودہ تھی تو ہر اچھے موقع پر ڈرامے کرنے لگتی ہے۔  
”نہا کوئی کھانا کھانا کر دے گا دورہ ڈال لیا تھا۔ بس اس کے ساتھ اسپتال میں خوار ہونا پڑا آپ ناراض نہ ہوں۔ میں یہیں آپ کے شہر میں ہوں۔ جلد ہی ملنے

آؤں گا۔“ ادھر سے کیا بولا جا رہا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی بھی لفظ کہے بغیر اس نے ریوڑا پھینک دیا اور وہیں نیچے بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ جس خطرے کو ملتا محسوس کر رہی تھی وہ پھر سے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔

چند لمحے بعد نوں پھر رخ اٹھا تھا۔ وہ ایک دم سے اٹھی اور ریوڑا اٹھا کر چھ کر بولی۔

”شاہنواز صاحب میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی اگر تم نے دوبارہ نوں کیا تو.....“

”میں شاہ میر بات کر رہا ہوں۔“ اس کی بات کاٹ کر کہا گیا تھا، وہ ساکت کھڑی رہ گئی۔ ”وہ اس کے جملے کا کیا مطلب لے گا۔ اگر اس نے دادو کو بتا دیا تو..... اگر اس نے دادو سے دریافت کیا کہ شاہنواز کون ہے؟“ وہ سوچے جا رہی تھی۔

”دادو جان نے کہا ہے کہ آپ سے پوچھ لوں کہ کوئی چیز تو نہیں لکھی۔“ اس کی خاموشی پر پوچھا گیا تھا۔  
”جی نہیں۔“ بڑی مشکل سے وہ دو لفظ بول پائی تھی اور شام تک تیز بخار میں تپ رہی تھی۔

☆☆☆

شاہ میر کو گھر سے آئے سات دن ہو گئے تھے۔ چار روز تو اس نے گاؤں میں گزارے تھے۔ سارا حساب کتاب چیک کر کے رقم وصول کی تھی اور اس رقم کو ٹریولنگ چیک میں تبدیل کروا لیا تھا۔ یہاں آئے اسے تیسرا دن تھا۔ رضا صاحب جب بھی گاؤں آتے یہاں ضرور آتے تھے۔ مسز حیدر دادو جان ان کی سگی چچی تھیں۔ نہا اور سنیہ کو ردا سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ احمد خان کی موت کے بعد سے اب تک رضا صاحب نے نہا اور سنیہ کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔ دادو جان نے نہا اور سنیہ کے رشتے کی ذمہ داری بھی اٹھائی۔ سوپ دی گئی لہذا وہ اپنی ذمہ داری بخوئی نہا چاہتے تھے۔ سنیہ کے لیے وہ کئی ایک اچھے رشتے دیکھ رہے تھے جب کہ نہا کے لیے وہ شاہ میر کا ساتھ سوچ رہے تھے اور ان کی مسز بھی اس فیصلے سے سوئی صدمہ منی تھیں۔ اب شاہ میر کو یہاں بھیجے کا مقصد بھی بطور خاص یہی تھا



کہ وہ دنیا کو دیکھ لے۔ اسے لگا جیسے اس کی تلاش ختم ہو گئی ہو۔ اسے یہاں آنا بہت اچھا لگا تھا۔ وہ جان بوجھ کر دنیا کو تنگ کرتا اور اس کی جستجو ہٹ پر محظوظ ہوتا۔

”ہائے.....“ اس کا بخار کسی حد تک کم ہو چکا تھا وہ دل ہی دل میں شاہ میر کی شکر گزاری کر رہی تھی کہ اس نے داد و اور آ پی سے شاہنواز کا ذکر نہیں کیا تھا اگر ایسا کیا تو یقیناً داد و اور آ پی اس کے متعلق ضرور پوچھتیں۔ اب اس نے خود ہی چوہدری شاہنواز سے سینے کا فیصلہ کیا تھا کسی حد تک اس نے دل سے خوف کم کر لیا تھا۔

”آخر ہے تو انسان ہی ناں اب فون آئے گا تو میں اسے سمجھا دوں گی وہ یقیناً ناں لے گا۔ یہی سوچ کر اس نے دل کو تلی دی تھی۔ ڈائجسٹ کی ایڈیٹر کا فون بار بار آ رہا تھا کہ ناؤں بھجواؤ۔ سو آج وہ کاغذ قلم سنبھال کر ہار سنگھاری بیل کے نیچے آ بیٹھی تھی۔

”کیا کر رہی ہیں؟“ شاہ میر کی اچانک آمد اور ایک دم سے بولنے پر وہ بری طرح ڈر گئی تھی اور دنیا کے اس طرح ڈر جانے پر وہ زور سے ہنسا۔

”کپڑے دھو رہی ہوں۔“ اس کی ہنسی دنیا کو پتا لگتی تھی۔

”اچھا میرا خیال تھا آپ کچھ لکھ رہی ہیں؟“ وہ بہت بے تکلفی سے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”لکھ رہی ہوں۔“ دنیا اس پر گہری نظر ڈال کر بولی تھی۔

”آں ہاں، آپ مرثیہ مت لکھیں ایسا کریں کہ قصیدہ لکھیں اور بادشاہ حضور کے حضور پیش کر کے انعام حاصل کریں۔“ شاہ میر شاہانہ انداز میں کالر اکڑا کر بولا۔

”آپ زیادہ خوش نہ ہوں میں اپنے انعامات میں فقیروں کو شامل نہیں کرتی۔“ اس سے پہلے کہ شاہ میر جواب دیتا۔ داد و جان برآمدے سے آتی نظر آئیں، ساتھ کاشی بھی تھا۔

”دادو، آپ کی پوتی تو بہت ذہین ہے۔“ ان کے قریب آ جانے پر شاہ میر ایک نظر دنیا کے خوبصورت چہرے پر ڈال کر بولا اور دنیا تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی کہ

کہیں وہ ذہانت کے ثبوت کے طور پر اس کے کہے گئے فقرے نہ سنا شروع کر دے۔

”ذہین تو واقعی بہت ہے میری پوتی۔“ داد و جان فخر سے بولیں۔

”دنیا تمہیں، سعید بھائی ہے۔ میں ذرا کاشی کے ساتھ جاری ہوں ابھی آ جاؤں گی۔“ دادو نے کہا۔

”چلیں دادو، میں بھی ذرا ہار کا پکڑ لگاؤں۔“ شاہ میر بھی ان کے ساتھ ہو لیا جب کہ دنیا لاؤنج میں آ گئی۔

”دنیا، پلیز یہاں آؤ، یہ راستہ بناؤ میں ذرا آؤں گوندھ لوں۔“ آ پی نے کچن میں سے کہا تھا۔ دنیا کچن کی طرف جاتے جاتے پٹی فون کی تیل ہو رہی تھی۔

”ہیلو.....“

”میں نے پہچان لیا آپ دنیا ہیں ناں۔“ دوسری طرف سے چوہدری شاہنواز کی آواز تھی۔

”کیا حال ہے آپ کا چوہدری صاحب؟“

”دنیا، کون ہے؟“ دنیا جو کہ دل میں شاہنواز سے بات کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہی تھی آ پی کے استفسار پر پریشان ہو گئی۔

”کوئی نہیں آ پی، رات گئی ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے ریسیور رکھ دیا۔

☆☆☆

”مما بھائی کو واپس بلائیں ناں۔ وہ تو وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج پورے دس دن ہو گئے ہیں۔“ ردا تقریر یاد دہانی دیتی تھی ویسے بھی شاہ میر اس سے صرف دو سال بڑا تھا اور دونوں میں خوب دوستی تھی۔ بچوں کی طرح لڑائی جھگڑا کرنا ان کا معمول تھا اور اس لڑائی جھگڑے سے بہن بھائی کی محبت میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔

اس کی غیر موجودگی کو بہت محسوس کر رہی تھی۔ پہلے بھی جب بھی شاہ میر اپنے دوستوں کے ساتھ کسی ٹرپ وغیرہ پر جاتا تھا ردا کی توجان پر بن آتی۔ اب جو مذاق وہ بے تکلفی سے شاہ میر سے کر لیتی تھی ممابابا سے تو نہیں کر سکتی تھی۔ ان دس دنوں میں وہ شاہ میر کے لیے بہت اداس ہو گئی تھی۔ یونیورسٹی سے واپس آ کر سارا دن بورنگز دیتا

ہاں البتہ آذر کے آ جانے سے کچھ وقت اچھا کٹ جاتا تھا۔ اس یوریت سے تنگ آ کر وہ ماما کے سر چبھتی گئی تھی۔ وہ خود بھی بہت اداس ہو گئی تھیں۔

”آجائے گا دو چار دن رہ کر۔“ ردا کو تنگ کرنے کے لیے وہ بے پروائی سے بولیں۔

”کیا دو چار دن.....؟“ ردا نے ہنسی سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”ہرگز نہیں، میں ابھی فون کرتی ہوں اور دنیا سے کہتی ہوں میرے بھائی کو فوراً واپس گھر بھجواؤ۔“ ردا نے کہا۔

”دنیا کیا واپس بھجوائے گی اب تو دنیا خود یہاں آنے کی تیاری کرے گی۔“ ماما تصور میں کچھ سوچ کر سرکا کر بولیں۔

”مما جانی اتنی خوبصورت مسکراہٹ، ضرور کوئی بات ہے مجھے بھی بتائیں۔“ ردا کے دل میں کھد بد ہونے لگی تھی۔

”آذر نے تمہیں نہیں بتایا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کیا.....؟ ردا نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی کہ شاہ میر نے اسے فون پر کہا ہے کہ دنیا اسے اچھی لگنے لگی ہے۔“ وہ بولیں۔

”کیا؟“ ردا خوشی سے چیخ مار کر ان سے لپٹ گئی۔ اتنی اچھی خبر اور شاہ میر کے منجے نے مجھ سے چھپائی۔ آئے تو سہی دیکھیں میں کیا حشر کرتی ہوں اس کا۔“ ولی خوشی کا عکس اس کے چہرے پر واضح تھا۔

”بس شاہ میر واپس آ جائے تو میں اور تمہارے بابا جا کر بات طے کر آئیں گے۔“ انہوں نے کہا۔

”ہائے مماتکنا مزہ آئے گا۔“ ردا خوشی سے معمور لہجے میں بولی۔

”لیکن سنو، شاہ میر کو اس بات کا پتا نہ چلے ہم اسے سر پر آذر دیں گے۔“ ممابولیں۔

”السلام علیکم آئی ایہ کس کو کیا سر پر آذر دیا جا رہا ہے۔“ آذر کب کچن میں داخل ہوا تھا انہیں خبر نہیں ہوئی۔

”ولیکم السلام بیٹا، آؤ، تم کب آئے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”بس بالکل ابھی آیا ہوں۔“ ڈائجسٹ ٹیبل کی چیر کھینچ کر وہ بیٹھے ہوئی بولا۔ ”لیکن آپ کس کا ذکر کر رہی ہیں اور ردا صاحبہ کیوں کھنار ہو رہی ہیں کہیں ان کے تو کوئی.....“ آذر نے شرارت سے ردا کے سرخ چہرے پر نظر ڈالی۔

”بیٹا جی آپ اپنی فکر کریں۔ شاہ میر کی بات طے ہو جائے تو پھر تمہارا بھی کوئی بندوبست کرنی ہوں۔ تمہاری ماما کا روز فون آتا ہے کہ ایک بہو میرے لیے دیکھ رکھو۔ میں نے تو انہیں کہہ دیا ہے کہ بس اگلے ماہ شاہ میر اور آذر دونوں ہی کو کسی کے پلو سے باندھ دیں گے۔ ہاں، ایک خصوصی رعایت ہے تمہارے لیے اگر کوئی پلو والی آپ کو پسند ہے تو بتا دو پھر گلہ مت کرنا۔“ وہ بولیں۔

”ارے آنٹی کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ یہ کوئی عمر ہے میری شادی کی.... آذر گڑ بڑا گیا تھا۔

”ہاں ہاں امی یہ کوئی عمر ہے ان کی شادی کی۔ ابھی تو کھیلنے کو دن ہیں۔ ابھی تو یہ فیڈر میں دودھ پیتے ہیں۔“ ردا نے فوراً بدل لیا تھا۔ آذر اس کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

☆☆☆

دنیا اس وقت بڑے خوشگوار موزوں میں ایزی چیئر پر بیٹھی نیم جاز کا ناؤ ”شاہین“ پڑھ رہی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے کوئی اچھی کتاب پڑھے۔ چوہدری شاہنواز، سر میر اور شاہ میر تینوں کی وجہ سے وہ پریشان تھی۔ چوہدری شاہنواز کا خوف قدرے کم ہو چکا تھا۔ سر میر ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد گئے ہوئے تھے سو بے فکری ہی سے لکھ رہی تھی۔ رہ گیا شاہ میر تو اسے کل واپس چلے جانا تھا مگر ایک بات اسے ابھن میں ڈالے ہوئے تھی کہ وہ آخر شاہ میر کی وجہ سے کیوں پریشان ہے۔ وہ جب بھی سامنے آتا وہ خود کو کہیں اور مصروف ظاہر کرتی مگر ایسا ہوتا نہیں تھا۔ وہ آ پی یا دادو سے بات کر رہا ہوتا تو دنیا کی ساری توجہ اس کی طرف ہوتی مگر بظاہر وہ کسی اور کام میں مگن رہتی اور جب وہ اس سے بات کرتا تو وہ خود بخود اس کی ہر بات کا الٹا جواب دیتی۔ وہ اپنے ہی



زین ہونے پر مہر لگائی۔

”ایک ایم بی اے اور دوسری ایم بی بی ایس کر رہی ہے لیکن آپ نے تو کہا ہے کہ وہ دونوں بہت ذہین ہیں۔“ شاہ میر بولا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔ ایم بی اے اور ایم بی بی ایس کم عقل لوگ کرتے ہیں۔“ ندیا غصے سے بولی۔  
”دیکھیں محترمہ، شادی کم از کم عقل والا کام نہیں ہے۔“ شاہ میر اس کے غصے سے بے نیاز تھا۔

”شادی..... اس میں شادی کا کیا ذکر؟“ ندیا کی آنکھوں میں حیرت بکھوڑے لینے لگی۔

”شادی ہی کا تو ذکر ہے۔ ایم بی اے یعنی میاں بیوی اکیلے اور ایم بی بی ایس یعنی میاں بیوی بچوں سمیت۔“ شاہ میر کی بات پر ہنسی بے اختیار ان کے لبوں پر آگئی تھی اور وہ ہلکھلا کر ہنس پڑی۔

”یہ بہتے ہوئے کتنی پیاری لگتی ہے۔“ شاہ میر نے اس کے صبح کے اجالے کی طرح گھر سے چرے پر نظر ڈال کر سوچا۔ چمکدار سیاہ غزالی آنکھیں ہنسنے سے نم ہو گئی تھیں۔

”آپ آنسکریم کھانے چلیں گی۔“ کچھ بل اس کے ساتھ گزارنے کی خواہش دل میں جاگ اٹھی۔  
”دادو سے میں پوچھ چکا ہوں۔“ اس کے بولنے سے پہلے ہی شاہ میر نے کہا۔

”تو پھر چلیں۔“ ندیا کچھ سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ میر نے آپنی سے بھی کہا مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ سورج الوداع کر نہیں بکھر رہا تھا۔ ندیا کی دہکتی رنگت سورج کی کرنوں میں نہا کر اور چمکنے لگی تھی۔ مارکٹ دس منٹ کی واک پر بھی۔ شام کا وقت ہو چلا تھا خوب گہما گہما تھی۔ شاہ میر کو ندیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا اچھا لگ رہا تھا جبکہ ندیا کا دل اداس سا ہو گیا تھا۔ غروب ہوتے سورج کی طرح اسے اپنا دل بھی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

”آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟“ شاہ میر نے اس کے چپ چپ روپ پر نظر جمائی۔

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس بل اس کا

نی چلا تھا کہ وہ شاہ کو شاہ نواز کے متعلق بتا کر اپنے دل کا بوجھ ختم کر لے کر وہ ایسا نہ کر سکی۔ شکر یلا اسٹیک بار ہاں کی مشہور شاپ تھی۔ سوشا میر اسے وہیں لے آیا تھا۔ سورج اپنی کرشمیں سمیٹ چکا تھا۔ البتہ اُفتی پر ہلکی سی سرخی باقی تھی۔

”شاہ میر، پلیز گھر چلتے ہیں آپ پیک کر والیں۔“ شاہ میر نے کہا۔ ”ندیا اس کے برابر ہی کھڑی تھی۔ شاپ کے باہر چھوٹے سے لان میں رکھی چیز ز اور ٹیبل میں سے ایک کے پاس وہ کھڑے تھے۔ وہ دیکھ کر آنس کریم کا کہہ کر ندیا کے لیے چیز ہٹا رہا تھا کہ ندیا کی مدھم سی آواز سنائی دی اور شاہ میر کو آواز کچھ بڑی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُفتی کی سرخی پیلا ہٹ میں بدل چکی تھی اور ندیا کی رنگت اس سے کہیں زیادہ زرد ہو رہی تھی۔

”کیا ہوا ندیا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ شاہ میر پریشان ہو گیا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اس کے پیچھے چھپنا چاہ رہی ہو۔  
”پلیز ندیا کیا ہوا ہے آپ کو؟“ وہ اس کے پایے پر گھبرا گیا تھا۔

”کچھ نہیں، پلیز گھر چلتے ہیں۔“ وہ سہمی نظروں سے شاپ کے سامنے بے تحریک پر دیکھتے ہوئے بولی۔ شاہ میر نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور ندیا کی پریشانی کی ساری وجہ سمجھ گیا۔ جب میں بڑی عجیب سی مشکل کا آدمی بیٹھا تھا۔ لال چمکتی آنکھیں فاصلے سے بھی واضح نظر آ رہی تھیں۔ اور خوف کا بڑی بڑی بل گمانی موچیں، ندیا شاید اسے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ شاہ میر پر لب مسکرایا۔ لڑکے کو دو کارڈیو اور اور ایک پیک لانے لگا۔ پیک پر منٹ کر کے وہ واپس ہو لیے۔ ندیا بار بار مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

”اگر آپ کو کوئی پر اہلم ہے تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔“ راستے میں اس نے ندیا سے کہا۔

”نہیں، نہیں پر اہلم تو کوئی نہیں ہے۔ مغرب ہو گئی۔“ اس لیے پریشان ہوں دادو جان انتظار کر رہی ہیں۔“ اس نے فصول سا بہانہ بنایا۔ حالانکہ پریشانی

اس کے چہرے پر کوئی اور داستان سنار ہی تھی۔  
”جیسے آپ کی مرضی۔“ شاہ میر نے کندھے اچکائے۔

”آپ یہ لے جائے مجھے کالنگ کارڈ خریدنا تھا یا وہی نہیں رہا۔ میں نے کراچی آتا ہوں۔“ گیٹ پر پہنچ کر شاہ میر نے شاپرندیا کو کھتایا۔ دادو اور آبی مغرب کی قرینچ میں رکھی۔ وضو کر کے وہ نماز کے لیے کھڑی ہوئی تھی کہ فون کی بیل بجلی جانماز کا کونا موڑ کر وہ لاؤنج میں آئی۔

”ہیلو۔“  
”مس ندیا ابھی شاپ پر آپ کے ساتھ کون تھا؟“ دوسری طرف کی گرجدار آواز نے اسے سہا کر رکھ دیا۔

”دیکھیے شاہ نواز صاحب میری زندگی میں دخل مت دیجیے۔ آپ کے لیے اچھا نہیں ہوگا اور جو کوئی بھی ہے آپ کو مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ..... میرے فیاسی ہیں اور اگر دوبارہ آپ نے مجھے ڈسٹرب کیا تو بہت برا ہوگا آپ کے لیے اور آپ.....“

”مس ندیا میرا نام چوہدری شاہ نواز خان ہے اور چوہدری شاہ نواز جو چیز ایک بار پسند کر لے وہ اس کی ہو جاتی ہے۔ دیکھ لوں گا آپ کے فیاسی کو۔“ ندیا میں نہ جاننا تھی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ اس نے بڑے غصے سے چوہدری شاہ نواز کو جواب دیا تھا لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شاہ نواز نے پہنچ دیتے لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ ”اوہ میں نے یہ کیا کر دیا۔“ ندیا کی نظروں میں وہ جپ والا شخص آ گیا۔ ”نہیں وہی تو..... اے اللہ مجھے اس مشکل سے نکال، میری مدد کر۔“ نماز پڑھ کر وہ بڑی عاجزی سے رو کر دعا مانگ رہی تھی۔

☆☆☆

ماما، دادو اور آذر کی بے تحاشا فون کالز پر آخر کار

رہا۔ دل کو سمجھ نہیں پاری تھی۔ کل اس کے جانے کی خبر پر وہ اپنے دل کو یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس کے جانے پر بہت خوش ہے مگر دل کے اندر کہیں کسی کونے میں کچھ اور تھا۔ کوئی اور بات تھی جسے وہ سمجھ نہیں پاری تھی۔ کتاب کے گڈنڈ ہوئے لفظوں پر نظر بس جمائے وہ انجانے میں شاہ میر کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

”کیا ہم دوستی نہیں کر سکتے؟“ شاہ میر دادو کے کمرے میں جاتے جاتے اسے یوں کھوئے ہوئے بیٹھا دیکھ کر اس کے سامنے آ بیٹھا۔

”جی..... کیا کہا آپ نے؟“ وہ خیالوں سے چوٹکی۔

”میں نے کہا، کیا ہم دوستی نہیں کر سکتے؟“ شاہ میر نے پھر سے جملہ دہرایا۔

”دوستی اور آپ سے.....؟“ کتاب کے گلابی صفحوں پر ایک تصویر ابھری تھی۔ اس نے کتاب بند کر کے شاہ میر کو دیکھا۔ ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ ضرورت کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بنایا جاسکتا ہے۔ اسے اپنا لکھنا دل یاد آیا جس میں ہیروں نے دن سے بچنے کے لیے اپنے کزن کو اپنا فیاسی ظاہر کیا تھا۔

”ہاں، کیوں نہیں، بالکل ہو سکتی ہے۔“ انکار کرتے کرتے وہ اقرار کر گئی۔

”مجھے پتا تھا آپ ضرور دوستی کر لیں گی۔“ شاہ میر مسکرا کر بولا اور ندیا اس کے پریقین لہجے پر چل کر رہ گئی۔

”آپ مجھے بتائیں کہ میرے علاوہ آپ کی کتنی دوست ہیں؟“ شاہ میر نے پوچھا۔

”دو ہیں۔“ ندیا نے جوابا کہا۔

”اچھا کیا کرتی ہیں؟“ شاہ میر نے جیسے انٹرویو کا آغاز کیا۔

”پڑھتی ہیں۔“ ندیا نے کہا۔

”کیا پڑھتی ہیں؟“ وہ وہیل کی طرح جرح کرنے لگا تھا۔

”ایک ایم بی اے کر رہی ہے اور دوسری ایم بی بی ایس۔“ ندیا نے ان کی شاندار تعلیم بیان کر کے ان کے



شاہ میر نے ایک ہفتے کے بعد واپسی کا رخت سفر باندھ ہی لیا۔ دادو اور آپ کو تو ایک ہی ہفتے میں اس نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ وہ دونوں اس کی واپسی پر بہت اداس تھیں۔ وہ خود بھی تو بہت افسردہ تھا مگر اس کا دل کسی اور کے چہرے پر ادا ہی دیکھنے کا خواہش مند تھا مگر اسے بڑی مایوسی ہوئی وہاں تو اطمینان ہی اطمینان تھا۔ البتہ وہ خلاف معمول چپ بھی اس نے کوئی یا طنزیہ بات بھی نہیں کی تھی۔ شاہ میر کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

”میں پھر آؤں گا۔“ ایک فقرہ چپکے سے شاہ میر کے لبوں سے نکلا تھا اور اس نے دنیا کی آنکھوں میں انتظار کا ستارہ بن کر چمکتے دیکھا تھا۔ گھر میں اس کے لیے ایک بمبائٹک نوز مختصر تھی جس نے سارے ستارے ریزہ ریزہ کر دیے تھے۔

”ہم نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔“ وہ صبح گھر پہنچا تھا اور سارا دن سو کر گزارا تھا۔ شام کو چائے پر خاصا اہتمام تھا۔ چائے پی کر اس کا ارادہ آذری طرف جانے کا تھا۔ ماما کے جملے پر سب کچھ بھول گیا۔

”کیا.....؟“ وہ حیرت سے مجسمہ ہی تو بن گیا۔ ”یعنی آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔“ اس نے کپ میز پر پٹخا۔ محبت کی ناؤ ڈوبتی نظر آ رہی تھی۔ پہلے تو محبت ہو ہی نہیں رہی تھی اور اب اگر کچھ بات بنتی نظر آ رہی تھی تو اس کے پانے کی راہیں مسدود کی جا رہی تھیں۔ ابھی دن میں ہی تو خواب میں اسے دنیا نظر آئی تھی اور ماما تیسرے پہلے ہی خواب توڑ رہی تھیں۔

”تم سے کیا پوچھتی ہمیشہ کی طرح انکار کر دیتے۔“ ان کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ”لیکن ماما میں کوئی لڑکی نہیں ہوں۔“ اس نے جیسے کوئی نئی اطلاع دی۔

”تو پھر.....؟“ انہوں نے جیکھی نظروں سے دیکھا۔

”تو یہ کہ میں اب انکار کروں گا۔ خود ہی جائے گا بارات لے کر۔“ اس کے اکھڑے لہجے پر وہ بھی غصے میں آ گئیں۔

”شاہ میر بہت بدتمیز ہو گئے ہوتے۔ بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔“ ان کے تپتے موڈ کو دیکھ کر وہ جھجک کر بڑھ گیا۔

”ماما آپ ردا کی شادی کر دیں۔“ ”تم سے پوچھ کر نہیں کروں گی۔ تم اپنی تیاری کرو۔ فروری کی چھٹیس طے کی ہے صرف ایک مہینہ بڑھ گیا ہے۔“ ”مجھے نہیں کرنی شادی۔“ کرسی کو کھوکھار کر وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

”شادی تو تم کرو گے چھٹیس تاریخ کو اور وہاں ہی جہاں ہم نے طے کی ہے۔“

”ماما آپ کچھ بھی کر لیں میں شادی نہیں کروں گا۔“ ان کے فیصلہ خوں نے پروہ چڑ گیا۔

”کیسے نہیں کرو گے۔ بات کرتی ہوں تمہارے باپ سے۔“ نکیل ڈالیں اپنے لاؤ لے۔ ذرا تمیز نہیں بات کرنے کی۔ ماں سے بحث کرنے لگا ہے۔“ غصے سے تیز آواز میں کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئیں۔ بابا کا حوالہ سن کر وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ ماما، بابا کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کر سکیں اور فیصلہ حسب معمول اس کے خلاف ہو جاتا اور وہ ہمیشہ کی طرح ”لیکن بابا“ جیسے وہ لفظ احتجاج کے طور پر استعمال کر کے مقدمہ ہار جاتا اس نے فوراً اپنے وکیل صفائی آذری کوون کیا۔ اور وکیل صفائی بوتل کے جن کی طرح حاضر تھا۔

شاہ میر نے تمام حالات و واقعات آذری کے گوش گزار کر کے اسے ماما کو راضی کرنے بھیجا اور خود ساری کارروائی سننے کے لیے دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دلائل و بیانات کی بھرپور آوازیں گونجتی رہیں اور پھر نیکلت خاموشی چھا گئی جیسے اندر کوئی ہو ہی نہ۔ اس نے حیرت سے دروازے کو دیکھا مگر جن تو تھا نہیں کہ دروازے کے پار بھی دیکھ لیتا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ کان کو انگلی سے خوب ہلایا اور پھر سننے کی کوشش کی۔ سرگوشیاں اور دل کی ہنسی سنائی دی مگر بات کیا تھی سمجھ نہ آئی۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور شاہ میر گرتے گرتے پچھا تھا آذری چمکتا دیکھا چہرہ لیے باہر نکلا۔ شاہ میر کے پاس سے یوں

غز کیا جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ نہایت اسٹائل سے موٹے پر بیٹھ گیا۔ شاہ میر یوں نظر انداز کیے جانے پر غلام گیا مگر وقت کا تقاضا تھا کہ گدھے کو باپ بنا لیا۔

”کیا فیصلہ ہوا.....؟“ آذری کے قریب آ کر اس نے بے تابانی سے پوچھا۔ جواب میں آذری بڑی ادا سے کھڑکیا کر اس کے سفید دانت بنگا گئے۔

”وہ نہیں مان رہے؟“ شاہ میر کو آگ لگ گئی۔ ”اس لیے یہ بیٹی نکل رہی ہے۔“ وہ غصے میں آذری پر چڑھ دوڑا۔

”دیکھو میرے بھائی، ماں باپ کی بات مان لو۔“ ”تمہیں اس لیے نہیں بلایا کہ تم مجھے نصیحتیں کرنے لگو۔“ وہ چیخ کر بولا۔ جواب میں آذری کے چہرے پر دہی مسکراہٹ تھی۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو شاہ میر کو

چمکنے پر مجبور کرے گی۔ ایسی خوبصورت مسکراہٹ آنکھوں سے پچھ پالنے کی خوشی جھلک رہی تھی۔ ”تمہیں کیا کوئی قانون کا خزانہ مل گیا ہے جو یوں دھچ پیٹ کا اشتہار بن رہے ہو۔“ شاہ میر نے چڑ کر

”یہی سمجھ لو۔“ مسکراہٹ بدستوریوں پر تھی۔ ”دیکھو سیدھی سیدھی بات کرو ورنہ سارے دانت زردوں گا۔“ شاہ میر کو غصہ آنے لگا تھا۔

”یہ تمہاری ان کی تصویر ہے۔ اتنی خوبصورت کہ کہتے ہی بے ہوش ہو جاؤ گے۔“ آذری نے کوٹ کی جب سے تصویر نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے رکھی۔

”مجھے نہیں دیکھنی۔“ احتجاجاً اس نے آنکھیں سختی سے بند کر لیں مگر ایک جھٹک آنکھوں میں آن گئی تھی۔

”کیا یہ.....؟“ وہ واقعی بے ہوش ہونے کو لگا۔ ”ہاں.....“ آذری نے کہا ہے کہ تصویر دکھا کر تمہاری آنکھوں میں آنکھیں پلندہ نہیں تو وہ انکار کر دیں گی۔ انکار آ ل انہیں اپنا ہونہار سپوت ساری دنیا سے عزیز

ہے۔“ اس نے سارے جملے میں انکار پر زور دیا۔ شاہ میر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بولا۔

”نہیں، نہیں میں بھلا ماما کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں۔ میں تو مشرقی لڑکا ہوں جو ماں باپ نہیں چپ چاپ مان لوں گا۔“ ڈیلمیسی کی اہمیت آج واضح ہوئی تھی۔

”تمہاری“ ”ہاں“ تو میں آئی تک پہنچا دوں گا مگر پہلے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“ آذری بولا۔

”ایک کام میں تو ساری عمر تمہاری غلامی پر تیار ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔ اصل میں تمہیں میرے لیے بات کرنی ہے۔“ آذری لڑکیوں کی طرح شرمایا۔

”تمہارے لیے بات مگر کیا.....؟“ شاہ میر نے حیرت سے پوچھا۔

”بہت کھانا شخص ہے صرف اپنی مطلب کی بات سمجھ آتی ہے۔ اس کے لیے۔“ آذری نے تصویر ایک بار پھر اس کے سامنے کی۔ دنیا کے ساتھ چمکتے چہرے والی آپلی تھیں۔

”یہ سبھی ہے جس کی تلاش میں آٹھ سال سے کر رہا ہوں۔“ آذری کی بات پر شاہ میر خوشی سے چیخ پڑا۔

”ساری بات سمجھ آ گئی۔“ شاہ میر آذری سے لپٹ گیا تھا۔

”آپلی وہ لڑکی ہیں اور تم میرے ہونے والے آپا.....“ شاہ میر کچھ کہتے کہتے رگ گیا۔

”اُردو لٹریچر رکھ کر بھی تم مذکر مونث کے ایسے صنیں بولو گے۔“ اس کے آپا کہنے پر آذری بے ساختہ ہنسا تھا۔

”میرا مطلب تھا کہ ہم دونوں ایک ہی گھر جائیں گے۔“ خجالت سے سر جھکاتے ہوئے پھر بولا۔

”ہم دونوں نہیں..... وہ دونوں ایک گھر میں آئیں گی۔“ آذری نے پھر صبح کی۔

”وہی، وہی اچھا زیادہ مؤدب بننے کی ضرورت نہیں۔ یاد کرو میں نے کہا تھا کہ میری محبت سے زیادہ خوشی تمہیں ہی ہوگی، کیا تاجی جملہ تھا۔“ شاہ میر نے یاد



”یہ تو ج ہے۔“ آذر نے اعتراف کیا۔ زندگی نے اس کے گرد خوشیوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔

☆☆☆

تمہیں کیسے بتا دوں تم میری منزل ہو جنہیں دیکھا تھا نظروں نے وہی معصوم سادل ہو عالمگیر کی شوق و شنگ آواز پورے کمرے میں بکھر رہی تھی۔ اس نے پنوں کی مدد سے سر پر نگائے بھاری بھر کم کا مدار روپنے کی اوٹ سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ردا آئی اور ڈھیروں خواتین کا ہجوم ابھی ابھی اس کے کمرے سے نکلا تھا اور ان سب کے جانے پر اس نے کئی گھنٹوں بعد اب سکون کا سانس لیا تھا۔ نیوب لائٹ کی روشنی میں ہر چیز جگمگا رہی تھی۔ بڑا خوبانہ ماحول تھا۔ ڈارک براؤن گلر کا کارپٹ وال ٹو وال بچھا تھا۔ دیواروں پر لائٹ براؤن پینٹ کیا گیا تھا اور دیواروں پر جا بجا گلاب کے سرخ و سفید پھول چپاں کیے گئے تھے۔ بیڈ پر سفید بیڈ شیٹ تھی۔ جس پر گلاب کی پتیوں سے دائرہ بنایا گیا تھا۔ بیڈ کے دائیں طرف دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل تھی اور ساتھ ہی کمپیوٹر رکھا تھا۔ اس کی نظریں پھر ڈریسنگ ٹیبل پر آجی گئیں۔ آئینے میں اس کا عکس واضح تھا۔ ڈارک میرون اور گولڈن لہنگا چوٹی، نفیس طلائی زیورات اور مہارت سے کیے گئے میک اپ نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ یہ سب اتنی جلدی ہو گیا تھا کہ اسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاہ میر کی واپسی کے ٹھیک تین دن بعد اس کی امی اور دروا، انگل رضا کے ساتھ اس کے لیے شاہ میر کا رشتہ لائے جسے دادو اور آبی نے باہم مشورے سے نہ صرف فوراً منظور کر لیا بلکہ تاریخ بھی طے کر دی گئی تھی۔ یعنی فروری کی پچیس اور آج ٹھیک ایک ماہ بعد ندیا احمد خان، ندیا شاہ میر بن کر یہاں آچکی تھی۔ وہ بھی ابھی اتنی جلد شادی پر راضی نہ ہوئی اگرچہ پوری شاہنواز نے اس کی زندگی میں بے سکونی نہ پیدا کر دی ہوئی۔ اس نے دل کھول کر دل ہی دل میں چوہدری شاہنواز کو گالیوں سے نوازنا تھا۔ ”آبی کتنی خوبصورت لگ رہی تھیں اور آذر بھائی کتنی

شاندار پر سنائی کے مالک ہیں۔“ آبی کے خیال پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ رہی کچھ لمبی کچھ پالینے کی خوشی بھروسہ بن کر ان کے ماتھے پر چمکی تھی۔ آنکھوں میں خواب کی تعبیروں کی روشنی تھی۔ ”یا اللہ! آبی..... ہمیشہ خوش رہیں۔“ ندیا نے سچے دل سے دعا کی۔ دادو کے بارے میں وہ بہت فکر مند تھی مگر اب ٹلی ہوئی تھی کہ آذر بھائی اور ان کی امی نے دادو کو اپنے ساتھ انگلینڈ جانے پر راضی کر لیا تھا۔

مبارک ہو تم کو یہ شادی تمہاری سدا خوش رہو تم دعا ہے ہماری دوسرا کا شروع ہو چکا تھا۔ وہ اپنے خیالوں سے چوکی۔ کمرے میں انہیں فون کی بیل گونج رہی تھی۔ اس نے متلاشی نظروں سے کمرے میں دیکھا۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر سی ایل آئی سیٹ رکھا تھا۔ ٹیلر مسلسل ہو رہی تھی۔ موبائل کا نمبر تھا۔

”ہیلو.....!“ ندیا نے ذرا پیچھے کھسک کر ریسیور اٹھایا۔

”مس ندیا تم نے اچھا نہیں کیا یہ۔ میں ایک ہفتے کے لیے امریکا گیا تھا تم نے نگاہیں ہی بدل لیں لیکن دیکھ لو میں بھی اس وقت تمہارے گھر میں موجود ہوں اور تمہارے اس دولہا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں ابھی آ رہا ہوں تمہارے پاس۔“ جواب میں بھاری بھر کم ڈرا دیئے والی آواز تھی۔ ندیا کے ہوش و حواس جیسے ساتھ چھوڑ گئے ہوں۔ ہلدی کے مانند زرد رنگت اور خود وہ خزاں رسیدہ پتے کے مانند کاپٹے لگی تھی۔ آنے والے لمحوں میں جو قیامت اٹھتی تھی اس نے اس کے ذہن کو منجمد کر دیا تھا۔ دھماکے سے ٹھٹھنے والے دروازے نے اس کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ قیامت خیز لمحوں سے بچنے کے لیے اس نے دونوں ماتھوں سے ہچرہ ڈھانپ لیا۔

”یہ چوہدری شاہنواز خان کون ہے؟“ اس کے قریب سے ایک ٹوک دار آواز ابھری۔ ندیا نے جھٹ سے ماتھ ہٹائے۔ اس کے بالکل قریب شاہ میر کھڑا تھا۔ لائٹ گولڈن راسک کی کام والی شیر وانی اس پر خوب ج

ی تھی۔ گھنیرے بال، چوڑی پیشانی، ہلکے گلابی بھرے ہونٹ اور سب سے بڑھ کر اس کی ہیزل براؤن آنکھیں۔

”ندیا! شاہ میر تو بہت ہینڈسم ہے۔“

”واہ بھئی دو لمبے پرتو دہنوں والا روپ آیا ہے۔“ ”چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔“ ندیا کی آنکھوں نے ندیا کے کان میں کئی سرگوشیاں کی تھیں مگر شاہ میر کی آنکھوں میں غصے کی اتنی آمیزش تھی کہ وہ ایک بل بھی اس کی طرف نہیں دیکھ پائی تھی۔ سانس لینے کو آستین کم پڑنے لگی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ابھی اس رک جائے گا۔

”میں نہیں جانتی۔“ وہ جیسے کسی کنویں سے بولی۔

”رہا شاہ میر کو اس میں ندیا پر بے پناہ پیار آیا۔“

”جانتی تو تم ہو...! شاہ میر اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر اسے ترس آنے لگا۔

”تمہیں میں نہیں جانتی۔“ اس نے پُر زور تردید سے ہار ہلایا اور حیرت سے شاہ میر کی طرف دیکھا کیونکہ اب کے بار اس کے لہجے میں ذرا غصہ نہیں تھا بلکہ اسے کس طرح اطمینان محسوس ہوا تھا۔

”جانتی نہیں ہو تو پھر شادی کیوں کی؟“ وہ اس کی بات سے محفوظ ہوا۔ مسکراتی آنکھوں کا ساتھ لب بھی

”شادی!“ ندیا نے زیر لب دہرایا وہ کچھ کچھ ہنس پاری تھی۔ ڈر، خوف کی جگہ اب حیرت اس کی ہون میں بکھوڑے لے رہی تھی۔

”ڈیر واقف، اصل میں آپ کے سر تاج شاہ میر اب ہی عرف عام میں چوہدری شاہنواز خان ”شاہ میر“ نے سر جھکا کر کہا۔ ایک بل کو تو ندیا کی آنکھیں کچھ نہیں آیا تھا۔ بات کا اندازہ کچھ کچھ ہو گیا تھا۔

”اب ذہن نے ساری بات واضح کی تو وہ ایک دم چیخ ”کیا...؟ آپ... آپ... چوہدری شاہ میر...“ غصے میں وہ پوری بات نہیں کر پاری تھی۔ شاہ

میر اس کی بلند وبالا چیخ پر گھبرا کر اس کی طرف بڑھا۔ ”کیا کر رہی ہو۔ آہستہ بولو سب لوگ جمع ہو جائیں گے کہ دولہا کے سر پر ہیگ تو نہیں لکل آئے جو دہن صاحبہ یوں چلا رہی ہیں۔“ شاہ میر نے غصے سے لال ہوتی ندیا کو ٹھنڈا کرنا چاہا مگر وہ تو اس وقت بالکل آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی تھی۔

”تمہیں ہوں گے اکٹھا تو میں خود سب کو بلاؤں گی۔“ انتہائی غصے میں کہتی ہوئی وہ دروازے کی طرف دوڑی۔ شاہ میر چھلانگ لگا کر اس سے پہلے دروازے کے پاس جا پہنچا تھا۔

”دیکھو ندیا... پلیز میری بات تو سنو...“ ندیا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

”تمہیں سننا مجھے کچھ بھی، ہٹ جائیں میرے راستے سے میں سب کو بتاؤں گی۔“ اپنی اتنی پریشانی اور ذہنی کوفت کا سوچ کر ندیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”دیکھو ندیا، میں نے سوچا اگر مجھ سے تمہاری شادی ہو جائے تو تمہیں یونیورسٹی میں ایڈمٹن مل جائے گا۔“ اپنی دانست میں شاہ میر نے بہت بڑا جواز پیش کیا۔

”مری نہیں جاری تھی میں یونیورسٹی میں ایڈمٹن کے لیے۔“ شاہ میر کے انتہائی بودے جواز پر اسے آگ ہی تو لگ گئی پھر وہ وہ مڑی روانی سے رونے لگی۔ ”مری اتنی دور... لیکن کوئی بات نہیں اگر تم کہو تو میں تمہیں مری میں بھی ایڈمٹن دلوا دوں گا لیکن پلیز تم خاموش ہو جاؤ۔“ اس قسم کی صورت حال سے پہلی دفعہ واسطہ پڑ رہا تھا اور شاہ میر کو کچھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اسے کس طرح ہینڈل کرے۔

”فصلوں باتیں مت کریں میرے ساتھ۔ میں ابھی آئی، انگل کو بتاؤں گی اتنا بڑا دھوکا کیا ہے آپ نے میرے ساتھ۔“ اوپنی آواز میں واضح دھمکی دی۔ ”تمہیں آگے سے... ندیا نے شاہ میر کا بازو پکڑ کر ہٹانا چاہا مگر ایک چھٹ کو تو جوان اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ وہ اسے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہ کر سکی۔



## دیا جلائے رکھنا

کے بغیر سو نہیں سکتی تھی۔ اور لیس کے کپڑے صوفے پر پڑے تھے۔ موزے قالین پر، والٹ اور بے شمار کندات ڈرینگ ٹیبل پر۔ اور لیس میں ذرا بھی سلیقہ نہیں تھا۔ ان کے آفس سے آتے ہی اچھا خاصا سجا

نتاشا کو فیڈ روے کر اس نے رضا کا یونی فارم اور لیس کے آفس جانے والے کپڑے استری کر کے پھر لٹکائے۔ سارا کمر اکھرا ہوا تھا وہ بہت تھک چکی تھی پھر بھی اپنی عادت سے مجبور تھی کہ کمرے کو صاف

### نگہت اعظمی



”یعنی صلح ہو گئی۔“ شاہ میر نے رسالہ پھر کھڑوس

پر اچھال دیا اور خوشی سے بولا۔

”جی نہیں، ناول کا اینڈ یہ نہیں تھا۔“ وہ کہتی ہوئی پھر جا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”لیکن ہماری زندگی کے ناول میں اینڈ صلح ہی ہو گا۔“ کہتا ہوا وہ بھی اس کے پیچھے بیڈ روم میں آ گیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ندیا کے چہرے پر نظر ڈال کر اس نے اچانک ہنسنا شروع کر دیا۔

”اب کیا مصیبت ہے؟“ شاہ میر کو اس طرح ہنسنے دیکھ کر وہ جھجلا اٹھی۔ اس نے بے دلی سے اپنے پر نظر ڈالی مگر اپنے نظر آتے عکس کو دیکھ کر وہ بھی ہنسنے پر مجبور ہو گئی۔ رونے کی وجہ سے کاہل پھیل کر گالوں تک آ چکا تھا اور آنسو ہاتھوں کی تھیلیوں سے صاف کرنے سے کاہل، بٹش آن اور آئی شیدو کس ہو کر ایک نئے رنگ کی شکل میں پورے چہرے پر پھیل چکے تھے۔ صرف اب اس تک بھی جو قدرے بہتر حالت میں تھی۔

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔“ ندیا مصنوعی ناراضی سے منہ پھلا کر بولی۔ بیڈ پر کھڑی گلاب کی پتیوں میں سمیٹ کر اس نے شاہ میر پر اچھال دیں اور شاہ میر نے ان پتیوں کی جھک اپنی سانچوں میں اتار لی۔ ندیا منہ دھو کر آ چکی تھی۔ اس کا گلابی حسن شبنم میں نہانے پا کیزہ پھول کے مانند لگ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ بڑی دلیری سے شاہ میر سے لڑ رہی تھی اور اب اسے شاہ میر سے ڈیروں شرم آ رہی تھی۔ مارے گھبراہٹ کے اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ طلائی اور نازک کالج کی چوڑیوں کی جلتنگ بچ آئیں۔ اسی جلتنگ میں شاہ میر اور ندیا کی خوشبو کی کھنک اور گلابوں کی مہک بھی شامل تھی۔



اگلا لمحہ اس کے لیے بہت حیرت ناک تھا۔ ”خاموش ہو جاؤ۔ اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو گلا دبا دوں گا۔“ اس نے شاہ میر کو ہمیشہ مسکرا کر نرمی سے بات کرتے دیکھا تھا اور اب جو اچانک وہ انتہائی غصے میں شیر کے مانند دھاڑا، وہ جہاں تھی وہیں سہم کر رہ گئی۔

”شاہ میر آپ.....“ سہمے ہوئے لہجے اور بے یقینی آنکھوں میں لیے اس نے کچھ کہنا چاہا مگر شاہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”سنائیں تم نے خاموش رہو، کسی نے تمہیں شوہر کی عزت کرنا نہیں سکھائی۔ آگے سے زبان چلائے جارہی ہو۔“ غصے سے جھپکی آنکھیں اور دل دہلا دینا والا لہجہ۔ ”چلو بیڈ پر بیٹھو جا کر۔“ وارکاری گر ہوتا دیکھ کر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”سنائیں تم نے؟“ ندیا کو اسی جگہ حیرت سے پتہ بنا کھڑا دیکھ کر وہ پھر گر جا۔ ندیا نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔

”خاموش بیٹھی رہو یہاں، میں ابھی آتا ہوں اگر ذرا سا بھی شور کیا تو نتائج کی ڈتے دار تم خود ہو گی۔“ سختی سے کہتا ہوا وہ بیڈ روم سے ملحقہ ڈرینگ روم میں گھس گیا۔ ندیا کے ذہن میں خیال لپکا وہ دبے پاؤں چل کر ڈرینگ روم کے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ ”ارے کہاں گیا۔“ یہیں تو رکھا تھا میں نے کہیں روانہ لے گئی ہو۔“ کپڑوں کے ڈھیر میں وہ کچھ تلاش کر رہا تھا۔ آخر اسے مطلوبہ شے مل ہی گئی۔ اس ماہ کا ڈائجسٹ اس کے ہاتھ میں تھا اسے جھٹ سے کھولا اور مطلوبہ صفحہ کھولنے لگا۔ ندیا کی طرف اس کی پشت تھی۔ ”اس کے بعد ہیرو نے کہا تھا کہ.....“ ندیا کی آواز پشت پر سن کر وہ جھٹکے سے پلٹا اور ڈائجسٹ والا ہاتھ اپنے پیچھے کر لیا۔

”کیا مطلب.....؟“ شاہ میر نے اپنے لہجے میں غصہ سمونے کی ناکام کوشش کی۔

”مطلب یہ کہ یہ ناول میں نے لکھا ہے اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔“ ندیا نے کچھ نکلی اور کچھ غصے میں جواب دیا۔



سنو راہوا کرا کھاڑ خانہ بن جاتا۔ کل رضا کا ٹیٹ تھا۔ اس کا بیک کھلا ہوا تھا اور ساری کتابیں، کاپیاں بیڈ پر بکھری پڑی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے ٹیٹ کی تیاری کی تھی، وہ دن میں سو یا نہیں تھا اس لیے اس وقت اسے شدید نیند آ رہی تھی۔ ناشائذ رہتے ہی سوچتی تھی۔

دونوں بچوں کے سونے کے بعد اس نے کمرے کی صفائی شروع کی۔ بیڈ پر بکھری ہوئی کتابیں، کاپیاں سمیٹ کر بیک میں ڈالیں۔ اور بیس کے کپڑے اور موزے ملے کپڑوں کی جالی میں رکھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی چیزیں کو میٹھا، ناشاد و سال کی ہونے والی تھی۔ اسے کیمیکس کی چیزوں سے بڑا عشق تھا۔ ڈراما مونیع ملتا وہ ساری چیزیں بھیر دیتی۔ حالانکہ اب تو اس نے میک اپ کی بیشتر چیزیں اندر رکھ دی تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کو صاف کرتے ہوئے نظر آئینے پر پڑی اور آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر اس کا دل ڈول گیا۔ ایک عجیب سا احساس زیاں اس کے اندر سراپت کر گیا۔

”یہ میں ہوں۔“ آئینہ حقیقت بیان کر رہا تھا۔ ”سناؤ لارنگ، فریبی مائل جسم، چھوٹا قد، بھرے ہوئے بال، گتے کپڑے۔“ بھالی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ میں اپنے آپ پر بالکل توجہ نہیں دیتی تھی تو میں اور بیس کے مقابلے میں کتنی بڑی بڑی لگنے لگی ہوں۔ اور بیس تو اب بھی کتنے اسٹارٹ اور فریش ہیں اور اسی لیے شاید..... اس کے دل میں کہیں کا غنا سا چھپا۔ وہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔

شادی سے پہلے وہ کتنی ویل ڈریسڈ تھی۔ اپنے آپ کو کتنا مین ٹین کر رہی تھی۔ سانو لے اور چھوٹے قد کے باوجود اس کی شخصیت بے حد جاذبہ نظر تھی لیکن اب تو ایسا لگتا تھا جیسے اسے کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ ہر وقت کام، کام اور صرف کام۔ وہ کھوکھو کے ٹیل کی طرح صبح سے شام تک کام میں جتی رہتی۔ صبح جیسے تیسے تیار ہو کر بینک جاتی۔ گھر سے نکلنے نکلنے ہزاروں کام جان پر سوار ہوتے۔ بھی کام کرنے والی اماں جی کو دوپہر کے کھانے کی ہدایت دیتا۔ کبھی اور بیس کو کسی کام

کے بارے میں بتاتا۔ کبھی گھر سے نکلنے ہوئے ناشائذ کرنے لگتی۔ اپنی گاڑی وہ خود ڈرائیو کرتی تھی۔ گاڑی کے نکالنے سے پہلے اس کا پانی و آئل چیک کرنا۔ اکثر راستے سے گیس بھی ڈھلوانی پڑتی۔ گھر سے بینک جاتے ہوئے تو راستے میں ٹریفک کا زیادہ رش نہیں ہوتا تھا کیونکہ اسے نوبے بینک پہنچنا ہوتا تھا لیکن وہ اپنی میں اتنا رش ہوتا کہ اسے گھر آتے آتے پورا ایک گھنٹا لگ جاتا۔ وہ عام طور پر چہرے تک ہی گھر پہنچ پاتی تھی، پھر گھر پہنچتے ہی دونوں بچے اس سے لپٹ جاتے اور مستقل اسے مصروف رکھتے۔

”مما مجھے فریج فرائز بنا کر دیں۔“ کبھی رضا کی فرمائش ہوتی اور کبھی ناشائذ کرتی کہ اسے گود سے نہ اتاریں۔

اور بیس اپنا برنس کرتے تھے۔ وہ رات گئے تک گھر آتے۔ اماں جی دونوں وقت کا کھانا پکاتی تھیں اور اس کے آنے تک بچوں کو سنبھالتیں۔ جب وہ گھر آ جاتی تو وہ چلی جاتیں۔ وہ سارا دن نوکری کر کے اتنا تنگ جاتی تھی کہ اسے بچوں کو سنبھالنا بہت مشکل لگتا تھا۔ بچے اس کے بینک سے آنے کے بعد اس کی جان کو چمپے رہتے۔ اسی لیے اسے اپنے آپ پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لیے تو بازار جانا، کپڑے خریدنا، انہیں روزی کو دینا ہی جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ پارلر جا سکے اور ڈھنگ سے میئر کٹینگ کروا سکے۔ چہرے کا فیشل کروائے یا کم از کم آئی بروڈ ہی بنوائے۔ کیمیکس کا سامان ختم ہو جاتا تو خریدنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ بقر عید آنے والی تھی اور اس نے ابھی تک اپنے کپڑے نہیں بنوائے تھے۔

زندگی کتنی مصروف ہے۔ ایک لمحہ بھی اپنے لیے نہیں ملتا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر پرش اٹھایا۔ بال کتنے روکھے اور بے جان ہو رہے تھے۔ جلد بھی کی خراب ہو گئی تھی۔ پہلے وہ ہفتے میں ایک بار ضرور اپنا سے منہ صاف کرتی تھی پھر بینک سے آ کر دودھ سے ضرور منہ دھوتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے رنگ میں بے

حد چمک تھی لیکن اب تو.....؟

”میں کتنی بڑی لگنے لگی ہوں میری عمر کی ساری عورتیں مجھ سے کتنی چھوٹی نظر آتی ہیں۔“ حاصہ کی شادی کو پندرہ سال ہو گئے ہیں اور وہ آج بھی کتنی فریش اور یک لگتی ہے جب کہ میری شادی کو صرف آٹھ سال ہوئے ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے برسوں گزر گئے۔ اصل میں اور بیس کو بھی تو کوئی شوق نہیں۔ کبھی تعریف نہیں کرتے، کبھی کوئی گفت لا کر نہیں دیتے۔ انہیں تو ایک ملازمہ مل گئی ہے جو گھر میں کما کر کبھی لائے گھر کو بھی سنبھالے اور ان کے بچوں کی دیکھ بھال بھی کرے۔ اپنے آپ پر کڑھتے کڑھتے اسے اور بیس پر غصہ آنے لگا۔

”جو شوہر اپنی بیویوں کا خیال رکھتے ہیں وہ بیویاں بھی کس قدر تروتازہ اور کھلی کھلی نظر آتی ہیں اور جو بیویاں شوہروں کی بے توجہی کا شکار ہوں وہ کتنی بھیجھی اور پڑمردہ لگتی ہیں۔“ اس نے پھر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ ”میں بھی ان ہی عورتوں میں شامل ہوں جو شوہروں کی بے توجہی کا شکار ہوتی ہیں۔“

رات کے دس بج چکے تھے اور اور بیس ابھی تک بیڈ روم میں نہیں آئے۔ وہ جب آئیں سے آئے تھے کپڑے تبدیل کرنے اور پر آئے پھر شاور لے کر نیچے چلے گئے۔ فائزہ ٹی وی لاؤنج میں بی تھی۔ وہ دونوں جب سے ٹی وی لاؤنج میں باتیں کر رہے تھے۔

فائزہ اور بیس کی خالہ زاد بہن تھی۔ وہ ماں باپ کی ایکوٹی بیٹی تھی۔ جب وہ میٹرک میں تھی تو باپ کا انتقال ہو گیا۔ جب سے وہ اور اس کی ماں بغیر مردے سہارے کے تباہ رہی تھیں۔ گھر اپنا تھا جس کا ادھر کا حصہ ان لوگوں نے کرایے پر اٹھا دیا تھا۔ فائزہ نے انگلیش میں ایم اے کر کے بینک ہاؤس جوائن کر لیا تھا۔

پچھلے سال اور بیس کی خالہ کا انتقال ہو گیا تھا جس سے بعد فائزہ بالکل تباہ ہو گئی تھی۔ شروع شروع میں تو رشتے دار خواتین آ کر رہتی رہیں لیکن کوئی کب تک کس کا ساتھ دے سکتا ہے؟ پھر کچھ عرصے تک کرائے داروں کے سہارے پر رہتی رہی لیکن پھر کرائے داروں سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور ان سے گھر خالی کر دیا گیا۔ کچھ تو

فائزہ ویسے ہی زبان کی بہت تیز تھی، کچھ تباہ رہنے اور حالات کی وجہ سے اس کا مزاج تکلیف دہ حد تک اکڑ ہو گیا تھا۔ وہ کسی کا لحاظ کیے بغیر جو منہ میں آتا سنا دیتی۔ اس وجہ سے اس کی شادی بھی نہیں ہو پا رہی تھی اور گھر میں تباہ رہنے کی وجہ سے خود غرض اور مقبلی لوگ مکان کے لاؤنج میں اس کے گرد جمع رہنے لگے تھے۔

ایک دن اور بیس اپنی ماں اور فرحت کے ساتھ اس کی خیریت دریافت کرنے اس کے گھر گئے تو وہ بہت اداس اور ڈپر سیڈ تھی۔

”میرا دل چاہتا ہے میں خود کشی کر لوں۔ اس طرح کی ذلت بھری زندگی سے تو موت بہتر ہے۔“ وہ اتنی پریشان تھی کہ خالہ کے گلے لگتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ خالہ سے بہت محبت کرتی تھی جب کہ خالہ اور اس کی ماں میں ساری زندگی کبھی نہیں بنی۔ وہ اور اس کی ماں بیویوں کے لحاظ سے سارے خاندان میں سب سے خوشحال تھے جب کہ اور بیس کے والدین سفید پوش مڈل کلاس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

”تم ایسا کرو گھر کو بند کر کے کچھ دن کے لیے ہمارے یہاں چلو۔“ اور بیس کو اس کے اس طرح رونے پر بے حد دکھ ہو رہا تھا۔

”ہاں اور کیا..... اس طرح تو اکیلے رہتے رہتے تم بیمار ہو جاؤ گی۔“ فرحت نے بھی اور بیس کا اشارہ پا کر اسے گلے لگا کر کہا۔

”میرا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں رہا۔ مجھے تین دن سے بخار ہے اور کوئی اتنا نہیں جو مجھے ایک گلاس پانی ملا سکے۔“ وہ ان لوگوں کی ہمدردی پا کر اور زیادہ بکتنے لگی۔

”تم کسی کو اپنا سمجھو تو بات ہے۔ میں نے تو آپا کے چہلم کے دوسرے دن ہی تم سے کہا تھا کہ ہمارے ساتھ چلو گھر تم راضی نہیں ہوئیں۔“ اور بیس کی امی کو بہو کے سامنے فائزہ کی باتیں کچھ اچھی نہیں لگیں اسی لیے انہوں نے انتہائی صاف گوئی سے اسے ہی مورد الزام ٹھہرایا۔

”خالہ امی آپ کو تو معلوم ہے اس وقت پاپا کے



سارے رشتے دار جمع تھے، میں کیسے ان سب کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ جاسکتی تھی۔“ فائزہ نے اپنی صفائی پیش کی۔

”یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو اس وقت تو تمہارا جانا مناسب نہیں تھا لیکن اب تمہارا اس طرح اکیلے رہنا بھی مناسب نہیں۔ تم ایک دو روز میں اچھی طرح سوچ لو۔ ابھی فی الحال امی تمہارے پاس رہیں گی۔ میں اور فرحت روزانہ آتے رہیں گے۔“ اور لیس نے مشورہ دیا۔

”میرا خیال ہے اس گھر کو کرائے پر اٹھا دیا جائے اور تم ہمارے ساتھ رہو۔“ فرحت نے ایک دم ہی وہ بات کہہ دی جو امی اور اور لیس کہنا تو چاہ رہے تھے مگر کہہ نہیں پارہے تھے۔

”میں ابھی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نہیں سمجھتی کہ میرا اس طرح آپ کے گھر میں رہنا مناسب ہوگا۔“ فائزہ کو یہ سب سن کر خاصی ڈھارس سی ہوئی کہ ابھی وہ بالکل تباہ نہیں ہے۔

”اس میں نامناسب کچھ نہیں ہے۔ اس وقت خاندان میں اور لیس سے زیادہ تمہارا کوئی قریبی عزیز نہیں اور پھر میرے اور امی کے ہوتے ہوئے کسی کو کچھ بھی کہنے کی جرات نہیں ہو سکتی۔“ فرحت نے اپنی عادت کے مطابق کھل کر بات کی۔ وہ بہت صاف گو اور کھلے دل کی مالک تھی۔

”ٹھیک ہے بھابی میں سوچوں گی۔“ فائزہ نے ٹالنے والے انداز میں کہا لیکن ایک مہینے مسلسل اور لیس اور فرحت کے سمجھانے کے بعد وہ بالآخر اس بات پر راضی ہو گئی اور اپنا گھر کرائے پر اٹھا کر اور لیس کے یہاں شفٹ ہو گئی۔

فرحت نے تو یہ سب انتہائی ٹیک دلی اور ہمدردی سے کیا تھا لیکن اسے ایسا لگا جیسے ساری دنیا اس کے خلاف ہو گئی۔ سب سے پہلے تو اس کے اپنے گھر والوں نے اسے سرزنس کی۔

”کمال ہے اتنی سمجھدار ہو کر تم نے اتنی بڑی حماقت کا ثبوت دے دیا۔ بھلا ایسے بھی کوئی کرتا ہے اس

قدر خوبصورت جوان جہان لڑکی کو گھر میں رکھ لیا جب کہ تم صبح سے شام تک گھر سے باہر رہتی ہو۔“ امی نے سنا تو کھٹے بھرتک اسے پتھر دیتی رہیں۔

”زمانہ اتنا خراب ہے اور تم نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے۔“ بھابی نے بھی اپنی رائے دینی ضروری سمجھی۔

”مردوں کا کیا بھروسہ، لاکھ وہ خالہ زاد ہو لیکن بھلا کوئی غیر شادی شدہ لڑکی کو اس طرح گھر میں رکھتا ہے۔“ اس کی ساری کونکیز اس کی عقل پر ماتم کر رہی تھیں۔

”پھر میں کیا کرتی۔ ایک بن ماں باپ کی بچی کو اکیلے گھر میں چھوڑ دیتی۔“ ہر بات کے جواب میں وہ یہی کہتی۔ حالانکہ فائزہ کے آنے کے بعد اس کے گھر کے ماحول میں بڑا فرق آ گیا تھا۔ شروع کے چند دن تو اس کی دلداری میں گزر گئے۔ امی اور اور لیس اس کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تھوڑے دنوں بعد امی اور اس میں سرد جنگ جاری ہو گئی۔ دونوں ہی زبان کی تیز

تھیں۔ امی ڈاڑھا سی بات پر پرانی باتیں چھیڑ دیتیں۔ انہیں بہن سے بے شمار شکایتیں تھیں جو بہن کے مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ وہ جب بھی ان باتوں کا ذکر کرتیں فائزہ سے برداشت نہیں ہوتا۔ وہ ترکی۔ ترکی جواب دیتی جو امی کو بہت ناگوار گزرتا۔ ایسے وقتوں میں اس کی یوزیشن بڑی آکروڑ ہو جاتی، نہ وہ امی کی طرف

داری کر سکتی اور نہ فائزہ کا ساتھ دے سکتی تھی۔ وہ عام طور پر خاموش ہی رہتی۔ اور لیس، فائزہ کا بہت خیال رکھتے تھے بلکہ جب امی اور فائزہ میں بحث ہوتی تو وہ ہمیشہ فائزہ کی طرف داری کرتے۔ ابھی بھلا تو اسے اور لیس کا اتنا خیال کرتا تھا جسٹیں لگتا تھا۔

فائزہ کے اس کے گھر میں آنے کے چند ماہ بعد امی کو کبھی بیٹھے بیٹھے ہارٹ ایک ہوا اور وہ اسپتال جانے سے پہلے ہی اللہ میاں کے یہاں چلی گئیں۔ اور لیس ماں کے مرنے کے بعد بالکل ہی کم ہمو کر رہ گئے۔ ایسے وقت میں فائزہ نے ان کا بڑا ساتھ دیا۔ وہ دونوں جب بھی بیٹھے امی ہی کی باتیں کرتے رہتے اور وہ ان دونوں

کے درمیان اپنے آپ کو بے مصرف ہی سمجھنے لگتی۔ کبھی تو وہ ان کی باتوں میں شریک ہو جاتی اور کبھی صرف ان کی باتیں سنتی رہتی۔ اس کا دل عجیب عجیب سا ہونے لگا اور وہ وہیں بستر پر بیٹھ کر رونے لگی۔

”کیا بات ہے..... خیریت؟“ اور لیس کمرے میں داخل ہوئے تو اسے روتا دیکھ کر ایک دم گھبرا گئے۔

”کچھ نہیں بس ویسے ہی میرا دل گھبرا رہا تھا۔“ ”طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ اور لیس کی دجوبی پر اس کا دل ٹھہر گیا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ ”اصل میں تم ٹھیک بھی بہت جاتی ہو۔ کچھ دن کی چھٹی کر لو گھر میں آرام کرو۔“

”آج کل چھٹی کہاں ملے گی پھر ایک ہفتے بعد تو بقرعید ہے۔“ ”ہوں۔“

”فائزہ جاگ رہی ہے کیا؟“ اس نے اپنے لہجے کو ہر ممکن خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں آج وہ بہت ڈپر سڈ تھی۔ آج خالو جان کی برسی تھی۔“

”مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔“ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔

”تم تو آج پینک سے آنے کے بعد نیچے ہی نہیں اتریں۔“ اور لیس کا لہجہ خاصا اکڑا ہوا تھا۔

”کل رضا کا ٹیٹ ہے میں اس کی تیاری کروا رہی تھی۔“

”وہ فاتحہ کے لیے بریانی لے کر آئی تھی۔ اس نے تمہیں آواز میں بھی دیں لیکن تم کھانے کے لیے بھی نہیں اتریں۔“

”تو وہ مجھے آپرا کر بتا دیتی۔“ اس کے لہجے میں کئی شکایت درآئی۔

”تمہیں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، ہم اسے اپنے گھر لے کر آئے ہیں ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔“ اور لیس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں حتی الامکان کوشش کرتی ہوں کہ اسے میری

کسی بات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔“ ”میں جانتا ہوں تم بہت کشادہ دل کی مالک ہو لیکن پھر بھی کبھی کبھار تم سے زیادتی ہو جاتی ہے۔“

”ٹھیک ہے میں آئندہ خیال رکھوں گی۔“ اسے اور لیس کے اس طرح کہنے پر بہت غصہ آیا لیکن اس نے اس وقت بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور اپنی غلطی تسلیم کر کے خاموش ہو گئی۔

فائزہ جنہیں یاد ہے ایک دفعہ جب ہم لوگ ماموں صاحب کے گھر سے واپس آ رہے تھے تو امی کے پیچھے ایک بھیز لگ گئی تھی۔“ اور لیس نے کوئی پرانا قصہ چھیڑا۔

وہ سب رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ آج فائزہ نے اور لیس کی فرمائش پر نرمی سے کونفے بنائے تھے جس کی تعریف میں اور لیس زمین آسمان کے قلابے ملا چکے تھے۔

”اور لیس وہ سین بھی کوئی بھول سکتا ہے، خالہ امی دائرے کی صورت میں دوڑ رہی تھیں اور بھیران کے پیچھے پیچھے۔“ فائزہ نے بے ساختہ ہنستے ہوئے وہ واقعہ دہرایا۔ وہ دل کھول کر ہنس رہی تھی اور ہنسنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں می آ گئی تھی۔ گلابی سوٹ میں اس کی گوری چٹی رنگت دمک رہی تھی۔ اور لیس بھی ہنستے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

”اور مزے کی بات یہ کہ کوئی بھیز کر کے کئی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا اور سب ہنس رہے تھے۔“ اور لیس نے مزید لقمہ دیا۔

”بھیز والا بھیز کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ بی بی رک جاؤ یہ بھیز کچھ نہیں کہے گی۔“ ”ویسے تو امی سے چلا نہیں جاتا تھا اور اس وقت ان کی کیا اسپڈ تھی۔“ وہ دونوں اس قصے کو یاد کر کے خوب قہقہے لگا رہے تھے اور وہ کوشش کے باوجود بھی ان کی باتوں میں شامل نہیں ہو پا رہی تھی۔

”رضا ڈھنگ سے کھانا کھاؤ ورنہ میں تھپڑ مار دوں گی۔“ اس نے جھنجھلا کر رضا کو ڈانٹا تو فائزہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔



”بھابی اے بھوک نہیں ہوگی میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی اسے بیڑا بنا کر دیا تھا۔“  
”تم نے تو ماشا اللہ سے پورے بچن کا چارج ہی سنبھال لیا ہے۔“ اوریس نے پھر فائزہ کی تعریف کی۔

”میں نے کوئنگ کی کلاسز لی ہیں نا۔“  
”پھر تو ہمارے عیش ہو گئے۔ شکر ہے اماں بی کے پکائے ہوئے کھانوں سے جان چھوٹے گی۔“

”چنانچہ آپ لوگ اماں جی کے ہاتھ کے کچے ہوئے کھانے کیسے کھالیتے ہیں، ان کے ہاتھ میں تو ذرا بھی ذائقہ نہیں۔“

”کیا کریں پسند تو ہمیں بھی نہیں ہیں بس مجبوری ہے۔“ اوریس کے اس جملے پر وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اس سے پہلے تو وہ اماں جی کے پکائے ہوئے کھانوں کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔

”تمہارے ہاتھ میں بالکل امی کے ہاتھ کا سا مزہ ہے۔“ اوریس کی اس تعریف پر فائزہ کھل اٹھی اور وہ سر سے پاؤں تک سلگ کر رہ گئی۔  
”چنانچہ مجھ سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔“ کھانے کی ٹیبل صاف کرتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔

”بھابی آج اسکول میں میننگ ہے میں لیٹ آؤں گی۔ آپ اوریس سے کہہ دیجیے گا کہ مجھے لینے ہوئے آئیں۔“ فائزہ خوشبوؤں میں بسی لائٹ فیروزی کلر کا کلف لگا کر بڑے کا سوٹ پہنے بچن کے دروازے پر کھڑی تھی۔

اس نے بڑے اہتمام سے میک اپ کیا تھا اور لائٹ فیروزی جینوری پہنے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ احساس کمتری کا شکار ہوئے لگی۔

آج اس نے بینک سے چھٹی کی تھی اس لیے گھر پر ہی تھی اور گھر ہی کے کپڑوں میں ملیں تھی۔

”بھابی آپ اپنا بالکل خیال نہیں رکھیں کل میں آپ کو پارلر لے کر جاؤں گی۔“ فائزہ یہ کہہ کر آگے بڑھ

گئی اور وہ خواہ مخواہ ماسی پر برس پڑی۔  
”تم کس طرح صفائی کرتی ہو۔ دروازوں کے پیچھے دیکھو کتنے چالے لگے ہیں اور اپنا حلیہ دیکھو تمہارے کپڑے کتنے میلے ہو رہے ہیں لگتا ہے برسوں سے تم نے پانی کی غسل نہیں دیکھی۔“

”کیا کریں باجی، ایک ہفتے سے ہمارے علاقے میں پانی نہیں آ رہا ہے۔“ ماسی نے شرمندہ ہو کر اپنی مجبوری بتائی تو اسے اپنے اس طرح غصہ کرنے پر ندامت ہوئی۔

”اچھا، اچھا آج میں نے اسی لیے چھٹی کی ہے تاکہ اپنی نگرانی میں صفائی کرواؤں۔ تین دن بعد عید ہے اور مجھے بے شمار کام کرنے ہیں۔“

”باجی ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گی۔“ ماسی کو اس کے لہجے کی خرابی سے تھوڑا حوصلہ ہوا۔

”کیا بات ہے؟“  
”باجی آپ اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ فائزہ بی بی کو دیکھیں کتنا سچ سنور کے رہتی ہیں اور کتنی خوبصورت لگتی ہیں، آپ بھی فائزہ بی بی کی طرح رہا کریں۔“

”اچھا اچھا زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنا کام کرو۔“ ماسی تو دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوئی اور وہ سارا دن اپنے آپ سے ابھرتی رہی۔ اسے عید کی تیاری کرنی تھی، گھر کو صاف کرنا تھا، مصالحے تیار کرنا تھے۔ برتن نکالنے تھے لیکن وہ سارے کام چھوڑ کر اپنے آپ میں لگ گئی۔ اس نے بہت دن بعد اپنے بال ڈاٹی کیے، چہرے کو امین سے صاف کیا اور نہادو کر لائٹ پنگ ٹرک کا کاشن کا سوٹ پہن کر تیار ہوئی تو اسے اپنا آپ بہت فریض لگنے لگا لیکن شام کو جب اوریس فائزہ کو لینے ہوئے گھر آئے تو اوریس نے اس کی تیاری کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا بلکہ مٹا شاسے کھیلنے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

”کیا کہیں جانا ہے کیا؟“  
”نہیں تو۔۔۔“ وہ چپ سی ہو گئی۔

”بھابی آپ یہ کمرہ نہ پھینا کریں اس سے آپ کا کمپلیکشن اور ڈارک لگتا ہے۔“ فائزہ نے انتہائی صاف

مانی سے ایسے کہا کہ وہ چور سی ہو گئی۔ اس نے چور چور سے اوریس کی طرف دیکھا، وہ مٹا شاس کو ہنسانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ انہوں نے فائزہ کی بات سن لی تھی لیکن کران سی کر دی۔ وہ کڑھتی ہوئی چائے پلانے بچن کی طرف چل دی۔

”یہ فائزہ بھی اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتی ہے۔ سارا رنگ کیا صاف ہے شخص ہے جیسے حسینہ عالم۔“ وہ دل ہی دل میں اسے ہزاروں صلواتیں دیتے ہوئے کتاب تلنے لگی۔

وہ چائے اور کباب بڑائی میں سجا کر لاؤنج میں آئی وہ دونوں کی بات پر ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔

”اوریس آپ نے بھابی کو یہ لطیفہ سنایا ہے۔“  
”یہ تو مجھے ایس ایس ایم ایس سے آج ہی موصول ہوا

ہے۔“  
”باجی آپ اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ فائزہ بی بی کو دیکھیں کتنا سچ سنور کے رہتی ہیں اور کتنی خوبصورت لگتی ہیں، آپ بھی فائزہ بی بی کی طرح رہا کریں۔“

”اچھا اچھا زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنا کام کرو۔“ ماسی تو دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوئی اور وہ سارا دن اپنے آپ سے ابھرتی رہی۔ اسے عید کی تیاری کرنی تھی، گھر کو صاف کرنا تھا، مصالحے تیار کرنا تھے۔ برتن نکالنے تھے لیکن وہ سارے کام چھوڑ کر اپنے آپ میں لگ گئی۔ اس نے بہت دن بعد اپنے بال ڈاٹی کیے، چہرے کو امین سے صاف کیا اور نہادو کر لائٹ پنگ ٹرک کا کاشن کا سوٹ پہن کر تیار ہوئی تو اسے اپنا آپ بہت فریض لگنے لگا لیکن شام کو جب اوریس فائزہ کو لینے ہوئے گھر آئے تو اوریس نے اس کی تیاری کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا بلکہ مٹا شاسے کھیلنے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

”کیا کہیں جانا ہے کیا؟“  
”نہیں تو۔۔۔“ وہ چپ سی ہو گئی۔

”بھابی آپ یہ کمرہ نہ پھینا کریں اس سے آپ کا کمپلیکشن اور ڈارک لگتا ہے۔“ فائزہ نے انتہائی صاف

مانی سے ایسے کہا کہ وہ چور سی ہو گئی۔ اس نے چور چور سے اوریس کی طرف دیکھا، وہ مٹا شاس کو ہنسانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ انہوں نے فائزہ کی بات سن لی تھی لیکن کران سی کر دی۔ وہ کڑھتی ہوئی چائے پلانے بچن کی طرف چل دی۔

”یہ فائزہ بھی اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتی ہے۔ سارا رنگ کیا صاف ہے شخص ہے جیسے حسینہ عالم۔“ وہ دل ہی دل میں اسے ہزاروں صلواتیں دیتے ہوئے کتاب تلنے لگی۔

وہ چائے اور کباب بڑائی میں سجا کر لاؤنج میں آئی وہ دونوں کی بات پر ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔

”اوریس آپ نے بھابی کو یہ لطیفہ سنایا ہے۔“  
”یہ تو مجھے ایس ایس ایم ایس سے آج ہی موصول ہوا

ہے۔“  
”ویسے اوریس آپ کا جواب نہیں آپ کی کمپنی میں تو کوئی بور ہو ہی نہیں سکتا، بھابی بہت خوش قسمت ہیں۔“ فائزہ کے لہجے میں خاصا رنگ و حسد تھا۔  
”چنانچہ کون خوش قسمت ہے، میں یا وہ؟“

اوریس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا یا اسے محسوس ہوا کہ وہ ٹھنڈی سانس بھر رہا ہے۔  
”آپ نے مجھے کا انتظار کر لیا؟“ اس نے اوریس کو چائے تھماتے ہوئے کہا۔

”اوہ، اچھا ہوا تم نے یاد دلادیا، میں ابھی کمال کو رنگ کرتا ہوں وہ اپنے لیے خریدنے جائے گا تو ہمارا اکبرا بھی لے آئے گا۔“ اوریس نے چائے تپائی پر رکھ کر سوبائل کا نمبر ملایا۔

”بھابی کل آپ نے ضرور پارلر جانا ہے، میں خود

رہے۔“  
”ویسے اوریس آپ کا جواب نہیں آپ کی کمپنی میں تو کوئی بور ہو ہی نہیں سکتا، بھابی بہت خوش قسمت ہیں۔“ فائزہ کے لہجے میں خاصا رنگ و حسد تھا۔  
”چنانچہ کون خوش قسمت ہے، میں یا وہ؟“

اوریس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا یا اسے محسوس ہوا کہ وہ ٹھنڈی سانس بھر رہا ہے۔  
”آپ نے مجھے کا انتظار کر لیا؟“ اس نے اوریس کو چائے تھماتے ہوئے کہا۔

”اوہ، اچھا ہوا تم نے یاد دلادیا، میں ابھی کمال کو رنگ کرتا ہوں وہ اپنے لیے خریدنے جائے گا تو ہمارا اکبرا بھی لے آئے گا۔“ اوریس نے چائے تپائی پر رکھ کر سوبائل کا نمبر ملایا۔

”بھابی کل آپ نے ضرور پارلر جانا ہے، میں خود

رہے۔“  
”ویسے اوریس آپ کا جواب نہیں آپ کی کمپنی میں تو کوئی بور ہو ہی نہیں سکتا، بھابی بہت خوش قسمت ہیں۔“ فائزہ کے لہجے میں خاصا رنگ و حسد تھا۔  
”چنانچہ کون خوش قسمت ہے، میں یا وہ؟“

اوریس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا یا اسے محسوس ہوا کہ وہ ٹھنڈی سانس بھر رہا ہے۔  
”آپ نے مجھے کا انتظار کر لیا؟“ اس نے اوریس کو چائے تھماتے ہوئے کہا۔

”اوہ، اچھا ہوا تم نے یاد دلادیا، میں ابھی کمال کو رنگ کرتا ہوں وہ اپنے لیے خریدنے جائے گا تو ہمارا اکبرا بھی لے آئے گا۔“ اوریس نے چائے تپائی پر رکھ کر سوبائل کا نمبر ملایا۔

”بھابی کل آپ نے ضرور پارلر جانا ہے، میں خود

رہے۔“  
”ویسے اوریس آپ کا جواب نہیں آپ کی کمپنی میں تو کوئی بور ہو ہی نہیں سکتا، بھابی بہت خوش قسمت ہیں۔“ فائزہ کے لہجے میں خاصا رنگ و حسد تھا۔  
”چنانچہ کون خوش قسمت ہے، میں یا وہ؟“

ریک۔ یورپ۔ برطانیہ اور برصغیر پاک و ہند کے مشہور معالج کی جدید حیرت انگیز تحقیق

**LACO RIGHT “دلیکوراٹ”**  
AN EXCELLENT HERBAL FOOD SUPPLEMENT

یورپ۔ سلطان الرحمہ۔ سفید پانی کا آنا۔ کمر میں درد۔ بھوک کی کمی۔ طبیعت ست۔ جسمانی کمزوری۔ پندلیوں میں درد۔ قبض۔

تھکاپ۔ خواتین کی اکثریت آج کل اس مرض میں مبتلا ہے۔ لیکن فطری شرم و حیا اور مرض کو معمولی سمجھ کر علاج پر توجہ نہیں دیتیں۔

انگہ۔ یہ مرض انکی صحت اور نسوانی حسن و جمال کو متاثر کرتا ہے۔ اگر اس مرض کا علاج بروقت نہ کیا جائے تو اس سے ضعف اعضائے

سار اور دیگر شکایات کے باعث استقرار حمل کی قابلیت نہیں رہتی اور شادی کے ثمر یعنی اولاد جیسی نعمت سے محروم ہو جاتیں ہیں۔

**Price £ 39.99**  
**برائے دابطہ**  
**HERBAL RIGHT UK LTD**  
228 MOSTON LANE, MOSTON  
MANCHESTER UK M40 9NS  
PH / FAX: 0161-2052118  
E-mail: syedherblist@yahoo.com

**POWER OF HEALING**  
ماہنامہ پاکیزہ 259 جنوری 2008

اس نے بڑے اہتمام سے میک اپ کیا تھا اور لائٹ فیروزی جینوری پہنے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ احساس کمتری کا شکار ہوئے لگی۔

آج اس نے بینک سے چھٹی کی تھی اس لیے گھر پر ہی تھی اور گھر ہی کے کپڑوں میں ملیں تھی۔

”بھابی آپ اپنا بالکل خیال نہیں رکھیں کل میں آپ کو پارلر لے کر جاؤں گی۔“ فائزہ یہ کہہ کر آگے بڑھ

گئی اور وہ خواہ مخواہ ماسی پر برس پڑی۔  
”تم کس طرح صفائی کرتی ہو۔ دروازوں کے پیچھے دیکھو کتنے چالے لگے ہیں اور اپنا حلیہ دیکھو تمہارے کپڑے کتنے میلے ہو رہے ہیں لگتا ہے برسوں سے تم نے پانی کی غسل نہیں دیکھی۔“

”کیا کریں باجی، ایک ہفتے سے ہمارے علاقے میں پانی نہیں آ رہا ہے۔“ ماسی نے شرمندہ ہو کر اپنی مجبوری بتائی تو اسے اپنے اس طرح غصہ کرنے پر ندامت ہوئی۔

”اچھا، اچھا آج میں نے اسی لیے چھٹی کی ہے تاکہ اپنی نگرانی میں صفائی کرواؤں۔ تین دن بعد عید ہے اور مجھے بے شمار کام کرنے ہیں۔“

”باجی ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گی۔“ ماسی کو اس کے لہجے کی خرابی سے تھوڑا حوصلہ ہوا۔

”کیا بات ہے؟“  
”باجی آپ اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ فائزہ بی بی کو دیکھیں کتنا سچ سنور کے رہتی ہیں اور کتنی خوبصورت لگتی ہیں، آپ بھی فائزہ بی بی کی طرح رہا کریں۔“

”اچھا اچھا زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنا کام کرو۔“ ماسی تو دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوئی اور وہ سارا دن اپنے آپ سے ابھرتی رہی۔ اسے عید کی تیاری کرنی تھی، گھر کو صاف کرنا تھا، مصالحے تیار کرنا تھے۔ برتن نکالنے تھے لیکن وہ سارے کام چھوڑ کر اپنے آپ میں لگ گئی۔ اس نے بہت دن بعد اپنے بال ڈاٹی کیے، چہرے کو امین سے صاف کیا اور نہادو کر لائٹ پنگ ٹرک کا کاشن کا سوٹ پہن کر تیار ہوئی تو اسے اپنا آپ بہت فریض لگنے لگا لیکن شام کو جب اوریس فائزہ کو لینے ہوئے گھر آئے تو اوریس نے اس کی تیاری کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا بلکہ مٹا شاسے کھیلنے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

”کیا کہیں جانا ہے کیا؟“  
”نہیں تو۔۔۔“ وہ چپ سی ہو گئی۔  
”بھابی آپ یہ کمرہ نہ پھینا کریں اس سے آپ کا کمپلیکشن اور ڈارک لگتا ہے۔“ فائزہ نے انتہائی صاف

ماہنامہ پاکیزہ 258 جنوری 2008



آپ کے ساتھ جاؤں گی اور اپنی مرضی سے آپ کی بیمر کٹنگ کراؤں گی۔ آپ کو دیکھ کر تو کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ آپ بینک میں آفیسر ہیں۔“ فائزہ کے اس طرح کہنے پر وہ جل کر خاک ہو گئی۔

”کل تو مجھے بے شمار کام ہیں اور یہ بیوی پارلر کے چوچلے تو غیر شادی شدہ لڑکیوں کو ہی زیب دیتے ہیں۔ بچوں والی ماؤں کو ان غروں کی کہاں فرستے۔“ اس نے اپنے اوپر جبر کر کے بڑی سہولت سے اسے جواب دیا۔

”بھالی آپ بہت بور ہیں۔“ فائزہ نے اس کے جواب پر منہ بنالیا۔

”تم میری بیوی کو پارلر کی لت نہ لگاؤ۔ اسے ایسے ہی رہنے دو۔“ وہ برتن سمیٹ کر بچن میں لے جا رہی تھی تو اسے اور لیس کی آواز سنائی دی۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں بھالی کو بتا دینا چاہیے۔“ فائزہ نے اپنے حساب سے یہ جملہ بڑی آہستگی سے کہا تھا لیکن بات اس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔

”ابھی نہیں جب تک پورا ایک انتظام نہ ہو جائے اس وقت تک کسی کو بھگ بھی نہیں لینی چاہیے۔“ اور لیس کا انداز بہت راز دارانہ تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا آپ اتنی رازداری کیوں برت رہے ہیں۔ اب تو سارا انتظام ہو چکا ہے، نہ جانے آپ کو کیا خوف ہے؟“

”مجھے کوئی خوف ووف نہیں۔ میں تو اسے حیران کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے یقین ہے جب بھالی کو پتا چلے گا تو وہ بہت ناراض ہوں گی۔“

”وہ اور مجھ سے ناراض، ایسا ممکن ہی نہیں۔“

اور لیس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اسے لگا جیسے دنیا ایک دم ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور ڈولتے ہوئے قدموں کے ساتھ بیڈروم میں پہنچی۔

”امی حج کتنی عرصے میں بہت بے وقوف ہوں، میں

لوگوں کی حال کیوں کو نہیں سمجھتی۔ لوگ مجھے کتنا سمجھاتے تھے، بھالی کتنے پیچ و پٹی میں، صائمہ اور سب کو لکھنے مجھے کتنا خبردار کیا تھا مگر میں نے تو خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی پر میں کیا کرتی۔ میں کس طرح ایک بینک ماں باپ کی بچی کو دنیا میں ٹرنے کے لیے چھوڑ دیتی۔“ اس کے اندر سے کہیں نیکی کی آواز ابھری تھی۔

”تو جو کچھ کیا ہے اسے بھگتو۔“

”کیا دنیا اتنی خراب ہو گئی ہے، لوگ اتنے ہی احسان فراموش ہو گئے ہیں۔ میں نے فائزہ کے ساتھ کتنا کیا ہے۔ شروع شروع میں جب اسے لے کر آئی تو اس کا کتنا خیال کرتی تھی۔ روزانہ اور لیس سے کہہ کر گھمانے لے جاتی۔ وہ امی سے ناراض ہوتی تو میں اس کی دلجوئی کرتی اور اس نے میرے احسانوں کا یہ بدلہ دیا کہ میرا ہی گھر اجاڑنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ ساری دنیا کو اکٹھا کر لے، سب کو بتائے کہ فائزہ جو باہر سے اتنی خوبصورت نظر آتی ہے اندر سے کتنی گھٹیا اور کم ظرف ہے لیکن وہ جانتی تھی کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ اسے بے شمار باتوں پر غصہ آتا تھا لیکن وہ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ وہ دیر تک آہستہ آہستہ بے آواز رونی رہی۔

اور لیس بکرا لے آئے تھے، رضا بکرا دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا خوش تو اور لیس اور فائزہ بھی بہت تھے۔ صیرف وہ مکی جو بظاہر کچھ کہہ نہیں رہی تھی لیکن اس کے اندر ہی اندر جیسے لاوا دھک رہا تھا۔

وہ بریالی کے لیے جتنی چڑھا کر ٹی وی لاڈلہ میں آئی تو ٹی وی پر مولانا صاحب تقریر کر رہے تھے۔

”حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کر کے دنیا کو یہ بتا دیا کہ خدا کے اصلی بندے کی پہچان کیا ہے۔ انسان خدا کا حقیقی بندہ اسی وقت بنتا ہے جب وہ اس کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ یاد رکھیے اللہ کا راستہ ہی سچا راستہ ہے، حق کا راستہ ہے۔ سیدھا راستہ ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی راستے ہیں وہ باطل کے راستے ہیں۔ انسان کی زندگی میں بے شمار مقامات آتے

جب اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ راستہ اللہ کا راستہ ہے لیکن جو خدا کے نیک ہوتے ہیں انہیں خدا خود ہدایت کرتا ہے اور ان کے اندر کی روشنی انہیں وہ راستہ دکھاتی ہے۔ ہمیں ہے کہ ہم خدا کے نیک اور پرہیزگار بندے بن سکیں۔ ہر سال ہم جو حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یاد

کرتے ہیں اس کا یہی مقصد ہے کہ ہمارے دلوں میں وہ

سچائی باندی پیدا ہو کہ ہمیں خدا کے سوا کسی اور کی پروا نہ ہو اور کا خوف نہ ہو۔ ہمیں صرف اور صرف اپنے کی خوشنودی کی فکر ہو اور اس کی رضا کے لیے ہم سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں۔“

وہ وہیں صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ تقریر سنتی جا رہی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کے اندر دھکے ہوئے لاوے کی شدت کم ہو رہی ہے۔

لوگ اسے بے وقوف کہہ رہے تھے کہ اس نے ذات کی تھی اور اب اسے اپنی حماقت کی سزا ملنے والی ہو گئی ہے۔ وہ بے وقوف نہیں تھی، وہ بہت نیک اور پرہیزگار تھی۔ اس نے جو کچھ کیا اپنے خدا اور مجازی خدا کی خوشنودی کے لیے کیا تھا۔ اس نے دنیا والوں کی پروا نہیں کی تھی بلکہ خدا کے حکم کے مطابق ایک یتیم اور وارث بچی کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی پھر وہ کیوں پریشان ہو رہی تھی۔ وہ کیوں ہراساں ہو رہی تھی اسے تو معاملہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ یقیناً ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرنے والا ہے۔ وہ یقیناً اس کی بہتری کے لیے کوئی تدبیر کرے گا۔ وہ یہ سب سوچ کر بے حد مطمئن ہو گئی۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے جلتے سگلتے دل پر ان کے چھینٹے ہر سادے۔

رات کو اچھی طرح سے تیار ہو جانا آج میری

فائزہ کی طرف سے بالیڈے لان میں ڈرنے ہے۔“ وہ محنت کے حصے لگا کر انہیں شاپر میں ڈال رہی تھی تو

انہیں نے اس کے قریب آ کر اسے اطلاع دی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور اپنے کام میں مصروف

رہی۔

”فائزہ اپنی دوست کے یہاں تیار ہونے گئی ہے، میں خاندان میں گوشت تقسیم کر کے اسے لیتا ہوا آؤں گا۔ تم اور بچے تیار رہنا۔“ وہ جیسے ہی صراط سے گزر رہی تھی جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز تھا۔

”بارا بلی مجھے حوصلہ اور صبر عطا کرنا۔“ مغرب کی نماز پڑھ کر اس نے دونوں بچوں کو تیار کیا اور خود بھی کچھ بچنے والے سے تیار ہو گئی۔

فائزہ اور اور لیس آگے تھے۔ آج دونوں کی جج دھج ہی نرمالی تھی۔ اور لیس نے سیاہ ڈنر سوٹ پہنا تھا جب کہ فائزہ میرون پیٹاز میں ملبوس تھی۔ دونوں ہی بے حد حسین اور فریش لگ رہے تھے۔ اس نے خود سی گرین رشم کی کڑھائی کا سوٹ پہنا تھا اور ہلکے ہلکے میک اپ میں بہت دلکش لگ رہی تھی۔

فنکشن بے حد شاندار تھا۔ سارا انتظام اور لیس

**ہر گھر کی ضرورت**

**بے نظیر اور بے مثال پروڈکشن**

**جیسی ٹیل** - کا استعمال بدن کی تصاویر ڈگریوں کر جوڑوں کا درد دور کر کے قیمت فی پیٹک 340 روپے علاوہ محصول ڈاک خرچ 50 روپے۔

**سکون** - ہر گھر کا ایک سرگرمی دہر ہالوں کو مضبوط کر کے بنانے ہالوں کو ہلکا بنانا یہ چند روز میں مکمل بھی کر کے قیمت فی پیٹک 200 روپے علاوہ محصول خرچ 50 روپے۔

**فارمولا F-5** - ہر بے پیرا شدہ قتل ہالوں سے نجات کا طریقہ آسان اور ہر گھر کے ایک کی ضرورت نہیں یہ ایک خاص پٹیاں ہیں جن سے کام لیا استعمال سے قاتل ہالوں کا تارک جاتا ہے قیمت فی پیٹک 400 روپے علاوہ محصول خرچ 50 روپے۔

گھر جیسے ایک خطہ کر دی بی پائل سے طلب فرمائیں کوئی بھی دو یا اس سے زائد اشیاء بھوکا سے محصول خرچ صاف ہوگا۔

**2209 فیری پرفورمرس** ہسٹ بکس نمبر 74600 کرناہی۔



گی۔

”ظاہر ہے، وہ سسرال میں رہ ہی نہیں سکتی۔“

”کیوں؟“

”تمہیں نہیں معلوم وہ کس مزاج کی لڑکی ہے۔“

تو تمہارا ہی حوصلہ اور صبر تھا جو تم نے اس قدر خوش اسلوبی سے اس کے ساتھ گزارا کیا تھا کہ وہ لڑکی اور ہوتا تو یہ گھر میدان کا رزار بن جاتا۔“ اور میں نے یہ جملے سن کر وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

”خدا کرے وہ اپنے گھر میں خوش و آباد رہے۔“

”آمین! آج میں بہت خوش ہوں۔“ خدا نے

میرے کاندھوں سے بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ خدا کرے وہ جلد از جلد رخصت ہو کر اپنے گھر جائے۔ جس دن وہ اپنے گھر جائے گی اس دن میں سکون کی نیند سو سکوں گا۔“

”خیر وہ اتنی پیاری ہے کہ اس کا شوہر تو اس کے

پاؤں و حدود کو کرے گا۔“

”تمہاری یہ سوچ بالکل غلط ہے، اگر ایسا ہوتا تو ساری دنیا کے مرد صرف خوب صورت عورتوں سے شادی کرتے اور گھروں میں خوبصورت عورتیں ہی آباد رہتیں۔“

”میں تو ہمیشہ اس کے سامنے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی تھی۔“

”حالانکہ اگر تم اپنے آپ کو میری نظروں سے دیکھو تو مجھے تم سے زیادہ خوبصورت کوئی اور عورت نظر نہیں آتی۔ تمہارے اندر جو نیکی کا دیار روشن ہے اس نے تمہاری ظاہری شخصیت کو اتنا مکمل، بھرپور اور روشن بنا دیا ہے کہ میں چاہوں تو بھی میرے قدم بہک نہیں پائیں۔“ اور میں نے ان الفاظ پر اس نے ان کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں سچائی کے نور کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔

واقعی اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے اور اس کی نیکی کو راز نگاہ میں ہونے دیتا۔ اس کا دل اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔



نے کروایا تھا۔ اسے تو ہوٹل جا کر ہی پتا چلا کہ سارا اہتمام فائزہ کی منگنی کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کی منگنی اور میں کی کوششوں سے اس کے دوست کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اسے اس لیے نہیں بتایا کہ اور میں کے دوست کے والدین گاؤں میں رہتے تھے اور وہ اتنی آزاد خیال لڑکی کو بوجھ بنانے پر راضی نہیں تھے لیکن اس کے دوست نے بڑی مشکل سے اپنے والدین کو راضی کیا تھا اور عید سے تین دن پہلے ہی یہ رشتہ پکا ہوا تھا پھر اور میں کو یہ بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہے۔ وہ اس سچویشن کو انجوائے کر رہا تھا اور ایک دم ہی اس کی غلط فہمی دور کر کے اسے سر پرانہ دینا چاہتا تھا۔

”آپ کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔“ اسے جب ہوٹل جا کر اصل بات پتا چلا تو اسے بہت برا لگا۔

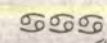
”تم یہ بتاؤ تم اس وقت کتنی خوش ہو؟“

”اگر آپ مجھے گھر میں بتا دیتے تو میں اور زیادہ خوش ہوتی اور میری عید تو نہ خراب ہوتی۔“

”عید کا کیا ہے، جب میاں بیوی راضی ہوں تو ہر دن عید اور ہر رات شب برات ہوتی ہے۔“ اور میں نے شونی سے مسکرا کر کہا۔

”اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اچھی طرح تیار تو ہو جاتی۔“

”تم تو اس تیاری میں بھی ستم ڈھا رہی ہو۔ کیا مزید جان سے مارنے کا ارادہ تھا۔“ اور میں نے دھیمے سے کہا تو اسے لگا جیسے اس کے چاروں طرف بہار کا موسم آ کر گھبرا گیا ہو۔



”لو کا تو اچھا ہے لیکن لڑکے کے والدین گاؤں میں رہتے ہیں بھلا فائزہ گاؤں میں کیسے رہے گی؟“ وہ فکشن سے واپس آ کر اپنے بیٹہ روم میں آئے تو اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”یہ بات طے ہو چکی ہے۔ فائزہ اور محمود شہر میں رہیں گے۔“

”اس کا مطلب ہے فائزہ سسرال میں نہیں رہے

## خدا یا سالِ نو آئے کمر آکا سائباں بن کر

شانستہ نزیر

مطمئن ہونے کے سبب ان کی خواہش ہی یہ ہوتی ہے کہ اب اس سے پہلے کہ سال گزرے وہی لکیریں وہی ستارہ میری لکیروں میں قید کرو لیکن جو آنے والے سال سے کئی اُمیدیں باندھ لیتے ہیں اور ستاروں کی چال پر یقین بھی رکھتے ہیں انجانے میں اپنے ستارے سے بہت سی توقعات باندھ لیتے ہیں ایسے میں خود بخود یہ دعا لیں پر بھر جاتی ہے کہ ندرج کا کوئی لمحہ کسی کے پاس آئے خدا کرے یہ نیا سال سب کو اس آئے

آمین  
نئے سال کی نسبت سے جہاں بہت سی توقعات، آرزوئیں اور دعائیں ہمارے ساتھ سفر کرتی ہیں وہاں نئے سال سے منسوب کوئی بھی شعری تخلیق ہمارے شاعرانہ ذوق کی تسکین کرتے ہوئے ہمیں اپنی جانب متوجہ بھی کر لیتی ہے۔

اب کے برس کچھ ایسا کرنا اپنے پچھلے بارہ ماہ کے، دکھ سکھ کا اندازہ کرنا سادہ سا ایک کاغذ لے کر بھولے بسرے مل لکھ لینا پھر اس بیٹے اک، اک مل کا، ایک، ایک موڑا حاطہ کرنا ساری صبحیں حاضر رکھنا، ساری شامیں پاس بلانا اور علاوہ ان کے دیکھو سارے موسم دھیان میں رکھنا اک، اک یا دگمان میں رکھنا

رختِ سفر باندھتا سالِ رواں برقِ رفتاری سے  
معے سال کی سمت رواں دواں پکار رہا ہے کہ  
جب بھی فرصت ملے تو گوشہ تنہائی میں  
یا دِ ماضی کے پرانے گوشوارے دیکھنا  
اور اگر یہ حساب سال بھر کا ہو اور برس کی آخری  
رات بھی تو نئے سال کا سورج طلوع ہونے سے پہلے  
خود احتسابی کے عمل سے گزرنے والوں کی قوتِ فکر ہی  
نہیں، قوتِ عمل بھی بیدار ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اوروں  
سے اور خود اپنے آپ سے کیے جانے والے وعدے  
اور عہد بہت ستاتے ہیں جو دانستہ یا نادانستہ پیکل رہ

گئے تب شاعر کا یہ خیال روشنی دکھا دیتا ہے کہ  
کس تدبیر میں ہے نئے سال کی دلیز پر  
جو کھویا ہے اس کا غم نہ کر جو پانا ہے اس کا عہد کر  
نہیں کچھ حاصل محرومیوں کے شمار سے  
گزرے غموں کو بھول کر نئی خوشیاں تلاش کر  
نشاطِ نو کی بازیافت کا عمل آسان بھی ہے اور مشکل  
بھی اگر ہمارا ضمیر مطمئن ہے کہ ہم نے کچھ بھی غلط نہیں کیا  
تو آسانی ہی آسانی ہے۔ کیے وعدے اور عہد وفا نہ  
کرنے کی صورت میں ان کی پیکل کی خواہش اور کوشش  
میں مشکل ضرور پیش آ سکتی ہے لیکن جب یہ مرحلہ طے  
کرنے کی امنگ شدت اختیار جائے تو از خود پاس کے  
باؤلِ حُسن اور آس کے جگنو چمکنے لگتے ہیں۔ ہاں کچھ ایسے  
بھی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی خوشیاں اور مسرتیں اپنے  
انگوٹوں کی لکیروں میں تلاش کرتے ہیں بلکہ حال سے



پھر حنا قیاس لگنا  
گرتو خوشیاں بڑھ جاتی ہیں  
تو پھر تم کو میری طرف سے  
نیا سال مبارک ہو  
اور اگر تم بڑھ جائیں تو  
مت بیکار تکلف کرنا  
میری خوشیاں تم لے لینا  
مجھ کو اپنے غم دے دینا  
اب کے برس کچھ ایسا کرنا  
حسب روایت پاکیزہ کے  
سال نو نمبر کے لیے ہم نے ایک  
سروے رپورٹ کا اہتمام کیا اور

سروے میں شریک خوانین سے معلوم کیا کہ  
۱: جانے والے سال نے آنے والے سال کے  
لیے کیا پیغام دیا؟

۲: جو وعدے اور عہد آپ ۲۰۰۷ء میں پورے نہ  
کر سکیں نئے سال میں ان کی تکمیل کا ارادہ ہے؟  
۳: نئے سال میں آپ کو اپنے ”ستارے“ سے  
کون سی توقعات ہیں؟ کیا وہ آپ کے حق میں جھللائے  
گا؟

۴: نئے سال کے لیے آپ کی دعا کیا ہے؟  
۵: نئے سال کی مناسبت سے کوئی شعری تخلیق نذر  
قارئین کریں؟

### شگفتہ یاسمین

میزبان مینا بازار پی ٹی وی کراچی سینٹر

۱: جو غلطیاں ۲۰۰۷ء میں سرزد ہو گئیں انہیں  
دہرانے کے بجائے ان کو دور کرنے کی کوشش کریں کہ  
ہرگز راہ وادن ہمیں جو سبق دے رہا ہے اگر ہم اس کو نہیں  
سمجھ پارہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم وقت ضائع کر  
رہے ہیں۔

۲: اللہ کا شکر ہے کہ جو میری کمینٹ تھیں ۲۰۰۷ء کی  
وہ میں نے پوری کی ہیں اور انشاء اللہ ۲۰۰۸ء کی تمام  
کمینٹ بھی پوری کروں گی۔



۳: میرے حساب سے میرے ستارے نے خوب  
چمکنا شروع کر دیا ہے۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو یہ  
چمک کب دکھائی دیتی ہے، کہتے ہیں کہ آپ اگر غنی ہیں  
اور آپ نے درست راستوں کا انتخاب کر لیا ہے تو  
نا کامی نہیں ہوگی بیشک یہ راستہ مشکل ہوتا ہے لیکن اگر  
نیت اچھی ہے تو اس میں مزہ بھی بہت ہے۔ سو مجھے نئے  
سال میں بھی اپنے ستارے سے بہت اچھی توقعات ہیں  
وہ اس برس بھی میرے حق میں ضرور جھللائے گا۔

۴: اللہ تعالیٰ میرے والدین کو تندرستی کے ساتھ  
لمبی عمر دے اور میں نے ماضی میں جو سخت محنت کی ہے  
اور اب بھی کر رہی ہوں اس کا بہترین صلہ دے، آمین!  
۵: وہ جس کے ہونے سے زندگی نئے سرائی ہے  
اسے کہنا کہ بیشکی جنوری پھر لوٹ آئی ہے

### مسز گوہر نذر

معلمہ لٹل ووڈ اسکول

۱: میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے.....  
۲: میرا اپنے آپ سے عہد یہی ہے کہ اپنے  
پروردگار سے دوستی کا رشتہ مضبوط کیا جائے۔ جو ہم  
ملازمت پیش وقت کی کمی کے باعث نہیں کر سکتے۔ اللہ  
تعالیٰ اس نئے سال کو سب کے لیے مبارک کرے اور ہم  
بھی اپنے وعدے کا پاس رکھیں، انشاء اللہ.....  
۳: میرا ستارہ جدی ہے ۲۰۰۸ء میں مجھے اس سے

تو ہمیں ایسی بہار دے  
غم کے بھورے نکال  
اور نگر نگر نکھار دے

آمین

### شہزادی زرتاشیہ

معاون ضیا اعوان

تنظیم وکلاء برائے انسانی حقوق علمی برادری

۱: کامیابی اور ترقی کے لیے صرف قسمت پر بھروسہ  
نہ کریں بلکہ خود بھی جدوجہد کریں، اتنی کہ منزل خود آپ  
کو پکاراٹھے۔

۲: کچھ وعدے اور عہد ہیں جو پورے نہ ہو سکے  
لیکن انشاء اللہ نئے سال میں یہ ندامت اب میرے حصے  
میں نہیں آئے گی اور میں بہت جلد اپنے سارے وعدے  
اور عہد پورے کروں گی۔

۳: میرا ستارہ اسد ہے۔ ستارے کبھی مدھم پڑتے  
ہیں تو کبھی ان کی روشنی بڑھ جاتی ہے، یہی ان کا کام  
ہے۔ ماضی میں جن پریشان کن حالات کا سامنا  
کرنا پڑا، مجھے یقین ہے کہ اب ان میں بہتری آئے گی  
اور میرا ستارہ خوب خوب جھللائے گا۔

۴: اللہ پاکستان کو اپنی امان میں رکھے اور ہمارے  
سیاستدانوں کو توفیق دے کہ آپس کے اختلاف بھلا  
کر ملک کی سلامتی کے لیے کام کریں۔ اللہ پاک



بہتری کی توقعات ہیں اور انشاء اللہ یہ میرے حق میں  
بہتر ہوگا۔

۵: یا الہی! اب کے برس  
تو ہمیں ایسی بہار دے  
پھول کھلیں امیدوں کے سب کی

وہ سدا بہار دے  
اتنا ہے میری تجھ سے  
اے میرے پروردگار  
کہیں خوش حملے نہ ہوں

آہ وزاری نہ ہو  
بواؤں کے ٹکٹے نہ ہوں  
قیوں کی آہیں نہ ہوں  
ترجیح نہیں نہ ہوں  
سکنتی بیٹیاں نہ ہوں  
بے بس بھائی نہ ہوں  
ماؤں کے زندہ لاشے نہ ہوں  
یا الہی اب کے برس





ہمارے بچوں کو نیک نیت اور دین پر چلنے والا اور فرمانبردار بنائے، آمین۔

۵: ہم نئے سال سے خیرات نہیں مانگیں گے رکھ دیا ہم نے بھی سکھول گدائی اپنا

**ارد سحر آفتاب**  
**رائٹر، معلمہ**

۱: کبھی نرمی کبھی سختی کبھی غلت کبھی دیر وقت اسے دوست بہر حال گزر جاتا ہے لمحہ لمحہ لگتا ہے کبھی ایک سال کبھی لمحے کی طرح سال گزر جاتا ہے وقت کا کام گزرنے اور وقت کی بساط کے آگے کسی کا زور نہیں۔ یہ کبھی کسی کے لیے رکتا نہیں۔ وقت کے دھارے میں انسان بہتا چلا جاتا ہے، زندگی کے ہزاروں غم جو زیت کے لمحوں میں جینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ ان گزرتے ماہ و سال میں جانے کتنے لمحے ایسے آئے جن کو پاکریوں محسوس ہوا بس زندگی کی تمام تر خوشیاں، تمام تر رعنا یاں بس اسی ایک پل میں ہیں مگر اگلے ہی پل وقت نے کروٹ لی تو احساس جاگا کہ زندگی کا سفر تو ابھی باقی ہے۔ جانے کتنے کام ہیں جو طاق نسیاں ہو چکے ہیں جنہیں مکمل کرنا بہت ضروری ہے۔ تو گزرے ہوئے سال نے گر کوئی پیغام دیا ہے تو وہ یہ ہے کہ وقت بہت قیمتی ہے۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اگر ہم وقت کی قدر و منزلت کو نہیں پہچانے تو یہ ہمیں چھوڑ کر بہت آگے بڑھ جائے گا اور ہم زندگی کی اس دوڑ میں پیچھے ایک شکست خوردہ کھلاڑی کی طرح رہ جائیں گے تو سب سے اہم پیغام جو وقت ہمیں دیتا ہے "میری قدر کرو میں تمہاری قدر و منزلت کو بڑھا دوں گا۔"

۲: وعدے تو خود سے بہت کیے ہیں..... ان میں سے کچھ تو ۲۰۰۷ء میں پورے ہوئے اور کچھ تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ اب صرف کوشش ہے، ارادہ ہے، منزل کو پانے کی جستجو ہے..... دیکھیے کہاں تک اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل کرتی ہوں اور خود سے کیے وعدوں کو پائے تکمیل تک پہنچاتی ہوں۔ ویسے بھی وہ

وعدہ ہی کیا جو فائدہ ہوا۔

۳: میرا ستارہ تو ہمیشہ ہی گردش میں رہا ہے۔ اور اس گردش میں میں ہمیشہ چمکتی رہی ہوں..... ویسے مجھے ستاروں پر بھی بھروسہ نہیں رہا۔ جانے کب یہ اپنی جال بدل دیں۔ میرا ماننا ہے کہ کاتب تقدیر نے جو لکھا تھا کمال دیا۔ اگر اسے بدلنا مقصود ہو تو خدا پر توکل، ہمت اور حوصلہ ہی اس کاتب تقدیر کی تحریر کردہ تقدیر کو بدل سکتا ہے مگر مجھے اُمید ہے کہ آنے والے سال میں میرا ستارہ ضرور میری مرضی سے جھلکائے گا یعنی بھروسہ ہے خود پر اس لمحے سیکم کوڑ کا شعر بڑی شدت سے یاد آ رہا ہے۔

کارِ جہاں سے کارِ جنوں ہارنا نہیں میں خاک ہو گیا ہوں ستارہ چمکتا ہے

۴: نئے سال کے لیے بس یہی دعا لیوں پر ہم وقت چلتی ہے آنے والا ہر پل سب کی زندگی میں خوشیاں لے کر آئے۔ جہاں دکھوں کا شائبہ تک نہ ہو ہر چہرہ مستم ہو اور وطن عزیز تر تری کے راستے پر گامزن ہو۔

۵: نیا سال تمہارے لیے خوشیوں کا گہوارہ ہو نئے سال میں کوئی درد نہ تمہارا ہو جو خواب دیکھو تعبیر اس کی یاد ہر آن زندگی ایک چمکتا ستارہ ہو

**مفلحہ رحمن**

**طالبہ شعبہ ابلاغ عامہ جامعہ کراچی**

**فدینی دھورندارے آر وائی ون ورلڈ**

۱: پچھلے سال نے مجھے اتنے پیغام دیے کہ اگر لکھنا شروع کروں تو آپ کا رسالہ بھر جائے گا مگر میری ڈھٹائی دیکھیے کہ اتنے پیغامات اور سبق ملنے کے باوجود سدھری نہیں اور ابھی تک ویسی ہی ویسی ہی ہوں۔ ۲۰۰۷ء نے بہت سے مواقع پر بہت اچھے اچھے پیغامات دیے اور سبق کھائے۔ ان میں سب سے اہم یہ تھا کہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کوئی منزل متعین کریں اور اس منزل کو پانے کے لیے بھرپور جدوجہد کریں۔ ارادے نیک اور پختہ ہوں اور قدیم منزل کی جانب اٹھ جائیں تو بیشک اللہ کی مدد بھی آجانی



۲: اور دوسرا یہ کہ میں بلاوجہ غصے میں آجاتی ہوں یہ بچ کر غصہ کم کرنا ہے کہ غصہ کرنے کا مطلب ہے کہ پانے دوسروں کی غلطیوں کا انتقام خود سے لیا۔

۲: ویسے تو میں کسی سے وعدے نہیں کرتی لیکن شیخ کی طرح دل میں راوے ضرور کرتی ہوں کہ ایسا کام کروں کہ امی ابو مجھ پر فخر کریں اور اس پکر میں آدھے ام آٹ ہو جاتے ہیں حیر اس وعدے کو نبھانے کے لیے کوششیں ابھی بھی جاری ہیں۔

۳: میں برج پر یقین رکھنے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتی ہوں کہ سارا اختیار تو اللہ کے پاس ہے۔ مجھ پر وہ تو لوگوں کو بیوقوف بنانے کے جھکنڈے ہیں۔

۴: نئے سال کے لیے دھیروں دعا میں ہیں کہ ہمارے ملک اور ایمان کو سلامت رکھے اور پاکستان کو اپنی طاقت کو پہچانے۔ ایسے کہ بجائے اس مستقبل اس پر حاوی ہووہ مستقبل کو اپنے اختیار میں لے، آمین۔

۵: نئے چراغ ہمیں راستہ دکھاتے ہیں جدھر نگاہ اٹھے پھول مسکراتے ہیں

**وریشہ زہرا فیچر**

**لٹل وڈ اسکول گلشن کیمپس**

۱: اے نئے سال مجھے اُمید ہے کہ تو اس وادھی کا

پیغام لائے گا۔ تیرے دامن میں مجھوں کے پھول ہوں گے، تو لوگوں کو اندھیروں سے روشنی میں لائے گا اور علم کے دروازے کھول دے گا۔

۲: ۲۰۰۷ء میں ہم نے بہت سارے عہد اور وعدے کیے تھے لیکن ان کو ہم پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔ جس کی وجہ خوابوں کی دنیا میں بیسرا ہے اور عملی اقدام سے گریز ہے۔ اے نئے سال ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اس سال ہم عملی اقدام زیادہ کریں گے اور خواب و خیال کی حسین دنیا سے باہر نکل آئیں گے۔ اور وہ سارے کام جو پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکے ان کو محنت اور اللہ کے بھروسے پر پورا کریں گے۔

۳: توقعات انسان کو صرف اور صرف اپنے رب سے رکھنی چاہیے۔ چاند تاروں اور اس کی چمک دک کی دنیا میں صرف وہ لوگ رہتے ہیں جنہیں اپنے عمل اور اللہ پر بھروسہ نہیں ہوتا، اس لیے اسٹار پر بھروسہ کرنا بے وقوفی



۴: اللہ پر بھروسہ اور اپنی ہمت ہو تو سارے کام ہو جاتے ہیں۔

ہمت ہے تو پیدا کر فردوس بریں اپنا  
۴: ایسا رہنما ملے جو خود بھی احکام خداوندی سے واقف ہو اور ان پر عمل کرتا ہو اور لوگوں کو اندھیرے سے اُجالے کی راہ دکھائے، آمین!





۵: اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں  
مل کر ایک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں  
خزاں کی اجازت شائیں نہ آئیں اگلے برس  
اس بہار رُت کو زنجیر کرتے ہیں

### مریخہ منظر

طالبہ انٹرن سائنس سال اول  
گورنمنٹ پی آئی بی گرلز کالج

۱: جی ہاں، وقت اور زندگی کو زیادہ بہتر انداز سے  
ڈالتا ہے، انشاء اللہ میری پوری کوشش ہوگی کہ میں  
۲: میری کوشش تو یہی ہوگی کہ ضرور پورے کروں  
اللہ بہتر جانتا ہے۔



سی کامیابیاں حاصل کروں۔  
۲: انشاء اللہ ضرور پورے کروں گی۔ نئے سال  
کے لیے بھی عہد ہے کہ میٹرک میں بہت اچھے نمبروں  
سے کامیابی حاصل کروں گی اور اس کے لیے پہلے  
زیادہ محنت کروں گی۔

۳: کیوں نہیں! ضرور جھللائے گا، میرا ستارہ جو  
ہے اسے تو جھللا نا ہی ہے۔ میں بہت پر امید ہوں کہ  
بہت سی خوشیاں اور کامیابیاں مجھے ملیں گی۔

۴: اللہ میرے وطن پر اپنا کرم کرے۔ مجھے اور  
میرے گھروالوں کو اپنی امان میں رکھے اور میٹرک میں  
میرا شاندار رزلٹ آئے، آمین!  
۵: پھر نیا سال آیا ہے

ایسے میں  
خوشیوں کے بیش بہا  
خزانے لگائی  
مرست بھری میری آنکھیں

کہہ رہی ہیں  
اے دوست

اٹھا کر چلیں، مغربی طاقت ہم کو زیر نہ کر سکے، آمین!  
۵: نہ تو شب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے  
کس پرہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے  
مہ وش اکرم طالبہ

بی بی اے سال دوم، جامعہ کراچی

۱: ہر جانے والا سال آنے والے سال کے لیے



دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت  
ہو جس کی نگاہ عالم افکار دو عالم  
۵: اک فجر ایسا محبت کا لگایا جائے  
جس کا ہمسائے کے آگن میں بھی سایہ جائے

### شازیہ اکرم

مونٹیسوری ٹیچر ہیپی ہوم اسکول

۱: جو غلطیاں اس سال ہوئیں وہ آنے والے سال  
میں نہ دہرائی جائیں بلکہ ان کو سدھارا جائے تاکہ آنے  
والا سال سکون اور خوشیوں سے گزرے۔  
۲: پھر پور کوشش ہوگی کہ جو وعدے ۲۰۰۷ میں  
پورے نہ کر سکی وہ نئے سال میں ضرور پورے کروں اور  
یہ بھی عہد کروں گی کہ ایسے وعدے نہ کروں جو پورے نہ  
کر سکوں اور پھر دل پر ایک بوجھ بن کر نہ رہے کہ ایسا  
کیوں ہوا۔

۳: میں ستاروں پر یقین نہیں رکھتی کیونکہ یہ  
ستارے دل کو دھوکا دینے کا طریقہ ہے۔ ستارے بھی  
اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ میں ہر بات کی توقع اللہ  
سے رکھتی ہوں۔

۴: جو لوگ پریشان ہیں اللہ ان کی سب  
پریشانیاں دور کرے جو ناراض ہیں آپس میں راضی ہو  
جائیں، سارے ملک میں امن قائم ہو بحیثیت مسلم ہم سہ



تاریخ رقم کرتا ہے۔ ۲۰۰۷ میں سیاسی، سماجی، معاشی طور  
پر لوگ متاثر ہوئے ہیں سو اس سال نے آنے والے  
سال کو یہ پیغام دیا ہے کہ ذرا سنبھل کر، زندگی انمول  
ہوتی ہے لہذا لوگ خوشیوں کی تلاش میں ہیں۔ اس لیے  
تم اچھا سال بن کر آنا۔

۲: انشاء اللہ ضرور پورے کروں گی اور نئے سال کے  
لیے بھی میرا عہد ہے کہ زیادہ محنت کر کے بہترین  
کامیابی حاصل کروں اور اللہ نے جو مجھے تخلیقی صلاحیت دی ہے  
اسے ملکی فلاح کے لیے بھی استعمال کروں۔

۳: جہاں تک ستاروں کی بات ہے تو میں ستاروں  
پر بالکل یقین نہیں رکھتی کہ غیب کا حال تو صرف اللہ ہی  
بہتر جانتا ہے اور اپنے رب پر بھروسہ ہے کہ کہنے والے  
سال کو میرے لیے بہت اچھا بنائے گا۔

۴: دعا یہی ہے کہ نئی نسل، ہم نوجوان اپنے ملک  
کے لیے کچھ ایسا کر سکیں کہ دنیا یاد رکھے، انشاء اللہ۔

۵: کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا  
جیون کا ایک اور سنہرا سال گیا

### رمشا سیف

میٹرک سائنس کراچی پبلک اسکول

۱: اور زیادہ محنت اور لگن سے کام کروں اور بہت



نیا سال مبارک ہو

پر تکیہ کر لیتے ہیں لیکن کثیر تعداد ایسے افراد کی ہے جو ستاروں کی چال کو مشکوک جانتے ہوئے اسے قابلِ توجہ و اعتبار نہیں سمجھتے ان کا ایمان ہے کہ قسمت بنانے بگاڑنے کا اختیار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور سروے کے بیشتر شرکانے اللہ ہی سے توقعات باندھی ہیں، بیشک وہ خالق کائنات ہے سو اس کے حضور ہماری دعا بھی یہی ہے کہ

قارئین! جانے والے سال پر ہی کیا منحصر ہے سچ تو یہ ہے کہ ہر جانے والا دن بھی آنے والے دن کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام دے ہی جاتا ہے بات صرف اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ہے اور جب معاملہ گئے برس کے نئے سال کو دیے جانے والے پیغام کا ہو تو مجموعی صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ شعرا اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔

خدا یا سالِ نو آئے کرم کا سا بیاں بن کر  
اٹھے سورج سحر کو رجتوں کا ترہماں بن کر  
ہر ایک موسم جو اس میں آئے ہو سکھ چین کا موسم  
چمن میں تازگی ہو، منہ دھلائے پھول کا شبنم  
اور ان خوش رنگ ساعتوں میں جہاں اپنوں کا،  
دوستوں کا قرب ہمارے لیے فرحت بخش ہوتا ہے وہاں  
کوئی نہ کوئی شعری تخلیق ہماری بہترین رفیق بھی ثابت  
ہوتی ہے۔

عجز کو اخلاص کو اپنائیت کو پیار کو  
آؤ دھوئیں گمشدہ تہذیب کے آثار کو  
۲۰۰۷ء کے خساروں میں سے ایک بڑا خسارہ  
ہمارا اپنی اقدار اور تہذیب و روایات سے دوری کا بھی  
ہے۔ بلاشبہ کسی بھی ملک کی ترقی، فلاح و بقا میں اس کا  
تہذیبی ورثہ جو مثبت سوچ کا مظہر ہو اہم کردار ادا کرتا  
ہے۔ ہم انجانے میں اپنی تہذیب سے دور ہوتے  
جارہے ہیں ماضی میں جو ہوا سو ہوا پر اب تو یہ سوچ کر  
جینا ہے کہ

وہی موسم ہے  
بارش کی ہلکی  
پیڑوں میں چھن چھن گونجتی ہے  
ہری شاخیں  
سنہری پھول کے زیور پہن کر  
تصور میں کسی کے مسکراتی ہیں  
ہوا کی اور حسی کارنگ پھر ہلکا گلابی ہے  
شنا سا باغ کو جاتا ہوا خوشبو بھرا رستہ  
تمہاری راہ نکلتا ہے  
طلوعِ ماہ کی ساعت  
تمہاری منتظر ہے  
نیک تمناؤں کے ہمراہ  
نیا سال مبارک ہو  
میری اور ادارہ پاکیزہ کی جانب سے تمام قارئین  
کو نیا سال نئی انگلیوں، نئی آرزوؤں اور ان کی تکمیل کی  
دعا کے ساتھ مبارک ہو۔

نئے سال کے نئے خواب ہیں، نئے موسموں کے گلاب ہیں  
یہ محبتوں کے چراغ ہیں انھیں نفرتوں کی ہوا نہ دے  
اخلاق کی پاسداری ہماری روایات کا خاص حصہ  
ہے اور اس میں بہت اہمیت ایقائے عہد کو حاصل ہے۔  
کیا ہی اچھا ہو جو ہم کیے وعدے اور عہد نبھانے کو اپنا  
شعار بنالیں ورنہ نئے برس پھر وہی پچھتاوا ہمیں ستائے  
گا کہ

جانے کن عجبتوں میں رہتے ہیں  
آنکھ جھپکی نہیں نیا سال آ گیا  
نئے سال کے آغاز سے ہی بعض لوگ اپنے برج  
کی سالانہ کارکردگی جاننے کے لیے بے چین رہتے ہیں  
اور ان میں سے کچھ تو اسی کی روشنی میں ہی اپنا لائحہ عمل  
مرتب کرتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا کہ

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض  
ایک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے  
جوستاروں کی چال پر یقین رکھتے ہیں وہ اسی



# شہزادی

نیلوفر عباسی



## آپس کی بات

اکثر ہوتا یوں ہے کہ جو ادیب، شاعر یا فنکار ہے وہ اپنے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، عموماً وہ اپنی شاعری اپنی تحریر، اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ذکر چاہتا ہے۔ کوئی اور آگے بڑھ جائے یہ بات اس کو کچھ بھاتی نہیں۔

قر علی عباسی، میرے شوہر عجیب و غریب عادات کے مالک ہیں۔ جہاں کسی میں تھوڑی سی بھی ادب و شاعری کی سوچ بوجھ اور دلچسپی نظر آئی اسے باور کراتے ہیں کہ اس میں ایک بڑھیا شاعر، عمدہ ادیب اور بڑا کالم نگار چھپا ہے، اسے بس راستہ ملنے کی دیر ہے اور یہ راستہ قر علی عباسی اسے دکھانے میں تن، من، و دھن سے لگ جاتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ وہ شخص جلد از جلد نام کمالے، مستند ادیب، شاعر بن جائے نہ صرف یہ بلکہ اس کا دیوان یا افسانوں کا مجموعہ بھی چھپ جائے۔ اس سلسلے میں صاحب معاملہ کی ہر ممکن عملدراہ نمائی بھی کرتے ہیں اور کتاب کیپروٹھ کرانے سے لے کر پبلشر کے نام، پتے

”کیوں نہیں ہر شخص کی زندگی، اس کا سفر ایک نئی، ایک افسانہ، ایک ناول ہوتا ہے جس میں لوگ، پڑھنے والے اپنے اپنے انداز سے اپنی دنیا کو دیکھتے ہیں۔ بس بات پیش کرنے کی ہوتی ہے لکھنا تو شروع کیجیے۔“

اب ہم قر علی عباسی کو کسے سمجھاتے کہ ہم میں وہ نہیں ہے کہ ان کی طرح قلم اٹھاتے ہی لفظوں کی سرورت دھنک ہمارے لئے بکھر جائے۔ لندن کی عالمی اردو کانفرنس پر گیا، برطانیہ، کینیڈا سے وقت بچنے والے سب بڑے اخبار اردو ٹائمز کی جانب سے منعقد کی گئی تھی۔

اور فون نمبر تک مہیا کرتے ہیں اور کتاب چھپ کر آنے لگتی ہے۔ ان میں جاسوسی پر اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے ان کی اپنی کتابوں کی بکس چلی کیشنز کی مالک فرست میں اضافہ ہو گیا ہو..... وہ ایسے ہی دوسروں کو درج رواں عذرا رسول بڑھتا دیکھ کر خوش ہونے والے ہیں۔ ایسے لوگ لکھنے میں۔ کانفرنس کے ایک سیشن میں ڈائجسٹوں کے ایک دن وہ اچانک بولے۔ ”آپ کو بھی تو لکھنے میں انہوں نے اتنی کھانے کا شوق تھا؟“

”جی.....!“ ہم نے مختصر ترین جواب دیا۔ ”تو پھر اب کیوں نہیں لکھتیں، افسانے لکھنا ان کی طبیعت اور طبع کے لوگ قائل ہو گئے۔“ وہ اس سچ سے اتڑیں تو کانٹیں۔ ”ہم نے وضاحت کی مگر وہ بھی بار بار ماننے والوں میں سے نہیں تھے بولے۔“

”تو پھر ایسا کریں اپنی یادیں قلمبند کریں اور کوئی نیا سوانح حیات لکھیں۔“

بات یاد آگئی۔ ”لکھیں..... اب لکھیں۔“ جنوری 2007ء میں ہم لوگ نیویارک سے کراچی آئے تو مصروفیت بے انتہا ہماری بھی تھی اور عذرا رسول کی بھی، بلکہ عذرا کو شدید بخار اور فلو نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے قر علی عباسی اور ہمارے لیے ایک پُر تکلف نشست کا اہتمام کیا، اس نشست میں ان کی چیدہ چیدہ رائےز بھی موجود تھیں۔



جن سے ملنا بے حد خوشی کی بات تھی۔ عذرا کے ساتھ پاکیزہ کی ایڈیٹر انجم انصار اور دلکش کی ایڈیٹر زہت اصغر بھی اہتمام و انتظام میں مصروف تھیں۔ اس نشست کے



اختتام پر ادارے کی جانب سے قرعہ عبا کی کوشیلڈ اور کیش پرانز بھی پیش کیا گیا، مجھے غمزدار نے ایک بہت خوبصورت سوٹ تحفے میں دیا اور بولیں ”نیلو سے تو ہم نے کہا تھا کہ ہمارے لیے لکھیں یہ بھی ہماری رائٹر ہوتیں تو رائٹر کی شیلڈ ہم انہیں بھی دیتے۔“

انجم انصار بولیں۔ ”ہاں، ہاں کیوں نہیں آپ لکھیں، اب لکھیں۔“

نزدہت اصغر کا بھی اصرار ہوا۔ ”آپ لکھیں۔ دل چاہا ان سے کہیں ”برڈس یوٹو“

جب اتنے عزیز اتنے پیارے لوگوں کا اتنا اصرار ہو تو آپ تو خوش قسمت ہوئے۔ اس خوش قسمتی میں اضافہ اس وقت اور ہو جائے اگر پڑھنے والوں نے میری چند لائنوں کو بھی پسند کر لیا، پسند آئے تو اس کے ذمے دار قرعہ عبا، غمزدار رسول، انجم انصار، نزدہت اصغر اور نہ پسند آئے تو مجھی۔۔۔۔۔

نام کا مرحلہ فوراً سامنے آ گیا۔ یادیں، سوانح حیات جو بھی ہے اس کا کوئی عنوان تو ہونا چاہیے، میرے بیٹے وجاہت علی عباسی نے کہا۔ ”نام کچھ ایسا ہو کہ فوراً اندازہ ہو جائے کہ کس شخصیت کی یہ یادیں ہیں۔ آپ کا سیریل شہزوری اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کے ذہنوں میں روز اول کی طرح تازہ ہے، جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، ریپٹ ٹیلی کاسٹ اور U-tube پر دیکھ کر جانتے ہیں کہ نیلو فر عباسی ہی شہزوری ہیں۔“

آپس کی باتیں، دل کی باتیں کیا بھی ختم ہوئی ہیں۔ ان کا کوئی سرا نہیں، نہ شروع ہونے کا اور نہ ختم ہونے کا یہ تو دراز سے ردا زتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب دل کی باتیں آپ سے انہی صفحات پر ہوں گی ”شہزوری“ کی صورت میں انشاء اللہ!

شہزادو

موسم دلوں میں اترتے ہیں، انسان خوش ہو تو ہر طرف بہار ہے اور ادا اس ہے تو۔۔۔۔۔

دل تو میرا اداس ہے ناصر شہر کیوں سامیں سامیں کرتا ہے

ہندوستان کے علاقے اتر پردیش (یو پی) میں ہر موسم اپنی توانائیوں اور دلکشی کے ساتھ اپنے رنگ دکھاتا ہے۔ سادہ آتا ہے تو ایسی چھب کے ساتھ کہ بیٹروں میں جھولے پڑ جاتے ہیں۔ چڑھوں پر کڑا ہیاں چڑھ جاتی ہیں اور صدائیں گونجنے لگتی ہیں۔

اماں میرے باوا کو بھیجی کہ سادہ آیا سردیاں آتی ہیں تو دانت سے دانت بجا دیتی ہیں اور گرمیوں میں تو پینہ چوٹی سے ایزی تک بہہ آتا ہے۔

جون 1919ء کی بات ہے۔ یہ مہینہ اپنی تمازت اور حرارت بکیر کر ختم ہو رہا تھا کہ اس کے آخری دن 30 جون کو شعلہ عظیم گڑھ کے ایک قصبے ”نرونی“ میں شفاعت احمد خان کے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آج ان کے یہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ عظیم گڑھ کے لوگ علم و ادب اور عقل و فضیلت میں ایک مقام رکھتے ہیں شاید اسی لیے اس بچے کو ”علیم“ کا نام دیا گیا۔ علیم الدین خان۔

شفاعت احمد خان اور ان کی بیوی رسول بانڈی کے یہاں علیم الدین خان کی پیدائش کے بعد ایک اور بیٹا شہاب الدین خان اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں اور یہ گھر انا ایک مکمل خاندان بن گیا خوشیوں مسرتوں اور بچوں کے تہمتوں سے بھرپور۔

شفاعت احمد خان ایک بڑے رئیس زمین دار تھے اس لیے علیم الدین خان۔۔۔ کی پرورش اسی طرح ہوئی جس طرح ایک ایسے گھرانے کے بچے کی ہوتی چاہیے تھی۔ لاڈ پیار باز و نعم لیکن علم اور تربیت پر بھی کیا ہاں توجہ یہی وجہ تھی کہ چھوٹی سی عمر میں قرآن پاک کے کچھ سپارے حفظ کر لیے۔

شفاعت احمد خان کا رنگون میں بہت بڑا بزنس تھا جب علیم الدین خان اسکول جانے کی عمر کے ہوئے ان کے والد انہیں اپنے ساتھ رنگون لے گئے اور پال سینٹ پال اسکول میں داخل کروا دیا۔ یہاں ان کے جوہر کھلے نہ صرف پڑھائی میں اول بلکہ غیر افسانہ سرگرمیوں بھی آگے آگے۔ کل ایشیائی بنیادوں

پینٹنگ کے مقابلے میں علیم الدین خان کی بنائی پینٹنگ کو اول قرار دیا گیا اور فریم سے نکال کر چانچ کر تصدیق کی گئی کہ یہ ہاتھ سے بنائی اور رنگ بھری گئی ہے۔ چھٹی ہوئی تصویریں کسرے سے۔ کھیل کے میدان میں بھی یہ اول تھے۔ ہاکی کے بہترین سینئر فاروڑ۔ ہانی جھپ، پول جھپ اور سوئٹری دوڑ میں کوئی ان کا برہم قابل نہ تھا۔ سوئٹری ریس میں ان کی رفتار کو دیکھ کر اسٹڈیم میں موجود لوگ کہتے۔ ارے یہ لڑکا دوڑ نہیں اڑ رہا ہے۔

یہ تمام مقابلے کل ایشیائی بنیادوں پر ہوتے تھے۔ ہر ایچا اور بڑا اسکول یہ چاہتا تھا کہ یہ ہونہار طالب علم ہمارے اسکول میں آ جائے۔ سینٹ پال سے سینٹ کیریلز کا نو سینٹ گئے جہاں ”نمایاں طالب علموں“ کی جتنی پراچ بھی ان کا نام کندہ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایسے اسکولوں میں داخلہ ملنا اور پڑھنا ہی ایک اعزاز تھا اور علیم الدین خان نے زندگی میں ایسے بہت سے اعزاز حاصل کیے۔ ان دنوں لکھنؤ کا کرچن کان ایک نامور اور مستند درگاہ تھی۔ ان کے والد چاہتے تھے عظیم گڑھ اور لکھنؤ کی تہذیبوں کا نکھار ان کے بیٹے میں نظر آئے۔ یہ شہر تہذیب و تمدن، علم و ادب اور روایات کی بستی تھے۔ اس ہونہار طالب علم نے اس کے سارے رنگ اپنے اندر سمو لیے اس ماحول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی تھی۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے علیم الدین خان نے الہ آباد یونیورسٹی کا انتخاب کیا۔ اس شہر کو اعزاز حاصل تھا کہ یہاں آزادی ہندی تحریک کے ایک جوشیلے کارکن پنڈت جواہر لعل نہرو رہتے تھے جن کی رہائش گاہ الہ آباد یونیورسٹی کے نزدیک ہی تھی۔ علیم الدین خان بھی وطن کی آزادی کے خواہشمند تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان کی بہن وجے لکشمی پنڈت کے ساتھ بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ یہ جنگ آزادی تھی جس میں ہر نوجوان ایک سپاہی تھا۔ جب جنگ جیتی جاتی ہے تو اس کا سارا سہرا کمائندہ کے سر ہوتا ہے۔ سپاہی گمنام رہتا ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی میں ہر استاد اپنی ذات میں ایک ادارہ تھا۔ ان میں سے بیشتر کا خیال تھا کہ علیم الدین

خان جیسا طالب علم ایک جوشیلہ لہڑا، ایک ممتاز شاعر اور بے مثال ادیب بنے گا اور ایسا ہوا بھی۔ وہ جتنی خوبصورت اُردو لکھتے تھے اتنے ہی جامع انداز میں انگریزی زبان میں بھی اظہار خیال کرتے، عظیم گڑھ کی مٹی لکھنؤ کے ماحول اور الہ آباد کی تعلیم و تربیت نے ان کو ادب کے کوپے میں داخل کر دیا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی کتاب ”یادیں“ میں ممتاز طالب علموں کا ذکر کرتے ہوئے علیم الدین خان کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی سے جب فارغ التحصیل ہو کر یہ واپس عظیم گڑھ آئے تو والد کی خواہش تھی کہ یہ ان کے بزنس میں ہاتھ بٹائیں، ان کے والد کارنس میں بھاگنے والے گھوڑوں کا بزنس تھا۔ رنگون برما میں علیم الدین خان جنگ آزادی کے سپاہی تھے وہ ملک و قوم کے لیے لڑنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک جہالت سے زیادہ انسان کا کوئی دشمن نہیں تھا انہوں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ وہ علم کو پھیلانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں گے، والد نے یہ سنا تو سمجھا یا پہلے اپنے گھر، خاندان اور شہر کی طرف توجہ کریں لیکن انہوں نے کہا پورا ہندوستان میرا گھر ہے اگر یہاں علم کی روشنی پھیل جائے تو میرا گھر بھی روشن ہو جائے گا۔ ایک دن اخبار میں آرمی ایجوکیشن کوری آسامیاں نکلیں، انہوں نے درخواست دی، انٹرویو ہوا اور یہ منتخب ہو کر فتح گڑھ چھاؤنی کے آرمی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی پوسٹ پر تعینات ہو کر کام کرنے لگے۔ یہ خواہش تو پوری ہوئی، کتابیں ان کی زندگی میں یوں داخل ہوئیں کہ پڑھاتے پڑھاتے اور کتابیں پڑھتے خود بھی لکھنے لگے، ان کا زیادہ تر رجحان تنقید کی طرف تھا۔

فتح گڑھ میں علم و ادب کی فضا تھی، شہر میں نوجوان ادیب، شاعر، نقاد مل بیٹھے تھے شعر و ادب کی محفلیں جھپٹیں، تنقیدی نشستیں ہوتیں اور پھر ان نوجوانوں نے فل کر ایک ادبی انجمن کی بنیاد رکھی جو نہایت فعال ثابت



ہوئی یہاں سے نوآموز اور ابھرتے ہوئے نوجوان آئندہ چل کر بلند پایہ ادیب و نقاد ثابت ہوئے۔

فتح گڑھ میں ایک بڑی جوبلی تھی اس کا دروازہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں سے ہاتھی گزر سکتا تھا۔ یہ احسن منزل تھی جہاں ایک ہنستا ہستا خاندان رہتا تھا۔ پانچ بیٹے، تین بیٹیاں اور بہت سے دوسرے فرشتے دار احسن منزل کو خوشیوں کا گہوارہ بنائے ہوئے تھے، اس گھر ان کے سربراہ محمد احسن فرخی کا تعلق فرخ آباد سے تھا۔ اور نگ زیب کے پڑپوتے اور مغل شہنشاہ فرخ سیر کے نام پر یہ شہر بسایا گیا تھا۔

محمد احسن کا گھریلو کاروبار تھا، اسی لیے انہوں نے آنے والے وقت کو پیمانہ لیا تھا۔ خاندان کی مخالفت کے باوجود انہوں نے اپنے تمام بچوں کو تعلیم دلائی حالانکہ اس وقت مسلمان گھرانے کی لڑکیوں کا اسکول جانا پابند یہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ محمد احسن کی بیگم نادر جہاں لکھنؤ سے بیہ کر آئی تھیں اور خود بھی تعلیم یافتہ تھیں، تعلیم کی اہمیت کو سمجھتی تھیں اس لیے میاں بیوی نے مل کر اپنے بچوں کو ہر ممکن تعلیم دلائی تاکہ بدلتے وقت کے ساتھ وہ شانہ بشانہ چل سکیں۔

محمد احسن کے تمام بچے خوش شکل اور ذہین تھے لیکن ایک بیٹی اقبال جہاں کو حسن و ذہانت قدرت نے دل کھول کر عطا کی۔ ایسی کہ جو دیکھ لے وہ اللہ کی تعریف ضرور کرے جو ساری دنیا کے حسن اور خوبصورتی کا خالق ہے۔

اقبال جہاں نہ صرف حسین و ذہین تھیں بلکہ اخلاق اور عادات میں بھی ایسے انسان کم کم ہوتے ہیں۔ نہ اپنے حسن پر نازاں نہ اپنی ذہانت پر غور، سلیقہ مند ایسی کہ سلائی، کٹائی اور نٹنے پکانوں میں ماہر، عید، بقر عید جب جو ملی کی ڈیوڑھی میں درزی شیشیں رکھ کر بیٹھتے اور خاندان کے افراد کے کپڑوں کی تیاری ہوتی تو یہ بھی کسی درزی سے سوئی ہاتھ میں لے کر کہتیں۔ ”دیکھیں ہم بھی درزی ہیں۔“

اقبال جہاں کو ہزاروں اشعار پوری پوری نظمیں

اردو، فارسی کی از بر تھیں۔ اسکول میں وہ اپنی استانیوں کی پسندیدہ شاگرد تھیں۔

محمد احسن کے سب سے بڑے بیٹے اسلم فرخی تھے۔ نہایت ذہین اور فعال نوجوان، علم و ادب اور شاعری سے گہرا لگاؤ۔ یہ ایک ادیب و شاعر کی حیثیت سے ابھر رہے تھے، شہر میں قائم ہونے والی نوجوانوں کی ادبی تنظیم کے بانیوں میں سے تھے۔ جس کی نشستوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے۔ یہیں ان کی ملاقات علیم الدین خان سے ہوئی جو ہم ذوق اور ہم خیال ہونے کی وجہ سے دوستی میں تبدیل ہو گئی۔

بڑا بیٹا ہونے کے ناتے اپنے گھر، خاندان اور بہنوں کی شادی بیاہ کے معاملات میں اسلم فرخی اپنے آپ کو اپنے والد کے ساتھ برابر کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ جب گھر کی بڑی بیٹی اقبال جہاں سترہ برس کی ہوئیں اور ان کی شادی بیاہ کی بات چیت شروع ہوئی تو اسلم فرخی کی نظر انتخاب ذہین اور پڑھے لکھے نوجوان علیم الدین خان پر پڑی۔ اسلم اور اقبال ان دو بہن بھائیوں میں دوستانہ بھی بہت تھا اور ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کو سمجھتے بھی خوب تھے۔ اسلم فرخی جانتے تھے کہ ان کی بہن روشن خیال، پڑھی لکھی اور علم و ادب کی دلدادہ ہیں اور ان کے لیے ایک صاحب علم اور وسیع النظر شخص کا زندگی بھر کا ساتھ ضروری ہے۔ کہاں یونی (اتر پردیش) کا مشرقی حصہ اعظم گڑھ اور کہاں فتح گڑھ، فرخ آباد۔ مگر یہ سچ ہے کہ جوڑے آسانوں پر بیٹے ہیں اس لیے علیم الدین خان، فرخی خاندان کے داماد بن گئے۔ یہ پاکستان بننے کے بعد کی بات ہے۔

پاکستان وجود میں آچکا تھا اور اپنے وطن کی محبت میں سرشار مملکت اسلامی کے شہری کہلانے کے تقاضے کے ساتھ جینے کے لیے ہزاروں لوگ روزانہ ہجرت کر کے ہندوستان سے پاکستان کا رخ کر رہے تھے۔ پاکستان بنانے، پاکستان حاصل کرنے کے لیے کتنے لوگوں نے اپنی جان کے نذرانے پیش کیے، کتنے بھرے پُرسے خاندان اجڑ گئے۔ کتنے باپ اور بھائیوں نے اپنی

نظروں کے سامنے اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو اجڑتے مارتے دیکھا اور کتنی ماں اور بہنوں نے اپنے کڑیل بچوں اور بھائیوں کو ذبح ہوتے ان کے جوان جسموں سے خون کے فوارے اگلے دیکھے، کتنی گودیں اجڑ گئیں کتنی ماؤں کے لال نظروں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ پھر بھی نہ پلٹ سکے جو گھر انے ہندوستان میں جدی پشتی رہیں تھے، جن کی جو بیٹیوں کے دروازوں پر ہاتھی چھوٹے تھے وہ پاکستان آ کر کہیں دو کمروں کے فلیٹ تو کہیں ٹین کی چادروں والے کوارٹرز اور کہیں جمہوریوں، کیپیوں میں پناہ گزین ہوئے۔ جن کی بیٹیاں ڈولی میں بیٹھتی تھیں تو کہہ رہے تھے کہ پردہ ڈال لیتے تھے وہ بغیر دوپٹے غنگے چڑھ سروس میں خاک، حسرت و یاسیت کا مریخ بنی کیپیوں، کیپیوں اپنے پیاروں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آج اتنی دہائیاں گزرنے کے بعد بھی ان میں سے بہت سے لوگ زندہ ہیں۔ ان کی یادداشتیں بھی صحیح کام کر رہی ہیں۔ ان کے پاس پیٹھ کران سے یہ سچی کہانیاں سنیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنا وطن اپنی آزادی کس جدوجہد کی قربانیاں دے کر حاصل ہوتی ہے۔ جن پہ گزری ہے جن پر گزرتی ہے وہی جانتے ہیں وہی محسوس کر سکتے ہیں ورنہ جن کے دل میں گداز نہیں جن کی روح آزادی اور ملکیت کے جذبے سے سرشار نہیں ان کو یہ احساس کہاں ہو سکتا ہے۔ انسان کی معمولی سی چیز بھی کھو جانے تو نظریں اسے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کا تو بہت کچھ کھو گیا تھا، لٹ گیا تھا، تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ نہ صرف گھر بار، روپیہ پیسہ، سب سے پیارے اور عزیز رشتے۔۔۔۔۔ آنکھوں کے سامنے کٹ گئے، مر گئے، کھو گئے تھے۔ ان تمام سانحوں، غموں، دکھوں اور آنے والے زمانے کی بے یقینی کی کیفیات کے باوجود ایک جذبہ ایسا تھا جو ان سب کو توانائی، خوشی اور عزم سے سرشار رکھتے تھا۔ آزادی۔۔۔۔۔ اپنا وطن۔۔۔۔۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا شہری ہونے کا اعزاز و فخر۔۔۔۔۔ اس جذبے سے سرشار محمد احسن کے سب سے بڑے بیٹے اسلم فرخی پاکستان آ گئے یہاں کے حالات کا جائزہ

لینے۔ حالات کچھ بہت زیادہ امید افزا تو نظر نہیں آتے لیکن ”اپنا وطن“ والا جذبہ ہر چیز پر حاوی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان سے ہندو اور ہندوستان سے مسلمان اپنے اپنے گھر، کاروبار چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ کراچی میں ہندوؤں کے بڑے بڑے مکانات اور بنگلے مع ساز و سامان کے خالی پڑے تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھانے والے لوگ اس وقت بھی جی بھر کر فائدے اٹھا رہے تھے۔ مال غنیمت سمجھ کر ان خالی مکانوں، بنگلوں، بلڈنگوں پر قبضہ کر رہے تھے۔ اسلم فرخی بھی نہایت آسانی سے یہ سب کچھ کر سکتے تھے لیکن ان کی تربیت اور فطرت ایسی نہ تھی کہ بغیر اپنی محنت اور جدوجہد کے کسی کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے کا سوچتے۔ انہوں نے پاکستان چوک کے علاقے میں واقع ایک ایسی بلڈنگ کا انتخاب کیا جس کا ہندو منیجر دھرمی رام موجود تھا اور کچڑی وصول کر کے فلیٹ ماہانہ کرایے پر دے رہا تھا۔ اسلم فرخی نے پاکستان چوک کے علاقے کا انتخاب اس لیے کیا کہ اس کے نام کے ساتھ ”پاکستان“ لگا تھا دوسرے یہاں اسکول، کالج بڑی تعداد میں تھے بلکہ شہر کے تمام نامی گرامی تعلیمی ادارے بالکل اسی چوک کے اطراف میں یا چند منٹ پیدل کے فاصلے پر تھے۔ ڈی جے سائنس کالج، این ای ڈی انجینئرنگ کالج، ڈاؤ میڈیکل کالج، ایس ایم آرٹس کالج، ایس ایم سائنس کالج، ایس ایم لا کالج، گورنمنٹ کامرس کالج اور سب سے بڑھ کر سندھ مدرسہ ہائی اسکول اور کے ایم ای مشن روڈ پر واقع اسکول جہاں کا اعزاز یہ ہے کہ وہاں بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پاکستان چوک پر اس وقت ایک بہت بڑی اور عالی شان بلڈنگ تھی ”برٹش کونسل“۔ یہی منزل عمارت برٹش کونسل لائبریری کی تھی جس کے ہر فلور پر ہزاروں کی تعداد میں کتابیں تھیں۔ بچوں کی کتابوں سے لے کر آرٹس سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن کیا علم کا خزانہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اسلم فرخی کے لیے یہ انتہائی خوشی اور اطمینان کی بات تھی کہ ان کے چھوٹے بہن بھائی آئیں گے تو ان اداروں



سے ان کتابوں سے بہ آسانی فیضیاب ہو سکیں گے۔ وہ واپس ہندوستان گئے اور جب دوبارہ پاکستان واپس آئے تو ان کے..... ساتھ والد، والدہ، بانی، رشتے کی بہن، باجی آپا، چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔

محمد احسن کھاتے پیتے متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ خاصی چائید چھوڑ کر آئے تھے لہذا اس کا کلیم بھرا جس کے نتیجے میں کھاراد کے علاقے میں ایک بہت بڑی زمین الٹ ہو گئی۔ اس زمین پر کچھ کمرے بھی بنے ہوئے تھے، یہاں محمد احسن نے مٹھیں نصب کروا کر ایک کارخانے کی بنیاد رکھی۔

اسلم فرخی کو ریڈیو پاکستان میں ملازمت مل گئی۔ ریڈیو میں ملازمت کا مطلب ہوتا تھا پڑھے لکھوں کی صحبت میسر آتا۔ ایسی شخصیات سے تعلق کہ جو نہ صرف آپ کے علم اور وسعت نظر میں فروغ کا باعث بنتے بلکہ آپ کی تربیت اور شخصیت نکھار میں اپنی مددگار ہوتے۔ ان میں سے ہر شخص اپنی ذات میں انجمن تھا۔ اسلم فرخی نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور باقی بہن بھائیوں کی بھی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ جوڑا۔

علیم الدین خان اپنی اہلیہ اقبال جہاں کے ساتھ ہندوستان (فتح گڑھ یو پی) میں رہ گئے تھے۔ ان کے خاندان میں ایک نئے مہمان کی آمد آمد تھی اور پھر اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹی کی شکل میں انہیں اولاد کی نعمت سے نوازا۔ وہ دونوں بے حد خوش تھے۔ انہوں نے اس کا نام رکھا نیلوفر۔ نیلوفر علیہم خان۔

وقت کے ساتھ ساتھ اقبال جہاں کی شدید خواہش تھی کہ اپنی بیٹی کو اپنے والدین اور بھائی بہنوں کو دکھائیں۔ ان لوگوں کی بھی پاکستان میں یہی خواہش تھی کہ جلد از جلد بچی سے ملیں کہ وہ اس خاندان کی پہلی نواں تھی۔ پاکستان جانا اتنا آسان نہ تھا، علیم الدین خان کی فوج کی نوکری۔ ان کے والد کی لمبی چوڑی زمینداری، وسیع و عریض کاروبار، زمین، جائیداد جس کے وارث علیم الدین خان اور ان کے بھائی شہاب الدین خان تھے۔ علیم الدین کے پاکستان ہجرت کرنے

کی صورت میں ان کے والد کی آدمی جائیداد اور زمین بچ کر رکھنا ہو جاتی، اتنی بڑی زمینداری، جائیداد اور کاروبار چھوڑ کر شفاعت احمد خان پاکستان ہجرت کرنے پر تیار نہ تھے۔ نیا ملک، نئی زمین نہ جانے وہاں کے حالات کیسے ہوں؟ زمین دار، جاگیردار آسائشوں کے عادی..... نئی اور مشکلات کے بارے میں سوچتے بھی ڈرتے تھے۔ وہ تو علیم الدین خان کو بھی اس سوچ سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ”تمہاری بیٹی بھی ہو گئی ہے۔ یہاں مکمل آرام و آسائش سے لپے کی نئی جگہ لے جا کر مشکلات میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کی ہے تم کو یہاں.....“ مگر پاکستان اور آزادی نہ صرف علیم الدین خان کا خواب تھا بلکہ انہوں نے اس کے لیے جدوجہد بھی کی تھی باقاعدہ تحریک میں حصہ لیا تھا۔ جوش و خروش سے نعرے لگاتے تھے ”لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان“ تن، من، دھن سے اپنی سرزمین پر بسنا چاہتا تھا۔ اسی جذبے کی شدت تھی کہ وہ خاموشی سے ہر چیز سے دستبردار ہو کر اپنی بیوی اور چند ماہ کی بیٹی کو لے کر پاکستان آ گئے۔ اسی فلیٹ میں جہاں ان کی بیوی اقبال جہاں کا پورا کتبہ رہائش پذیر تھا۔ ان لوگوں نے ان کا خوشدلی سے استقبال کیا خاص طور سے نیلوفر کا جس کو وہ سب پیار سے نیلو پکارتے تھے۔

یہ سب خوش تھے، مطمئن تھے۔ نہ جگہ کی تنگی کی شکایت نہ اپنی کوششوں، جویلیوں کو چھوڑ کر آنے کا ملال۔ مسرور تھے ایک آزاد اسلامی مملکت کے شہری ہونے پر، آج سوچیں تو تصور نہیں آتا کہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں مختلف عمروں، مختلف مزاجوں کے اتنے سارے افراد کا گزر بسر ناول انداز میں کیسے ہوتا تھا اب جب کہ گھروں میں ڈرائنگ، ڈائننگ لاونڈری اور کچن کی ٹیبلٹ اور ہوتے ہیں وہاں ایک دوسرے سے عجیب سی بیزاری اور کوفت کی کیفیت طاری رہتی ہے۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

## بہنوں کی محفل

انجم انصار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ جان! بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

محمد ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو جو بدبخشا اور درود سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہنوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

\*\*\*

نیا عیسوی سال آپ سب کو مبارک ہو۔ خدا کرے یہ سال تمام مسلمانوں کے لیے خوشیوں اور شادمانیوں کی ایک نئی بارگاہ کرنے کا موجب بنے، آمین ثم آمین!

ہماری یہ ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ اس محفل میں آپ کے خطوط ایسے دلچسپ اور قریبے، قاعدے والے ہوں کہ ان کو پڑھ کر سب کے منہ سے بے اختیار ”واہ“ نکلے۔ اس لیے اب آپ مزید کمر کس کر اس محفل میں شریک ہوں کہ آئندہ اسے سب سے بہترین خط پر شمیم فضل خالق کی کتاب تحفے میں بھیجی جائے گی۔ شمیم بہن کی دلچسپ اور مزے دار کتاب ”سارے باس پہنچ چکی ہے“ بلکہ کتابیں پہنچ چکی ہیں جو ہر ماہ اس بہن کو دی جائے گی جس کا تمبر بہت اچھا ہوگا۔ ہاں طویل مضمون لکھنے سے پرہیز کریں آپ کا تمبر کا پی کے دو صفحات سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

گزشتہ ماہ میں نے بزم پاکیزہ کے سوالات کے ہمراہ شائشی کارڈ یا کانچ یا اسکول کارڈ بھیجنے کے لیے کہا تھا..... بہت سی بہنوں نے خطوط کے ہمراہ بھی کارڈ بھیجے ہیں۔ خطوط کے لیے اس قسم کی کوئی شرط نہیں ہے..... دراصل حافظ طلوع والے چاہتے ہیں کہ ان کا حلوہ پاکستان میں ہر بہن کے گھر جائے۔ اس لیے اب آپ خوب مختارے دار سوالات بھیجیں۔

نیلوفر عباسی شوبز کے حوالے سے ایسی شخصیت ہیں جو کل بھی پسندیدہ تھیں اور آج بھی ہیں..... ان کی شخصیت میں خود کار اور حکمت ہے..... اس کی سب سے بڑی وجہ ان کے اپنے خاندان کے اثرات ہیں..... نیلوفر کی آپس کی باتیں آپ اب باقاعدگی سے پڑھیں گی..... اور یقیناً نیلوفر کے ساتھ ساتھ آپ کی بہت سارے لوگوں کے بارے میں معلومات بھی پڑھیں گی..... یہ پہلی قسط کیسی رہی؟ اس بارے میں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

\*\*\*

نئے عیسوی سال کا یہ پہلا شمارہ ہے۔ آئیے پہلے دو شریف پڑھ لیں (جو نماز میں پڑھا جاتا ہے) ابھی پڑھ لیں۔

\*\*\*

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ سرگرمیاں

\*\*\*

معروف ادیب اور جاسوسی پلی کیشنز کے جنرل منیجر جناب قلم علیم کے بیٹے بلال کی شادی افشین کے



ساتھ خبر دوغنی کے ساتھ ہوئی۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛۛ پاکیزہ کی مقبول اور محبوب مصنفات ناہید سلطانہ اختر اور شیریں حیدر ان دنوں ٹی وی کے مختلف چینل کے لیے سیریل لکھ رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

کرکٹ کے حوالے سے معروف شخصیت جناب منیر حسین کے بیٹے اور شہینہ منیر کے بھائی اختر کی شادی نازلی کے ساتھ سترہ دسمبر کو کراچی میں ہوئی۔ انیس دسمبر کو گولف کلب ڈی ایچ اے میں ویدہ ہواجس میں کرکٹ اور صحافت کے لوگوں نے بھی شرکت کی۔

ۛۛۛ گزشتہ دنوں شاعرہ اور افسانہ نگار رمینی احمد کی بہن شاہانہ احمد کی شادی محمد سلطان کے ہمراہ مقامی لان میں ہوئی۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛۛ جاسوسی پبلی کیشنز سے وابستہ محمد اختر بیگ کی بہن شہینہ نازی کی شادی محمد عمران کے ساتھ 24 نومبر کوئی ہوئی۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛۛ اہنامہ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ رابعہ اسلم وڑائچ رحیم یار خاں کی شادی چار جنوری کو عمران کے ساتھ ہو رہی ہے۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛۛ پاکیزہ کی مستقل قاری عائشہ شہیل کی شادی تنویر اقبال سے 17 دسمبر کو خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛۛ پاکیزہ کی مستقل قاری بہنیں ربیما اور انیلا کے بڑے بھائی نوفل پرویز اقبال کی شادی کنول سے خوب دھوم سے ہوئی اس شادی میں شرکت کرنے کے لیے انیلا نوید اور فہدہ بی سے کراچی آئے۔ (بے حد مبارکباد)

ۛۛۛ شاعرہ یاسمین کنول راجپوت، پسرور کے بیٹا ہوا ہے جس کا نام محمد عبداللہ رکھا گیا ہے۔ (مبارکباد)

پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ یاسمین کنول، پسرور کا پہلا شعری مجموعہ ”خاشا جب کلام کرتی ہے“ شائع ہو گیا ہے۔ خوبصورت سرورق صفحات 144 اور قیمت صرف 200 روپے ہے۔ کتاب منکوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ مقصود

پبلشرز، سرور مارکیٹ، اردو بازار۔ لاہور

ۛۛۛ پاکیزہ کی مستقل قاری آمنہ مشیر، نیویارک کی بیٹی غزل مشیر کی شادی 29 دسمبر کو تیسو چھٹائی سے ہو رہی ہے۔ غزل نیویارک سے رخصت ہو کر ورجینیا جا رہی گی۔ (بے حد مبارکباد اور بہت ساری دعا میں)

ۛۛۛ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ عالیہ طاہرہ رفیقی، لاہور کے بھائی حماد رضا کی شادی عدیلہ ضیا کے ساتھ 25 دسمبر کو سرگودھا میں خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ (مبارکباد)

ۛۛۛ افسانہ نگار فرحانہ ناز ملک، ڈیرا غازی خان کے آٹھ سالہ بیٹے ملک دانیال نے قرآن پاک پڑھ لیا ہے۔ اس خوشی میں انہوں نے اس کی آئین کی تقریب کی۔ (ماشاء اللہ) فرحانہ ناز ملک کے حوالے سے دوسری خوشخبری یہ ہے کہ ان دنوں وہ ایم اے کا امتحان دے رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

ۛۛۛ ہماری نئی افسانہ نگار طاہرہ حسین کی والدہ ان دنوں بستر علالت پر ہیں ان کی صحت یابی کے لیے ضرور دعا کریں۔

ۛۛۛ سینئر قلم کار ایم۔ کے صوفیہ، کراچی ان دنوں علیل ہیں ان کی صحت یابی کے لیے دعا کے لیے التماس ہے۔

ۛۛۛ حیدر آباد کی ایک بزرگ شخصیت جناب عبدالحق کی صاحبزادی نگہت انتقال کر گئیں۔ ان کے لیے ایک بار سورۃ اخلاص پڑھ کر مغفرت کی دعا کریں۔

ۛۛۛۛ

کچھ نسیم آمنہ شاہ، کراچی سے۔ ”میں نے سوچا کہ آیا یہ بلا و اختتام کو پہنچے پھر خط لکھوں گی۔ اتنی معلوماتی

ماثر ٹکنز تحریر تھی کہ تعریف کے الفاظ نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ہلکے ہلکے انداز کی گھریلو باتوں کی وجہ سے دلچسپی کا عنصر آخر تک برقرار رہا۔ یقیناً اسے ”رہنما عمر“ کے طور پر سنبھال کر رکھا جاسکتا ہے۔ پاکیزہ میں ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے ناہید سلطانہ اختر کا ناول پڑھتی ہوں۔ ہوا، ریت اور آگن میں اس بار جو ہوادہ غیر متوقع نہیں تھا۔ جیسا کہ ارفع کے سرالیوں کا رویہ تھا۔ شادی سے پہلے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ تیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ ارفع کے والدین اسے اتنے سمجھدار اور جہانگیرہ ہونے کے باوجود یہ سامنے کی بات نہیں دیکھ سکے۔ بہر حال اگر یہ شخص ایک کہانی ہے تو یونانی اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہی آگے بڑھتی ہے اور اگر حقیقی واقعات پر مبنی ہے تو بھلا تقدیر سے زیادہ دور آدروکون ہے، دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ امرتیل بھی اچھا ناول ہے۔ لگتا ہے اس میں زندگی کی مزید دلچسپ حقائق سامنے آئیں گی۔ سائرہ عارف کے خواب آنکھیں، خواہش چہرہ نے یہ تجسس مزید بڑھا ڈالا کہ ایسے نامساعد حالات میں شہینہ نے کیونکر اپنا مقام حاصل کیا۔ صائبر اکرم کے ناول میں انسانی رشتوں کی کھلی باغیالی پر حیرت بھی ہوئی، افسوس بھی ہاں مگر یوں بھی ہوتا ہے آدرا کے حال تو ہونا ہی تھا۔ روحی بھابی کا کردار کسی نفسیاتی کمی کا شکار تھا۔“ (آمنہ بہت عرصے بعد آئیں۔ تبصرے کے لیے ممنون ہوں)

کچھ عالیہ حراء، کراچی سے۔ ”آپ کی عمر کے کا سفر نامہ تو اس قدر مکمل اور جامع ہے کہ بس! پہلے سے زیادہ ماثرتکن ہے پڑھ کر دوبارہ پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ خاص طور پر اکتوبر کی قسط بہت جاندار تھی میں نے دوسرے پڑھی۔ تمام قارئین بہنوں کا شکریہ جو میری تحریر کو اتنا پسند کیا۔ یہ آپ لوگوں کی محبت ہے جو وقت اور محبت مجھے دیتے ہیں۔ بے حد شکریہ..... فصیحہ آصف خان اور عرشہ آپ دونوں کو سلام خلوص محبت، خدا کرے اس سال آپ کی تمام دعا میں پوری ہوں، آمین۔ شیریں حیدر اتنے انسوا، آئی آپ میں بھی کریں اور ناہید سلطانہ اختر آپ کو کیا ہو گیا اتنی دلچسپ انکچول سمجھدار اور پیاری ارفع کے ساتھ آپ کیا کر رہی ہیں۔ کہانی بننے کے لیے آپ نے اس کی سمجھداری کو ہی کہیں لگا دیا یا یہ بڑھ کر اپنا قلم..... ایسی ہوتا ہے۔ شائستہ زریں بھی، بھی مجھے بھی یادوں میں یاد رکھا کریں۔ عالیہ حراء کے نام سے نہ بھی مسرتیم کے نام سے ہی سہی۔ سعدیہ ہاشم بے حد مبارکباد، امی کی طبیعت کیسی ہے۔ بہت سلام کہنا اور کہاں غائب ہو جاتی ہو۔ شاعری میں نکھار آتا جا رہا ہے۔ یہ محبت کا کمال ہے یا نکھار ایمن کا۔ رخ چوہدری تم تو بس اب تبصروں اور روداد کی نذر ہوئی جا رہی ہو۔ کہاں ہے تمہاری فکر کاریاں۔ عمیرہ سید سلام قلم۔ سچ آپ کے قلم کی فکر کاریاں پڑھ کر اپنا قلم..... قلم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ کتنی صفائی کیا فصاحت و بلاغت ہے۔ عذرا آپ کی اور تمام قارئین پاکیزہ کو نیا سال مبارک ہو۔“ (آپ کی رائے پہنچانی جا رہی ہے)

کچھ فاخرہ گل، امی نئے بیوی کلینک والوں نے تو خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ سر دیاں آئیں کیونکہ بارہ مہینے اس میں مالنے کے چھکوں کا ماسک ہی بتایا جاتا ہے حتیٰ کہ جون جولائی کے شمارے میں بھی۔ جلتے تک میں پاگل کون نہیں اب تک کا آخری سپر ڈپر ہٹ خاکہ رہا (میری نظر میں) اور پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کاش ایک دو سطریں ہر جگہ کے لیے مختص کر کے اس میں سے بھی پاگل چھائی کیے جاتے۔ عالیہ طاہر کی خوشخبری کا انتظار ہے۔ میری طرف سے ایڈوائس مبارکباد پاکیزہ میں اب تک فرح اور کلین کی کی محسوس ہوتی ہے۔ ناہیدہ آئی کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق ہے اس قدر خوبصورت لکھتی ہیں کہ مجھے ان کی تعریف میں استعمال ہونے والے الفاظ بھی بے بایاں لگتے ہیں۔ شیریں آئی کا بھی جواب نہیں لیکن ان کی نوے فیصد کہانیوں میں اسپتال کے تکلیف دہ مناظر کی تفصیل ضرور بیان کی جاتی ہے۔ بہر حال ہر بات سے قطع نظر وہ کھتی بہت اچھا ہیں۔ بزم پاکیزہ یکسانیت کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ عالیہ حراء نے دیے کی لو کے ذریعے بہت سوں کو ایک بہترین روشنی دکھائی۔ سائرہ عارف کے ناول کی ہر دوں شہینہ یک کھاتے ہوئے بتاتی ہے کہ تقریب کی کوریج بعد میں ٹی وی پر بھی دکھائی جائے گی لیکن میں اس کے ایوارڈ لے کر نیچے اترتے ہی مبارکبادوں کے فونز آنا مجیب لگا۔ اگر کوریج براہ راست ہو رہی ہو تو اچھے کی بات



نہیں لیکن سب کا عین وقت پر فون کرنا..... نسیم نیازی سے کہنا ہے کہ حرف کی شاعری جیسے ری عی د کرتے وقت بلینز ان کے درم اور تو ان کا بھی خیال رکھیں کیونکہ بعض اوقات وہ شاعری سے زیادہ نثر کا تاثر دینے لگتی ہے۔ نوشین ناز نے روایت پر قرار رکھتے ہوئے بہترین لکھا۔ امرتیل کا ٹیچو بڑا فاسٹ ہے اور مزہ دیتا ہے۔ ماہ رخ ضرور دل کا کردار ادا کرے گی۔ صائمہ اکرم کا محبت اب نہیں ہوگی موضوع کچھ اتنا منفرد نہیں تھا لیکن لکھا اچھا ہے اور امید ہے اگلا حصہ مزید دلچسپی لے ہوگا۔ سیز گرل جیسی اسٹوری پاکیزہ میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ طاہرہ جمیل کو بھی مزید محنت کی ضرورت ہے۔ کم از کم اس افسانے سے تو یہی تاثر ابھرا ہے۔ اسماعیل کے افسانے میں جب کہ اس کی ماں اس کے بولنے کی قوت سے محروم ہونے کا جاننے کے باوجود بھی نکاح کی تاریخ طے کرنے آتی تھیں اور پھر فاران کی ماں کے آنے پر نو آسرینڈر کرنا کچھ بات نہیں بنی۔ ویسے ٹاپک خاصا ڈیفیریٹ تھا۔ نسیم فضل جی کا افسانہ اچھا تھا لیکن فیاض جیسے چپ گپ بندے کے ساتھ تو..... سعد یہ رئیس کی گاؤں کی گوری بھی اچھا تھا۔ واقعی ظاہری تاثر اکثر غلط ثابت ہوتا ہے۔ سرفرازے میں پیسے دینے والا واقعہ بڑا مزہ دے گیا۔ سروے بالکل بور تھا۔ عائش کی منہ دکھائی مزے کی تھی۔ شیریں حیدر بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں بھی ناکس لگیں۔ بہنوئی کی محفل میں، افسانوں میں (مثلاً صائمہ اکرم نے اس وفد) اشار چلس کا اتنا حوالہ دیتی ہیں کہ اوہنے لگی ہوں بھی سوہتی ہوں میں بھی وہ سب ڈرامے دیکھوں کہ آخر میں کیا بلا جو سب نے ایک استعارہ ہی بنا ڈالا ہے۔“ (فاخرہ..... آپ کی رائے پہنچانی جارہی ہے)

کچھ رابعہ فیاض قادری، کراچی سے۔ ”اس واقعہ پاکیزہ ملا۔ تین وجوہات کی بنا پر قلم اٹھانے پر مجبور ہوئی۔ غیر ایک ناہید سلطنت کا ہوا، ریت اور آگن جو خراماں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس میں جھکا اس وقت لگا جب ارفع کو طلاق ہوگئی حالانکہ یہ تو طے تھا جس طرح کی حرکتیں ارفع کی تھیں اس کا انجام یہی ہونا تھا مگر بہت جلدی ہو گیا جب دو انسان شادی کے بندھن میں بندھے ہیں تو دونوں فریق پر پے حد ذمے داریاں آن پڑتی ہیں پھر جب ایک فریق صحیح طرح نہ چلے تو اس کی ذمے داری خود بخود دوسرے فریق پر آ جاتی ہے۔ زندگی کی گاڑی میں ڈپٹل لانے کے لیے کسی ایک کو ذمے داری سنبھانی پڑتی ہے۔ یہاں بھی یہی واضح تھا کہ ارفع کو یہ سنبھانا ہے پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی بی بی جی کو اس کے سرال والے نظر انداز کر دیتے۔ میں ان تمام لڑکیوں کو جو شادی کے بندھن میں بندھے والی ہیں یا نئی شادی شدہ ہوتی ہیں ایک مشورہ ضرور دوں گی کہ کبھی اپنے دل کے جذبات کو دل میں بند کر کے مت رکھنا۔ شادی کے رشتے میں اظہار بڑا معنی رکھتا ہے۔ آپ لا کھا اپنے جیون ساتھی کا خیال رکھیں، اپنے ہر عمل سے اس کا اظہار کریں مگر زبان سے اظہار ضرور کریں کیونکہ یہ بے حد ضروری ہوتا ہے کہ تجدید و فاد محبت ہوتی رہے۔ دل کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔ بندوں کو بتانا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ ارفع فیر ہوتے ہوئے سزاوارٹھمہر لائی اب اگر کوئی یہ کہے کہ جی ہماری عادت ایسی نہیں ہے تو جان لیں شادی نام ہی تبدیلی کا ہے اور اس میں زیادہ تبدیلیاں عورت کو ہی اپنے اندر باہر لانی پڑتی ہے۔ اب وجہ یہ تو آپ آتے ہیں۔ آنٹی یہ کیا، آیا ہے بلاوائتی جلدی ختم کر دیا۔ بہنوئی حیران رہ گئے اس میں جس طرح آپ نے تمام مساجد کے بارے میں مختصر مگر جامع انداز میں بتایا وہ قابلِ تحریف لگا مگر اس کا اختتام دل کو افسردہ نہ کر گیا۔ آخری اور تیسری وجہ پڑھیں یہ پرچنی مصنفات نمبر تھا مگر اس میں ہمارا نام تو تھا ہی نہیں۔“ (جی! کیا تم نئی مصنفہ ہو؟)

کچھ عالیہ طاہر ریاضی، لاہور سے۔ ”عالیہ حرامی نے بہت زبردست لکھا۔ سائیکالوجسٹ کے ہاتھوں ایک ایسے ایسے کیل کو سنوارنے کا احوال بیان کر کے عالیہ جی نے نئی کیلو کے چھوٹے موٹے الجھاوے دور کر ڈالے ہوں گے اگر کوئی اپنا حاشہ کرنا چاہے تو..... صائمہ اکرم اپنی تحریر کی ابتدائی سطور سے ہی قاری کو تجسس میں جکڑ لینے کے فن سے آگاہ ہوتی جا رہی ہیں۔ بقیہ حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ فوزیہ فرخ کا افسانہ بہت عام سالگا۔ نسیم فضل خالق نے حسبِ معمول بہت اچھا لکھا..... انہوں نے یہ ”جملہ“ بالکل درست لکھا کہ جس بندے کو اظہار کرنا نہ آئے اسے محبت کرنے کا بھی کوئی حق

نہیں۔ سعد یہ رئیس نے عشق کا ایک کڑوا پہلو دکھایا..... ایک تلخ رخ چدر بہت کم دھیان دیا جاتا ہے بلکہ پھلکی تحریر تھی اچھی تھی..... طاہرہ حسین جو غالباً نیو انٹری تھیں۔ سیز گرل مختصر ترین افسانہ اچھا لکھا۔ اسما قادری اور سائرہ عارف کی تحریروں کے بقیہ حصے پڑھ کر پھر تبصرہ کریں گے اور جناب جو سب سے زبردست تحریر رہی وہ نوشین ناز آخر کا افسانہ بے چش روٹیرا تھا پارہاویل ڈن نوٹین جی ویل ڈن..... بہت ہی شاندار لکھا۔ آیا ہے بلاوا مسکون تو ہے ہی مزید معلوماتی ہوتا جا رہا ہے آج کل پاکیزہ اور دلکش ہر طرف عائش صاحب کی بڑی دھوم مچی ہوئی ہے۔ عقلی کی نظم کے ساتھ ہونے والی ریڈیو پر آپ کے تبصرے نے بہت لطف دیا۔ ہنس تو ہمیں ہے تھا شا آئی۔ نسیم پروین کے خط کے جواب میں آپ کی رے کی طور پڑھنے کے بھی مجموعہ کلام کے نام پر آپ کا تبصرہ..... آپ برا حال ہو گیا ہنس سے۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

کچھ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ”خوبصورت یا سٹل اور منجمی ہوئی تحریروں سے سجا ہوا نئی مصنفات نمبر بہت زیادہ پسند آیا۔ دھوپ، بادل اور بوندیں بہت ہی زیادہ اچھا لگا۔ ٹھیک ہی لکھا ہے۔ سیکڑ فرخ نے کہ جب بھی کوئی اپنے ساسی کو صرف اپنا پابند کرنا چاہے تو پہلے اپنے بے راہ روی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک لے کیونکہ یہ تو مکافات عمل ہے کہ حساب پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ صائمہ اکرم کا ناول محبت اب نہیں ہوگی، اختتام کو پہنچا۔ یہ ناول بھی زبردست رہا۔ نیر شفیقت کا در خواب وا کرے کوئی بھی پیارا افسانہ تھا۔ آیا ہے بلاوا بڑھ کر بس دل سے یہ صدا آتی ہے کہ ہمارا بلاوا بھی وہاں سے جلد دوبارہ آئے کہ دل اب وہاں جانے کے لیے بے قرار بہت ہے۔ شیریں حیدر کا ناول امرتیل بہت ہی پسند آ رہا ہے۔ اس بار مظہر کے بارے میں زبردست کر دلی لگی ہے۔ کاش کہ شیریں اس میں نا تمام نہاد جہادی کیسوں کا ذکر ضرور لکھیں جہاں گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعے یہ جلتے پھرتے خود کش بمبار تیار کیے جا رہے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو معلومات ہو سکیں۔ باقی مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔ اس بار خوبصورت شاعر امجد اسلام امجد کی خوب شاعری پڑھنے کوئی جو کہ بہت خوب تھی۔ میری طرف سے تمام قارئین کو بھی نیا سال اور مزید کی مبارکباد۔“ (آپ کی رائے پہنچانی جارہی ہے)

کچھ ڈاکٹر ممتاز ضیا، ماہر امراض خواتین فیاض الدین اسپتال، کراچی سے۔ ”مجھے کچھ کہنا ہے کہ لیے میرا خیال تھا کہ لکھنے کے لیے اتنا مواد تھا کہ لکھوں لیکن داد و دین پڑتی ہے جنہیں کہ تم نے سورہ ہود کی ایک ایسی آیت مبارکہ کا انتخاب کیا جس نے تقریباً ہر مسئلہ کو حل کر لیا۔ اللہ تعالیٰ جزا دے، آمین۔ افوہ تاہید ارفع کے ساتھ وہ سب کچھ کروادیا آپ نے جس کا خدشہ تھا۔ آپ بہت اچھی رائٹر ہیں مگر میرا خیال ہے کہ ارفع کا رویہ بھی سرال والوں کے ساتھ مناسب تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جو لوگ نوکری پیشہ لڑکی سے شادی کے خواہش مند ہوں ان کی کیا خواہشات ہوں گی اور ان کو قاتل انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا۔ بے شک ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی ذات کو اہمیت دی جائے مگر یہ تو ان کو شادی کے وقت ہی سوچنا چاہیے تھا اور پھر شادی کے بعد تو اس جیسی لڑکی کو اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ سرال والوں سے محاذ آرائی مہنگی پڑے گی جو تک تنہا نہیں اور سرال والوں کے کام آنے کے لیے جو منصوبہ بندی وہ کر رہی تھی، کاش اس کا تصور اس اظہار بھی کر دیا ہوتا۔ اندھا دھند دولت کمانے والوں کے لیے عالیہ حرامی نے اچھی کہانی لکھی ہے۔ عالیہ کچھ لوگوں کو عقل آ جائے کہ پیسہ ہر چیز کا بدل نہیں ہوتا اصل اہمیت انسانی جذباتوں کی ہے مگر کہانی جیسے معالج آج کی کہاں؟ سنور گئے سب کے لیے میں کیوں گی کہ اللہ کی مہربانی سے سنور گئے سب۔ نوشین ناز آخر کی کہانی پر کیا تبصرہ کروں۔ ایسے نازک وقت جب تمام عالم اسلام اور پاکستان لب و لہجہ ہیں۔ انہوں نے بھی نام نہاد ملاؤں کی طرح کیا۔ کی خاص طبقہ کی طرف اشارہ کیے بغیر بھی وہ اس موضوع پر لکھ سکتی تھیں۔ ایسے ہمدرد اور شفیق مالک نے اشتقاق کو اتنا آگے جانے ہی کیوں دیا جب کہ وہ اس کی خصوصی کفالت بھی کر رہے تھے اور اس کی تبدیلی خیالات سے بھی واقف تھے۔ شیریں حیدر ایک نو جوان بیوہ کی مشکلات کو بہت اچھے انداز میں اجاگر کر رہی ہیں۔ فاخرہ گل کی بلکی پھلکی اچھی تحریر تھی۔ صائمہ اکرم اچھے موضوع پر اچھا لکھ رہی ہیں۔ سیز گرل کو اگر آخر بھی مگر مصیبت زدہ سیز گرل کو ان کی ہیر و دن



کی طرح شارٹ کٹ کی خواہش نہیں ہوگی اور نہ ہی ایسے مواقع اتنی آسانی سے ملتے ہیں۔ اسما گل کی کہانی عام سی ہے شکر ہے کہ فاران کی گویائی جانے کا سبب ایک حادثہ تھا ورنہ اگر وہ پیدائشی گوشتا ہوتا تو نقص بچوں میں بھی ہونے کا چانس زیادہ ہوتا۔ ملال کے موسم بیت گئے اچھی تحریر ہے۔ سعدیہ رئیس کی گاؤں کی گوری میں ان کے بہو نے کچھ زیادہ ہی تیزی دکھائی شادی میں ورنہ عرس اور گاؤں کی ساتوں کے علاوہ بھی اور جہاں تھے بہر حال بالکل پھٹکی تحریر ذرا اچھی لگی۔ آیا ہے بلاوا اس وفد حاجیوں کی بہت رہنمائی کرے گا۔ اس کو پڑھ لگتا ہے ہم بھی وہاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک دفعہ یہ سعادت نصیب کرادے۔ سب یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور دل دوبارہ زیارت کے لیے تڑپ جاتا ہے۔ انجمن شکرہ یہ تم نے وہاں میرا نام لے کر دعا کی اب دعا کریں مجھے دوبارہ یہ سعادت نصیب ہو۔ علی اور شائستہ کے شوہر کو جو سعودیوں نے ریال دیے اس کا ہمیں بالکل اندازہ نہ تھا۔ ہاں البتہ ان کی مہمان نوازی کے ہم بھی مزے لے چکے ہیں بلکہ وہاں تو ہر شخص ہی مہمان نوازی کے موڈ میں ہوتا ہے۔ رمضان صاحب اور ان کی بیگم کے عائش کی پیدائش مبارک ہو۔ تم نے اور رخنے اچھی کوریج کی ہے۔“ (شکرہ)

کچھ ایدہ عندلیب، سلاوولی سے۔ ”محترمہ نسیم نیازی کو دیکھنے کی آرزو مدت سے تھی سو پوری ہوئی۔ ڈینٹ سی پر سٹائی ہے۔ میں انہیں عرصہ دراز سے جانتی ہوں۔ تقریب کی روداد بڑی بہت اچھی تھی اس لیے آپ سب کی باتیں رمضان بھائی صاحب کی میزبانی سب کچھ اچھا لگا۔ خواتین کی خریداری کے کمالات نے کیف کے قابل نہیں ٹھہرایہ تو عام سی باتیں، واقعات، حالات سب کے تقریباً سبھی ہوتے ہیں۔ عذر دراصل کی یہ بات مجھے بڑی پیاری لگی۔ (مجھے اپنی رائٹر کو نمایاں کر کے زیادہ خوشی ہوتی ہے) بالکل رائٹر تو رسالے کی جان ہیں ان کی محنت اور پیاری پیاری سبق آموز تحریروں سے رسالہ ساتویں آسمان کو چھو رہا ہے۔ صائمہ اکرم، کوئل ستار (نیور مائنڈ) یہ محفل ہمارا گھر ہے، ہم اپنے تجربات، خیالات بل بیچہ کر شیر کرتے ہیں جو میرا تجربہ تھا ٹیچرز کے لی ہوئے متعلقہ لکھا جو آپ کے تجربات ہیں میں ان سے بھی متفق ہوں۔ کوئل بہن، ہم کیسے اپنی بہنوں سے ناراض ہو سکتے ہیں بلکہ ہم سب کو ایک دوسرے کے خیالات صبر و تحمل سے سننے چاہئیں۔ ایک ما بعد انجم آپ کے گھر جمع ہوتے ہیں مجھے اچھا لگتا ہے۔ پیاری بہن نوشین ساجد نوشی سرگودھا، آپ سلاوولی آئیں مجھے بھی دکھ ہوا نہ لٹنے کا۔ کاش کوئی رابطہ ہوتا تو میں اپنے کنبے کے گھر میں آپ کو اچھی سی چائے پلائی، کھانا بنائی آپ کے لیے۔ آپ سرگودھا میں ہوتی ہیں، میں ہر نئے دو چکر لگاتی ہوں علاج کے سلسلے میں۔ شاید میں ہی آپ سے کوئی راہ نکال لوں ملنے کی ویسے میں بہت سادہ مزاج سی لڑکی ہوں۔ جلیہ نگ میں ہشتے بھوت تحریر پسند آئی۔ ناہید آبی یہ کیا غضب کر دیا۔ اربح کے آشیانے کو آگ لگا دی۔ ویسے آبی اب بھی اکثر گھروں میں بیٹی کو رخصت کرتے وقت یہی نصیحت ہوتی ہے کہ بیٹی اب وہی تمہارا گھر ہے بس جنازہ ہی نکلے گا لیکن اب وہ حالات نہیں رہے۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

کچھ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا سے۔ ”ناٹل گرل کی ٹیکھی نظروں کا وارسید عادل کے آ رہا ہو گیا۔ نیلا اور کالا دونوں ڈریسز پر دست تھے۔ ادارے کا ایک ایک لفظ کھرا لگا۔ واقعی آج کل کے نوجوان کھائی سے بچ کر کنوئیں میں خوشی سے گر رہے ہیں۔ ناہید سلطانہ کے قلم سے نکلا معاشرتی ناول ہوا، ریت اور آنگن ازدواجی تعلقات اور اس کے اتار چڑھاؤ کی غمازی کرتا ہے اور گھر بیویا ستوں کی وجہ سے اچڑنے والے گھروں کی عکاسی بہت عمدگی سے کر رہا ہے۔ واقعی یہ دنیا منافقوں کی ہے۔ اربح کی چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا اس معاشرے کے لیے تازیانہ ہے۔ عراک شکایت ہے کہ کہانی کا ٹیپو بہت سلو ہے یہ قسط بھی طلاق پر ہی ٹھہری رہی پلینز کہانی کو ذرا تیز کریں۔ سیکینہ فرن کی تحریر دھوب، بادل اور یوند میں بھی از دو اجیات پر ہی تھی۔ رعنا کوثر کی پہلی تحریر متاثر کر گئی۔ محبت اب نہیں ہوگی جس محبت تو پھر ہوگی عروج کو حنا سے ہاں روحی اور ذرا کا انجام صحیح ہوا۔ جیسی کرئی ویسی بھرنی۔ بائیزہ ڈائری اس دفعہ غضب کی تھی لہر وغل ٹکینے کی طرح فٹ تھی۔ بہنوں کی محفل بھی خاصی دھواں دھاری ہاں سرگرمیاں تو اس دفعہ ہمیں زہرہ

نامہ لگیں۔ شیریں حیدر ہماری طرف سے مبارکباد کا گلہ مت قبول کریں اور آپ بھی میری دوست صائمہ خان مردان کو برا سلام پہنچادیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

کچھ فریدہ خانم، لاہور سے۔ ”فریدہ فری صاحبہ کی رائے کا بے حد شکر یہ ویسے فون پر تو وہ مجھے عظیم اور بڑی شاعرہ کہتی ہیں اور میری شاعری کی بے حد دیوانی ہیں۔ میری نظمیں انہوں نے اپنے پاس رکھا رکھا ہوا ہے۔ حیرت ہے کہ ایسی یکسانیت کی شکار شاعری کو وہ کیوں اتنا سنبھال کر رکھتی ہیں؟ ویسے فریدہ فری کو چاہیے کہ وہ اپنی شاعری پر بھی نظر ثانی ضرور کریں کہ وہ خود کیا کہتی ہیں؟ اپنے محبوب سے کسی کو بھی شکوہ ہو سکتا ہے اور اس کا اظہار برہندہ اپنے انداز سے کرتا ہے اور جہاں تک مرگئی، پاگل ہوئی تو ان الفاظ میں انہیں کون سا لفظ عجیب لگا، میں سمجھ نہیں سکی۔ میری شاعری پاکیزہ کے علاوہ مختلف ماہناموں، انٹرنیٹ اور اخبارات میں بھی آتی ہے، وہاں سے تو ایسی کوئی شکایت نہیں آئی۔ بہر حال میں ہرگز کوئی بہت بڑی شاعرہ نہیں ہوں، میں تو ابھی خود کھینے کے عمل میں ہوں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے میرے مقاصد میں کامیاب کرے، آمین! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت والی لمبی زندگی عطا کرے، آمین، میں نے اپنی رائے کا جواب دیا تھا۔ یقیناً آپ مائنڈ نہیں کریں گی۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

کچھ فرحانہ ناز ملک، ڈیرا غازی خان سے۔ ”عاوت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہنوں کی محفل کھنگالی جو ہمیشہ کی طرح ٹانٹ تھی۔ طاہرہ پروین آرا میں کا خط پڑھ کر احساس ہوا کہ انہوں نے قابل توجہ باتیں لکھی ہیں۔ طاہرہ بی..... اس خوبصورت اندازِ بیاں کے ساتھ افسانہ نویس کے میدان میں بھی انتر ہو جائیں۔ مجھے مزید بات کرنی ہے اپنے ناول جن گھر جانا ہے کے متعلق سب سے پہلے تو ان بہنوں کی تہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے پسندیدگی کی سند عطا کی۔ بیج ہٹاؤں تو حوصلہ مزید بڑھا ہے جن بہنوں نے تنقید کی اسے بھی لائق غور جانا۔ نوخیز انجمن نے لکھا تھا کہ یوں روڈ پر ماں کا بیٹوں کو دھوکے مارنا عجیب لگا۔ آپ کا اعتراض سرا آٹھوں پر لکھتے وقت تو احساس نہیں ہوا مگر آپ نے توجہ دلائی تو افسوس ہوا کہ نہ کتنی پھر بھی..... بعض اوقات مزاح لکھنے کی کوشش میں قلم سے ایسے واقعات ہو جاتے ہیں جو حقیقت میں رونما نہیں ہو سکتے۔ جیسے کہ سب کام میں حقیقی زندگی سے برعکس مزاح ڈال کر ناظرین کو ہنسانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح مزاحیہ تحریر لکھنے میں نادانستہ رائٹر کا قلم غیر حقیقی سا ہو جاتا ہے۔ ایدہ عندلیب آپ نے تو بلا جواز ہی میرے بے چارے ناول کا تیا پانچ کیا۔ میں نے اپنے ناول میں نہیں بھی لکھا تھا کہ ٹیچرز کا انداز گفتگو کیا ہوتا ہے؟ میں نے اپنے این سی سی کے انٹرکوز کال ب دلچہ جوں کا توں دکھانے کی کوشش کی اور کالج کے یہ واقعات میری حقیقی زندگی سے نکسید ہوئے تھے۔ رضیہ سلطانہ گوندل..... کوئی شک نہیں ڈی جی خان کی گھوڑیں بہت مشہور ہیں لیکن جناب..... ہم فرینڈ ز اور کرزنز کا غلطی ذاتی خیال ہے کہ ہمارے شہر کا حسن بھی بہت مشہور ہے جو ہملہ میرے ناول میں سرخام نے اٹھی کو چانے نہ پینے کے جواب میں کہا۔ بیبی جملہ ایک لاہوری نے میری دوست سے کہا تھا کہ جو حسن و خوبصورتی میں زیبا بہتتر سے بھی دس قدم آگے ہے۔ فیصد ڈیزر آپ نے بالکل درست پہچانا۔ گاؤں کی زندگی بھی تجرباتی اور مشاہداتی دکھائی۔ آپ سب بہنوں کی تعریف و تنقید سربانے سے کم نہیں، یہ ساتھ ہے تو لکھاری کا قلم جان بڑھتا ہے۔ امید ہے آپ کی محبتیں میری ہم قدم رہیں گی۔ آج کل پاکیزہ کی جان ناہید سلطانہ اختر کا ناول بنا ہوا ہے۔ کیا خوبصورت اندازِ بیاں اور کہانی ہے..... مہتاب جیسے شوہروں کو تو لائن وار کھڑا کر کے کلاشکوف سے اڑا دینا چاہیے۔ طلاق کے بعد ناہید بی نے جو کچھ دکھایا۔ وہ جسم میں منشی دوڑا گیا۔ اربح کا غم اپنے دل کی گہرائیوں تک لٹکیا گیا۔ خدار اربح کی بھابی کو برے انجام تک پہنچائے گا۔ یہی نہیں سارے فساد کی جڑ شیریں حیدر بھی پیچھے نہیں رہیں۔ ماہا کا کردار متاثر کن ہے۔ شیریں جی ماہا کا بھی زندگی کی خوشیوں پر حق ہونا چاہیے۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)







خدا کی ہر مسلمان کو بیت اللہ ضرور دکھائے۔“ (پیارے بہن خوش آمدید، اللہ تعالیٰ آپ کی اور تمام مسلمانوں کی یہ مراد ضرور پوری کرے)

✍ آمنہ، ایم، لاہور۔ گڑیا تمہارا تفصیلی خط پڑھا ہے تم بے حد کمزور دل کی لڑکی ہو اور بے حد حساس بھی ہو اس لیے ہر بات کو بے حد محسوس کرتی ہو اگر تمہیں شوگر نہیں ہے تو صبح، شام ایک ایک چھوٹے شہد رو دشریف پڑھ کر ضرور کھایا کرو..... روحانی مشورے میں سے کوئی وعدہ دیکھ کر پڑھو سب ٹھیک ہو جائے گا..... خدا نخواستہ تمہارے ساتھ کوئی بھی ایسی بات نہیں ہے جس سے دل کو جلا یا جائے۔

✍ غزیرہ، کراچی۔ آپ کا افسانہ میں نے دلکش میں دے دیا ہے، وہاں شائع ہو جائے گا۔ رہی بات آپ کی ناراضی کی وہ انشاء اللہ رفع کر دی جائے گی۔

✍ رخسانہ امجد، گلوال۔ گڑیا تم خیریت سے تو ہونا تمہارے میاں جی کی اب طبیعت کیسی ہے؟

✍ رابعہ اسکرم وڑائچ، رحیم یار خان۔ اپنی شادی کی روداد خود لکھ کر بھیجنا..... یا اگر صائرہ اکرم تمہاری شادی میں

بہنوں کی محفل میں سارے خطوط اچھے تھے مگر طاہرہ پروین آرائیں نے کچھ عجیب سا تجویز کر کے تلاش رفتی حیات کے حوالے سے ذاتی تجربات کی فرمائش کی ہے۔ لڑکیاں اگر اپنی عمر کی بنا پر کچھ شوخی اپنی تحریر میں لے آتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز اخذ نہیں کیا جانا چاہیے کہ انہیں رفتی حیات کی تلاش ہے۔ میں طاہرہ پروین کے تبصرے اور تجویز سے بالکل متفق نہیں۔ جلتنگ حسب معمول ہٹ کے تھا۔ بہت بہت پسند آیا۔ میرا انتخاب میں سارے انتخاب اچھے لگے۔ میں اکثر گنگنائی ہوں سدرہ تبسم اور زریں آفتاب کے انتخاب کردہ اشعار دل کو بھائے۔“ (شکریہ)

✍ فرح بخاری، یو ایے ای..... خوش آمدید، آپ کا افسانہ قابل اشاعت ہے۔ آپ اپنے دیگر افسانے اور ناول ہمیں ضرور بھیجوائیں۔

✍ سیدہ نینا عروج، ساہیوال..... خوش آمدید آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ مختصر افسانے ہمیں بھیجے ضرور شائع ہوں گے۔ قسط وار ناول ہم بطور خاص اپنی مصنفات سے لکھواتے ہیں..... اس لیے آپ نے جو ناول کی پہلی قسط ہمیں بھیجی ہے اسے ہم شائع کرنے سے قاصر ہیں۔

✍ فریدہ بانو، لاہور..... خوش آمدید آیا ہے بلاوا کی دسمبر کے شمارے میں آخری قسط تھی..... بہت جلد کتابی صورت میں آنے والا ہے..... مزید اضافے کے ساتھ..... وہ اس لیے کہ پاکیزہ میں مجھے اپنے نواسوں، نواسی کی باتیں لکھتے ہوئے عجیب سا لگتا تھا کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ چونکہ ایڈیٹر ہیں اس لیے اپنے بچوں کی باتیں لکھ رہی ہیں۔ ہاں، کتاب، میں میں نے جو اضافہ کیا ہے..... وہ اپنے بچوں کی مزے مزے کی باتیں بھی لکھی ہیں..... جیسے ہم الووہ ہوئی میں ٹھہرے تھے..... یہ مکہ کا اچھا خاصہ مشہور ہوئی ہے..... عظمیٰ کا چھوٹا بیٹا علی..... ہر ایک کو یہی بات تھاکہ ہم لوگ الو ہوئی میں ٹھہرے ہیں..... ہمارا الو ہوئی بہت اچھا ہے وغیرہ وغیرہ۔

✍ فیروزہ بیگم، کراچی..... اللہ تعالیٰ آپ کی طبیعت ہمیشہ ٹھیک رکھے کہ آپ کی بے لوث دعاؤں کی مجھے واقعی بے حد ضرورت ہے۔ میرا ناول کب شروع ہوگا..... اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی..... فی الحال پاکیزہ میں ہمارے جو ناول چل رہے ہیں..... وہ میرے ناول سے بھی بہت اچھے ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر، شیریں حیدر، سائرہ عارف اور اما قادری بھی ہماری بے حد اچھی رائٹرز ہیں جن پر مجھے بے حد فخر بھی ہے۔ اس ماہ کی قسطیں کس غضب کی ہیں پڑھ کر رائے دیجئے گا۔

✍ عائشہ چندا، لاہور..... اپنا غصہ تھوک دو۔ بزم پاکیزہ کے لیے نئے سوالات بھیجو۔ ایک ساتھ بہت سارے سوالات بھی بھیج سکتی ہو۔ حافظہ کا ملتان کی حلوے کا انعام براہ راست انعام یافتگان کو بھیجا جا رہا ہے۔

کچھ سمیرا حمید فاروق، اسلام آباد سے۔ ”سب سے پہلے آیا ہے بلاوا میں آپ کے عمر کے قسط پڑھی۔ میں آج سے سات سال پہلے کی تھی۔ بچہ گاڑی کے ساتھ یہ ٹیلی مجھ سے بھی لکرائی تھی میں نے ان صاحب کو بے حد ڈانٹا بھی تھا..... وہ ابھی تک وہیں ہیں پڑھ کر ٹی بھی آئی۔ پہلے صائرہ اکرم کی تحریریں پسند نہیں آتی تھیں مگر اب بہت اچھی لگتی ہیں۔ برویسر عابدہ خان کا تیسرا پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے میں نے لکھا ہو۔ وہ میرے دل کی بات سچائی سے کہتی ہیں۔ عالیہ حرا کی تحریروں میں طوالت بے جا لگتی ہے۔ شیریں حیدر کے ناول کی یہ قسط بہترین رہی۔ ناہید سلطانہ اختر بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ نئی مصنفات نمبر پڑھ کر مزہ آیا۔ عظمیٰ آفاق سے کہتا ہے کہ پاکیزہ کے لیے کچھ لکھیں ان کے تبصرے اور پورے تنگ بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ (سمیرا خوش آمدید..... تبصرے کے لیے ممنون ہوں)

کچھ مسز محمد علی، پنجاب سے۔ ”پہلی بار کسی ڈائجسٹ میں خط لکھ رہی ہوں۔ ایک غریب ٹیلی سے تعلق رکھتی ہوں۔ گھر کے کبھیڑے، پریشائیاں، مسائل اتنے زیادہ ہیں کہ کبھی عمرہ کرنے کا خیال تک نہیں آیا..... بخدا یہ آپ سے سچ کہہ رہی ہوں کہ آپ کے عمر کے کا سفر نامہ پڑھ کر میرے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ میں بھی عمرے پر جاؤں..... یہ تحریر کی خوبی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں وہ خواہش بیدار کرے جو ایک مسلمان کی آن اور شان ہے۔ اللہ

## اگر آپ کو

### جاسوسی سسٹم سیرگزشت لکھیں

کے حصول میں وقت بیش آ رہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے کب اساتل سے کوئی شکایات ہیں اور آپ کے علاقے میں بر وقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو اس کو پین کو پر کر کے روانہ کریں یا فیکس کریں۔ (جس پرچے کے بارے میں شکایات ہوں اس پر دائرہ بنادیں)

- 1) نام.....
- 2) پتہ.....
- 3) ٹیلی فون نمبر.....
- 4) کب اساتل کا نام پر پتہ ریفون نمبر.....
- 5) قریب ترین کب اساتل کے نام ٹیلی فون نمبر.....

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس: 0301-2454188

بدل الدین سکرلشن منیجر 5804200- 5386783- 5802552 فیکس نمبر 5802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز- C-63 نی 63 III سسٹم اینڈ پبلی کیشنز ہاؤسنگ اتھارٹی مین کو روڈ، کراچی

E-mail: jdpgroup@hotmail.com



ماہنامہ پادیرہ 291 جنوری 2000



# جلیترنگ

انجم انصار

غلط فہمی

بابو بھائی کی فیملی کے ہر گھر کا ایک لڑکا ملک سے باہر ضرور گیا ہوا تھا۔

صرف بنو آ پاکے گھر... کے چاروں کے چاروں لڑکے باوجود کوششوں کے باہر نہیں جاسکے تھے۔ بابو بھائی تو باہر بھجوانے کا کام بھی کرتے تھے۔ انہوں نے خاندان کے پچاس فی صد لڑکوں کو خود باہر بھجوایا تھا مگر بنو آ پاکے لڑکوں کا جب کام کروایا وہ پائینیکل تک پہنچ ہی نہیں پایا۔

”ایسا لگتا ہے کہ تمہارے کسی بیٹے کے ہاتھ میں باہر جانے کی لکیر ہی نہیں ہے۔“ ایک شب بابو بھائی نے ہنس کر کہا تھا مگر بنو آ پائے تو رو کر گھر بھر دیا تھا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے خاندان میں ان کی ناک کٹ گئی ہو۔

اور پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بڑا لڑکا اسکا لرشپ پر خود ہی امریکا چلا گیا۔

اب تو بنو آ پاکے ہاتھ پاؤں پھول سے گئے۔ انہیں یوں لگتا جیسے کوئی ان کے بیٹے کو اچک کر لے گیا ہو۔

شاید وہ ایسی جگہ چلا گیا ہے۔ جہاں سے لڑکے واپس نہیں آتے۔ ان سے لوگ اپنی دکھ بھری کہانیاں کے ساتھ جب ان کے بیٹے کے بارے میں کچھ پوچھتے تو ان کی آنکھوں سے برسات شروع ہو جاتی۔

گھٹتے جو اکلوتی بہن تھی۔ اسے اپنے بھائی کے جانے کا از حد رنج تھا۔

اسے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔

یا تو اپنے بھائی کے بارے میں یا لگوں کی طرح باتیں کرتی یا اس کی تصویریں دیکھتی رہتی۔ یا پھر وہ انہیں یاد کر کے روتی رہتی۔

بہنوں کو بھائیوں سے کس قدر محبت ہوتی ہے اس کا اندازہ کوئی بھائی لگا ہی نہیں سکتا۔ مگر گھٹتے کا بھائی اس سے بے حد قریب تھا اور وہ اس قدر پر مزاج مزاج کا حامل تھا۔ کہ اپنی بہن کو ہر وقت ہنساتا رہتا تھا۔

ایسے میں بھائی سے ملتی جلتی غصہ اخبار میں نظر آتی پانی دی پر یا پھر راہ چلتے۔ تو اس کا ان پر بار بار نظر ڈالنے کو جی چاہتا۔

پہلے فلمیں دیکھنے سے اسے چڑھتی مگر جب عام خان میں اسے اپنے بھائی کی غصہ نظر آئی تو وہ اس ہیرو کی فلمیں بڑی باقاعدگی سے دیکھنے لگی تھی۔

بنو آ پاکا بھی یہی خیال تھا کہ عام خان کی فلمیں دیکھ کر ایسا ہی لگتا ہے کہ ان کا بیٹا امریکا کے بجائے بانی وڈ چلا گیا ہے۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے یونیورسٹی میں گھٹتے کا نیا نیا ایڈمٹن ہو ا تھا۔ ایک صبح وہ یونیورسٹی جاری تھی پوائنٹ میں خاصا رش تھا۔

لاابالی لڑکے ہر اسٹاپ پر چڑھنے والوں کی حاضری لے رہے تھے۔

چھکلی	غیر حاضر
مولی	حاضر سائیں
شاہجہ	غیر حاضر
کدو	حاضر جناب
بھوت	لبیک
ڈیجائپ	غیر حاضر
نجی	غیر حاضر

شریر لڑکوں کی جملے بازیاں پوائنٹ میں قہقہوں کے پھول کھلا رہی تھیں کہ اچانک گھٹتے کی نظر ایک لڑکے پر پڑی۔

یہ دیکھ کر وہ متحیر رہ گئی کہ وہ لڑکا ہو ہو اس کے ہاتھ جیسا تھا۔ اس قدر بھی مشابہت ہو سکتی ہے وہ ایک لڑکے کے لیے چکرا سی گئی۔ دوبارہ دیکھا وہ اپنے ساتھی کی سی بات پر سکر رہا تھا۔

اللہ سکر ایٹ کا انداز بھی بالکل وہی تیسری بار نہ جتنے ہوئے بھی ایک اچھٹی سی نظر ڈالی۔ وہ بھی شاید سے ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی گھٹتے نے اسے پھر دیکھا۔ ان صاحب نے اپنی بائیں آنکھ انتہائی حاشی سے دبا دی۔

آف، مارے رنج کے اس کی آنکھوں میں آنسو گئے۔ دل چاہا کہ اس کے منہ پر تھوک دے۔ وہ ان کے بھائی جیسا تو بالکل بھی نہ تھا۔

۵۵۵۵

کھری کھری

سطوت کے گھر میں امیرانہ ٹھاٹ اور اسلامی لباس ملے ہوئے تھے جیسے نارنگی میں کھٹاس اور لباس برابر کی رچی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اندان کے لوگ جب بھی کوئی اچھی مثال دینا چاہتے تو اس کا نام بڑے فخر سے لیا کرتے۔

مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب ان کے بیٹے ہوئے تھے اور وہ جو انٹ فیل سسٹم میں رہتی تھیں۔ اس سسٹم میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں وہ سے بڑے ریلے کے اوپر بند باندھے رکھتا ہے۔

اکیلے گھر میں رہنے کا خسار جب چڑھا۔ تو ان کے میاں علیحدہ کوٹھی لے کر شفٹ ہو گئے اور سطوت نے بے حساب سے فرینڈ شپ کے تحت سوشل ورک کرنے کی ٹھانی۔ بہت سے لڑکے لڑکیوں کے رشتے انہوں نے لے کر وائے۔

مظلوم خواتین پر ڈھیر سارے فحش زلکے۔ ان کو بھائی کی مشینیں دیتے ہوئے اپنی بڑی بڑی تصاویر شہادت میں لگوا لیں۔

اب ان کے گھر کے ماحول سے اسلامی رنگ اڑ گیا تھا۔ اور امیرانہ ٹھاٹ پر دکھاوے اور مکاری کے ساتھ ساتھ چھچھور پن کی چھاپ علیحدہ لگ چکی تھی۔

جب ان کے بیٹے فرحان کی شادی کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے احباب میں سے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا۔ جس کی فیملی کے پاس اتنی دولت اور جائیداد تھی کہ ان کا بیٹا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بھی بیٹھا رہتا تو اس کی کئی نسلیں پرورش پا جائیں اور جب انہوں نے اپنے لاڈلے سپوت سے نجات بھرے لہجے میں کہا۔

”بیٹے سوئے کا چچو تو لے کر تم ضرور پیدا ہوئے ہو مگر میری یہ خواہش ہے کہ تمہاری زندگی سونے کی کان میں گزرے۔ اس لیے میں تمہارے لیے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا ہے کہ تم اپنی ماں کی پسند پر داد دو گے۔“

”ماما۔۔۔ میری پسند آپ کی پسند سے میل نہیں کھاتی۔ میں نے اپنا جیون ساتھی چن لیا ہے۔“ وہ بیل کم چپاتا ہوا بے پروائی سے بولا جیسے کہہ رہا ہو آج موسم میں نکلی زیادہ ہے۔

”چن لیا ہے۔۔۔؟“ انہیں غصہ ہی تو آ گیا۔ ”فرحان تم اپنی جھلی پھپھو۔۔۔ نسیم بیگم کے ہاں بہت جاتے ہو۔۔۔ ان کی مولوی خالہ کو پسند کر لیا ہوگا جو اپنے باپ کے کیفرنگ کے کاروبار کی نگرانی کر رہی ہے اور خوب مزے مزے کے کھانے پکانے بھی سکھ گئی ہے۔ اسی نے صلیق سے دل تک کا راستہ طے کیا ہو گا۔“ سطوت نے زہرا لگا۔

”جی نہیں۔۔۔ آپ بڑی پھپھو پر بہتان مت دھریں۔“

”اچھا تو۔۔۔ پھر تمہارے باپ کی سوتیلی بہن ناصرہ کی سوچی زرینہ نے تمہیں ششے میں اتارا ہو گا۔ جب سے وہ ستار بجانا سکھی ہے۔ ہاکی کی طرح کیلجے سے لگا کے تاروں پر شن کرنا ہی جانتی ہے اور جب کسی کو متاثر کرنا ہو تو بھرے ہوئے کیسٹ کا ٹن دبا دیتی ہے۔ تب تو اس کے ستار سے ایسے ایسے جھرنے بہتے ہیں کہ ایک مرتبہ تو میں بھی مدھوش ہو گئی تھی۔ وہ تو اس کی ایک کٹی لٹی نے مجھے سرگوشی سے بتایا۔ کہ ایسا اس نے آپ کو متاثر کرنے کے لیے کیا ہے ورنہ ذرہ کچھ بجانا نہیں آتا ورنہ میں تو زرینہ پر اپنی خاصی سمجھ گئی تھی۔“



تھی..... وہ تو اس کی پہلی کو مجھ پر رحم آگیا ورنہ میری آنکھیں تو اس کی بلانیں لے رہی تھیں مگر پہلی کی بات سن کر تو میرے ہوش ہی اڑ گئے۔ ”حد ہو گئی ہے..... لوگ جوان بیٹوں کی ماؤں کو کس کس انداز سے گھبرا کرتے ہیں۔ پتا نہیں ناصرہ کو کیسے ہے پتا چلا کہ کسی زمانے میں مجھے ستار بجانے سے دیوانگی کی حد تک رغبت رہی تھی۔ اس نے وہی داؤ مجھ پر بھی آزمایا۔“

”اُف ماما..... آپ تو پریشان ہونے میں کمال رکھتی ہیں۔“

”بیٹا کیا یہ پریشانی کی بات نہیں ہے کہ تم نے مجھے بتائے بغیر اپنا جیون ساھی منتخب کر لیا ہے اور میں اس کے بارے میں جانتی تک نہیں ہوں۔“

”امی آپ جس انداز سے زربہ کے بارے میں سوچ رہی ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ بیوی..... زربہ کے بارے میں تو میں نے بھی نہیں سوچا، خواب تک میں نہیں لایا اس کو اور سب سے بڑی بات وہ پڑھی لکھی جاہلی ہے..... کوئی بات بھی اس سے کروں تو پہلے وہ شرماتی ہے اور پھر کہتی ہے امی سے پوچھ کر بتاؤ گی، بالکل کہیں کی۔ اس پر اس کے بال کتنے لمبے ہیں..... بالکل چڑیل کی لگتی ہے..... وحشت ہوتی ہے جب اس کا آدھا چہرہ بالوں سے ڈھکا ہوا دکھتا ہوں..... بے وقوف کو پتا ہی نہیں کہ آج کل لمبے بالوں کا فیشن نہیں ہے۔“

”پھر کون ہے وہ مگھوئی.....“ سطوت کا مارے غصے کے برا حال تھا۔ بیٹے کی بے قوفی کی وجہ سے ہاتھ سے کروڑوں روپے جانے کا نقصان علیحدہ دکھ دے رہا تھا۔

”سوئیڈی ڈی آپ کو بے حد پسند آئے گی ماما..... وہ جب سے مجھے ملی ہے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”یہ ڈی بھلا کیا نام ہوا.....؟“ وہ غصے سے بولیں۔

”نام تو اس کا ذکیہ ہے مگر گھر میں اس کو سب ڈی کہتے ہیں..... اور وہ ہے بھی تو اسے نو ڈی ماہر۔ تیرا کی بھی جانتی ہے اور گھڑسواری بھی۔“

”ہم دونوں جینمائی ہیں، دونوں کے اشارے کلرز،

میزن، ڈشز سب ایک جیسی ہیں اور میری بات اتنی مانی ہے کہ اسے نیوزی لینڈ پسند نہیں..... مگر جب میں نے اس سے کہا کہ مجھے نیوزی لینڈ پسند ہے تو اس نے کہا اب یہ کنٹری مجھے بھی پسند ہے۔ وہ بیٹنگز سے نفرت کرتی ہے مگر جب میں نے اس سے کہا کہ میں تمہیں اپنی ماس خاندانی برسلٹ شادی میں دوں گا تو اس نے کہا فرحان اب میں چوڑیوں سے کبھی نفرت نہیں کروں گی..... ماما اس کو کہتے ہیں جینی ہم آجنگی..... اب شادی کے لیے اس سے زیادہ ہم آجنگی بھلا کہیں ہو سکتی ہے۔ فرحان سرشار سے لہجے میں ماں سے پوچھ رہا تھا۔

”مگر یہ پگھو نہیں ملی کہاں؟“ مگس نے تمہارا تعارف کروایا اس منحوس سے۔“

”ماما..... اسے لگ کہتے ہیں..... ایک دن میں اپنے دوست کی آنی ڈی پر چینگ کر رہا تھا..... تو ڈی سے میری دوستی ہو گئی..... حالانکہ اس وقت وہ لڑکے کے نام سے چٹ کر رہی تھی اور میں لڑکی بنا ہوا تھا۔“

اور سطوت آرا اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے اب اس تصویر کو دیکھ رہی تھیں جس میں فرحان اپنے کندھے پر ڈی کو بٹھائے کھڑا تھا۔

”اچھی ہے ناں..... ڈی.....“ وہ پوچھ رہا تھا۔

میرے دوست کہتے ہیں البشور یا اور ابھیٹک کی جوڑی ہے..... ایک فلم میں ابھیٹک کا بھی ایسا ہی پوز تھا البش کے ساتھ.....“ فرحان ہنستے ہوئے ماں کو بتا رہا تھا۔

اور سطوت کی اس وقت اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنے بیٹے کو کھری کھری سناسکین کے بعض اوقات دل کی باتیں دل ہی میں داب لیتی پڑتی ہیں کہ اس میں ہی فریقین کا بھلا ہوتا ہے۔

ایک خط

”پیارے میاں جانی  
سچیاں محبتاں!  
آپ تو گھر آتے ہیں تو اپنی ماں بہنوں میں

معروف ہو جاتے ہیں کہ مجھ سے بات کرنے کا نام ہی نہیں ملتا..... آفس جاتے ہیں تو وہاں افسرانہ اکڑ اتنی یادہ آ جاتی ہے کہ بیوی کا فون سن کر چڑھائی سے کھلوا دیتے ہیں کہ صاحب اس وقت بہت زیادہ مصروف ہیں مگر میں بات کرنے کا نام نہیں ہے۔

اس لیے آج آپ کو آپ کے دفتر کے ایڈریس پر دیکھ رہی ہوں۔

نیا سال شروع ہونے والا ہے..... میری بھابی کی بہن جب نجوی کے پاس گئی تھی تو وہ مجھے بھی لے گئی تھی..... اس نے ہزار روپے تو مجھ سے بھی ضرور لیے مگر باتیں اتنی بھی بتائی ہیں کہ آپ بھی خوش ہو جائیں گے۔

اس نے کہا کہ یہ نیا سال بیویوں کا سال ہوگا۔ یعنی اس سال شوہر صاحبان اپنی، اپنی بیوی کا حکم مانیں گے..... ایمان سے میرا دل تو مارے خوشی کے بے حال ہے پندرہ سال شادی کو ہو گئے..... آپ نے میری کوئی بچ باتیں بھی نہیں مانی ہوں گی..... اور اب آپ میری بات مانا کریں گے..... اللہ کتنا اچھا لگا کرے گا۔

نجوی نے دوسری بات یہ بتائی کہ آپ اس جنجال بارے سے نکل کر میرے میکے سے قریب مکان میں بسنے کے جائیں گے..... سچ میں اپنا مکان ایسا پیارا بسٹ کروں گی کہ پورا خاندان حیران رہ جائے گا کہ فرخندہ ذکر نے کتنا پیارا گھر سکھایا ہے۔

مجھے نجوی نے یہ بھی بتایا کہ آنے والے سال میں نو بزم میں آ جاؤں گی۔

ذکر یقین کرو..... جو انٹ فلی سسٹم کی ایک جگہ جو بے حد شاندار ہے وہ ہے کہ اس میں رہنے والا من از خود فنکار بن جاتا ہے یعنی اسے کوئی اسٹی ٹیوٹ ان ہی نہیں کرنا پڑتا..... اب آپ سے کیا چھپانا..... دی وی کے ایک چینل کے لیے جب اپنا آڈیشن دے گی تو انہوں نے مجھ سے پانچ منٹ باتیں کرنے کا یقین دہا کہ ہم اپنی آئندہ آنے والی سیریل میں سائڈ ہیروئن لینے کو تیار ہیں..... میں نے کہا پہلے مجھے بتائیے کہ میرا ہیرو کون ہوگا۔ وہ بولے ہیرو مجھے بھی ہوا آپ کو اس سے کیا مطلب مگر ہیروئن تو آپ

ہیں۔ پلیز ذاکر! اگر تم میرے ساتھ ٹی وی چینل چلو تو شاید وہ تمہیں بھی لے لیں..... اگر ہیر نہیں لے لیں گے تو کم از کم تمہیں میرا شو فریالکک میں تو ضرور لے لیں گے..... کم از کم تم میری وجہ سے ٹی وی پر نظر تو آ جاؤ گے۔

ہاں سب سے خاص بات تو میں بتانا ہی بھول گئی تھی..... وہ یہ کہ نئے سال میں آپ مجھے زیر میٹر گاڑی بھی دلوائیں گے.....

اب آپ گھر آ کر مجھے بتائیے کہ نئے سال میں میرے ارمان کتنے فی صد پورے ہو جائیں گے۔

فقط آپ کی پیاری بیوی فرخندہ ذاکر“

اور اس شب ذاکر اپنی بیگم پر آ کر اتنا چٹختا کبھی وہ پندرہ سالوں میں نہیں چٹتے تھے۔ فرخندہ نے رور کر آنکھیں سجالیں مگر وہ ان کی کسی بات سے اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ تھک ہار کر انہوں نے اپنی بھابی کی بہن کو فون کر کے بتایا کہ نجوی نے ان کے بارے میں تمام پیش گوئیاں غلط کی ہیں..... نئے سال میں اس کی بتائی ہوئی کوئی پیش گوئی پوری ہوتی نظر آ رہی۔

تب بھابی کی بہن نے بھی آزرده سے لہجے میں کہا۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ کوئی اچھا والا نجوی نہیں تھا۔ میرے بارے میں اس نے جو بتایا ہے..... مجھے بھی بالکل غلط لگ رہا ہے۔“

”خواتین میرے ہزار روپے ضائع گئے۔“ فرخندہ کو افسوس ہو رہا تھا۔

”پریشان مت ہو، میں اب تمہیں ایک اچھے نجوی کے پاس لے کر چلوں گی۔ وہ پیسے تو زیادہ لیتا ہے مگر اس کی پیش گوئیاں بالکل اصلی ہوتی ہیں۔“

”نہیں بھئی..... مجھے تو تم رہنے ہی دو..... اس کی پیش گوئیاں کو میرے میاں جی فیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بیویوں کا سال تو کیا کوئی دن نہیں ہوتا..... تو ہمارے بارے میں پیش گوئیاں کیسے صحیح ہو سکتی ہیں؟“

فرخندہ آزرده سے لہجے میں کہہ رہی تھیں جسے ان کی بھابی کی بہن سن کر ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں..... ایسا ہی کچھ ان کے ساتھ بھی تو ہوا تھا۔



## میرا انتخاب

آمنہ حماد

توموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی دنیا بھی بدلتی رہتی ہے۔ اردو ادب اور شاعری کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ اس برصغیر میں تخت طاؤس اور تاج محل کے معماروں کی سلطنت کا آفتاب روشن رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہر رنگ اپنی کشش کھودیتا ہے اور پرانا ہو جاتا ہے مگر ادب میں ایسا نہیں ہے۔ اس کا اندازہ اساتذہ کے کلام کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ فراق گورکھپوری کی یہ غزل بھی کچھ اسی رنگ میں ہے اس کا انتخاب کیا ہے شاز یہ حیر نے کراچی سے۔

### غزل

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں  
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں  
جسے کہتی ہے دنیا کامیابی وائے نادانی  
اسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں  
طبیعت اپنی گھبرائی ہے جب سنان راتوں میں  
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں  
تری مقبولیت کی وجہ واحد تیری رمزیت  
کہ اس کو ماننے ہی کب ہیں جس کو جان لیتے ہیں  
رفیق زندگی تھی اب انہیں وقت آخر ہے  
ترا اے موت ہم یہ دھوا احسان لیتے ہیں  
فراق اکثر بدل کر بھی ملتا ہے کوئی کافر  
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

\*\*\*

ہماری مہکتی فضاؤں میں یہ کیسا درد آسا ہے کہ منظر  
لبو لہو ہیں، دل درد سے بوجھل ہیں۔ گلاب چہرے مر جھا  
رہے ہیں۔ ناامیدی، خوف، مایوسی اور بے بسی کی فضا

جتنی آنکھوں کے نیلم فروزاں نہیں  
جتنے چہروں کے مرجان زرداب ہیں  
جتنی سوچیں بھی مشعل بداماں نہیں  
جتنے گل رنگ مہتاب گہنا گئے جتنے معصوم  
رخسار مچھائے  
جتنی شمعیں تھیں، جتنی شامیں جلیں  
سب کو خوشبو بھری زندگی بخش دیں، تازگی  
بخش دیں

بھر دیں سب کی رگوں میں ہونم بہنم  
مٹل ابر کرم رکھ لیں سب کا بھرم  
دیدہ دل کی بے انت شامی میں ہم  
زخم کھائیں گے حسن چمن کے لیے  
اتک مہر کاں گے مکمل رخسار گل  
صرف آرائش بچہ بن کے لیے  
مسکرائیں گے رونم و غم دہر میں  
اپنی بستی ہوئی انجمن کے لیے  
طعن احباب، سرمایہ کج دل، بجز اغیار سہہ  
لیں گے  
فن کے لیے

### نظم

آؤ وعدہ کریں  
آج کے دن کی روشن گواہی میں ہم  
دیدہ دل کی بے انت شامی میں ہم  
زیر دامن تقدیریں لوح و قلم  
اپنے خوابوں، خیالوں کی جاگیر کو  
فکر کے موقلم سے تراشی ہوئی  
اپنی شفاف سوچوں کی تصویر کو  
اپنے بے حرف ہاتھوں کی تحریر کو، اپنی تقدیر کو  
یوں سنھالیں گے، مثل چراغ حرم  
چسپے آندھی میں بے گھر مسافر کوئی  
جتنی آنکھوں کے بوسیدہ فانوس میں  
چہرہ داروں کی صورت چھپائے رکھے  
جانے والوں کے، دھندلے سے نقش قدم  
آج کے دن کی دلکش گواہی میں ہم پھر ارادہ کریں  
جتنی یادوں کے خاکے نمایاں نہیں  
جتنے ہونٹوں کے یا قوت بے آب ہیں

### غزل

یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا  
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا  
غم جہاں ہو، رخ یار ہو کہ دست عدو  
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا  
تھے خاکہ راہ بھی ہم لوگ قہر طوفاں بھی  
سہا تو کیا نہ سہا اور کیا تو کیا نہ کیا  
خوشاک آج ہر اک مدعی کے لب پر ہے  
وہ راز جس نے ہمیں راندہ زمانہ کیا  
وہ حیلہ گر جو وفا جو بھی ہے جفا جو بھی  
کیا بھی فیض تو کس بت سے دوستانہ کیا

\*\*\*

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں اور جو لوگ  
سراپا محبت ہیں وہ بے ادبی سے گریزی کرتے ہیں۔ یہ  
بات بھی حرف بہ حرف سچ ہے کہ کبھی کبھی واقعی اداس  
ہونے کا کوئی سبب نہیں ہوتا مگر ہماری آنکھیں آنسوؤں  
سے لبریز ہوتی ہیں نہ جانے کیوں..... امیر اسلام احمد نے  
اس نظم میں اس احساس کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا  
ہے اسے منتخب کیا ہے یعنی سحر نے ہری پور ہزارہ سے۔

### نظم

محبت نام کا جواک جزیرہ ہے  
وہاں جانا پڑے تم کو  
ہماری یاد کو بھی ساتھ لے لینا  
سنا ہے اس جزیرے پہ بھی دونس رہتے تھے  
وہ دونوں ایک دو بچے کے دلوں پر راج کرتے تھے  
وہ لاک دو بچے کی آنکھوں میں اتر کر خواب جتنے تھے  
وفا کے تانے بانے رہی باتوں سے بنتے تھے  
پھر روز اس کی تجھیدی بھی کرتے تھے  
مگر رُت کے بدلتے ہی ہوا ایسے  
وہ دونوں مختلف سستوں میں چل نکلے  
سنا ہے پھر دونوں کو اک ساتھ نہیں دیکھا  
محبت نام کا جواک جزیرہ ہے  
وہاں جانا پڑے تم کو



کہا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق میں محبت کا رفرما ہے  
..... خدا نے بشر کو محبت سے تخلیق کیا اور اس کے دل میں  
محبت ڈال دی جو کبھی عشق حقیقی تو کبھی عشق مجازی کی  
صورت میں نظر آتی ہے۔ محبت کے اسی تاثر کو لیے  
اداء جعفری کی نظم وہ لمحہ جو میرا تھا کا انتخاب کیا ہے امینہ  
عندلیب نے سلاوا لی ہے۔

## وہ لمحہ جو میرا تھا

اک دن  
تم نے مجھ سے کہا تھا  
دھوپ کڑی ہے  
اپنا سایہ ساتھ رکھنا  
وقت کے ترکش میں جو تیرے تھے نکل کر برسے ہیں  
زرد ہوا کے پتھر لیے جمونکوں سے  
جسم کا پیچھی گھاسل ہے  
دھوپ کا جنگل، پیاس کا دریا  
ایسے میں آنسو کی اک اک بوند کو  
انساں ترسے ہیں  
تم نے مجھ سے کہا تھا  
سے کی، بہتی ندی میں  
لمحے کی پہچان بھی رکھنا  
میرے دل میں جھانک کے دیکھو  
سات رنگوں کا پھول کھلا ہے  
وہ لمحہ جو میرا تھا وہ میرا ہے  
وقت کے پیکال بے شک تن پر آن لگے  
دیکھو اس لمحے سے کتنا گہرا رشتہ ہے  
خوشبو بند در سے بچے کھول رہی ہے  
چاندنی راتوں سا موسم بھی  
گلیاں بھی ہیں شبنم بھی  
یہ سب میرے آئینے ہیں  
اور ہر آئینے میں تم ہو

تو اس تنہا شجر کے پاس بھی جانا  
کہ جس کی ساری شاخوں کے لہا دے پر  
ہر اک جانب اک نام لکھا ہے  
سنا ہے لکھنے والا زندگی بھر  
پھر کبھی کچھ نہ لکھ پایا

وہ اپنی انگلیوں پر خون کی مہر لگا بیٹھا  
مقدردار کر بیٹھا وہ خود کو ہار بیٹھا  
محبت نام کا جو اک جزیرہ ہے

وہاں جانا پڑے تم کو  
ہماری یاد کو بھی ساتھ لے لینا  
ہماری یاد کو بھی دھوپ میں چھاؤں کی صورت ہے  
یہ ماضی کے کسی معصوم سے گاؤں کی صورت ہے



شوق ہو، لگن ہو، تو انسان اپنی بیشتر خواہشات کی تکمیل  
کر لیتا ہے اسے سب کچھ حاصل ہوتا ہے مگر پھر بھی کچھ کمی  
لگتی ہے۔ کچھ لوگ اس کمی سے واقف نہیں ہوتے اور چند  
لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس بات سے آگاہ ہوتے  
ہیں کہ زندگی میں انہیں کیا ملا اور کس چیز کی کمی رہی۔ جون  
ایلیا کی یہ غزل اسی احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ اسے  
منتخب کیا ہے۔ اقرار شد نے اسلام آباد سے۔

## غزل

نہ ہم رہے نہ وہ خوابوں کی زندگی ہی رہی  
گماں گماں سی مہک خود کو ڈھونڈتی ہی رہی  
حریم شوق کا عالم بتائیں کیا تم کو  
حریم شوق میں بس شوق کی کمی ہی رہی  
پس نگاہ تغافل بھی اک نگاہ کہ تھی  
جو دل کے چہرہ حسرت کی تازگی ہی رہی  
بدل گیا سبھی کچھ اس دیار بودش میں  
گلی بھی جو تری جاں وہ تری گلی ہی رہی  
تمام دل کے محلے اجڑ چکے تھے مگر  
بہت دنوں تو پہنی ہی رہی، خوشی ہی رہی  
سناؤں میں کسے افسانہ خیال ملال  
تری کمی ہی رہی اور مری کمی ہی رہی



## میں اکثر گنگنائی ہوں

صغریٰ زیدی

پہلا انعام یافتہ شعر

☆ نازیہ کنول نازی..... بھاؤنگر  
کہاں سے لاؤں ہنر اب اسے منانے کا  
کوئی جواز نہ تھا اس کے روٹھ جانے کا  
مٹیوں میں سزا بھی مجھے ہی ملنی تھی  
کہ جرم میں نے کیا رابطے بڑھانے کا

دوسرا انعام یافتہ شعر

☆ شائستہ..... لاہور  
کتنی دلکش ہے آس کی خاموشی  
ساری باتیں فضول ہوں جیسے

تیسرا انعام یافتہ شعر

☆ پروین اختر..... حیدر آباد  
اک عمر جو کانے کی طرح چھپتی رہی ہے  
درپردہ اسی بات کا اظہار کیا ہے  
کافی ہے شہادت کے لیے اس کا کرنا  
قاتل نے کبھی جرم کا اقرار کیا ہے  
☆ زاہدہ رزاق..... فیصل آباد  
ہوتا نہیں ہے ختم قاتل آس کا سفر  
پاؤں کٹے ہوئے ہیں مگر چل رہے ہیں لوگ

☆ بشری باجوہ..... اوکاڑہ  
ڈس گیا اسے بھی شاید ہجر کا ناگ  
لہجہ تھکا ہوا، چہرہ بھی زرد تھا  
جی تھی جذبول پہ کچھ برف اور  
کچھ اس کے شہر کا موسم بھی سرد تھا  
☆ فرزانہ قمر..... لاہور  
گلاب لمحوں کے محل پہ کیلتے بچپن  
پلٹ کے آکر میں تجھ سے شرارتیں مانگوں  
☆ ایس ماسن..... سکوال  
کس سوز میں دھلتے ہیں آلام محبت کے  
چل کر تو ذرا دیکھو دو گام محبت کے  
کتنا ہے جگر ان میں ہر لختہ مگر پھر بھی  
بے کیف نہیں جاتے ایام محبت کے  
☆ ناہید..... کراچی  
بات جو دل میں دھڑکتی ہے محبت کی طرح  
اس سے کہنی بھی نہیں اس سے چھپانی بھی نہیں  
☆ فاخرہ جبار..... راولپنڈی  
لب خاموش سے اظہار تمنا چاہیں  
بات کرنے کو بھی تصویر کا لہجہ چاہیں

تو چلے ساتھ تو آہٹ بھی نہ آئے اپنی  
درمیاں ہم بھی نہ ہوں یوں تجھے تنہا چاہیں  
☆ نغمہ اختر..... خانیوال  
صلیب وقت پہ میں نے پکارا تھا محبت کو  
مری آواز جس نے بھی سنی ہوگی، ہنسا ہوگا  
☆ عزیزین..... چکوال

رکھ اپنے پاس اپنے مہ و مہر اے فلک  
ہم خود کی کی آنکھ کے تارے ہیں ان دنوں  
اس عشق نے ہمیں ہی نہیں معتدل کیا  
اس کی بھی خوش مزاجی کے چرے ہیں ان دنوں  
☆ سائرہ رانی..... خانیوال

میں سوچتا ہوں شہر کے پتھر سمیٹ کر  
وہ کون تھا جو راہ کو پھولوں سے ڈھک گیا  
☆ گہمت..... اسلام آباد

کیسا اس نفرت کے سنائے میں گھبراتا ہے دل  
اے محبت کیا ترے ہنگامہ آرا سو گئے  
☆ بشری سلیم..... کوٹری

راہ تاریک سہی پھر بھی ملے گی منزل  
صرف ایک عزم کی قندیل جلا دی جائے  
☆ صدف..... حیدر آباد

جو فصل خواب کی تیار ہے تو یہ جانو  
کہ وقت آگیا پھر درد کوئی بونے کا  
☆ مازہ ریاض..... لاہور

میں آئینہ ہی نہیں عکس بھی ہوں لیکن تو  
وہ روشنی ہے جو دامن کشا گزر جائے  
ہے ایک خواب مری خود غریب آنکھوں میں  
اگر یہ خواب مری روح میں اتر جائے  
☆ عائشہ چندا..... لاہور

اپنے دھوئیں کو چھوڑ گیا آسمان پر  
کہتے ہوئے دیے میں غرور امتحا کا تھا  
☆ عبدالعزیز مریم..... خانیوال

ہے درنجی وہی اور گداگر بھی وہی ہیں  
اس شہر غریباں کے مقدر بھی وہی ہیں

اب بچ کے کہاں جاؤ گے اس شہر غضب میں  
اندر بھی وہی لوگ ہیں باہر بھی وہی ہیں  
☆ حنا متین..... لاہور

سمندروں سے بہت دیر گفتگو مت کر  
یہ لکھ نہ جائیں تری زندگی میں پیاس بہت  
☆ واجدہ واجدہ..... کراچی

اک نام کیا لکھا ترا ساحل کی ریت پر  
پھر عمر بھر ہوا سے میری دشمنی رہی  
☆ علیہ نعیم..... پشاور

ہم حقیقت کو نہیں جان سکیں گے ہرگز  
دل نے آنکھوں سے نکالا ہی نہیں خوابوں کو  
☆ مسز فرح احمد..... لاہور

عجب یہ زندگی کی قید ہے دنیا کا ہر انسان  
رہائی مانگتا ہے اور رہا ہونے سے ڈرتا ہے  
☆ میونہ عزیزین..... کراچی

ہے یہ بھی بچ کہ ترے سامنے مجھے برسوں  
کوئی رفیق، کوئی کام بھی نہ یاد آیا  
پہ چھوٹ یہ بھی نہیں ہے تجھے جو دیکھا کل  
تو کتنی دیر ترا نام بھی نہ یاد آیا  
☆ شاہینہ ممتاز..... بہاولپور

ہزاروں اشک قرباں اس کے افسردہ تبسم پر  
چھپائی مسکرا کے جس نے شدت درد پنہاں کی  
☆ نورین نعیم..... کراچی

تو نے دیکھا ہے منڈیروں پہ چراغوں کو فقط  
میں نے جلتا ہوا ہر دور میں انسان دیکھا  
☆ رضیہ سلطانہ گوئندل..... بھلوال

ترا ہونا ضروری تھا نہ ہونا بھی ضروری تھا  
کسی بھی یاد کا ہستی میں ہونا بھی ضروری تھا  
کہاں تک سوچتے رہتے اسے شام غریباں میں  
تھکن اتنی سفر کی تھی کہ سوتا بھی ضروری تھا  
☆ عربہ عابدہ..... راولپنڈی

نیند والوں کو کیا خبر اس کی  
کون جاگا ہے رات بھر تنہا

بسم اللہ الرحمن الرحیم اور حافظ علامہ کی جانب سے انعامات کا اعلان

حافظ سہیل جلولہ ملتان کی جانب سے چراہ پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے بہترین شعروں پر انعامات دیے جا رہے ہیں۔ کہیں شعر لکھتے ہوئے اپنا مکمل پتہ یا فون نمبر ضرور تحریر کریں۔

نوٹ: انعام یافتہ بہترین اپنے شناختی کارڈ یا اسکول کالج کے کارڈ کی فوٹو کاٹنی فوراً روانہ کریں۔ بغیر شناخت کے انعام روانہ نہیں کیا جائے گا۔







○ سبز دھنیے کا رس نکال کر منہ کے چھالوں پر لگائیں، چھالے ختم ہو جائیں گے۔

○ اگر ہاتھ جل جائے تو پیاز کے عرق میں نمک ملا کر لگانے سے آرام ملتا ہے۔

○ آنکھوں کی بیماری میں چھلی نہیں کھانی چاہیے۔

○ رات کو سونے سے پہلے دودھ میں زیتون کا تیل ڈال کر بننے سے رنگ نکھرتا ہے۔

○ اگر آپ کے چہرے پر جھریاں ہیں تو رات کو سونے سے قبل ایک چمچ شہد میں میوں کا رس ملا کر چہرے پر پندرہ منٹ لگائیں پھر صاف پانی سے چہرہ دھو لیں۔ بیس دن تک یہ نسخہ استعمال کریں۔ چہرے کی جھریاں ختم ہو جائیں گی۔

مرسلہ: نزیہ شہزادی نزی، گوجرانوالہ

دکھو کون سے

رات کے آخر پہر کی قسم دکھوں سے انسان نہیں مرتا تم پوچھو آ کر میری نیندوں سے نکیلے کے بھیکے غلاف سے پوچھو میرے کمرے کی خاموشی سے پوچھو

درو دیوار سے پوچھو تم پوچھو آ کر میرے من کی شورشوں سے وحشتوں کے غبار سے پوچھو تم پوچھو اس کہانی سے، معصوم جوانی سے میرے دل سے پوچھو تم مجھ سے پوچھو تم پوچھو لو درد کی بیکرانی سے دکھوں سے انسان نہیں مرتا

شاعر: محمد ارشد

مرسلہ: روبینہ سید، کراچی

مختصر کہانی

یاد اس کی ہمیں آتی ہے وہ جو خوشبو کی میرے آئینوں کی

میرے دل کی جودھڑکن میرے ہر دن کی سحر ہونٹوں پر رہنے والی

ہمہ وقت جو ہنسی تھی وہ

ہنستے ہوئے جدا ہوئی

پل میں ہم سے خفا ہوئی

گلشن میرا دیران کر گئی

جا کے سب کو حیران کر گئی وہ

نارسانی کا دکھ، دے کر خالی ہاتھ مگر

پھر بھی..... پھر بھی

سب لے گئی، ایسی کیا خطا ہوئی

کڑی اتنی جس کی سزا ہوئی

مرسلہ: مسز ارشد محمود آسی، اتوالہ

فرصت کے الگ کائنات

”ارے شاکر! تم اپنی بیوی کے ساتھ شائع کرنے جا رہے تھے..... یہ اچانک فٹ بال کا میچ دیکھنے کیسے چلے آئے؟“

”ہاں فرید! میں تمہاری بھابی کے ساتھ شائع کرنے ہی نکلا تھا مگر مارکیٹ میں ان کی ایک پرانی سٹیبل مل گئیں۔ میں نے سوچا جب تک وہ دعا سلام کر لیں میں اتنے میچ ہی دیکھ آؤں۔“

مرسلہ: باجرہ نواب، کراچی

گیٹوں

سننے آئے ہیں ہم

کہ

پیٹیاں سب کی ساٹھی ہوتی ہیں

تو ایسا کیوں

ہوتا ہے پھر

جب بھی جو ملنا چھٹتا ہے تو

بہویں ہی کیوں جلتی ہیں





## اچھا سا مزیدار، چلبلاتا ہوا سوال بھیجنے اور حافظ حلوہ کی جانب سے انعامات حاصل کیجیے۔

**نوٹ:** بہتیں سوال بھیجتے ہوئے اپنا مکمل پتہ اور ٹیلی فون نمبر ضرور روانہ کریں۔ انعام یافتہ بہتیں اپنے شناختی کارڈ یا اسکول، کالج کے کارڈ کی نوٹوں کا پی نور روانہ کریں بغیر شناخت کے انعام روانہ نہیں کیا جائے گا۔

## بزمِ پاکیزہ

انجم انصار

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ ایقہ صدف..... حیدر آباد

س۔ سفید جھوٹ کسے کہتے ہیں؟

ج۔ جو سفید لباس پہن کر بولا جائے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ صائمہ کنول..... سرگودھا

س۔ اگر اس سال ساس اور بہو کے جھگڑے

تھانوں تک پہنچنے لگے تو.....؟

ج۔ پولیس والوں کی توجہ دینی ہو جائے گی۔

تیسرا انعام یافتہ سوال

☆ عظیمہ ضامن..... کراچی

س۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور باتوں کے ڈھنگ

بدل گئے..... کس طرح؟

ج۔ اس کے چلن جو بگڑ گئے تھے اس لیے۔

☆

☆ لعلی غزل..... کراچی

س۔ آئے بھی وہ گئے بھی وہ..... آخر کیوں؟

ج۔ نیا نوکر بڈھرام تھا..... کام زیادہ دیکھ کر چلا گیا۔

☆ نوخیز انجم..... جہلم

س۔ کہا جاتا ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہے آج کل

کی موسیقی کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج۔ اچھی خاصی سزا ہے۔

☆ امامہ مجمل..... حیدر آباد

س۔ دو لہا کے سر پر دو پٹا ڈال کر آئینے میں دہن کی

صورت کیوں دکھاتے ہیں؟

ج۔ تاکہ پہلے دن سے ہی وہ ڈر کر رہے۔

☆ فرحت احمد..... کراچی

س۔ شعر مکمل کریں،

آئے موسم رنگیلے سہانے جیا نہیں مانے

ج۔ تو اور دو ٹائم کر کے ہی آنا ہالہ.....!

☆ رابعہ عمر رانی..... ننکانہ صاحب

س۔ وہ اتنے خوبصورت ہیں کہ نظر نہیں ہٹتی مگر ان

کی ناک.....؟

ج۔ بہت خوف ناک ہے۔

☆ ندا اسمیل..... ملتان

س۔ نئے سال کی کوئی نئی بات؟

ج۔ پرانے سال کی باتیں بھی نئی لگیں گی۔

☆ انیلا شاہن مہک..... ٹھٹھک

س۔ اللہ غنی ہے، انسان غنی ہے، دولت پانی ہے

دنیا فانی ہے پھر کیوں انسان دولت کے لیے دھن جانی

ہے؟

ج۔ بیکار کی من مانی ہے۔

☆ بشری باجوہ..... اوکاڑہ

س۔ اس سادوں میں وہ کس کو جھولا جھلائیں گے؟

ج۔ جو ان کے قریب ہوگا۔

☆ منی بیگم..... گوجرانوالہ

س۔ اگر کسی کا دلیر کھلے میدان میں ہو اور بارش کا  
طوفان ہو تو..... تو کیا ہوگا؟

ج۔ ظاہر ہے لوگ دھکیں لے کر بھاگیں گے

..... دو لہا، دو لہن تو خود بھاگ سکتے ہیں۔

☆ ہاجرہ نواب..... کراچی

س۔ وہ ہر وقت مجھ سے ناخوش رہتے ہیں حالانکہ

بہت کوشش کرتی ہوں مگر ناکام..... آخر کیوں؟

ج۔ آپ ابھی اپنے میاں کو صحیح طرح سے پرکھ نہیں

سکی ہیں کہ ان کی خوشیاں کیا ہیں۔

☆ ساجدہ ظفر..... سکمالیہ

س۔ سادوں کے اندھے کو ہر اہی سوچتا ہے، پیلا

کس کو نظر آتا ہے؟

ج۔ بسنت کے اندھے کو.....!

☆ امین رانی..... سکمالیہ

س۔ وہ محلے میں اس قدر غیر مقبول کیوں ہے؟

ج۔ اپنی کڑی کھلا بیٹھو تیز کی وجہ سے۔

☆ ڈاکٹر عفت مسعود..... سکمالیہ

س۔ سینڈل اور اسکیٹل میں کیا فرق ہے؟

ج۔ اگر شروع میں ہی سینڈل برس جائیں تو

اسکیٹل نہیں بن سکتا۔

☆ فارخہ گل..... اٹلی

س۔ آنٹی ہوائی جہاز میں ہارن کیوں نہیں ہوتا؟

ج۔ ابھی آسان کی سڑکوں پر اتار دیا نہیں ہے

نا، جب وہاں پر بھی ٹریفک جام ہونے لگے گا تو ہارن ہی

ہارن بنائی دیں گے۔

☆ غزالہ یاسین..... سرگودھا

س۔ تو کبے اگر جیون بھر..... آگے انہوں نے کیا کہا

تھا؟

ج۔ غلام بن کر رہوں گا۔

☆ عرشہ مجید..... کراچی

س۔ بابائی میں پنجاب جاری ہوں، بتائیے کیوں؟

ج۔ گھومنے کے لیے۔

☆ مسکان اقبال خان..... میرپور خاص

س۔ میری نند میرے اچھے کپڑے دیکھ کر کیوں

جلتی ہے؟

ج۔ وہ آپ سے متاثر بھی تو بہت ہے۔

☆ سعدیہ ہاشم..... سرگودھا

س۔ شادی سے پہلے لڑکا، لڑکی کے لیے جھگڑتا ہے

اور شادی کے بعد؟

ج۔ بیوی سے جھگڑتا ہے۔

☆ رخسانہ..... پنجاب

س۔ وہ اکثر تصویر لیے پھرتے ہیں، بھلا کس کی؟

ج۔ کسی مریض کے ایکسرے کی ہوتی ہے امداد

حاصل کرنے کے لیے۔

☆ رعنا عالم..... لاٹھی، کراچی

س۔ طنزیہ لہجے میں گفتگو کرنے والے لوگ کیسے

ہوتے ہیں؟

ج۔ بدتمیز اور بد صورت

❖

الرحمی  
کینا ڈسٹ  
چھتکیں

ہولن پرانازلہ چنبل مرگی

تمام دوائی، ادوا، امراض

کا آسان اور قدرتی حل!

سہولیات ڈاکٹرناسک  
تخصیص  
چند

لیزر  
بال، جمریاں  
مستقل خاتمہ  
ریجوینیشن  
مستقل خاتمہ

لاہور ماڈل الرحمی دماہ کلینک

لاہور میڈیکل سنٹر 25 شاہراہ راک روڈ

سنگاپور میڈیکل سنٹر بین روڈ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

0333-4244727



# روحانی مشورے

ادارہ

اور اپنا ہر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر کریں۔

اس دعا کو پڑھنا اپنا معمول بنالیں۔ یہ نہ صرف ہر پریشانی کا علاج ہے بلکہ آپ کی ہر مراد کو پورا بھی کر سکتی ہے۔ (اگر وہ جائز ہو تو) دعا حسب ذیل ہے جسے آپ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بتا کر نیکی کے کاموں میں شریک ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم O

یا لطیفاً بخلقہ یا علیماً بخلقہ یا  
خبیراً بخلقہ اللطیف بی یا لطیف یا علیم یا  
خبیر O

(نوٹ: انمول خزانے کی یہ دونوں دعائیں قارئین کرام کی فرمائش پر تیسری مرتبہ شائع کی جا رہی ہیں)

مال میں برکت کے لیے

ہمارے پاس مختلف مقامات سے بے شمار خطوط آتے ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ ان کے ہاں برکت نہیں ہے۔ کہیں پیسے کی کمی ہے وہاں برکت نہیں ہے اور جہاں پیسے کی زیادتی ہے وہاں بھی برکت نہیں ہے۔ اس ضمن میں، میں اپنے تمام قارئین سے یہ کہنا چاہوں گی کہ ہر کام کرنے سے پہلے پوری بسم اللہ پڑھا کریں۔ گھر میں سلام کو پھیلائیں بلکہ سلام کرنے میں سبقت

انمول خزانہ کی ایک دعا

انمول خزانے کی دعائیں پڑھنے سے بے شمار فوائد اور فضائل حاصل ہوں گے۔ ان دعاؤں کو تمام قارئین کو پڑھنے کی عام اجازت ہے۔ اسے ہر پریشانی کے حل کے لیے پڑھ سکتے ہیں۔ کسی ناجائز کام یا کسی کو تکلیف دینے کے خیال سے ہرگز نہ پڑھا جائے کہ فائدہ نہیں ہوگا۔

اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے درود شریف کم از کم تین مرتبہ پڑھیے پھر بسم اللہ پڑھ کر ہر فرض نماز کے بعد یہ دعا میں پڑھیں۔

(۱) سورۃ فاتحہ (۲) آیت الکرسی (۳) سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۹-۱۸ تک (۴) سورۃ آل عمران آیت نمبر ۲۶-۲۷ تک (۵) سورۃ توبہ آیت نمبر ۱۲۸ سے ۱۲۹ (۶) حادثات سے بچنے کی دعا اللھم انت ربی سے صراط مستقیم تک۔

انمول خزانے کی دوسری دعا

ہر نماز کے بعد ادا دل و آخرو درود شریف کے ساتھ کم از کم تین مرتبہ پڑھیے۔ آپ اس دعا کو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سفر کرنے کے دوران، بس میں، اسٹاپ پر، وضو، وضو بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس دعا کو پڑھنے کے لیے نماز کی باقاعدگی کرنی ہوگی۔ سلام میں پہل کریں



حاصل کیا کریں۔ آج سے یہ عہد بھی کر لیں کہ فون کرتے وقت آپ ہلو کے بجائے السلام علیکم کہا کریں گے۔ جب آپ اپنے گھر میں داخل ہوں، بے شک دس مرتبہ باہر سے گھر آئیں تو ہر مرتبہ گھر میں داخل ہوتے وقت پہلے بسم اللہ پڑھیں پھر ایک مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر سیدھا پاؤں اندر پہلے رکھیں اور قدم بڑھا کر گھر میں موجود سب لوگوں کو سلام کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ آج ایک بے حد جامع دعا ہم آپ کو بتا رہے ہیں۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جس شخص کو منظور ہو کہ میرا مال بڑھ جائے، وہ یوں کہا کرے۔

اللہم صلی علی محمد عبدک ورسولک وصلی علی المومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات O

(بخاری و ابوداؤد السعید)

**خوبصورتی کے لیے**  
آپ سب ہر نماز کے بعد ایک تسبیح درود شریف اور ایک تسبیح یا جیل کی پڑھ کر شیشہ دیکھا کریں۔

**حصول قوت جسمانی کی دعا**  
سیدنا ابن عباسؓ کہتے ہیں قبیحہ بن خارق الہلالی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ انہیں خوش آمدید کہا پھر فرمایا۔ ”قبیحہ! کیسے آتا ہوا؟“

عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میری جلد نرم پڑ چکی ہے اور میرے قوی کمزور ہو چکے ہیں۔ میں اپنے اہل و عیال کے سلسلے میں کمزور ہو چکا ہوں اور ان کاموں کے کرنے سے عاجز ہو چکا ہوں جو پہلے کیا کرتا تھا، پس مجھے چند کلمات سکھائیے جس سے اللہ مجھے فائدہ پہنچائے اور وہ کلمات مختصر ہوں۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے قبیحہ! جب تم صبح کی نماز پڑھ چکو تو تین مرتبہ یہ کہو۔

سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم O

(اللہ کی ذات پاک ہے اور اسی کے لیے حمام تعریف ہے۔ اللہ کی ذات پاک اور بڑی ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور کوئی طاقت اور قوت نہیں مگر اللہ ہی کے ذریعے)

پس جب تم یہ کہو گے تو اللہ کی مرضی سے تم اندھا پن، جذام اور برص سے محفوظ ہو جاؤ گے۔“ راوی کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے جا رہے تھے اور قبیحہ اسے اپنی انگلیوں پر اشارہ کر رہے تھے۔ (ترمذی)

نوٹ (تمام قارئین سے کہوں گی کہ تیسرے کلمے کو صبح و شام کم از کم تین تین مرتبہ پڑھنا اپنا معمول بنا لیں)

**ہر بیماری کا علاج**

اول و آخر تین تین مرتبہ درود ابراہیمی۔ سات مرتبہ سورۃ الفاتحہ۔ ایک سو پندرہ مرتبہ یا سلام اور ایک تسبیح (سو مرتبہ) یا حفظ پڑھ کر پانی پر دم کر کے سارا دن وہی پانی پئیں۔ ہر بیماری کا علاج ہے۔

**نشادی کے لیے**  
اول و آخر تین تین مرتبہ درود ابراہیمی اور تین مرتبہ سورۃ تغابن (انٹیکس وال پارہ گیارہ دن پڑھیں پھر ایک دن چھوڑ کر پھر گیارہ دن پڑھیں۔ انشاء اللہ جلدی اور اچھا رشتہ ملے گا۔ (تین ماہ تک کریں)

**بینانی کے لیے**  
اول و آخر تین تین مرتبہ درود ابراہیمی اور آسمانی مرتبہ یا غفور پڑھ کر پانی پر دم کر کے آئیں دھوئی جائیں۔ روزانہ یہ عمل کرنے سے چند ماہ بعد آنکھوں کی روشنی بھی تیز ہوگی اور اس سے متعلق تمام بیماریاں بھی دور ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ!



## بیوی کی کلینک

رضوانہ خان

خوبصورتی اللہ کی دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو خوبصورت بنایا ہے۔ اس حسن کی حفاظت کرنا بے حد ضروری ہے۔ ہر عورت چاہتی ہے کہ وہ خوبصورت لگے اور یہ اس کا حق بھی ہے لیکن اس کے لیے تھوڑا سا وقت نکال کر اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کی حفاظت کرنا بے حد ضروری ہے۔ پاکیزہ کے ان صفحات میں آپ کو گھریلو ٹونکے اور جدید تکنیک دونوں ہی ملیں گی جس سے آپ گھر بیٹھے خوبصورت، مزید خوبصورت بن سکتی ہیں اگر آپ مجھ سے براہ راست جواب چاہتی ہیں تو لفافے پر شعبہ بیوی کلینک لکھ کر پاکیزہ کے پتے پر ارسال کر سکتی ہیں۔ نماز کی پابندی کریں اور اپنا دل صاف رکھیں آپ ہمیشہ خوبصورت رہیں گی۔ اس ماہ کچھ بہنوں کے مسائل اور ان کا حل درج ذیل ہیں۔

ردافاطہ..... کراچی

س: سردیاں آتے ہی میرے چہرہ خشک اور سیاہی مائل ہو جاتے ہیں۔ ایڑیاں سخت اور بد نما لگتی ہیں۔  
ج: ردا، یہ مسئلہ صرف آپ ہی کا نہیں ہے یہ ایک عام مسئلہ ہے۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں، بیروں کی حفاظت ہر موسم میں ضروری ہے کیونکہ بد نما پیر پوری شخصیت کا تاثر خراب کر سکتے ہیں۔ سردیوں میں یہ مسئلہ اس لیے بڑھ جاتا ہے کیونکہ فضا میں خشکی بڑھ جاتی ہے اور بیروں کی جلد خشک ہو جاتی ہے۔ مردہ خلیے کی تہ بیروں پر جم جاتی ہے اس کے لیے چند آسان اور بے حد ضروری نسخے ہیں۔ سب سے پہلے تو بیروں کو ہمیشہ صاف رکھیں۔ روزانہ بیروں کو برش سے یا بازار میں عام ملنے والے جھاڑوں سے رگڑ کر صاف کریں۔ خاص کر ایڑیوں کو..... برش اس لیے بہتر رہتا ہے کیونکہ اس

سے ناخنوں و اس کے ارد گرد جمع خشکی اور میل کی صفائی بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ آپ چاہیں تو ناخن صاف کرنے کے لیے پرانا ٹوتھ برش بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ آپ نوکری کرتی ہیں تو کوشش کریں کہ بیروں کو دھوپ اور گرد و غبار سے بچائیں۔ سینڈل کے بجائے جلد کے ہر رنگ موزوں اور جھوٹوں کا استعمال کریں۔ روزانہ سونے سے پہلے پیر دھو کر کوئی اچھی کریم لگائیں اور موزے پہنیں۔ اگر موزے پہن کر سونے کی عادت نہیں ہے تو کم از کم دو گھنٹے موزے پہن کر رکھیں اور سونے سے پہلے اتار دیں۔ ہفتے میں ایک دفعہ گھر پر پیڑی کیور کریں۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ پیڑی کیور کی مہنگی کریمیں اور نول کٹ خریدیں۔ طریقہ کچھ یوں ہے کہ ایک ہالٹی میں نیم گرم پانی لیں۔ اس میں آدھا چائے کا چمچ نمک اور ایک بڑا چمچ شیو ڈال کر پانی ہلا لیں۔ میں منٹ اس پانی میں پیر ڈبو کر رکھیں۔ بیروں کو اچھی طرح برش سے صاف کریں۔ نیم گرم پانی سے پیر دھو کر کریم سے بیروں پر مساج کریں اور موزے پہن لیں۔ ایک گھنٹے بعد موزے اتار کر صاف کپڑے سے بیروں کو صاف کر لیں۔ صبحے میں ایک بار کسی اچھے بیوٹی پارلر سے پیڑی کیور بھی کروا سکتی ہیں۔

کنول راشد، کراچی۔ معیزہ خان، کراچی۔ نیہا سومان، کراچی۔ ندا حنیف، کراچی۔ صبا احمد، اسلام آباد۔ شائستہ نظام، حیدر آباد۔

آپ تمام بہنیں براہ راست جواب چاہتی ہیں اس کے لیے آپ پاکیزہ کے دفتر فون کر کے میرا نمبر لے کر رابطہ کر سکتی ہیں۔ خوش رہیے اور ہمیشہ خوبصورت نظر آئیے، اللہ نگہبان۔





# عید کے پکوان

پاکیزہ بہنیں

## لذیذ چانپ

اشیا کے چانپ، ایک کلو۔ گھی، ایک پاؤ۔ پیاز، ایک پاؤ۔ دہی، ایک پاؤ۔ بھنے ہوئے پننے، ایک کچھ۔ خشکاش، ایک کچھ نمک، حسب ذائقہ۔ مرچ، حسب ضرورت۔ کچا پیٹا، ایک کلو۔ دھنیا، ایک کچھ۔ ہری مرچ، چھ عدد۔ زیرہ، ایک کچھ۔ کالی مرچ، دس عدد۔ لونگ، چار عدد۔ دارچینی، ایک کلو۔ ادراک، ایک گانٹھ۔ بڑی الائچی، چار عدد۔ ٹماٹر، دو عدد۔ سرکہ، تھوڑا سا۔

ترکیب: چانپوں کو نمک اور سرکہ لگا کر رکھ دیں۔ کالی مرچ، لونگ، الائچی، دارچینی اور لہسن کو پیس لیں اور پے ہوئے اس سارے مسالے کو دہی میں ملا دیں۔ نمک، بھنے ہوئے پننے، مرچ، خشکاش اور پیٹا بھی پیس کر تھوڑا سا پانی ڈال کر خوب اچھی طرح ملا لیں۔ چانپ دہی میں ڈال دیں اور ایک گھنٹے تک رکھا رہنے دیں۔ دہی میں گھی گرم کر کے لچھے دار پیاز تل لیں۔ پیاز کے بعد ٹماٹر اور ادراک، لہسن، گھی میں ڈال دیں۔ جب ان کا پانی خشک ہو جائے تو زیرہ ڈال کر بھجوں۔ ٹماٹر مسالے میں چانپ اور دہی ڈال کر ہلکی آگ پر پکے دیں جب چانپیں گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو کچھ دیر ان کو اور بھجوں جب مسالا گھی چھوڑ دے تو چند منٹ کے لیے ڈھکن لگا کر دم پر رہنے دیں بعد میں نان اور سلا کے ساتھ پیش کریں۔

میونہ عزیز، کراچی

## تنوری تکیے

اشیا کے گوشت کے تیلے پارچے، آدھا کلو۔ پیاز، ایک پاؤ۔ دہی، ایک پاؤ۔ گھی، آدھا پاؤ۔ کچا پیٹا، آدھا پاؤ۔ زیرہ، تل، خشکاش، ایک ایک چھٹانک۔ بھنے ہوئے پننے، آدھا پاؤ۔ لہسن، ایک پونجی۔ نمک، حسب ذائقہ۔ سرخ مرچ، حسب ذائقہ۔

ترکیب: پیاز کے باریک لچھے کا بے اور انہیں تھوڑے گھی میں تل کر لال کر کے نکال لیجئے۔ دیگر تمام مسالے بھی اسی طرح گھی میں تل کر نکال لیجئے۔ اب انہیں پیاز کے ساتھ سل پر باریک پیس لیں پھر ان میں پہلے پیٹا پیس کر ملا لیں پھر پیاز اور مسالے بھی شامل کر دیجئے اب مرکب کو خوب اچھی طرح ملا لیجئے تاکہ اس کے تمام اجزاء خوب اچھی طرح گل مل جائیں۔ اس کام سے فارغ ہو جانے کے بعد اس میں پسی ہوئی ادراک، پیاہوا لہسن، نمک، اور دہی بھی ملا دیں۔ یہ مرکب گوشت کی بوتلیوں پر اس طرح لگائیں کہ بوتلیاں اس میں پوری طرح لتھ جائیں۔ انہیں کم از کم تین گھنٹے تک اسی حالت میں رکھ دیجئے (اس طرح گوشت کے ریشے مسالا جذب کر کے جلد گھٹنے کے قابل ہو جاتے ہیں) پھر انہیں کسی تھالی میں پھیلا کر اوون یا بھنی یا تنور میں اس طرح دم پر لگا دیجئے کہ تھالی پر ڈھکنے یا سرپوش کی قسم کا کوئی برتن ضرور ہو۔ کچھ دیر بعد اس برتن کو اٹھا کر تنوں کی حالت کا اندازہ لگائیں۔ اگر سرخی پر آگئے ہیں تو تھالی تنور سے نکال لیجئے اور پراٹھوں کے ساتھ گرم گرم کھائیں۔

آمنہ، اسلام آباد

## بیف اور پیاز کا سوپ

اشیا کے پیاز، دو عدد۔ چینی، دو چائے کے کچھ۔ کارن فلور، دو کچھ۔ لال مرچوں کی پٹنی، آدھا چائے کا کچھ۔ گائے کا گوشت، ڈیڑھ کلو۔ سویا سوس، ڈھائی چائے کا کچھ۔ پسی ہوئی ادراک، آدھا کھانے کا کچھ۔ پانی، حسب ضرورت۔ دبئی ٹیل آئل، چار چائے کے کچھ۔ نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب: گائے کے گوشت کے پارچے بنائیں۔ پیاز باریک کتر لیں۔ کارن فلور اور پانی مسالوں کا آمیزہ بنائیں۔ گوشت کے پارچوں کو اس میں شامل کر کے مسالا اس میں لگائیں۔ یہ مسالا تھوڑی دیر تک اس میں رہنے دیں۔ بڑے فرانی پن میں تیل ڈالیں۔ گرم ہونے پر باریک کتری ہوئی پیاز اس میں ڈال کر تین منٹ تک تیز آگ پر فرانی کریں۔ اب اسے پانی میں ایک طرف رکھ دیں اور گوشت کے آمیزے کے ساتھ فرانی پن کے وسط میں ڈال دیں اور اس کے ساتھ ہی حسب ضرورت پانی شامل کر دیں۔ ڈیڑھ منٹ تک تیز آگ پر فرانی کریں اور پھر اسے پانی اور پیاز کے ساتھ ملا کر تین یا چار منٹ پکائیں۔ اب اسے گرم گرم پیش کریں۔

حناء، کوئٹہ

## کچے گوشت کی بریانی

اشیا کے گوشت، ایک کلو۔ چاول، ایک کلو۔ پیاز، ایک پاؤ۔ لال مرچ پسی ہوئی، آدھا چائے کا کچھ۔ بلدی، ایک چوتھائی چائے کا کچھ۔ بڑی الائچی، تین عدد۔ دارچینی، چار کلو۔ جاوڑی پسی ہوئی، آدھا چائے کا کچھ۔ ادراک، ایک چھٹانک۔ لہسن، دو پونجی۔ دہی، ڈیڑھ کلو۔ ہری مرچ، آٹھ عدد۔ لیون، ایک عدد۔ پیٹا، تھوڑا سا۔ لونگ، چھ عدد۔ چھوٹی الائچی، تین عدد۔ پودینہ، ہر ادھیا، آدھی آدھی گڈی۔ زعفرانی رنگ، حسب ضرورت۔ نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب: گوشت صاف کر کے اس میں بڑی اور چھوٹی الائچی پیس کر لگادیں۔ تھوڑی دیر بعد لہسن، پیٹا اور ادراک بھی پیس کر لگادیں پھر کسی دہنی میں پیاز باریک کاٹ کر گھی میں براؤن کریں پھر اس میں آدھا مسالا پیس کر اور ہر ادھیا کاٹ کر ڈال دیں۔ گوشت میں آدھا لیون کا عرق ملا دیں اور حسب ضرورت نمک ڈال دیں۔ اب اس کو دو گھنٹے کے لیے علیحدہ رکھ دیں۔ اس دوران چاول صاف کر کے بھجوا دیں اور کچھ دیر بعد دہنی میں پانی ابالیں جب پانی کھولنے لگے تو اس میں چاول اور نمک ڈال دیں، بقیہ ثابت گرم مسالا بھی ڈال دیں جب چاول میں ایک نئی رہ جائے تو اتار کر چھلنی میں چھان لیں پھر خالی دہنی میں گوشت ڈالیں اور اس پر یہ چاول پھیلا دیں اس کے اوپر پھر گرم مسالا اور براؤن کی ہوئی پیاز اس پر پھیلا دیں اس کے اوپر پھر مزید چاول پھیلا دیں اور زعفران ڈال دیں۔ دہنی پر ڈھکن رکھ کر اس کے کناروں پر آٹا لگادیں تاکہ اندر کی بھاپ ڈرا بھی باہر نہ آئے چند منٹ تک دم دینے کے بعد اتار لیں۔ بریانی تیار ہے۔

صبیحہ علی، کوٹ غلام محمد

## گولا کباب

اشیا کے قیمہ، آدھا کلو۔ کچا پیٹا، دو انچ کا کلو۔ لونگ، چھ عدد۔ جاوڑی، دو کلو۔ خشکاش، چار کھانے کے کچھ۔ بھنے ہوئے پننے، پے ہوئے، چار کھانے کے کچھ۔ ہرا دھنیا کترا ہوا، تھوڑا سا۔ ادراک، ایک انچ کا کلو۔ لہسن، چار جوے۔ بڑی الائچی، دو عدد۔ چھوٹی الائچی، چھ عدد۔ دارچینی، ایک انچ کا کلو۔ سرخ مرچ پسی ہوئی، ایک چائے کا کچھ۔ پیاز، ایک عدد۔ نمک، حسب ضرورت۔

ترکیب: کچا پیٹا پیس کر اور نمک قیمے میں ملا لیں اور تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں پھر اس میں باقی تمام مسالے پیس کر اور ہر ادھیا، پودینہ اور باریک کٹی



ہوئی پیاز ملا دیں۔ سب کچھ ملانے کے بعد دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر بہت ہلکی آگ پر کباب بنا کر فرائی کر لیں اور اس بات کا دھیان رکھیں کہ مسالے پیتے وقت زیادہ پانی نہ ڈالیں۔

شببہ مرغی، ایبٹ آباد

## دھواں دھنی گوشت

اشیا کچھ گوشت، گائے، بکری، مرغی، ایک کلو۔ پیاز، درمیانے سائز کی تین عدد۔ دہی (زیادہ کھانا نہ ہو) ڈبڑھ کپ۔ اورک، لہسن، پیسٹ، ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ جھوٹی الائچی، چار پانچ عدد۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا، پودینہ۔ سجاوٹ کے لیے۔ سرخ مرچ، نمک، حسب ذائقہ۔ پیاز دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔ تیل، آدھا کپ۔ کونکہ، ایک درمیانے سائز کا۔ ترکیب کچھ ایک پیاز باریک پیس لیں اور لہسن، اورک، نمک، مرچ اور دھنیا کے ساتھ گوشت میں ملا دیں۔ دیگی میں چار پانچ پیالی پانی ڈالیں یہ مسالا ملا گوشت اتنا پکائیں کہ گل جائے مرغی میں پانی کی مقدار کم رکھیں۔ گوشت گھنے پر اوپر سے تیل ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ اب دہی میں چٹکی بھر نمک ڈال کر بقیہ پیاز کے گول گول لچھے کاٹ لیں۔ ایک سرونگ ڈش میں پہلے گوشت پھر دہی اور پھر ہرا دھنیا ہری مرچ کاٹ کر ڈالیں اسی طرح تہہ لگاتی جائیں۔ کونکے کو آگ پر خوب دہکا لیں۔ اب اس ڈش میں روٹی کے ٹکڑے یا پیاز کے اوپر یہ سرخ کیا ہوا کونکہ رکھ لیں اور اس پر ایک قطرہ تیل ڈال کر ڈش کا دھکن بند کر دیں کچھ دیر بعد روٹی اور کونکہ نکال لیں۔

سلی، پشاور

## کلیجی

اشیا کچھ کلیجی، آدھا کلو۔ پیاز، دو عدد بڑی۔ نمائز، دو عدد بڑے۔ دہی، ایک پیالی۔ لہسن، اورک کا پیسٹ، دو کھانے کے چمچ۔ دھنیا پھا ہوا، ایک چمچ۔ ہلدی، آدھا چمچ۔ پسا گرم مسالا، ایک چمچ۔ سوکھی

میتھی، ایک چمچ۔ تیل، حسب ضرورت۔

ترکیب کچھ کلیجی اچھی طرح صاف کر لیں اور دھو کر رکھ دیں۔ پیاز براؤن کریں اور نکال لیں پھر اس کو دہی، نمائز کے ساتھ پیس لیں۔ اب تیل میں لہسن اورک کا پیسٹ فرائی کریں پھر اس میں ہلدی دھنیا پس پیاز اور کلیجی شامل کر دیں اور خوب اچھی طرح بھون لیں۔ تھوڑا پانی ڈال کر گھنے دیں۔ گھنے پر اس میں سوکھی میتھی بھی شامل کر دیں اور بھون کر پسا گرم مسالا اور ہرا دھنیا، ہری مرچ شامل کر دیں۔

صائمہ انظہر، گوجرانوالہ

## مغز

اشیا کچھ گائے، بکرے کا مغز 6 عدد۔ پیاز، دو عدد درمیانے۔ نمائز، دو عدد۔ گرم مسالا، ثابت تھوڑا سا۔ بھنا پھا دھنیا، ایک چمچ۔ ہلدی، آدھا چمچ۔ زیرہ سفید، ایک چمچ۔ نمک، ایک چائے کا چمچ، لال مرچ پس ہوئی، دو چمچ۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا۔ گارنش کے لیے۔ لہسن، اورک کا پیسٹ ایک چمچ۔ تیل، حسب ضرورت۔ ترکیب کچھ مغز کو صاف کر لیں اور دھو کر رکھ لیں۔ تیل میں پیاز لال کریں پھر اس میں لہسن، اورک کا پیسٹ ڈال دیں۔ ہلدی اور گرم مسالا، دھنیا، نمک، مرچ ڈال کر نمائز بھی ڈال دیں۔ دو منٹ بعد مغز بھی ڈال دیں۔ مغز بہت زیادہ توڑیں نہیں اچھی طرح بھون لیں۔ آخر میں ہرا دھنیا، ہری مرچ کاٹ کر چھڑک دیں۔

جویریہ علی، میرپور خاص





**نوٹ:** ہومیو پیتھی علاج میں علامات کی بڑی اہمیت ہے، آپ بیماری کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ہمیں لکھ کر بھیجیں تاکہ بہتر سے بہتر دوا کا انتخاب کیا جاسکے۔ بہنوں کو باری کے ساتھ جواب دیئے جاتے ہیں۔ بذریعہ ڈاک مشورے کی کوئی فیس نہیں لی جاتی اور دوائیں بھجوانا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ مشترکہ پرہیز زیادہ ٹھنڈی غذائیں، بادی اشیاء، ٹھنڈے مشروبات اور بڑا گوشت ہے۔ دن میں 10-15 گلاس پانی ضرور پیتیں۔ نوٹ اپنے مسائل کے ساتھ اپنی تحریر فرمائیں۔ تمام خطوط اس پتے پر بھیجیں۔

ہومیو پیتھک ماہنامہ پاکیزہ۔ پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200

## ہومیو کلیٹک

ڈاکٹر ارشد قاز

امرافاطہ..... قصور

حل کے آپ نے جو علامات تحریر کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا معدہ ٹھیک کام نہیں کر رہا ہے۔ آپ ڈاکٹر ولما رشواہی کے دوا Merc Sol-30 کے پانچ پانچ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ آپ کے معدے کی تکالیف درست

## ٹوکن برائے ہومیو کلیٹک

فروری 2008

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسکوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مینے بھیجیں اسی مینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام:

پتا:

ہو جائیں گی۔ منہ سے بد بو آتا بھی بند ہو جائے گی اور دانٹوں میں ٹھنڈا گرم لگنا بھی ختم ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ آپ لہٹک لیبارٹری کی دوا L-No-95 کے پانچ پانچ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ بڑے گوشت اور بادی چیزیں استعمال نہ کریں۔

رائیل قریشی، نواب شاہ۔ جیلہ نعیم، حسن ابدال حل کے آپ سب نے لکھا ہے کہ بال گرتے ہیں اور ان میں خشکی بہت زیادہ ہے اس کے لیے مناسب نسخہ تجویز کریں۔ آپ سب کی خواہش کے مطابق نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ سب Cinci Hair Oil کا سر پر روزانہ مساج کریں اور اس کے ساتھ ہی مہران ہومیو فارما کا تیار کردہ ہریز شیمپو سر دھونے کے لیے استعمال کریں۔ انشا اللہ چند روز کے استعمال سے ہی آپ کے سر کی خشکی ختم ہو جائے گی اور بال بھی گرنا رک جائیں گے۔ نمک کا استعمال کم سے کم کریں دپے بھی آئیو ڈین ملائیم استعمال کریں۔ کھٹی چیزوں کے استعمال سے بھی گریز کریں۔

راجہ اشرف، لاہور..... شیریں بی بی، سوات حل کے آپ سب نے لیکوریا کے لئے مجرب نسخہ تجویز کرنے کی درخواست کی ہے۔ آپ سب کے لیے نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ لہٹک لیبارٹری فرانس کی دوا L-No-20 کی دو دو فیملٹ دن میں تین بار چپا کر کھائیں۔ دو سے تین ماہ تک اس دوا کا مسلسل استعمال کریں اور اس کے ساتھ Toko-40 کپسول صبح شام ایک ایک پانی کے ساتھ کھائیں۔ کھٹی چیزوں سے

پرہیز کریں۔ چاول اور بادی چیزوں سے پرہیز کریں۔ دودھ روزانہ پیتیں، تازہ سبزیاں اور موسم کے چھل کھائیں۔ اس نسخے کے استعمال سے لیکوریا بھی ختم ہو جائے گا اور کمزوری بھی دور ہو جائے گی۔

نگھام حسین..... پنجند

حل کے آپ نے جو علامات تحریر کی ہیں اس کے مطابق دوا تجویز کر رہا ہوں۔ آپ لہٹک لیبارٹری فرانس کی دوا L-No-2 کے پندرہ پندرہ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ اس کے ساتھ Sinuspax-Tab ایک ایک گولی چوس کر کھائیں۔ دوا ہر تک تجویز کردہ ادویات استعمال کرنے کے بعد اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔ ٹھنڈی کھٹی اور چکنائی والی اشیاء استعمال نہ کریں۔ ٹھنڈے پانی سے غسل نہ کریں اور آکس کریم اور کولڈ ڈرنک کا استعمال بھی نہ کریں۔ آپ ایک ماہ تک یہ ادویات استعمال کرنے کے بعد لہٹک لیبارٹری کی دوا Santaherba کے پندرہ پندرہ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر تین بار پی لیں، مزید تفصیل کے لیے آپ میرے موبائل پر دن میں دو بجے سے چار بجے تک رابطہ کر لیں۔

نبیل احمد شیخ..... سمندری

حل کے آپ نے جو علامات تحریر کیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بے راہ روی کا شکار رہے ہیں جس کے باعث اب آپ کی کیفیت پریشان کن ہے۔ آپ Toko-5 کی ایک گولی روزانہ رات سوتے سے قبل پانی کے ساتھ کھائیں اور اس کے ساتھ لہٹک لیبارٹری فرانس کی دوا Titanium-3X کی ایک ایک گولی دن میں تین بار چپا کر کھائیں۔ کھٹی اور تلی ہوئی چیزوں سے پرہیز کریں۔ نماز کی پابندی کریں اور اپنے خیالات کو صاف رکھیں۔ مزید کوئی معلومات درکار ہوں تو آپ میرے موبائل نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

شفیق احمد..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

حل کے آپ نے معدے کی خرابی اور لیکوریا اور کمزوری کی علامات تحریر کی ہیں۔ آپ کے لیے نسخہ تجویز

کر رہا ہوں، کم از کم دو ماہ تک اس نسخے کو استعمال کریں اور پھر اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔ آپ لہٹک لیبارٹری فرانس کی دوا L-No-98 کی دو دو گولیاں دن میں تین بار چپا کر کھائیں۔ اس کے ساتھ مہران ہومیو فارما کے Toko-40 کپسول صبح، شام ایک گلاس پانی کے ساتھ کھائیں۔ بادی، مصلے دار اور تلی ہوئی اشیاء سے پرہیز کریں۔ چائے کا استعمال بھی کم کریں۔ پانی زیادہ پیتیں۔ نیند پوری کریں اور کسی بھی قسم کا ذہنی دباؤ نہ لیں۔

نوشاہ خاتون..... ملتان

حل کے آپ نے جو علامات تحریر کی ہیں ان کے مطابق نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ استعمال کریں، انشا اللہ آپ کو اس سے ضرور افادہ ہوگا۔ آپ لہٹک لیبارٹری کی دوا L-No-20 کی دو دو گولیاں دن میں تین بار چپا کر کھائیں۔ اس کے ساتھ L-No-36 کے بیس بیس قطرے دن میں تین بار تھوڑے پانی میں ڈال کر پی لیں جبکہ سیون ہریل فارما کی Breastogen کریم دن میں تین بار مساج کریں۔ آپ ایسی سبزیاں جن میں نمکیات اور پانی زیادہ ہوتا ہے استعمال نہ کریں۔ مثلاً پالک کا ساگ اور بند گوبھی وغیرہ۔ اس کے ساتھ ٹھنڈے مشروبات اور کھٹی چیزیں بھی استعمال نہ کریں۔ دودھ کا روزانہ استعمال کریں۔ تین ماہ تک دوا کا مسلسل استعمال کریں اور اس کے بعد مکمل کیفیت لکھ کر آگاہ کریں۔ انشا اللہ آپ کو ضرور افادہ ہوگا۔

بشیر احمد، اردو ال..... نورین مجاہد، کوئٹہ

حل کے آپ سب نے قد بڑھانے کے لیے نسخہ تجویز کرنے کی درخواست کی ہے۔ آپ سب D.B Hight ٹیبلٹ ایک ایک دن میں تین مرتبہ چپ کر کھائیں۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر ولما رشواہی کی دوا Phos-6x کی چار چار گولیاں دن میں تین مرتبہ چپا کر کھائیں۔ یاد رکھیں قد فوری طور نہیں بڑھتا اس کے لیے آپ کو کم از کم چار ماہ تک دوا کھانا پڑے گی۔ بالکی پھلکی ورزش اپنا معمول بنائیں۔ وقت پر کھانا



کھائیں اور تازہ سبزیاں پھل کھانے میں ضرور شامل کریں۔ روزانہ غسل کریں۔

نوید احمد بہادر پور۔  
حل کے آپ نے پیٹ کی خرابی سینے کی جلن اور گیس کی شکایت کی ہے۔ ہمارے ہاں یہ امراض عام ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ بے وقت کھانا، بے تحاشا کھانا، مرغن غذاؤں اور چٹ پٹی چیزوں کا استعمال ہے۔ اس کے علاوہ کوک وغیرہ اور زیادہ چائے نوشی کی وجہ سے بھی گیس اور معدے کی جلن ہو سکتی ہے۔ ایسے تمام افراد جو ان کیفیات میں مبتلا ہیں وہ لہنگ لیبارٹری فرانس کے L-No-95 کے پندرہ پندرہ قطرے دن میں تین مرتبہ تھوڑے پانی میں ملا کر پی لیں۔ مرغن ترش اور تیز مسالے دار اشیاء پر ہیز کریں۔ کھانا وقت پر تناول فرمائیں۔ رات کھانا کھانے کے بعد فوری بستر پر دراز نہ ہوں۔ چائے نوشی بکثرت نہ کریں۔

سحرش فاروقی چکوال۔ مس فردوس۔ کوہاٹ  
حل کے آپ سب نے بالوں کے گرنے، سر کی خشکی اور بالوں کے بے رونق ہونے کے بارے میں لکھا ہے۔ آپ سب کے لیے نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ سب مہران ہومیو فارما کا آئل Hair and Fair استعمال کریں۔ ابتدائی طور پر آپ اس آئل کی چھوٹی بیکنگ لے لیں اور بیکٹ میں موجود طریقے کے مطابق استعمال کریں اور اس کے ساتھ ہار پیئر شیپو استعمال کریں۔ ہر بار سر دھونے کے لیے آپ یہ شیپو استعمال کریں انشاء اللہ اس آئل اور شیپو کے کچھ عرصہ استعمال کے بعد آپ کے بال گرنا رک جائیں گے۔ خشکی بھی ختم ہو جائے گی اور بالوں میں چمک بھی پیدا ہو جائے گی۔

مس فردوس صاحبہ آپ کی تجویز ہم نے نوٹ کر لی ہے کسی قریبی اشاعت میں ہم بالوں کے مسائل پر مختصراً لکھنے کی کوشش کریں گے۔

گھزار بی بی، حویلی ٹوکھا۔ دیدار حسین، حب بلوچستان

رج کے آپ نے جو علامات تحریر کی ہیں اس کے مطابق دوا تجویز کر رہا ہوں۔ آپ لہنگ لیبارٹری فرانس کی دوا L-NO-2 کے پندرہ، پندرہ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ اس کے ساتھ Sinuspax Tab ایک، ایک گولی چوس کر کھالیں۔ دو ماہ تک تجویز کردہ ادویات استعمال کرنے کے بعد اپنی کیفیات سے آگاہ کریں۔ ٹھنڈی، کھٹی اور چکنائی والی اشیاء کا استعمال نہ کریں۔ ٹھنڈے پانی سے غسل نہ کریں اور آئس کریم اور کوئلڈ ڈرنک کا استعمال بھی نہ کریں۔

روزینہ دلی، حیدرآباد۔ میوند بیگم، ملیر کراچی  
رج کے آپ سب نے بوا سیر کے لیے نسخہ تجویز کرنے کی درخواست کی ہے۔ آپ سب ڈاکٹر ولما شواہ کی دوا BIO-NO-17 کی چار، چار گولیاں دن میں تین بار چبا کر کھالیں اور اس کے ساتھ لہنگ لیبارٹری فرانس کی دوا L-NO-104 کے 15-15 قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ گرم اور بادی چیزوں سے پرہیز کریں۔ گوشت کسی قسم کا نہ کھائیں۔ تازہ پھل اور سبزیاں استعمال کریں۔ جائے کم سے کم استعمال کریں۔ سرخ مرچ کا استعمال بالکل ترک کر دیں۔

شمین بلال۔ کوٹ لکھپت  
رج کے آپ نے جو علامات تحریر کی ہیں، ان کے مطابق نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ استعمال کریں، انشاء اللہ آپ کو اس سے ضرور فائدہ ہوگا۔ آپ لہنگ لیبارٹری کی دوا L-NO-20 کی دو، دو گولیاں دن میں تین، چار بار چبا کر کھالیں۔ اس کے ساتھ L-NO-36 کے بیس، بیس قطرے دن میں تین بار تھوڑے پانی میں ڈال کر پی لیں جبکہ سیون ہرمل فارما کی Breastogen Cream دن میں تین بار مساج کریں۔ آپ ایسی سبزیاں جن میں نمکیات اور پانی زیادہ ہوتا ہے، استعمال نہ کریں۔ مثلاً پالک کا ساگ اور پنڈ گوبھی وغیرہ۔ اس کے ساتھ ٹھنڈے مشروبات اور کھٹی چیزیں بھی استعمال نہ کریں۔ دودھ کا

روزانہ استعمال کریں۔ تین ماہ تک دوا کا مسلسل استعمال کریں اور اس کے بعد مکمل کیفیت لکھ کر آگاہ کریں۔ انشاء اللہ آپ کو ضرور فائدہ ہوگا۔

شمس بیگم، کراچی۔ علینا فاروقی، فیصل آباد  
رج کے آپ سب نے وزن بڑھانے اور جسم کو متناسب کرنے کے لیے تجویز نسخہ کی درخواست کی ہے۔ آپ سب مہران ہومیو فارما کے TOKO-40 کپسول صبح شام ایک، ایک سادہ پانی کے ساتھ کھالیں۔ اس کے ساتھ لہنگ لیبارٹری فرانس کا Lehning Tonic ایک، ایک چمچ دن میں تین بار کھانا کھانے سے قبل ایک گلاس پانی میں ڈال کر پی لیں۔ تازہ پھل اور سبزیاں کھائیں۔ کھٹی چیزیں استعمال نہ کریں۔ صبح شام سیر ضرور کریں اور دن میں کم از کم 14 گلاس پانی پئیں۔

نکھت فاطمہ۔ گجرات  
رج کے آپ نے لکھا ہے کہ بال گرتے ہیں، ان میں خشکی بہت زیادہ ہے، اس کے لیے مناسب نسخہ تجویز کیا جائے۔ آپ اور جینی بھی خواتین اس مرض میں مبتلا ہیں، کی خواہش کے مطابق نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ سب Cinci Hair Oil کا سر پر روزانہ مساج کریں اور اس کے ساتھ ہی مہران ہومیو فارما کا تیار کردہ ہر پیئر شیپو سر دھونے کے لیے استعمال کریں۔ انشاء اللہ چند روز کے استعمال سے ہی آپ کے سر کی خشکی ختم ہو جائے گی اور بال بھی گرنا رک جائیں گے۔ نمک کا استعمال کم سے کم کریں۔ ویسے بھی آئیوڈین ملا نمک استعمال کریں۔ کھٹی چیزوں کے استعمال سے بھی پرہیز کریں۔

عندلیب۔ لاہور  
رج کے آپ نے اپنے خط میں جسمانی کمزوری اور بالوں کے گرنے کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ آپ سیون ہرمل فارما کے تیار کردہ Harmogeen ٹیبلٹ ایک، ایک دن میں تین بار چبا کر کھالیں۔ اس کے ساتھ لہنگ لیبارٹری کا تیار کردہ Lehning Tonic دن میں تین بار ایک، ایک چمچ تھوڑے پانی

میں ڈال کر کھانے سے آدھا گھنٹا قبل پی لیں جبکہ بالوں کے لیے آپ Cinci Hair Oil روزانہ رات سونے سے قبل بالوں میں لگائیں اور خوب مساج کریں۔ آپ 8 ہفتے تک مذکورہ نسخے کا باقاعدگی سے استعمال کریں۔ آپ کو انشاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا۔

انعم حسن۔ کھاریاں  
رج کے آپ کے لیے نسخہ تجویز کر رہا ہوں۔ آپ کم از کم دو ماہ تک استعمال کرنے کے بعد اپنی کیفیات سے آگاہ کریں۔ انشاء اللہ آپ کو ضرور فائدہ ہوگا۔ آپ Cinci Acne کریم چہرے پر دن میں کم از کم چار مرتبہ لگائیں اور اس کے ساتھ لہنگ لیبارٹری فرانس کی دوا L-NO-40 کے پندرہ، پندرہ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ کھٹی ہوئی اور ترش چیزوں کا استعمال بالکل نہ کریں۔ چاول اور بڑے کا گوشت بالکل استعمال نہ کریں۔ پانی کا استعمال زیادہ کریں۔ منہ دھونے کے لیے بروکس ہومیو لیب کا نیم سوپ استعمال کریں۔

ن، کراچی۔ نکھت، مقام معلوم  
رج کے آپ سب نے جو کیفیات تحریر کی ہیں، ہمارے معاشرے کی بے شمار لڑکیاں اس مسئلے سے دوچار ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ ان کی اپنی نادانی اور والدین کی بے پروائی ہے۔ ڈش، کیبل اور انٹرنیٹ نے جہاں اس معاشرے کو فائدہ دیے ہیں وہاں بے پناہ نقصانات سے بھی دوچار کیا ہے جس کے باعث ہمارا معاشرہ بے شمار مسائل سے دوچار ہوا ہے۔ علاوہ ازیں غیر معیاری لٹریچر نے سونے پر ہمارے کام کیا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہر ایک بہن بچی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہر برائی سے بچائے۔ آپ سب سچے دل سے توبہ کریں، نماز کی پابندی کریں۔ بے شک نماز بے حیائی سے روکتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے۔

آپ سب ڈاکٹر ولما شواہ کی دوا Origenum-a کے 10-10 قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر پی لیں۔ اس کے ساتھ BIO





سپیشل

دن اسلام کی روغنیں آپ کے مسائل و مسائل

ایس۔ ایم۔ قادری

تمام قرینیں اللہ تعالیٰ جل شانہ و حق سبحانہ کو دیا ہیں۔ کہ جس نے کن لکھن سے اس عالم قانی کو کمال مہربانی سے تخلیق کیا۔ اور اس کو اپنی ذات کے نور سے معزز کیا ہے۔ اس نے بہترین مذہب اور بہترین رسول عطا کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدس نے انسانی شعور کو ہدایت کی ان بلند یوں کی جانب گامزن کیا کہ جہاں ذات باری تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ انسان کیلئے آج بھی راہ ہدایت موجود ہے۔ کتاب الہی الہیک ہمارے روشن مستقبل کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی۔ اور اسی طرح سنت رسول کریم ﷺ آج بھی قائم و دائم ہے۔ اور تاقیامت عالم انسانیت کے لئے روشنی کا یہ تار ہے گی۔ تو پھر آئیے ہم اپنی کوتاہ نظری اور بیماری، تعلقات کو اسامہ الحسنى اور اسوۂ حسنہ سے تروتازگی بخشیں اور اللہ جبارک و تعالیٰ کے نام سے اپنی عقل و قلوب کو روشن کریں۔ دیکھیں پریشانوں اور مشکلات کے حل کے لئے اس معبود برحق کی جانب رجوع کریں۔ جو کل عالمین کا رب ہے۔ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں جو تکلیف، اقتدار، ترقی، آسائش، شعور و آگاہی اور انسانی ضروریات کے تمام وسائل کا خالق و مالک ہے۔

جناب محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب معروف روحانی کارلہ اسامہ الحسنى کے متعلق دو دیگر دینی اور روحانی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علمدار بارہ سال سے اندرون اور بیرون ملک عوام کو اپنے مشوروں سے مستفید فرما رہے ہیں۔ انتہائی قابل قدر کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے کالم ملک کے تمام قومی اخبارات، مجامع میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے ماحول میں علمی و غیر علمی معروف اہل علم، دانشور، بیوروکریٹ اور ماسی شخصیات شامل ہیں۔ اندرون اور بیرون ملک ایک وسیع تر حلقہ محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کے مشوروں سے فیضیاب ہو کر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں سے امر قابل ذکر ہے کہ ہر سال بارہ سے چند ہزار افراد بذریعہ خط و کتابت روحانی تسکین اور جسمانی امراض میں شفا کے حصول کے لئے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ طر کا امتیاز بھی محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کو ہی حاصل ہے کہ وسطی ایشیا، عرب ممالک، کنیڈا، امریکا اور یورپ میں بسنے والے ہزاروں افراد بھی آپ سے بذریعہ خط و کتابت فیض حاصل کر رہے ہیں۔

ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے بھی ممتاز و منفرد ہے۔ کہ ان کے پروگرام بعنوان اسلام الحسنى 1998ء سے لے کر آج تک دنیا بھر میں کاسٹ ہوتا شروع ہوئے۔ ان پروگرام کی مقبولیت اور افادیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان میں ARY ڈیجیٹل سے آپ کے پروگرام اسلام الحسنى بعنوان "کامیابی کا راستہ" ہر جمعہ المبارک کو نشر ہوتا رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ دو دہائیوں میں کسی نہ کسی چینل کے حوالے سے پروگرام اسلام الحسنى ٹیلی کاسٹ ہوتے رہے ہیں۔

☆☆☆☆

بپ، ہمارے بھائی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس چینل کو بہت جلد آسمان کی رفعتیں عطا فرمائے (آمین) ہماری جانب سے چینل کے لئے ایک چھوٹا سا عطیہ ارسال ہے اللہ تعالیٰ ہمارے اس چینل کو ہر قسم کی نظر بد اور حسد سے بچائے۔ میرا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ میرے بچے بہت ذہین ہونے کے باوجود بعض اوقات نیٹ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ عام حالات میں وہ بہت اچھے

بکلیہ تبسم - کراچی

محترم! انتہائی خوش ہوئی ہے کہ جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی روحانی اور ایمانی قیادت میں علم کا سفر مسلسل آگے بڑھ رہا ہے ماہنامہ اسامہ الحسنى کا سہ ماہی کاراستہ کے بعد آپ کی جانب سے یہ اطلاع کہ ایک انتہائی خوبصورت، علمی، سماجی اقدار کے ستونوں پر قائم چینل کا اجراء ہو رہا ہے تو جی جی یوں لگا کہ جیسے ہم بارے

Oleum-Jac-3 x نیپلٹ دن میں تین مرتبہ دو، دو چوس کر یا چبا کر کھالیں۔ اس کے ساتھ L-NO-11 کے 15 قطرے دن میں تین مرتبہ تھوڑے پانی میں ڈال کر پی لیں۔ اس کے ہمراہ برانڈو کریم کا دن میں کم از کم تین بار استعمال کریں۔ انشاء اللہ آپ کو ضرور فائدہ ہوگا۔ ان دواؤں کا استعمال کم از کم دو ماہ کریں۔ تیز مرجع مصالحے والی اشیاء، بادی چیزوں اور چٹ پٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔ ہماری چند پاکیزہ بہنوں نے معلوم کیا ہے کہ آپ جو ادویات تجویز کرتے ہیں کیا وہ ہر جگہ دستیاب ہیں، اس کے لیے عرض ہے کہ ہومیوپیتھک میں جو نسخہ ہم تجویز کرتے ہیں اس کی ادویات پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں بہ آسانی دستیاب ہیں۔ یہ ادویات نہ ملنے کی صورت میں آپ میرے موبائل نمبر 0333-2133099 پر شام 4 تا 5 بجے تک فون کر کے معلومات حاصل کر سکتی ہیں۔

صبیحہ رشید..... سبئی

حل ہے آپ نے لیکچر یا کی تکالیف کا لکھا ہے اور مجرب دوا تجویز کرنے کی درخواست کی ہے۔ آپ سب مہراں ہومیوفارما کے Toko-40 کپسول، صبح، شام ایک ایک تازہ پانی سے لیں اور اس کے ساتھ لہتنگ لیبارٹریز فرانس کی دوا L.No-20 کی دو دو گولیاں دن میں تین بار چبا کر کھالیں۔ گرم اور ترش چیزوں سے پرہیز کریں۔ متوازن غذا استعمال کریں۔ تازہ پھل اور سبزیاں استعمال کریں۔

✱

NO-13 کی چار، چار گولیاں دن میں تین بار چبا کر کھالیں۔ اس کے ساتھ TOKO-40 کے صبح شام ایک، ایک کپسول سادہ پانی کے ساتھ کھالیں۔ جب اس نسخے کو چار ہفتے استعمال کر چکیں تو ڈاکٹر و لمار شواہے کی دوا Avena Stiva-Q کے 10-10 قطرے دن میں تین بار تھوڑے پانی میں ڈال کر پی لیں۔ ترش چیزوں کا استعمال نہ کریں۔ صبح شام پھل قدری کریں۔ تنہائی پسند نہ بنیں۔ گھر کے دیگر افراد کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند کریں اور خوش رہنے کی کوشش کریں۔

نور بانو، لاہور۔ عبدالجبار، چوکی

صبح ہے آپ نے قبض، معدے کی خرابی اور کمزوری کی علامات بیان کی ہیں۔ آپ ڈاکٹر و لمار شواہے کی دوا BIO-NO-4 کی چار، چار گولیاں دن میں تین بار چبا کر کھالیں۔ اس کے ساتھ Carbo Vege-30 کے پانچ، پانچ قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر دن میں تین بار پی لیں۔ اس کے ساتھ سیون ہرمل فارمیسی سوات کی تیار کردہ ٹیبلٹ Harmogeen صبح، شام ایک، ایک گولی چبا کر یا پانی کے ساتھ کھالیں۔ بادی چیزیں استعمال نہ کریں۔ موسم کے تازہ پھل ضرور کھالیں۔ کھانا دقت پر کھالیں۔ چائے کا استعمال کم کریں۔

صائمہ رئیس، میرپور خاص۔ شمشاد بیگم، کوٹ اڈو حل ہے آپ نے چہرے کے کیل جھامیوں کے بارے میں نسخہ تجویز کرنے کی درخواست کی ہے۔ آپ سب بہنیں لہتنگ لیبارٹری فرانس کی تیار کردہ

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) ٹیک نیٹ کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشہورین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشہورین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ چلی نہیں۔ کوئی اخلاقی یا قانونی ذمہ داری نہیں ہوگی۔



نمبر لیتے ہیں مگر جب انہیں یہ بتادیا جائے کہ آج امتحان ہے ٹیٹ ہے تو پھر وہ پتا نہیں کیوں خوفزدہ ہو جاتے ہیں، اس صورت حال کے لئے کوئی نقش جو یہ فرمائیے۔ آپ کی دعاؤں کی طلبگار۔ آپ کی بہن

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو تمام بہن بھائیوں کو اپنی رحمتوں اور برکتوں کے سائے میں رکھے آپ سب کی حوصلہ افزائی ہے جو کہ اتنا زیادتی پر وحیئت پایہ تکمیل کی جانب رواں دواں ہے۔ آپ سب کی دعاؤں کا بے حد شکریہ۔ آپ کے بچوں کے لئے امتحانی کامیابی اور خیر و برکت کے لئے لوح عطا در ارسال کی جارہی ہے۔ بروز جمعہ سورۃ الحجۃ تین مرتبہ پانی پر دم کر کے پالیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔

☆ ☆ ☆ درخواستیں مطلوب ہیں ☆ ☆ ☆

☆ ہمیں اپنے دینی ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے بیرون ملک ٹیلی پورٹ کیلئے درخواستیں مطلوب ہیں۔ ویڈیو لائبریرین، آفس اسٹنٹ معقول تنخواہ، رہائش، خوراک مہیا کی جائے گی۔

☆ کیمبرہ مین، اسٹنٹ کیمبرہ مین، لائٹ مین، کمپیوٹر مینکس (انجینئر) (ایڈیٹر) (نان لیٹر) اپنی تازہ تصویر اور مکمل کوائف کے ساتھ رابطہ کریں۔

☆ ☆ بحیثیت بی بی وی نمائندہ اپنا کیریئر بنائیے ☆ ☆

ہمیں اپنے دینی ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے لئے ملک کے تمام اضلاع میں مستعد اور فعال نمائندے درکار ہیں۔ جو کہ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہوں اور اپنے اپنے علاقوں میں جانے پہچانے جاتے ہوں۔ اپنے اضلاع کی دینی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کی کوریج کر سکیں۔ اپنی یونین، ضلع، ناؤں اور کونسل کے نمائندوں کے انٹرویوز کر سکیں۔ مکمل اعتماد کے ساتھ اپنی تازہ ترین تصویر اور مکمل کوائف کے ہمراہ رجوع کریں۔

359-B فیصل ناؤں لاہور۔ فون نمبر: 042-5168036

☆ سر۔ شیخوپورہ

☆ آپ اپنی صحت کے لئے کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے۔ بھائی کے لئے علاج در عتیم کے سلسلے میں دوبارہ میڈیکل رپورٹس کے ساتھ خط لاہور کے پتے پر لکھیں۔

☆ صدف جاوید۔

☆ عزیز بہن! دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کو ہدایت دے (آمین) آپ بکثرت ”یا عزیز یا قدوس“ پڑھا کریں اول

آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ لاہور کے پتے پر براہ راست بھی خط لکھ سکتی ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

☆ ع۔ ر۔ اسولناورے

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی ازدواجی تاہماری کو بہتر فرمائے (آمین) از روئے استخارہ اس فیصلے کے نتیجے میں کافی مسائل جنم لیں گے۔ اس لئے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں بکثرت ”یا ستار“ پڑھا کریں۔ آپ لاہور کے پتے پر براہ راست خط بھیج سکتی ہیں میرا ذاتی فون نمبر 92300-8425381 پاکستانی وقت کے مطابق صبح 10 بجے تا رات 10 بجے تک کال کر سکتی ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

☆ ہانیہ آزاد کشمیر

☆ آپ کے معاملات میں خصوصاً بیرون ملک کے سفر میں تاخیر ہے۔ ”یا فاتح“ بکثرت پڑھیں نماز کی پابندی کیجئے۔

☆ روشنی رحمان۔ سرگودھا

☆ عزیز بہن! یاپس نہیں ہوتے بکثرت ”یا داب“ پڑھا کریں۔ حسب توفیق صدقہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کر م فرمائیں گے۔ انشاء اللہ عفرہ خاتون۔ کوٹ عبدالمالک لاہور

☆ محترم! اگر شہر طویل عرصے سے عجیب سی کیفیت رہتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی اندر ہی اندر کچھ کھرج رہا ہے گھر میں عجیب قسم کی بدبو کا احساس ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں رکاوٹ پڑتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی نے ہمیں اندھنی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ بیٹی کی نسبت جہاں ڈیڑھ سال سے طے تھی انہوں نے اپنا ایک بغیر کی معقول وجہ کے رشتے سے انکار کر دیا بیٹے کا اقامہ اچانک کنسل ہو گیا شوہر کا ایکسڈنٹ ہو گیا اور ٹانگیں ٹوٹ گئیں ایک دن اچانک ایسا شارت سرکٹ ہوا کہ فرج، ٹی وی، مائیکرو ویو اوون کیزر سب بھگ سے جل گئے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ناویدہ بلاؤں نے چاروں طرف سے اپنا حصار کر لیا ہے۔ آپ از روئے استخارہ کچھ ارشاد فرمائیے اور اس صورتحال کا تذکرہ کیجئے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ سخت قسم کی بندش اور شعلی علم کیا گیا ہے سمجھ نہیں آتا کہ ہم سے کیا گواہ کیا تعمیر ہوگئی ہے جو زندگی پر غلاؤں کی لپیٹ میں آگئی ہے۔

☆ عزیز بہن! از روئے استخارہ یہ تفصیل درست ہے کہ آپ حقیقتاً شعلی اور ایسی معاملات میں مبتلا کر دی گئی ہیں۔ سب اس کا جائزہ آپ کا کسی خاص معاملے میں انکار تھا بہر کیف ظالم کا قہر اللہ کی

رحمت کاملہ کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے آپ ذاتی طور پر مکمل اتار“ اور متعلقہ نقوش دفن سے منکوا لیں سورۃ بقرہ کی تلاوت کثرت سے کیجئے۔ اور گھر میں باقاعدگی سے بیچ وقت اذان اور نماز کی طرف توجہ دیجئے۔ انشاء اللہ حالات میں فرق پڑ جائے گا۔

☆ سہیلہ کریم۔ کراچی

☆ محترم! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حقوق خدا آپ کے بنائے ہوئے وفاق سے صحیح اسلامی طریقے سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ ہماری توہر سانس میں یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام اہل خانہ دین، ایمان، اور مقامات دنیا ہمیشہ میں عروج پر فائز رہیں کہ جن کے ذریعے ہمارا آپ سے مسلسل رابطہ رہتا ہے۔ میرا ایک مسئلہ یہ ہے کہ میں ہر بات میں بہت جلدی گھبرا جاتی ہوں۔ بچوں کو اسکول سے دیر ہو جائے یہاں انکر کسی مہمان کو باہر چھوڑنے کے لئے چائیں، نوکرائی کسی دوسری نوکرائی سے کھر پھر کر یوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی سناٹا ہو رہی ہے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ایسا کیوں ہو گیا ہے حالانکہ پہلے تو میں ایسی نہیں تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی کی شادی کا مسئلہ کسی صورت حل نہیں ہوا ہے۔ لہذا آپ اس حوالے سے مجھے کوئی نقش یا لوح عنایت فرمائیں۔ گیارہویں شریف کے لئے بچیں ہزار مرتبہ درود شریف اس کو میری جانب سے شامل کر لیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین) آپ کی بہن۔ آپ کے لئے ہمیشہ دعا گو

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ سب کو بھی ہمیشہ غایت کی چھاؤں میں رکھے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد ”یا قوی یا سلام“ 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی کیفیت کے پیش نظر آپ کو لوح اسم ذات ارسال کی جارہی ہے۔ حسب ہدایت استعمال سے آپ کے خوف اور ڈر پریشانی میں کمی آجائے گی۔ انشاء اللہ

☆ مراد بخش۔ کوئی لوہار خان

☆ محترم! میری پریشانی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میں مستقل مزاج نہیں ہوں ذاتی اور شعلی بھی ہوں بات بات پر خجڑ کرتا ہوں اور ایقاندار سے اپنا تجزیہ کروں تو آپ کو صاف صاف کہہ دوں کہ میں جلد باز، غصہ ور، کیتھ پرور، اور کج فہم ہوں میری بیوی بہت اچھی ہے میری ساری خامیاں برداشت کرتی ہے لیکن میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہوں پھر بعد میں چچھتا ہوں مجھے کوئی ایسا

اسم الہی عطا کریں کہ جس سے میں نرم مزاج، چل مزاج ہو جاؤں میری خامیاں اور اصلاح ہو پائیں۔ میں نے آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اس امید پر کہ آپ کے در سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ میری مدد کیجئے آپ کا پرستار ذاتی خادم آپ کی نظر کرم کا شہت سے متنی۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہم سب کی اصلاح فرمائے اور ہماری بھلائی کے راستے کھول دے (آمین) جب انسان کے اندر اصلاح کی خواہش ہو خود کو بدلنے کی بجلی آرزو ہو تو اللہ تعالیٰ یقیناً مدد فرماتا ہے آپ کو کشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ با وضو رہا کریں اور بکثرت ”یا قدوس“ پڑھا کریں اور اسم ذات برائے اصلاح اور روحانی ترقی کے لئے ارسال کی جارہی ہے نماز کی پابندی فرمائیں۔

☆ نبیلہ حیدر اکرام۔ حیدر آباد

☆ محترم! میں ایک خاص مسئلے میں آپ کی رائے چاہتا چاہتی ہوں۔ کیونکہ اسی مسئلے کے حوالے سے آپ نے ایک بہن کو مشورہ دیا تھا اور اب وہ بے حد مطمئن اور معاشی اعتبار سے آسودہ ہیں اور وہ میری بیوی بھی زاد بہن ہیں۔ مسئلہ کچھ یوں ہے کہ میرے والدین کے ترکے سے مجھے آٹھ لاکھ روپے ملے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ وہ کسی اچھی جگہ لگائیں جہاں سے ہمیں کچھ مناسب آمدنی مل سکے اور ہمارا سرمایہ بھی محفوظ رہے۔ میرے شوہر اور میرا دونوں کا دل بینک میں انوسٹ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ

## ٹوکن برائے مسیحا

فروری 2008ء

اپنا مسئلہ ٹوکن کے ساتھ ارسال کریں ورنہ قابل توجہ نہ ہوگا۔ پورا نام: \_\_\_\_\_

مکمل تاریخ پیدائش: \_\_\_\_\_

مکمل پتہ: \_\_\_\_\_



موجود ہے جس کی تاو برکت ہے اور سب سے بڑھ کر جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک قطعاً حرام ہے۔ ہم اس کو ایسی جگہ استعمال کرنا چاہتے ہیں جہاں سے ہم کو اسلامی حلال طریقے سے منافع بھی ملے، اور ہمارا سرمایہ کسی اسلامی کام میں استعمال ہو، آپ ہمیں بھی اس دینی ادارے کا نام بھجوا دیجئے تاکہ ہم اس کے نیک کام میں شریک بھی ہو سکیں اور سرمایہ کاری سے ہمیں بھی منافع مل جائے۔ امید ہے کہ آپ جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں گے۔ آپ کی بہن۔ آپ کے لئے دعا گو

✽ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو، ہم سب کو استقامت دین عطا فرمائے اور ہم سب کو حلال اور طیب رزق عطا فرمائے (آمین) آپ رزق میں اضافے کے لئے ”یا کریم یا غنی“ بکثرت پڑھا کریں۔ آپ کو اس ادارے کی تفصیلات بھجوائی جارہی ہیں۔ دعاؤں کا شکریہ

مریم کوثر۔ اسلام آباد

○ محترم! گزشتہ کافی عرصے سے شدید پریشان ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے مشورہ لوں، ایک خاتون نے مجھے آپ کا کالم پڑھوایا۔ ایسا لگا کہ جیسے اندھیرے میں روشنی مل گئی میں ایک ملٹی ٹیکسل کپنی کے مقامی دفتر میں کام کرتی ہوں وہاں مجھے ایک کولیک نے پر پوز کیا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ میں اپنے بہن بھائیوں کی پرورش کا عزم لیکر گھر سے نکلی تھی اور تیسرے ہی مہینے میں کس طرح اپنے مقصد سے بے وفائی کر سکتی تھی مگر اس کا اصرار بدھتا ہی گیا پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں اس سے گریز نہ کر سکی اور اس سے اقرار کر بھی لیا مگر میں نے اس کو اپنے سارے حالات بتا دیئے کہ میں تم سے محبت تو کر سکتی ہوں مگر کم از کم مجھے سات سال شادی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس وقت تک میرے بہن بھائی بڑھ لکھ کر کسی قابل ہو سکیں گے اس نے فوراً ہی اس صورت حال کو قبول کر لیا کیونکہ اس پر بھی بہت ڈے دے دیاں تھیں۔ اور وہ بھی اس سے قبل شادی نہیں کر سکتا تھا اس کے بعد یوں ہوا کہ اس کا ایک دوست آسٹریلیا چلا گیا اور اپنا فلیٹ اس کو دے گیا کہ تم بہت دور رہتے ہو یہاں رہا کرو اس طرح تمہیں ہر ہفتے گاؤں آنے جانے سے نجات مل جائے گی وہ بہت خوش ہوا پھر اس فلیٹ کو میں نے سچایا سنواریا۔ وہ کہنے لگا مگر مل گیا ہے چاہے عارضی طور پر ہی کسی (عارضی سال کم از کم پانچ سال تھے) ہم لوگ اکثر ویک اینڈ اکٹھا گزارتے اور اس

سے پہلے کہ جذبات کے ہاتھوں کوئی غلطی کرتے ہم نے باہمی رضامندی سے نکاح کر لیا کیونکہ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو شاید گناہ کے مرتکب ہوتے۔ بد قسمتی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ ایک دن میری والدہ نے مجھے اس کے ساتھ کھوتے دیکھ لیا پھر انہوں نے کوشش کر کے میرا فلیٹ بھی دیکھ لیا پھر ایک دن وہ فلیٹ پر آ پہنچیں۔ انہوں نے ہمیں بحیثیت میاں بیوی دیکھ لیا۔ اب وہ سخت ناراض ہیں انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ حالانکہ میں نے اور میرے شوہر نے ان سے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی، ہمارے دو تین کو لیک جو اس صورت حال سے واقف تھے انہوں نے نکاح کی گواہی دی، نکاح نامہ دکھایا مگر میری والدہ کی ناراضگی برقرار رہی۔ خدا گواہ ہے کہ اب تک میں نے گھر بلو اخراجات میں کوئی کی نہیں کی۔ اور ہمیشہ انہیں پیسے دینے کی کوشش کی۔ مگر وہ مجھ سے پیسے نہیں لیتی ہیں، اس قدر بھی ترشی میں وقت گزار رہی ہیں کہ کیا بتاؤں آج اس خط کو لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے کسی گھر میں کھانا پکانے برتن دھونے کی نوکری کر لی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بھائی مجھ سے ملنے کے لئے ترستے ہیں۔ مگر ماں کو چھوڑ نہیں سکتے۔ وال چٹنی کھا لیتے ہیں مگر مجھ سے پیسے لینے کی انہیں اجازت نہیں ہے ماں نے مجھے بہن بھائیوں سے ملنے سے نہیں روکا مگر میں ان سے مل کر کیا کروں جب وہ مجھے ایک گلاس پانی بھی دے نہیں سکتے۔ میرے شوہر نے میری خزا کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم یہ یہ ساری مصیبت میری وجہ سے آئی ہے میں نے اس بات کا وعدہ کیا تھا تمہیں نہیں روکوں گا ملازمت کرنے سے، شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ یہ سب خالی دعوے ہیں مگر ہر گزرتے ہوئے وقت ان باتوں میں سچائی بھری ہے۔ میں والدہ کو منانا چاہتی ہوں میں نے نافرمانی کی ہے لیکن کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ خدا اور اس کے رسول کے حضور میں گناہ کا رنجش ہوں مگر میری ماں کے پاس میرے لئے سوائے حرف انکار کے کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ سے اس امر کی درخواست ہے کہ کوئی ایسا اسم بتائیے کہ جس سے میری ماں مجھ کو واپس مل جائیں کوئی لوح عنایت کر دیں تو بہت ہی مہربانی ہوگی۔ اس کے علاوہ میں چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد کی نعمت بھی عطا فرمادیں۔ آپ کی بیٹی محتاج دعا۔

✽ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ پر فضل و کرم فرمائے (آمین)

بنیادی طور پر آپ نے کوئی شرعی اعتبار سے غلطی یا گناہ نہیں کیا مگر آپ نے چونکہ ان کے علم میں لائے بغیر یہ کام کیا اس لئے ان کی ناراضگی ہوئی دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ آپ کے والد کے انتقال کے بعد انہوں نے تمام توقع آپ سے وابستہ کر لی تھی اس حوالے سے بھی ان کا رد عمل شدید ہوا۔ تاہم خوشی اس امر کی ہے کہ آپ کے شوہر آپ کے معاملات میں آپ کے ساتھ مکمل تعاون کر رہے ہیں آپ ہر نماز کے بعد ”یا عزیز یا قدوس“ پڑھا کریں 140 مرتبہ۔ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف والدہ کے لئے لوح تسخیر خاص اور اولاد کے لئے علاج درقیم ارسال ہے دعاؤں کا شکریہ

محمد ادریس۔ راولپنڈی

○ محترم! آج سے 7 سال پہلے میری نوکری بہت اچھی تھی میں نے نوکری چھوڑ کر پراپٹی کا کام شروع کر دیا جس میں، میں نے بہت پیسا کمایا میرا کام زیادہ فالگوں کا ہوا کرتا تھا جتنے لوگوں کو میں نے فالگوں دلوائیں تھیں ان کو شروع میں تو منافع ہوا لیکن اب ان فالگوں کے ریٹ کافی کم ہو گیا ہے میں نے بھی جو پیسہ کمایا اس پیسے کی فالگوں خرید لی تھیں۔ اب نہ روز کار اور نہ کوئی سرمایہ ہے کہ کوئی کاروبار کر سکوں میری مدد فرمائیں۔

✽ ”یاداب یا فاتح“ بکثرت پڑھا کریں۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔ لوح مشتری ارسال ہے۔

حمید انثار۔ پوک اعظم

○ محترم! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت میسر نہیں آئی ہے۔ شادی کے پہلے سال تین ماہ کے بعد حمل ضائع ہو گیا تھا۔ پھر اس کے بعد آج تک کوئی معاملہ نہیں ہوا ہے۔ جبکہ طبی اعتبار سے ہم دونوں بالکل فٹ ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ حمل دعا میں ہمارے لئے اولاد کی دعا بھی فرمائیں اور اس حوالے سے مجھے روحانی علاج بھی تجویز فرمائیے۔ آپ کی بیٹی۔ ہمیشہ آپ کے لئے دعا گو

✽ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ آپ کے گھر کو شاد و آباد رکھے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ ”یا کریم یا سلام یا وارث یا باقی“ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر اولاد و نرینہ کے لئے علاج درقیم ارسال کیا جا رہا ہے۔ دعاؤں کا شکریہ

## شرف ستارگان کی ادوائے

اسپتہ نام اور ستارے کے مطابق لوح ہوا کا کامب دھکیں۔

## لوح شرف مرغ

دل کی گھبراہٹ، ڈپریشن، مروانہ امراض، خواہش کے امراض، بخون کی کمی، آسپ سے نجات، افسران بالائی توجہ اور رجوع خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف ذہرہ

تسخیر خلق، پسند کی شادی، ڈاکٹر و سکیم، سیاستدان، جورتوں کے امراض، ایڈیز، ٹیڈیکوریشن، مصوروں، خطاطوں اور ادیبوں کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف عطارد

علی ترقی، حافظہ میں اضافہ، تعلیم میں کامیابی، یادداشت میں اضافہ، بچوں کا خواب میں ڈرنا، ٹرانسپوٹ تجارت اور کیٹیکیشن سے منسلک افراد کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف قمر

پرانی جسمانی بیماریاں، نفسانی امراض، تسخیر ترقی، زراعت اور باغبانی کے لئے مفید روحانی قوتوں میں مشافہ، روحانی علوم میں کامیابی، تسخیر خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف مہس

ترقی، عروج، بھر، جادو سے حفاظت، روپے پیسے کی آمد، سماجی مرتبے میں اضافے کے لئے تیار کی جاتی ہے، جن کے واسطے میں محس کمزور بہان کیلئے مفید ہے۔

## لوح شرف مشتری

مالی خوش بختی، حصول دولت، آمدنی کے مختلف ذرائع کو ترقی دینا، انعامی اسکیموں میں فائدہ، مستقبل کی بہتری، کیریئر اور ترقی کے استحکام کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف زحل

کاموں میں رکاوٹ، حیا ستاد کے تنازعات، چرانے امراض، خدشی امراض، محسوس، جادو، آسپ سے نجات کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

## لوح شرف سبع ستارگان

### ساتوں ستاروں کا یکجا تسخیر

خیر و برکت، مالی خوش بختی، تسخیر خلق، مرد اور عورتوں کے پرانے امراض، شادی میں تاخیر اور رکاوٹ، علی ترقی، تعلیم میں کامیابی، گھریلو پریشانیوں، جادو آسپ سے نجات کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

اپنی پسند کی لوح ہوائے کیلئے رابطہ کیجئے۔ B-359 فیس 5168036-5167842 ٹاؤن لاہور۔ پاکستان۔ فون نمبر:



محسن اکبر۔ لیاقت آباد کراچی

○ محترم! کانی ماہ سے ہمت کر رہی ہوں کہ آپ کو خط لکھوں مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر نے ہمیشہ مجھے دوسرے درجے کی عورت سمجھ کر محبت اور پیار سے بات نہیں کی، مجھے بھروسہ نہیں کیا۔ میری ساری زندگی کی کمائی چار بچے ہیں جو کہ میاں کے سامنے موم کے پتے بنے رہتے ہیں میرے شوہر مجھے جوان اولاد کے سامنے بیٹے ہیں اس طرح کھینچ کھینچ کر مارتے ہیں کہ بعض اوقات فیض پھٹ جاتی ہے جوان اولاد کے سامنے بے عزتی ہوتی ہے۔ مجھے طلاق کا نہیں موت کا خوف طاری رہتا ہے۔ شوہر ایسا جنونی شخص ہے کہ کیا بتاؤں ان کو عورت پر اعتراض نہیں۔ ہمیشہ گندی زبان سے یاد کیا۔ مجھ میں نہیں آتا کہ کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ خود کٹی کر لوں مگر پھر سوچتی ہوں کہ اس حرکت کے بعد اگر خدا مجھ سے روکھ گیا تو میرا شک نہ کہاں ہوگا؟ بس انہی وجوہات کی بناء پر خود کٹی نہیں کر سکی۔ چاروں جوان بیٹے، باپ سے خوف زدہ رہتے ہیں یوں لگتا ہے کہ انہیں خوابوں میں بھی صرف باپ ہی دکھائی دیتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرا شوہر تشدد سے باز آ جائے۔ کیونکہ مجھ میں اب مزید زخم کھانے کی استطاعت نہیں رہی ہے اس کے لئے آپ مجھے کوئی تعویذ کوئی وصا بتا دیجئے۔ یہ آپ کا مجھ پر سب سے بڑا احسان ہوگا۔ آپ کی کمیاری بہن! ہمیشہ آپ کے لئے دعا گو رہے گی۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے صبر اور استقامت کی جزا دینا اور آخرت دونوں ہی جگہ دے گا انشاء اللہ۔ آپ جیسی عورتوں نے ہی ہمیشہ ابودقائم رکھی ہے۔ درحقیقت جب انسان بچپن سے عورت کا منفی رخ دیکھتا آئے تو پھر اس کا یقین عورت ذات سے اٹھ جاتا ہے آپ کے شوہر کی والدہ کا کردار ان کی نفسیات پر اثر انداز ہوا اور یوں ایک عورت کی قلبی دوسری عورت کے لئے سزا بن گئی۔ آپ بکثرت "یا قددوس" پڑھا کریں۔ آپ کی فرمائش پر لوحِ تخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ دعاؤں کا شکریہ۔

○ نقیص خان۔ واہ کینٹ

☆ عزیز بہن! شب قدر کے سلسلے میں لکھا گیا خط مجھے 2 دسمبر کو موصول ہوا الحمد للہ شریف کے بعد دونوں سورہ مبارکہ تیرہ، تیرہ مرتبہ پڑھتی ہیں۔ اگر آپ کو جلدی جواب چاہئے تو براہ راست لاہور کے پتے پر خط لکھئے پاکیزہ میں خط کا جواب باری

آئے پری دیا جاتا ہے۔

○ رضوانہ۔ کورنگی۔ کراچی

☆ عزیز بیٹی! ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ سورہ الم نشرح پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

نائیکہ۔ کراچی

○ محترم! میں اپنے نام اور ستارے کے حساب سے لوحِ بنوانا چاہتی ہوں۔ میرا ستارہ عقرب تاریخ پیدائش 7 نومبر ہے۔ جس سے میری زندگی میں کوئی دکھ پریشانی نہ آئے اور میں ہمیشہ حسد، جادو، معاشی، حالات سے دوچار نہ ہوں۔

☆ عزیز بیٹی! دکھ، پریشانی، خوشیاں یہ زندگی کا حصہ ہیں۔ کوشش کریں کہ اچھے اخلاق، اچھا برتاؤ اختیار کریں۔ اور اس ذات پاک سے رابطہ رکھیں کہ جس کے بعد کسی اور شے کی ضرورت نہیں رہتی۔ "یا سلام" بکثرت پڑھیں۔ لوحِ مرخ ارسال ہے۔

عائشہ۔ اوکاڑہ

○ محترم! میں اپنے گھر میں وقتی سکون کی خواہشمند ہوں والدہ امراض جگر میں مبتلا ہیں وہ ہر وقت طرح طرح کی پریشانیوں میں گھری رہتی ہیں۔ اور تقریباً قیامی مریض بن چکی ہیں۔ میری والدہ چاہتی ہیں کہ ہم سب بہن بھائی تعلیمی میدان میں کامیاب ہو جائیں اور اپنے اپنے مستقبل میں خود بخار ہوں۔ میں میری بہن ڈاکٹر بننا چاہتی ہیں مہربانی فرما کہ ہمیں کامیابی کیلئے کوئی لوح تجویز فرمائیں۔

☆ عزیز بیٹی! آپ میں محبت اور دوگز رکھو اختیار کریں۔ سورہ بقرہ کا اکثر قسم کرایا کریں۔ آپ کیلئے لوحِ سبع ستارگان ارسال ہے والدہ صاحبہ کیلئے اجتماعی میں خصوصی دعا کر دی گئی ہے ان کیلئے لوحِ شفاء ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

سعیدہ۔ لاہور

○ محترم! آپ کا کالم پڑھا تو مجھے امید نظر آئی میں بہت دگی ہوں بیس سال ہو گئے میری شادی کو حالات خراب سے خراب ہو رہے ہیں نہ گھر ہے نہ بہتر روزگار۔ 5 بچے ہیں سب سکول جاتے ہیں 7 ہزار تنخواہ ہے۔ اتنی تنخواہ میں گزارہ کرنا مشکل ہے۔ گھر بھی کرائے کا ہے۔ آپ ہمیں کوئی ایسا طریقہ دیں جس سے ہماری جائز ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ تاحیات آپ کی احسان مند رہوں گی۔

☆ عزیز بہن! "یا کریم یا قی" بکثرت پڑھیں۔ ایک روٹی خیرات کر دیا کریں۔ نقش نامہ ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

○ فرزند شبنم۔ کراچی

☆ آپ دونوں کے ہاں اولاد کے امکانات ہیں لیکن اس میں سخت طبی نگہداشت کی ضرورت ہوگی "یا کریم" بکثرت پڑھا کریں۔

○ رشما۔ میانوالی

☆ عزیز بیٹی! بار بار عرض کیا ہے کہ پاکیزہ میں خط باری آنے پر شائع ہوتے ہیں، اور جن کے خط شامل ہوتے ہیں ان میں سے کوئی ہمارا رشتے دار نہیں ہوتا۔ اگر آپ ارجنٹ جواب چاہتی ہیں تو براہ راست جوانی لفافے کے ہمراہ B-359 فیصل ٹاؤن لاہور کے پتے پر خط لکھ سکتی ہیں اپنا گھر سامنے کے لئے عورت کو قربانی دینا ہوتی ہے۔ ہمارا تو آپ کو یہ مشورہ ہے کہ اس مسئلے کو اتنا مسئلہ نہ بنائیے اور بھابھی سے کہیں اپنے گھر آجائیے۔ اپنے گھر آنے میں کوئی سبکی نہیں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو صحیح فیصلہ کرنے کی قوت عطا فرمائے (آمین) "یا جامع" بکثرت پڑھیں۔

○ فرزندہ۔ کراچی

☆ عزیز بیٹی! تعجب کی بات ہے کہ آپ ہمارا کالم کئی سال سے مسلسل پڑھ رہی ہیں اور پھر بھی ایک ایسے عامل کے ہتھے چڑھ گئی ہیں جو اپنا نام ایس۔ ایم۔ قادری بتاتا ہے بلکہ پاکیزہ کا حوالہ بھی دے رہا تھا۔ ہماری تصویر پہچان کے لئے کافی ہے اب اگر پھر بھی آپ کی پہچان میں نہ آئے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہاں ہم آپ کو وضاحت سے عرض کر دیں کہ کراچی یا پاکستان بھر میں سوائے لاہور کے تا تو ہمارا کوئی ذیلی آفس ہے ناسی ہمارا خلیفہ، شاکر دیا بزم خود کوئی استاد یا رشتے دار ہے۔ اور ناسی ہم نے اپنا کوئی مرید خاص برطانیہ یا امریکا میں متعین کیا ہے۔ "یا کریم" بکثرت پڑھیں۔

○ کرن عمر۔ نامعلوم شہر

☆ عزیز بیٹی! بھائی کے لئے "یا رافع" 100 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں رشتے کے مسائل کے لئے "یا لطیف یا قاض" 140 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں۔ اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ دیگر مسائل کے لئے آپ براہ راست خط لکھ سکتی ہیں۔ یہی جواب ان تمام بہنوں کے لئے جو براہ راست جواب چاہتی ہیں کہ وہ اپنا خط اور پتا لکھا ہوا جوانی لفافہ ارسال کر دیں۔

ماہ علی۔ ملتان

○ محترم! میرا بیٹا شہر کے ایک بہت اچھے سکول میں پڑھتا ہے شروع میں اس کی تعلیمی معاملات سے ہم سب نہایت مطمئن اور خوش تھے لیکن جس سے ان نے اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لی

ہے اس کا پڑھائی سے دل اچھا ہو گیا ہے دوسرے یہ کہ وہ اکثر بیہار رہنے لگا ہے مزاجاً چڑچڑا بہت زیادہ ہو گیا ہے ششماہی رپورٹس بہت خراب آئی ہے کوئی بہتر مشورہ عنایت کیجئے۔

☆ عزیز بہن! آپ کے صاحبزادے کی شدید قسم کی نظر مگی ہے آپ صبح و شام 9 مرتبہ آیت الکرسی پانی پر دم کر کے پلائیں منگل کے روز بڑے گوشت کا صدقہ حسبِ توفیق دیجئے۔ تعلیمی ترقی اور نظربد سے حفاظت کے لئے لوحِ عطار دار سال کی جارہی ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کے بچوں کی حفاظت اور نگہبانی فرمائے۔

نوشابہ۔ کھاریاں

○ محترم! گزشتہ پانچ سال سے ہم لوگ اولاد کے لئے طرح طرح کے علاج دم بھار پھونک کر دارہے ہیں۔ لیکن کہیں سے مراد پوری نہ ہوئی۔ سب نے سبکی بتایا ہے کہ کالا جادو ہے کوکھ بندی ہے ستاروں کی نحوست ہے لیکن کوئی اس مسئلے کو حل نہ کر پایا۔ آپ سے درخواست ہے اللہ تعالیٰ کے مقدس اور بابرکت ناموں سے کوئی شافی حل اور عظیم تجویز فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو جائے اور اولاد کے لئے کی گئیں دعائیں بار آور ثابت ہو جائیں۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ جل شانہ کی حکمت اور مصلحت کے باعث بعض اوقات اس کی نعمتوں کے حصول میں تاخیر ہو جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کی رحمت آپ پر نہیں ہوگی۔ اس کی تاخیر میں حکمت ہے آپ ہر نماز کے بعد 131 مرتبہ "یا غنی یا دار ثباتی" پڑھ کر دعا کیا کریں۔ اول آخر 9 مرتبہ درود شریف بھی پڑھیں اولاد کے لئے علانِ درعقیم ارسال کیا جا رہا ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

○ فرزندہ جبین۔ سیالکوٹ

☆ عزیز بیٹی! آپ کا تفصیلی خط ملا۔ آپ بعد نماز عشاء ایک بار سورہ یوسف پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

○ صاحبہ۔ انک شہر

☆ عزیز بیٹی! آپ روزانہ (ربنا اتاننا الہنا حسنتہ و فی الآخرة حسنتہ و قنا عذاب النار) ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔

○ عزیز فاطمہ۔ گول چوک سرگودھا

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کی ہدایت عطا فرمائے اور آپ کو صحت کلی عطا فرمائے۔ (آمین) آپ "یا قوی یا سلام"



بکثرت بڑھیں۔ آپ لاہور کے پتے پر براہ راست خط لکھ کر لوح منکوا سکتی ہیں۔ دعاؤں کا شکر یہ

ساجدہ پروین۔ اسلام آباد

○ محترم! میری والدہ نے میری مفتی میرے خالہ زادے کی تھی مفتی کے بعد وہ لوگ باہر شفٹ ہو گئے اس کے بعد سے ان کے مالی حالات میں بہت بہتری آگئی ہے۔ چند ہفتے قبل ان کے کہنے کے مطابق جب ہم نے شادی کی تیاری کے سلسلے میں ان سے بات کرنا چاہی تو انہوں نے نہایت بے رخی سے کام لیا۔ اور کہا کہ میرے بیٹے کے ابھی تعلیمی مرحل میں کم از کم چار سال تو شادی کے لئے سوچا ہی نہ جائے جبکہ اس وقت بھی مفتی کو تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے اسی دوران ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ امریکہ میں ایک بہت امیر فیملی میں لڑکی دیکھ رہی ہیں۔ میں اور میرے معیت ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں ہماری خواہش ہے کہ ہماری شادی ہو جائے مگر میری خالہ کے کسی کسی کی بھی نہیں چلتی ہے میرے خالو دل سے اس رشتے کے حق میں ہیں لیکن خالہ کے آگے وہ نہیں مار سکتے ہیں۔ میرے معیت بھی کچھ نہیں کر سکتے ہیں آپ کا کالم میرے معیت نے امریکا میں پڑھا تھا اور انہوں نے ہی مجھے آپ سے رابطہ کے لئے کہا ہے ہماری راہ نمائی کیجئے اور اس مشکل سے نکالنے کیلئے کوئی حل تجویز کیجئے بے حد شکر گزار رہیں گے۔

☆ عزیز بھئی! اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو لالچ اور حرص سے محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین) ”یا کریم یا سلام یا عزیز یا جامع“ 313 مرتبہ بعد نماز عشاء پڑھ کر دعا کیا کریں۔ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف بھی پڑھیں۔ نماز کی پابندی کیجئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو منزل مراد عطا فرمائے۔ (آمین) نیلوفر۔ کراچی

○ محترم! میری بہن کی شادی ہونے والی ہے مگر بھائی کو کوئی ٹکری نہیں ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے لیکن میکے کے مسکوں کی وجہ سے ذہن ہر وقت پریشان رہتا ہے میں بھی ان کی مدد نہیں کر سکتی آپ مجھے کوئی ایسی دعا بتائیں کہ بھائی ڈے داری کا احساس کرے۔

☆ بھئی! اکثر مسائل کی اصل وجہ ایسی ہی ہے آپ کے گھر میں بھی اگر مالی پریشانی ختم ہو جائے تو حالات بہتر ہو جائیں گے نیت اچھی رکھیں صلہ بھی اچھا لے گا۔ ”یا وہاب“ کا بکثرت ورد کریں۔ لوح مشتری ارسال ہے۔

محمد شعیب۔ کراچی

○ میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں میں نے اپنے گھروالوں کو ان کے پاس بھیجا تھا کیلئے تو وہ راضی ہو گئے تھے مگر اب وہ نہیں مانتے۔ کوئی وظیفہ بتائیں کہ میری جلدی شادی ہو جائے آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹے! ہر نماز کے بعد ”یا کریم یا جامع“ بکثرت پڑھا کریں۔ انشاء اللہ مسئلہ جلد حل ہو جائے گا۔ لوح زہرہ ارسال ہے۔

سدرہ خانم۔ دہلی

○ محترم! کسی شام سے میں آپ نے کاروباری ترقی اور خیر و برکت کے لئے لوح مشتری تجویز کی تھی ہمارا یہاں ایک ڈیپارٹمنٹل مشور ہے جس کی سیل گزشتہ کئی مہینوں سے بہت کم ہو رہی ہے ہندوستان سے میری نندے کے پیر مشر یہاں تشریف لائے تھے ان سے عرض کیا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کے کاروبار میں کسی نے بندش کی ہے اور نظر لگی ہے۔ انہوں نے ہمیں ایک وظیفہ اور نقش عنایت کیا تھا اس کی برکت سے معاملہ کچھ دن تو ٹھیک رہا پھر دوبارہ وہی صورت حال ہو گئی ہے کچھ ایسا وظیفہ عنایت کیجئے کہ معاشی معاملات مستقل طور پر بہتر ہو جائیں۔ تاکہ ہم سکون سے زندگی گزار سکیں۔ بظاہر بڑا نام بڑا کاروبار ہے لیکن عملاً صورتحال وہی ہے کہ قبر کا حال بس مرده ہی جانتا ہے آپ دعاؤں کی درخواست ہے۔

☆ عزیز بھئی! اللہ تعالیٰ آپ کی اور تمام افراد کی معاشی سرگرمیوں کی حفاظت فرمائے اور اس میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ (آمین) سورۃ واقعہ بعد نماز عشاء پڑھنا معمول بنالیں۔ اول آخر 9 مرتبہ درود شریف پڑھیں۔ بکثرت ”یا وہاب“ پڑھا کریں معاشی خیر و برکت کیلئے لوح مشتری ارسال کی جا رہی ہے۔

☆ قراء۔ نعت خواں۔ مقرر۔ رکارڈ

ہمیں اپنے دینی جہتیں کیلئے ایسی خواتین و حضرات کی ضرورت ہے جو تلاوت قرآن، حمد و نعت ریکارڈ کرنا چاہیں، ایسے علماء اور خطیب اور اسلامی موضوعات پر رکارڈ حضرات بھی تشریف لائیں جو کہ فن خطابت پر عبور رکھتے ہوں۔ اور اپنی تقاریر ریکارڈ کروانا چاہتے ہوں۔ اگر آپ کی اس سے قبل کوئی تلاوت، حمد و نعت، تقریر، غرض کی وی سے نشر ہوئی ہو تو اس کی بھی CD ہمراہ لائیں۔

برائے رابطہ: ایس۔ ایم۔ قادری۔ B-359 فیصل ٹاؤن۔ لاہور

شہزاد احمد۔ راولپنڈی

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ جو دین کی خدمت کر رہے اس کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے لیکن اسامہ الحنسی کے حوالے سے یہ عرض کرنا کہ وہ آیا اس کو دیکھا اس نے فتح کر لیا جس کو خوبصورتی سلیقہ اور اعلیٰ درجے کی طباعت اور نفاست سے آپ اسامہ الحنسی کا میانی کاراستہ شائع کر رہے ہیں اس نے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمت کرنے والوں کو محنت کرنا دلوں کو اجر عظیم عطا کرتا ہے۔ اشرف بنو انجمنی والوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اتنی تیزی سے کوئی میگزین نہیں دیکھا جو آج ہی فروخت ہو جاتا ہو میں چار میگزین خریدتا ہوں ایک اپنے لئے، اور ایک، ایک احباب کو تحفہ دینے کیلئے مگر اس مرتبہ میرے ایک دوست نے کہا کہ آئندہ سے وہ خود بھی چار میگزین خرید کر تقسیم کریں گے اگر تم خود ایسا میگزین نہیں نکال سکتے تو اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق محترم قادر صا صاحب کا ہاتھ تو بنا سکتے ہیں۔ میری، میرے دوست احباب کو طرف سے اس شاندار کار میانی پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور بھی بلندوں سے ہم کنار فرمائے۔ (آمین) اب اصل عرض مدعا یہ ہے کہ میری مفتی کو چار سال ہو گئے ہیں مگر لڑکی والے تاریخ نہیں دیتے فضول قسم کی تاویل پیش کرتے رہتے ہیں کوئی ایسی لوح عنایت فرمادیجئے کہ جس کی وجہ سے میری جلد سے جلد شادی ہو جائے آپ کے لئے ہمیشہ دعا گو۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام احباب کو اعمال خیر کی ہمیشہ توفیق عطا فرمائے (آمین) آپ شادی کے لئے ”یا لطیف یا جامع“ بعد نماز عشاء 313 مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف بھی پڑھیں۔ آپ کی فرمائش پر لوح زہرہ ارسال کی جا رہی ہے دعاؤں اور محبتوں کا شکر یہ۔

سجاد احمد۔ راس الخیمہ

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے۔ اور آپ کو ہمیشہ عروج و ترقی سے ہم کنار رکھے۔ گزشتہ 8 سال سے یہاں ہوں

لیکن کوئی تسلی بخش معاملات نہیں ہو رہے ہیں۔ رزق کا یہ عالم ہے کہ آتا ہے اور خرچ ہو جاتا ہے پس انداز کچھ نہیں ہوتا وہ بیٹیاں جوان ہیں ان کی شادیوں کا مسئلہ ہے۔ بیٹے پڑھ رہے ہیں دن رات ایسی ٹگر میں نینداڑی جاتی ہے۔ پاکستان میں مکان بنایا ہے لیکن وہ بھی نامکمل ہے اس کے لئے ابھی مزید سات آٹھ لاکھ کی ضرورت ہے۔ رشتے میں بھی آجکل انٹینسٹ فیکٹر انوالو ہو گیا ہے بیگم کی بیماری علیحدہ ہے غریبہ زندگی عجیب سی ہے چینیوں اور دوسروں پر مشتمل ہے میری راہ نمائی کیجئے اور خیر و برکت کے لئے کچھ تجویز کیجئے۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کے اور تمام افراد عالم کے مسائل اور پریشانیوں اپنی رحمت کے طفیل دور فرمائے (آمین) ”یا کریم یا قاض“ بکثرت پڑھا کریں حسب توفیق بروز جمعہ صدقہ دیا کیجئے۔ صدقہ روزہ نماز کی پابندی کیجئے لوح تسخیر ستارگان ارسال ہے بیگم کی بیماری اور شوگر کے لئے لوح شفا اور نقش زعفران ارسال کر دیئے گئے ہیں۔ بیگم سے کہیں کہ ”یا مقیت“ بکثرت پڑھا کریں۔ اللہ تعالیٰ حامی اور ناصر ہو۔

○ س۔ ش

☆ عزیز بھئی! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو جسمانی اور ایمانی دونوں اعتبار سے بہترین حالت میں رکھے (آمین) آپ صحت کے لئے ”یا کریم یا سلام یا قوی یا مقیت“ 125 مرتبہ صبح، دوپہر و شام پانی پر دم کر کے پی لیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ سود کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ منافع جو نقص ہو وہ چاہے کہیں بھی ہو وہ سود ہے لہذا اس حوالے سے احتیاط بہتر ہے۔ آپ سود کی رقم کسی کو بھی دے سکتی ہیں مگر اس میں نیت مدد کی ہوگی ثواب کی نہیں۔ باقی تفصیلات آپ اپنے مقامی شہر کے علماء کرام سے لے سکتی ہیں۔ یا براہ راست دفتر بھی فون کر سکتی ہیں۔ دعاؤں کے لئے شکر یہ۔ فون نمبر 042-5168036

○ در شہوار۔ کراچی

ملاقات: روزانہ صبح 9 مغرب ”جمعت المبارک تعطیل“ (براہ راست جواب کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے۔)

ایس۔ ایم۔ قادری۔ B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون نمبر: 042-5167842, 5168036

ختم کیا ہو میں شریف اور اجتماعی دعا ہر انگریزی صبیہ کی پہلی اتوار کو بعد نماز عصر تا مغرب منعقد ہوتی ہے



## ☆ پاکستان کا پہلا مکمل رنگین اسلامی میگزین ☆

آسماء الحسنی  
۲۰ سالہ



## ☆☆ تازہ شمارے کی ایک جھلک ☆☆

”آسماء الحسنی۔ کامیابی کا راستہ“

دنیاۓ اسلام کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا سلسلہ

☆ حاشرہ کی عبادات اور وظائف

☆ سورۃ اخلاص۔ اعلانِ توحید، شرک سے خلاصی

☆ انکارِ حسینؑ۔ کتبائے اور خطبات کی روشنی میں

☆ شہادتِ معلوم کرنا۔ ”آپ کی سہل پھر ہم نہیں کرتے تھے“

☆ قدیم مدنی کتابیں اور قرآن پاک۔ ایک شاعرِ تحقیق مضمون

غراب اور قہیر۔ زندگی کی مشکلات اور پریشانیوں کا غراب سے باہمی تعلق

☆ آپ کے لئے ☆ سب کے لئے ☆

سالانہ ہدیہ برائے پاکستان۔ 900/- روپے

پاکستان بھر میں بذریعہ V.P سگوانے کیلئے خط لکھئے یا فون کریں

359-B فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان

فون نمبر: 5168036-5167842

☆ عزیز بیٹی! حیرت تو آپ کی والدہ پر ہے پر جو آپ کی شادی ایسے گھر میں کرنا چاہتی ہیں جہاں آپ کی عزت کو ہر طرف سے خطرہ ہے۔ اور جہاں بحیثیت عورت آپ کا جب کوئی احترام رہا تو پھر بہو کے حوالے سے آپ کے ساتھ کیا سلوک ہوگا اللہ تعالیٰ ہمیں برے فیصلوں سے بچائے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد ”یا سلام“ 400 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اور بہتر ہے کہ اپنی والدہ کے گھر ہی رہیں۔ اس گھر کو چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہم سب کی بیٹیوں کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

ضروری گزارش

☆ خط لکھتے وقت اپنا نام اور پتہ معہ شہر کے مکمل لکھئے۔ مخفی نام والے خطوط قابل جواب نہ ہوں گے۔ براہ راست جواب کے لئے لکھا ہوا جوابی الفاظ ارسال کیجئے اور ف، ک، ٹائپ کے نام لکھئے سے گریز کیجئے۔ اگر آپ اپنا نام نہ شائع کر دانا چاہیں تو فرضی نام لکھ کر واضح ہدایت کر دیجئے۔ فون پر مسئلہ و سس نہیں کیا جاتا ہے بہتر ہے کہ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھ دیجئے۔ بیرون ملک مقیم بہن بھائی صرف اپنا مکمل پتہ ارسال کریں انہیں جوابی لفافے کی ضرورت نہیں ہے۔

○ فرزانه، صاحبہ، شاکرہ فردوس، فائزہ اکرم، ادیبہ، انور، بلقیس بیگم، شمرہ، سلویٰ ماجد، عطیہ، روشن آراء، نسرین احمد۔ مقرر شہر

☆ آپ سب نے ختم شریف میں قرآن حکیم، مکملہ شریف، سورۃ ملک، سورۃ یسین، آیت کریمہ کی جو پڑھائیاں ایصالِ ثواب کے لئے تحریر کئے تھے۔ وہ سب محفل ختم شریف میں حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انبیاء علیہ السلام صحابہ اجمعین، سیدنا غوث الاعظم جملہ مسلمین و مسلمات کیلئے ہدیہ کر دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری کادشوں کو قبول و مقبول فرمائے۔ جو بہن بھائی ایصالِ ثواب حصولِ خیر و برکت کیلئے قرآن حکیم، مختلف سورتیں، مکملہ شریف، درود شریف پڑھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کی طرف سے ہادی عالم کی بارگاہ میں، بزرگانِ دین کے لئے پڑھائیوں کے ہدیئے بھیجے جائیں وہ بذریعہ خط، ٹیلی فون مطلع فرما دیا کریں۔

☆☆☆

اس مرتبہ ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا انشاء اللہ 6 جنوری بروز اتوار کو منعقد ہوگی۔ تمام بہن اور بھائیوں اور سریدین سے شرکت کی استدعا ہے۔